

کربِ محبت

(ناول)

فہمی فردوس



کربِ محبت

(ناول)

فہمی فردوس

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.439 Firdus, Fehmi
Karab-i Mohabbat/ Fehmi Firdus.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2016.
352pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ معصوم سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2016ء
انضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2963-4
ISBN-13: 978-969-35-2963-0

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN

Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423 724 5101

<http://www.sangemeel.com> e-mail: smp@sangemeel.com

عالمی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اس لازوال جذبے کے نام جسے عشق کہتے ہیں

بہت ہی اچھی اور پیاری

دوست

غزالہ یاسمین

کے لئے

خلوص و محبت کے ساتھ

فرام

فرہنگی دس

میں نورین فلک ناز ہوں۔ بہت بڑے چودھری کی بیٹی اور بہت بڑے زمینداروں کی بہو۔ میں وہ بد نصیب عورت ہوں جسے اپنے ہی گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ تل تل سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ مجھے عمر قید کی سزا اس جرم کی پاداش میں سنائی گئی جو میرے خاندان اور معاشرے کی نظر میں ناقابل معافی تھا۔ وہ سنگین گناہ جو مجھ سے سرزد ہوا اسے عشق کہتے ہیں۔ وہ عشق جو میرے لیے ”عشق ممنوع“ تھا۔ وہ عشق جس کی حدت سے میں جل جل کر خاکستر ہو گئی۔ وہ عشق جس نے پل پل مجھے مانڈ بیچ پکھلایا۔ وقت کا ہر گزرتا لمحہ مجھ سے میری زندگی کا خراج وصول کرتا ہوا رخصت ہوتا رہا اور میں لمحہ بالمحہ موت سے قریب تر ہوتی گئی۔

اب میری سزا ختم ہو رہی ہے کیونکہ میری زندگی بھی ختم ہو رہی ہے۔ میرے صیاد چاہتے ہیں کہ میں مرنے سے پہلے آزادی کا مزہ چکھ لوں۔ اسے محسوس کروں، اس سے لطف اندوز ہو سکوں مگر میرے لیے اب آزادی اور غلامی میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ کیونکہ میری سانسیں اب جسم کے پیچھے سے رہائی پانے کے لیے پرتول رہی ہیں۔ میرے لیے اس گھر کو ہی نہیں بلکہ میری زندگی کو ہی زندان بنادیا گیا تھا۔

میں نورین فلک ناز جسے خود پر کبھی واقعی بہت ناز ہوا کرتا تھا۔ جس کے قلم میں بلا کی کاٹ تھی۔ جس کی تحریر میں نندیوں کی سی روانی تھی۔ جس کا انداز بیان پڑھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتا تھا۔ جو ستاروں پر کند ڈالنے کی خواہش مند تھی۔ جو اپنے اندر پہاڑوں کو متحرک کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ جو شاہین کی طرح آسمانوں کی وسعتوں میں اڑنا چاہتی تھی۔ مگر محبت کرنے کے جرم میں اس کے پر کاٹ دیئے گئے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی خطا سرزد ہوئی۔ مگر یہ وہ جرم ہے جو جان بوجھ کر نہیں کیا جاتا، خود بخود سرزد ہو جاتا ہے۔ اس جذبے کو عقل و شعور کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ یہ وہ سرکش جذبہ ہے جو نہ عمر دیکھتا ہے اور نہ ذات۔

میں جو خود کو بہت بہادر اور بلند حوصلے کی مالک سمجھا کرتی تھی، اس جذبے کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ گئی۔ تنکا تنکا ہو کر بکھر گئی۔ خود کو ملیا میٹ کر ڈالا۔ یہاں تک کہ زندگی جیسی بیش قیمت نعمت کو بھی ٹھوکر ماردی۔

زندگی کا یہ ٹھٹھاتا ہوا چراغ کب بجھ جائے معلوم نہیں۔ چند بچی کچھی سانسوں کا نام اگر زندگی ہے تو ہاں میں ابھی تک زندہ ہوں۔ کب تک زندہ ہوں یہ بالکل غیر یقینی بات ہے کیونکہ کینسر کا کوئی بھی مریض، جس کی بیماری آخری اسٹیج پر ہو، یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا۔

سوچوں کی ایک یلغار تھی جو اس وقت مجھ پر حملہ آور ہو گئی تھی۔ میں آنکھیں موندے، آرام دہ چیر پر ہلکورے

کھاتی ہوئی یہ بے سرو پاتیں سوچے چلی جا رہی تھی کہ اچانک میرے کندھے پر مجھے ہلکے ہاتھ کا نرم سانس محسوس ہوا۔ میں نے ہلنا بند کر کے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ میری پیاری بیٹی اٹھارہ سالہ فاریہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے، میرے اوپر جھکی مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نم آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے میرے ماتھے پر پیار کیا۔

آہ.... میری پیاری بیٹی جب بھی ماں کی بند آنکھیں دیکھتی ہے تو خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ کسی اپنے بہت پیارے کو زندگی سے موت کی جانب جاتے ہوئے دیکھنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، یہ مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے، خصوصاً ایک بیٹی کا اپنی ماں کو۔ ماں اور بیٹی کا رشتہ بھی کتنا انوکھا اور پیارا ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کا سایہ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی تکلیف کو بن کہے محسوس کر لیتی ہیں۔

”امی جان!“ فاریہ نے آہستگی سے پکارا۔

”ہوں۔“ میں نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

”سوپ تیار ہے لے آؤں۔“

میں آنکھیں کھول کر فاریہ کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں، میرے لیے کیا نہیں تھا۔ ڈھیروں محبت، فکر، دُکھ، پریشانی اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر ترس۔

”میں لے کر آتی ہوں۔“ میری خاموشی کو میری رضامندی سمجھ کر وہ جانے کے لیے پلٹی تو میں نے آواز دی۔

”نہیں چندا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

میرا جواب سن کر اس کا چہرہ بجھ گیا۔

”امی جان! پلیز تھوڑا سا پی لیں۔ آپ کی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ چپ ہو گئی۔

”شاہ زیب کہاں ہے؟“ میں لاؤنج میں چاروں طرف یوں نظریں دوڑانے لگی جیسے شاہ زیب وہیں کسی کو نے

کھد رے میں چھپا بیٹھا ہو۔

”بھائی اپنے روم میں ہیں۔ میں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔“ وہ شاہ زیب کو بلانے چلی گئی تو میں پھر سے آنکھیں بند کیے سوچوں میں کھو گئی۔ چند لمحوں بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی جو میرے پاس آ کر رک گئی۔

”جی امی جان!“ شاہ زیب کی بھاری مردانہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرا تیس سالہ بیٹا میرے سامنے کھڑا استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں شاہ زیب کا بغور جائزہ لینے لگی۔ میرا ایٹا کتنا مچھوڑ ہو گیا تھا۔ لڑکے سے مرد بن گیا تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

میرے اس طرح دیکھنے سے وہ بے چین ہو گیا۔ میرے پاس دوڑا نو ہو کر بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگا پھر آہستگی سے بولا۔

”امی جان! آپ نے مجھے بلایا تھا؟“

”ہاں، دراصل مجھے تم سے اجازت چاہیے تھی۔ میں قبرستان جانا چاہتی ہوں۔ اگر تم اجازت دے دو تو چلی

جاؤں۔“ میں التجائیہ لہجے میں پوچھنے لگی تو وہ تڑپ اٹھا۔ میرا ہاتھ چوم کر رونے لگا۔
 ”امی جان! آپ کہیں بھی جانے کے لیے بالکل آزاد ہیں۔ یہ بات میں کتنی مرتبہ آپ سے کہہ چکا ہوں۔ پلیز مجھے شرمندہ نہ کیا کریں۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”بالکل آزاد۔“ میں نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔
 ”ہاں ہاں، بالکل آزاد اور یہ آزادی آپ کو کب کی مل چکی۔“
 ”کیا تمہارے ابو مرنے سے پہلے مجھے آزاد کر گئے تھے؟“

”جی امی کر گئے تھے، مرنے سے بہت پہلے۔ آپ کا ذہن اس بات کو کیوں تسلیم نہیں کرتا کہ آپ ہر معاملے میں آزاد اور خود مختار ہیں۔ کہیں آنے جانے کے لیے کسی کی اجازت کی پابندی نہیں۔“ شاہ زیب آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولا تو پاس کھڑی فاریہ بھی ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

”ارے ارے، تم دونوں کیوں رورہے ہو۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔ مجھے آزادی مل رہی ہے۔ آج سے میں آزاد ہوں مجھے کہیں آنے جانے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔“ میری باتیں سن کر وہ اور شدت سے رونے لگے۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں وضو کر لوں پھر جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

آستینیں چڑھاتی ہوئی واش روم میں کھس گئی، وضو کر کے باہر نکلی۔ ٹاؤل سے چہرہ اور بازو خشک کیے۔ قیص کے بازو نیچے کر کے آئینے کے آگے آکھڑی ہوئی۔ خود کا سراپا غور سے دیکھا تو بے یقینی سے اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔ کیا یہ میں ہوں نورین فلک ناز، ایک شوخ اور زندہ دل عورت؟ نہیں بالکل نہیں، یہ میں نہیں ہو سکتی۔ یہ تو کوئی بیمار اور بوڑھی عورت اپنی اجازت کے لیے کھڑی ہے جس کے سفید چھوٹے چھوٹے بوائے کٹ بال منتشر ہو کر اور بھی بد وضع لگ رہے ہیں۔ یہ ہیز اسٹائل میں نے شوق سے نہیں بنوایا تھا بلکہ کینسر کے ٹریٹمنٹ میں سر کے تمام بال جھڑ گئے تھے۔ اب دوبارہ اگ رہے تھے۔ سفید بے ہنگم بالوں سے ذرا نیچے ویران اور گدلائی ہوئی آنکھیں اور ان آنکھوں سے ذرا نیچے خشک اور بے رنگ ہونٹ، جن سے مسکراہٹ ایسے روٹھ گئی تھی جیسے کسی مرنے والے سے زندگی۔

جوانی سے بڑھاپے کا سفر کتنی جلدی طے کر لیا میں نے۔ عموماً لوگ یہ سفر طے کرنے میں بیس پچیس سال لگا دیتے ہیں مگر میں نے صرف پانچ سال لگائے، صرف پانچ سال۔ کتنی حیران کن بات ہے بیس پچیس سال کا سفر میں نے پانچ سال میں طے کر لیا۔ آج سے پانچ سال پہلے میں ایک صحت مند جوان عورت تھی بلکہ عورت سے زیادہ لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ جس کی اک بات سے، اک اک حرکت سے زندگی پھلکتی تھی۔ زندہ دلی پھلکتی تھی۔ صرف پانچ سال کے قلیل عرصہ میں، میں ایک بد وضع بیمار بوڑھا کا روپ دھار چکی تھی، جو اپنے لاغر اور نحیف جسم کو گھسیٹتے ہوئے زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہی تھی۔

میں نے سر کو اسے کارف سے لپیٹا، کندھوں پر گرم چادر ڈالی اور باہر آ گئی۔ شاہ زیب اور فاریہ لاؤنج میں رکھے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ شاہ زیب کے دونوں بچے بھی ان کے پاس کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف دوڑے چلے آئے۔ میری ناگوں سے لپٹتے ہوئے چلائے۔

”دادو جان!..... کہاں جا رہی ہیں؟“

پانچ سالہ علی اور تین سالہ شیراز ایک آواز میں بولے تو میں ایک گہری سانس لے کر ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”بچوں میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہی ہوں۔“

”باہر..... دونوں حیرانی سے بولے۔“ باہر کہاں؟“ علی بولا۔

میں نے علی کے سوال کا جواب نہ دیا تو دونوں ضد کرنے لگے ہم بھی ساتھ چلیں گے۔

”آپ دونوں اپنی ماما کے پاس جائیں۔ چلو شاباش۔ فاریہ انہیں پکڑو اور بھابی کے پاس لے جاؤ۔“ فاریہ اٹھی

اور انہیں پچکارے ہوئے مجھ سے دور لے گئی۔

”شریفاں!“..... میں نے ملازمہ کو پکارا۔

”امی! اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں۔“

”میں اکیلی جانا چاہتی ہوں۔ شریفاں کو ساتھ لے جاتی ہوں۔“

”جیسا آپ ٹھیک سمجھیں۔ اگر کہیں تو میں گاڑی میں لے جاتا ہوں۔“

”نہیں، میں پیدل جاؤں گی۔ قبرستان کون سا دور ہے چند قدم کے فاصلے پر تو ہے۔ بس مجھے تھوڑی سی گلاب

کی پتیاں لادو۔“

”جی امی، شریفاں!“ شاہ زیب نے شریفاں کو مخاطب کیا جو پاس کھڑی حکم کی منتظر تھی۔

”جی صاحب جی۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”تم ایسا کرو باہر لان سے چند گلاب کے پھول توڑ کے لے آؤ اور امی کے ساتھ قبرستان چلی جاؤ اور ہاں ان کا

بہت خیال رکھنا۔ انہیں زیادہ تھکنے نہ دینا اور اگر ان کی طبیعت خراب ہوتی نظر آئے تو مجھے فوراً کال کر لینا۔“

”ٹھیک ہے صاحب جی۔“

☆.....

سرکوما تھے تک اسکارف سے لپیٹے، کاندھوں پر گرم شال ڈالے میں گھر سے باہر نکلی تو چند لمحوں کے لیے آزاد فضا

میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ بالکل اسی طرح جیسے جیل سے عمر قید کی سزا کاٹ کر کوئی قیدی باہر نکلے اور آزاد فضا میں

کھڑا ہو کر آزادی کو اپنے رگ و جان میں اتارنے کی کوشش کرے۔

چند لمحے کھڑا رہنے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھائے تو شریفاں بھی پھولوں کا شاہر ہاتھ میں پکڑے ساتھ

چلنے لگی۔

موسم بہار کی آمد آدھی مگر ابھی ماحول میں خنکی باقی تھی۔ بلکہ مجھے تو اچھی خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے

گرم چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا۔ قبرستان پہنچنے تک میں اچھی خاصی تھک چکی تھی۔ میری سانس دھونکی کی طرح چل رہی

تھی۔ قبرستان کے گیٹ کے ساتھ بنی ہوئی پتھر کی بنچ پر بیٹھ کر میں بُری طرح ہانپنے لگی۔

”بی بی جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا!“ شریفاں فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ ”صاحب کو فون کروں۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف پانی پلادو۔“

”جی اچھا۔“ یہ کہہ کر اس نے بغل میں دبائی منرل واٹر کی بوتل کھولی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ پانی پی کر میرے حواس ٹھکانے آئے۔ میں نے بوتل اس کے حوالے کی اور آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں قبرستان کے اندر داخل ہوئی اور آہستگی سے چلتی ہوئی شریفاں کے پیچھے پیچھے خاور کی قبر تک پہنچ گئی۔ شریفاں کو میں راستے میں بتا چکی تھی کہ میں پہلے خاور کی قبر پر جاؤں گی۔ بعد میں جبار کی قبر پر حاضری دوں گی۔

شریفاں خاور کی قبر تک پہنچا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں خاور کی قبر کے سر ہانے لگے کتبے کو دیکھنے لگی جہاں اس کے نام کے علاوہ یہ شعر بھی کندہ تھا۔ جسے جوں جوں میں پڑھتی گئی میری حالت غیر ہوتی گئی۔ شعر یہ تھا:

شجر سے پتے یوں ہی تو گرا نہیں کرتے

پتھر کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے

شعر پڑھ کر میں زار و قطار روتی ہوئی اس کی قبر کے پاس بیٹھ گئی۔ خاور میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تم سے بچھڑ کر مجھ پر کیا ہوتی۔ کرب و اذیت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس میں پل پل سسکی ہوں، پل پل تڑپی ہوں۔ مجھے اتنا ذلیل و رسوا کیا گیا کہ اپنی ہی نظروں میں حقیر ہو گئی۔

روتے روتے میری ہنچکی بندھ گئی تو شریفاں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بی بی جی حوصلہ کریں۔ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔“ شریفاں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ بھی رورہی ہے۔

ہے۔

میں آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شال کو پھر سے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا۔ یہ شال میرے لیے بہت انمول تھی کیونکہ یہ خاور کا دیا ہوا تحفہ تھا، جسے میں نے ہمیشہ خاور کی یادوں کی طرح سنبھال کر رکھا۔ میں نے خاور کی قبر پر پھولوں کی پیتاں ڈالیں اور پھر میں نے اور شریفاں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جتنی سورتیں یاد تھیں سب پڑھ کر خاور کی بخشش کی دُعا مانگی۔ پھر شریفاں کی راہنمائی میں چلتے چلتے جبار کی قبر پر پہنچ گئی۔ چند لمحوں ساکت و جامد کھڑی قبر کو دیکھتی رہی پھر پھول ڈالے اور دُعا مانگی۔ دُعا مانگنے کے بعد دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے اور پھر سے قبر کو دیکھنے لگی۔

آہ!..... یہ موت بھی کتنی اٹل اور سفاک ہے۔ کوئی ظالم ہو یا مظلوم..... حاکم ہو یا محکوم..... غریب ہو یا امیر ہر کسی کو مٹی میں ملا کر مٹی کر دیتی ہے۔ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتی۔ کوئی اس کے بچے سے بچ نہیں سکتا۔

”بی بی چلیں۔ گھر بے بادل چھا گئے ہیں یہ نا ہو بارش شروع ہو جائے اور ہم بھیگ جائیں۔“

”ہاں چلو۔“ میں نے بیرونی گیٹ کی طرف قدم اٹھائے تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

بادلوں نے شام ہونے سے پہلے ہی اندھیرا کر دیا تھا۔ ہم بمشکل گھر پہنچیں تھیں کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

”خدا کا شکر ہے کہ ہم گھر پہنچ گئیں۔“ شریفاں نے تبصرہ کیا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ لاؤنج میں فاریہ بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

”امی اب تھوڑا سوپ پی لیں، پلیز۔“

”ٹھیک ہے میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ وہیں لے آؤ۔“ میں کمرے میں داخل ہوئی جہاں اس وقت

اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے لائٹ جلائی اور بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد فاریہ سوپ کا پیالہ اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس نے پیالہ سائینڈ ٹیبل پر رکھا۔

”میں پلاؤں یا خود پی لیں گی؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”چند امیں خود پی لوں گی۔“

”چلیں ٹھیک ہے آپ پیس میں آپ کی دوائی نکالتی ہوں۔“ میں دل میں ہنسی۔ نگرانی کرنے کا خوب بہانہ

ڈھونڈا ہے میری بیٹی نے۔ یقیناً اس کے دل میں خدشہ ہے کہ وہ باہر چلی گئی تو میں سوپ پئے بغیر لیٹ جاؤں گی۔

میں پیالہ اٹھا کر چمچ سے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔ فاریہ نے دوائیوں والی باسکٹ سے میری دوائی نکالی۔

ایک ڈوز نکال کر میرے آگے رکھی اور پھر سائینڈ ٹیبل پر رکھے گئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ گلاس میرے ہاتھ میں

تھمایا اور خود پاس کھڑی ہو گئی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں مجھے کھلائے بغیر باہر نہیں جائے گی۔ میں نے

پانی کے گلاس سے دوائی نگلی اور پھر بیڈ پر دو ٹکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

”امی! آپ کو پیدل نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب یقیناً آپ تھک گئی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی اور

میری ٹانگیں دبائے لگی۔

واقعی میں تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس کے دبائے سے مجھے سکون مل رہا تھا۔ میں نے آنکھیں موند کر دھیرے

سے پکارا۔

”فاریہ!“

”جی امی!“ وہ ٹانگیں دباتے ہوئے فرمانبرداری سے بولی۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹی!“

”کس چیز کے لیے امی!“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”میں تمہیں اس وقت چھوڑ کر جا رہی ہوں جس وقت ایک بیٹی کو ماں کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی!“ وہ سن کر تڑپ اٹھی۔ زار زار رونے لگی۔ ”آپ کہیں نہیں جا رہیں امی سنا آپ نے۔“

آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔“ یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ لپٹ گئی۔

کافی دیر تک ماں بیٹی ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر روتی رہیں پھر میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”جاؤ بیٹا باہر جا کر

اپنی پڑھائی کرو۔“

”امی! آپ ٹھیک ہیں نا۔“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں میری جان میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے سے پہلے اس نے میرے وجود پر کبل ڈالا اور باہر نکل گئی۔

اب میں تھی اور میری تنہائی تھی۔ باہر بارش زور و شور سے جاری تھی۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا جس سے تیز برسی

بارش اور بادلوں کی گھن گرج کی آواز آرہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے یادوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی۔ ایک ایک کر

کے بیتی ہوئی زندگی کی کتاب کے اوراق میرے سامنے پلٹتے چلے گئے اور میں سات سال پیچھے چلی گئی جب میری زندگی

میں خاور آیتھا ایک لطیف اور خوشگوار ہوا کا جھونکا بن کر۔ جس نے صبح معنوں میں مجھے جینا سکھایا۔

☆.....

جیسے ہی موبائل فون کا الارم بجنا شروع ہوا میری آنکھ کھل گئی۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے الارم بند کیا مبادا کہ ساتھ سوئے ہوئے شوہر نامہ دار کی نیند میں خلل نہ پڑ جائے۔ پھر ایک انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ وال کلاک پر نظر پڑی جو اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہا تھا۔

چپل میں پاؤں گھسیڑے اور واش روم میں گھس گئی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کیا اور ٹاول سے اعضاء پونچھتی ہوئی باہر آ گئی۔ کمرے میں زیر واث بلب کی ملگجی روشنی میں نماز ادا کی پھر جائے نماز تہہ کر کے اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ ایک نظر بے سندھ سوئے جبار کو دیکھا، جس کے بے ہنگم خراٹے ہر سو پھیلی ہوئی خاموشی اور سکون کو تہس نہس کر رہے تھے۔ میں آہستگی سے چلتی ہوئی روم سے باہر آ گئی۔ باہر آ کر سکون بھری گہری سانس خارج کی پھر فاریہ کے کمرے میں جھانکا۔ بارہ سالہ فاریہ چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت اور پاکیزگی سجائے ہوئی تھی۔

میں نے اسے پیار کیا اور پھر بیرونی گیٹ کی چابی، کی اسٹینڈ سے اتاری۔ بچوں کے کمرے کے پاس سے گذرتی گذرتی رک گئی۔ ان کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میرے دونوں بیٹے اپنے اپنے سنگل بیڈ پر آڑے ترچھے سوئے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے ہونٹ مسکرانے لگے۔ جوان اور خوبصورت بیٹوں کو دیکھ کر شاید ہر ماں ایسے ہی مسکراتی ہے۔ میں مین ڈور کھول کر باہر آئی۔ دوپٹے کو سر پر اچھی طرح لپیٹا۔ پورچ عبور کر کے چھوٹے گیٹ میں چابی لگائی۔ دروازہ کھول کر باہر آئی پھر چابی سے دروازہ بند کیا اور پارک کی طرف چل دی جو ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے چلتے چلتے موبائل پر ناٹم دیکھا، چھ بجتے میں دس منٹ تھے۔ آج پانچ منٹ لیٹ ہو گئی۔ میں منہ میں بڑبڑائی۔ میں ہر صبح نماز کی ادائیگی کے بعد تقریباً پونے چھ مارننگ واک کے لیے قریبی پارک میں جاتی اور پونے سات بجے تک گھر واپس آ جاتی۔

پھر بچوں کو اور ان کے ابو کو جگاتی، ان کے لیے ناشتہ تیار کرتی۔ دونوں بیٹے کالج جبکہ بیٹی سکول کے لیے نکل جاتے تو پھر شوہر صاحب کو تیار کروا کر دفتر بھیجتی۔ بچوں کے چونچلے اور میاں کے نخرے اٹھاتے اٹھاتے اور انہیں رخصت کرتے کرتے نڈھال سی ہو جاتی۔ پھر اپنا ناشتہ تیار کرتی۔ ناشتہ کرتے کرتے مارننگ شو سے بھی لطف اندوز ہوتی رہتی۔ دس بجے تک کام کرنے والی ماسی آ جاتی۔ اس سے اپنی گمرانی میں گھر کا کام کرواتی اور پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں جت جاتی۔

بچوں کے آنے سے پہلے ہر صورت کھانا تیار کرنا ہوتا تھا۔ جبکہ میاں دفتر سے چھ بجے آتے تھے۔ ان کو آنے کے فوراً بعد چائے کی پیالی چاہیے ہوتی تھی۔ جس دن چائے پیش کرنے میں تاخیر ہو جاتی، اسی وقت اُن کا ڈانٹ ڈپٹ اور کوسنوں والا لیکچر شروع ہو جاتا اور جب وہ ایک مرتبہ شروع ہو جاتا تو پھر کافی دیر تک نان اسٹاپ چلتا رہتا۔ اس لیے میری حتی المقدور کوشش ہوتی تھی کہ میاں کو شکایت کا موقع نہ ملے اور نہ گھر کے ماحول میں کشیدگی پیدا ہو سکے۔ مگر میری تمام کوششوں کے باوجود وہ کسی نہ کسی بات کو وجہ بنا کر بک بک جھک جھک کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا اور اپنے کڑوے کیلئے الفاظ میری سماعت میں انڈیل کر رہتا۔

۱۰۔ ہاں میں کم میں پارک کے مین گیٹ پر پہنچ گئی۔ آج بھی حسب معمول بہت کم لوگ تھے۔ چند عورتوں اور مرنے پنے مردوں کے علاوہ پورا پارک خالی تھا۔ میں بھی باؤنڈری وال کے قریب بنے ہوئے ٹریک پر تیز قدموں سے چلتے لگی۔ یہ ٹریک باؤنڈری وال کے بالکل ساتھ چلتا ہوا پارک کا ایک چکر مکمل کرتا تھا جو کہ تقریباً پونا کلومیٹر بن جاتا تھا۔ میں بھی اب یہ چکر پورا کرتی تھی۔ شروع شروع میں آدھے راستے سے واپس لوٹ آتی تھی مگر اب پورا راؤنڈ لگاتی تھی۔ چلتے چلتے میں متلاشی نظروں سے ہر سود کچھ رہی تھی۔

لگتا ہے آج نہیں آیا۔ میں منہ میں بڑبڑاتی۔ مگر جیسے ہی میں پارک کے وسط میں پہنچی وہ نظر آ گیا۔ وہ مخالف سمت سے جا لنگ کرتا ہوا میری طرف ہی آ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ٹراؤزر، شرٹ کے ساتھ جو گرز پہنے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں شٹا گئی۔

”السلام علیکم۔“ ہمیشہ کی طرح اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھ پر سلامتی بھیجی اور جواب کا انتظار کئے بغیر گزرتا چلا گیا۔ عجیب احق انسان ہے۔ میں دل میں سوچنے لگی۔ عورتوں سے سلام دعا کرنے کی کیا تک ہنسی ہے سر پھر کہیں کا۔ میں نے پارک کا چکر مکمل کیا اور گیٹ کے ساتھ بنی ہوئی سنگی بچ پر بیٹھ کر سستانے لگی۔

یہ تھا خاور، نظار عام اور معمولی نظر آنے والا انسان، جو بعد میں میری زندگی میں غیر معمولی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا اور بالآخر ایک مقام ایسا آ گیا کہ وہ میرے جینے کی وجہ بن گیا۔

تھوڑی سانس ہموار ہوئی تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ موبائل پر وقت دیکھا تو پونے سات بج رہے تھے۔ پارک سے باہر آ کر تیزی سے گھر کی طرف چل دی۔



گھر میں داخل ہوئی تو جبار لان میں سرسبز گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اچنتی نظر اس پر ڈالی اور اندر کی طرف قدم بڑھائے۔

”نام دیکھا ہے؟“ اس کی کڑکی آواز کانوں سے ٹکرائی تو میرے چلتے قدم رک گئے۔

”ہاں دیکھا ہے۔ سات بج رہے ہیں۔“ میں پیچھے مڑے بغیر بولی۔

”آٹھ بجے بچے گھر سے نکلتے ہیں، جانتی ہونا!“ وہ پھر سے گرجا۔

”ہاں جانتی ہوں، میں کرلوں گی سب۔“ میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

”غیر ذمہ داری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ہر روز صبح اٹھتے ہی منہ اٹھا کر پارک میں چلی جاتی ہو۔ پورے ایک

کینال کا گھر لے کر دیا ہے تم کو۔ اس کی چھت پر چڑھ جایا کر دو۔ مگر نہیں تمہیں تو باہر گھومنے کا بہانہ چاہیے۔“ وہ زہرا گلنے لگا۔

میں غصے سے پٹٹی۔ ”پلیز جبار خاموش ہو جائیں۔ ایسا کیا ہو گیا ہے صرف دس پندرہ منٹ لیٹ ہوئی ہوں۔ کہہ

رہی ہوں نا کہ بچے لیٹ نہیں ہوں گے۔ انہیں نام پر فارغ کر دوں گی۔ پانچ منٹ تو آپ نے مزید ضائع کر دیئے۔“ یہ

کہہ کر میں پاؤں پختی ہوئی مین ڈور کھول کر اندر داخل ہوئی۔ بچوں کے کمروں کے دروازے کھول کر انہیں آوازیں دینے

لگی۔

یہ بتا ہے کہ بچے لیٹ ہو جائیں گے اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ میرے آنے تک انہیں جگا ہی دیتے۔ رعب

جھاڑنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ بچوں کو اٹھانے کے بعد کچن کا رخ کیا۔ ایک چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور دوسرے پر انڈے فرائی کرنے لگی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی۔ جب بچے ایک ایک کر کے آنے لگے۔

”امی آج پھر انڈے سلاکس، میں نے پراٹھا کھانا تھا۔“ زوہیب نے احتجاج کیا۔

”چپ چاپ ناشتہ کرو۔ پراٹھے صرف چھٹی والے دن۔ ویسے بھی آج میرے پاس ٹائم بالکل نہیں ہے۔“

”تو نہ جایا کریں مارنگ واک کے لیے۔“ زوہیب نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہ جایا کروں؟ تمہیں کیا اعتراض ہے؟“ میں نے سختی سے پوچھا۔

”گھر میں رہ کر ہمارے لیے ہمارا من پسند ناشتہ تیار کیا کریں۔“ وہی باپ والا تحکمانہ لہجہ۔

میں سن کر سلگ اٹھی۔ ”تم بالکل اپنے باپ کی طرح خود غرض اور خود پسند ہو۔ کیا تم بھی اس کی طرح مجھے اپنی

باندی یا نوکرانی سمجھتے ہو۔ میری زندگی پر میرا اپنا کوئی حق نہیں۔ میری زندگی کا واحد مقصد تم لوگوں کی خدمت گزاری ہے۔“
دو جہزبات سے میں رو پڑی۔

جبار کو اندر آتا دیکھ کر میں آنسو پونچھنے لگی۔ وہ زن سے ہمارے پاس سے گذر کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے روتا دیکھ کر فاریہ بھی آنسو بہانے لگی جبکہ شاہ زیب نے آکر میرے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔

”امی آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیوں اتنی چھوٹی سی بات پر جذباتی ہو رہی ہیں؟ ریلیکس مائی سویٹ مام۔

زوہیب امی سے معافی مانگو۔“ اس نے زوہیب کو حکم دیا۔

”سوری امی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”اٹس اوکے..... جلدی سے ناشتہ ختم کرو۔ پونے آٹھ ہو رہے ہیں یہ نہ ہو تمہارے لیٹ ہو جانے پر میری کم

بخشی آجائے۔“ میری بات سن کر بچے جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر تینوں نے اپنے اپنے بیگ

اٹھائے، باری باری مجھے پیار کیا اور اللہ حافظ کہتے ہوئے رخصت ہوئے تو میں نے سکون بھری سانس لی۔ اٹھ کر برتن سیننے لگی۔

برتن سمیٹ کر ٹیبل صاف کی۔ ٹی وی کا ریموٹ پکڑ کر ٹی وی آن کیا اور صوفے پر بیٹھ کر نیوز دیکھنے لگی۔ جبار

شاید نہار ہے تھے میں نے لاؤنج میں لگے وال کلاک میں وقت دیکھا، جہاں اس وقت سوا آٹھ بج رہے تھے۔

اوہ مائی گاڈ! سوا آٹھ بج گئے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی اور کچن میں گھس گئی۔ فٹنٹ جبار کے لیے پراٹھے بنانے لگی۔

تین بھاری بھر کم پراٹھے تیار کر کے ٹیبل پر رکھے۔ ساتھ رات کا بچا ہوا کدو گوشت کا سالن گرم کر کے رکھا۔ اتنی

دیر میں جبار بھی ٹاول سے اپنے سر کے بچے کچھے بال پونچھتے ہوئے آگئے کیونکہ اس کے سر کا بڑا حصہ بالوں سے خالی ہو چکا

تھا اور جو تھوڑے رہ گئے تھے وہ بھی بالکل چاندی کی طرح سفید۔

وہ ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا اور میں اس کے سامنے بیٹھی یہ سوچنے لگی کہ یہ بندہ اس عمر میں اتنی ہیوی غذا

کیسے ہضم کر لیتا ہے۔ تین، تین، تین پراٹھے کھا کر ہضم کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی اور وہ بھی باون سال کی عمر میں۔ قابل رشک

صحت کا مالک تھا جبار۔ بس بالوں نے وفاندہ کی یا پھر سامنے والے دودانت داغ مفارقت دے گئے۔ ان دونوں خامیوں کی

۱۰۰۔ : ہمارا پی مر سے دس سال بڑا دکھتا تھا۔ ”بی بی“ بیٹے میں ہا سٹھ سال کا نظر آتا تھا۔
 جبار نے بھی نوٹس لے لیا کہ میں کافی دیر سے اس کا جائزہ لے رہی ہوں۔
 ”آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف کیا دیکھ رہی ہو۔“ اس نے گھر کا۔
 ”تو کیا آنکھیں بند کر لوں۔“ میں تنک کر بولی۔
 ”کیا ہر کام ہر روز تمہیں کہنا پڑے گا؟“
 ”کیا مطلب۔“

”تمہیں نہیں پتا کہ ناشتے کے بعد میں جوتا پہنوں گا۔ جتنی دیر میں کھا رہا ہوں، میرے جوتے صاف کر کے میرے پاس رکھو۔ کیا یہ بات ہر روز کہنی پڑے گی۔“ وہ رعوت سے بولا۔
 میں چارو ناچار اٹھی۔ سنور سے اس کا جوتا اٹھا کر لائی۔ کپڑے سے صاف کر کے اس کے پاس رکھ دیا۔ ویسے میری نظر میں کچھ کام ہر انسان کو خود کرنے چاہیے۔ جیسے اپنا جوتا صاف کرنا، اپنی شلوار میں ازار بند ڈالنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ کام ہیں جو بالکل ذاتی نوعیت کے ہیں اور جن کا کسی دوسرے سے کروانا بالکل غیر اخلاقی بات ہے، وہ دوسرا چاہے بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر یہ تو میری سوچ ہے ہر کسی کا اس سوچ سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ میں جوتا صاف کر کے پھر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ناشتے بلکہ کھانے سے فارغ ہو کر جرائیں پہنتے ہوئے بولا۔
 ”بچوں کے ساتھ کس بات پر بحث کر رہی تھی؟“

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔“ میں نے جان چھڑائی چاہی۔ پتا نہیں کیوں جبار کی بحث کرنے کی عادت سے میری جان جاتی تھی۔ میں ہمیشہ اس کے چپ رہنے کی دعائیں مانگتی تھی۔
 میرا جواب سن کر وہ چپ ہو گیا تو میں واقعی حیران ہوئی۔ وہ تیار ہو کر گھر سے نکلنے لگا تو میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ مین ڈور کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ پلٹ کر اونچی آواز میں بولا۔
 ”اور ہاں ایک بات تم کان کھول کر سن لو۔ تمہاری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے میری اور میرے بچوں کی خدمت کرنا، سمجھی تم۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا اور پھر باہر نکل گیا۔ میں صوفے پر گر گئی۔
 یہ تھی میری زندگی، جو میرے لیے جنت بھی تھی اور جہنم بھی۔



اگلی صبح میں پارک کا چکر مکمل کر کے گیٹ کے ساتھ بنی ہوئی بیچ پر بیٹھی۔ تیر رہی تھی کہ وہی مانوس جملہ کانوں میں پڑا۔

”السلام علیکم.....“
 میں چونک کر دیکھنے لگی۔ وہ بالکل میرے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کمال ہے آج تو گراؤنڈ میں کہیں نظر نہیں آیا تھا پھر اچانک کہاں سے ٹپک پڑا۔ میں دل میں سوچ رہی تھی کہ وہ پھر سے بولا۔
 ”آپ کے نزدیک سلام کا جواب دینا معیوب بات ہے یا سلام کرنا۔“ وہ کمال ڈھٹائی سے پوچھ رہا تھا۔
 ”ایک بات بتائیں۔“ میں بولی۔

”جی پوچھیں..... مگر پہلے میں بیٹھ جاؤں اگر آپ کی اجازت ہو تو۔ کیونکہ جواب تھوڑا لمبا بھی ہو سکتا تھا۔“ اور پھر وہ میری اجازت کا انتظار کیے بغیر دھم سے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

ہم دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا مگر میں تھوڑا اور سٹ کر بالکل کنارے پر پہنچ گئی۔ میری اس حرکت سے اس کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

”جی پوچھیں..... میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ وہ پھر بولا۔

مجھے اس کی بے تکلفی پر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے بولی۔

”آپ راستے سے گزرنے والی ہر عورت کو سلام کرتے ہیں یا یہ عنایت صرف خاص خاص پر ہی ہوتی ہے۔“ میرے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو اس نے محسوس کر لیا۔ اسی لیے اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔

”ہر کسی کو نہیں صرف ان کو جن کی دل سے عزت کرتا ہوں۔“ اس کا جواب سن کر میں شرمندہ سی ہو گئی۔

”میری اس قدر عزت افزائی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔“ اب میں نارل لہجے میں بولی۔

”جی بالکل پوچھ سکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ چودھری زمان کی بیٹی ہیں اور چودھری بلال کی بہن ہیں۔ میں آپ کے والد کا بہت بڑا فین ہوں۔ ان کے بلند کردار اور عظمت کا دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ ان جیسے لوگ بہت کم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر افسوس اللہ نے بہت جلدی انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ اللہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور بلال صاحب کے ساتھ بھی بہت اچھے تعلقات ہیں میرے۔“ اس کے منہ سے ابو اور بھائی کی تعریف سن کر جہاں میرا سر فخر سے بلند ہوا۔ وہیں خجالت بھی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ افسوس میں نے ایسے ہی بے چارے کی نیت پر شک کیا۔

”میں معافی چاہتی ہوں۔“ اس دفعہ میں واقعی دل سے کہہ رہی تھی۔

”کس بات کے لیے؟“ وہ تھوڑا حیران ہوا۔

”میرا ہجہ آپ سے بات کرتے وقت مناسب نہیں تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔ غلط فہمی تو کسی کو بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔

”ویسے جہاں آپ کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ اتنے اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جن کا سیاست میں

بہت بڑا نام ہے، معاشرے میں ایک باعزت مقام ہے۔ وہیں ایک دکھ بھی ہوتا ہے۔“

”وہ کیا بھلا۔“ میرے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

”وہ یہ کہ آپ جبار صاحب جیسے آدمی کی بیوی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں اس کی جرأت پر حیران رہ گئی۔

”مطلب یہ کہ آپ جیون ساتھی کے معاملے میں میری طرح بہت بد قسمت ہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولتا چلا

گیا۔

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔“ مجھے اپنی آواز کھوکھلی سی محسوس ہوئی۔

”کیا واقعی؟“ وہ میری طرف غور سے دیکھتا ہوا بولا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی پارک سے باہر آ گئی۔

یہ آدمی تو بہت خطرناک ہے۔ آئندہ اس سے دور ہی رہوں گی۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے میری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا۔ میں سوچتی ہوئی کب گھر پہنچ گئی پتا ہی نہ چلا۔

.....☆.....

رات کے کھانے پر خلاف معمول جبار کا موڈ خوشگوار تھا۔ وہ فاریہ سے مسکرا مسکرا کر ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا۔ اس کا موڈ بہتر ہوتا تو فیملی میں صرف فاریہ ایسا فرد واحد تھی جس پر اسے کبھی کبھار پیارا آ جاتا۔ شاید اگر وہ بھی بیٹا ہوتا تو اس پر کبھی کبھار جو شفقت کا چھڑکاؤ ہوتا تھا وہ بھی اس سے محروم ہی رہتی اور اسے بھی ماں کا جاسوس یا ماں کا چچہ جیسے خطابات ہی ملتے۔ ان دونوں باپ بیٹی کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر ہم تینوں ماں بیٹے خوش ہو رہے تھے۔ چکن بریانی کا لطف دو بالا ہو گیا تھا۔

”امی آج بہت لذیذ بریانی بنائی ہے۔“ شاہ زیب نے تعریف کی۔

”ہاں واقعی، بہت مزیدار ہے۔“ اب کہ فاریہ بولی۔ ”ہے نا ابو۔“ اس نے باپ سے اپنی بات کی تائید چاہی۔

جبار اس کی بات کو ان سنی کرتا ہوا سر جھکائے کھاتا گیا۔ میں جبار کی طرف دیکھنے لگی۔

”ابو بتائیں نا اچھی بنی ہے نا!“ فاریہ نے بھی جیسے ضد پکڑ لی۔

”ہوں.... ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے جان چھڑائی۔

میرادل دُکھ سے بھر گیا۔ کبھی آج تک اس بندے کے منہ سے اپنے لیے تعریف کے دو بول نہ سنے تھے۔ کھانا اچھا بنتا تو چپ کر کے کھاتا رہتا اور اگر کوئی معمولی کمی بیشی ہو جاتی تو گھر سر پر اٹھا لیتا۔ کہاں چڑھتا اور کہاں جا اترتا۔ وہ سنا تا کہ خدا کی پناہ۔

کھانا ختم ہوا تو میں برتن سمیٹنے لگی۔ فاریہ بھی میری ہیلپ کر نہ لگی۔ کھانے کے بعد ہم سب لاؤنج میں بیٹھنے کی وی ڈرامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مہوش آ گئی۔

مہوش کہنے کو تو میری سگی بہن تھی مگر میری زندگی میں اس نے ہمیشہ ایک نند کا رول ادا کیا۔ مجھے زچ کرنے اور نیچا دکھانے کا کوئی موقع بھی کبھی اس نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ تھی تو وہ مجھ سے تین سال چھوٹی مگر بڑی بہنوں والی عزت اور احترام کبھی اس نے مجھے نہیں دیا۔ میرا نام لے کر مخاطب کرتی اور بات بے بات مجھے جھڑک دیتی۔ میری ہر بات کا مذاق اڑاتا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ میں اس کی ہر گستاخی اور بدتمیزی کو کمال حوصلے سے برداشت کر جاتی اور اگر کبھی کسی بات پر غصہ کرتی تو وہ مجھ سے ڈبل غصہ کر کے میرے غصے کو ٹھنڈا کر دیتی۔ میں پھر دل کو سمجھاتی کہ ماں، باپ تو ہیں نہیں ایک بڑا بھائی ہے جسے ہماری زندگیوں میں جھانکنے کی فرصت کم ہی ملتی ہے، ہم دو بہنیں ہی تو ہیں جو ایک دوسرے کے دکھ درد کے علاوہ خوشی و مسرت کی بھی ساتھی ہیں۔ ویسے بھی بہنوں کی آپسی محبت تو ہر نصنع اور مصنوعی پن سے پاک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مہوش کو اپنے ہاتھوں سے بیاہ کر اپنی دیورانی بنا کر اس گھر میں لائی تھی۔

”آئی.... آئی.... کرن کہاں ہے؟“ مہوش کو دیکھتے ہی فاریہ نے شور مچایا۔

”وہ اپنے پاپا کے ساتھ آکس کریم کھانے گئی ہے۔“ مہوش لا پرواہی سے بولتے ہوئے دھم سے صوفے پر

گر گئی۔

”آئس کریم۔“ فاریہ نے حسرت سے کہا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

”تمہارا بھی دل چاہ رہا ہے آئس کریم کھانے کو؟“ میں نے فاریہ سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں بولی۔ ”تم بھی اپنے ابو جان سے کہو ابھی تھوڑی دیر پہلے تو پوچھ رہے تھے کہ کیا

کھانا ہے؟“

میری بات سن کر جبار متوحش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اسے نظر انداز کرتی ہوئی مہوش سے

پوچھنے لگی۔

”ہاں بھئی تم سناؤ کیا کرتی آئی ہو؟“

”کرنا مرنا کیا ہوتا ہے، وہی گھریلو روزمرہ کے جھنجھٹ۔ کھانا پکا کر سب کو کھلا کر برتن سمیٹ کر ادھر آگئی ہوں۔

ویسے آج تمہارے گھر سے بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔ کیا پکا یا ہے؟“ اس نے نتھنے سکوڑے۔

”چکن بریانی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کھانی ہے تو لاؤں؟“

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔ جلدی سے لاؤ۔ میرا تو بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔“ وہ بے صبری سے بولی تو

میں مسکراتی ہوئی کچن کی جانب چل دی۔

”ابو! آئیں نا ہم بھی آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔“ میں مہوش کے آگے بریانی کی پلیٹ رکھ رہی تھی، جب

فاریہ کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ جبار کی خاموشی اس کی ضد کو بڑھا رہی تھی۔ آخر چارو ناچار اس نے شاہ زیب کو آواز

دی۔

”شاہ زیب یہ لو پیسے بہن کو قریبی بیکری سے آئس کریم لا دو۔“

”جی ابو۔“ شاہ زیب نے پیسے پکڑے اور باہر نکل گیا۔ اس کی بایک کے اشارت ہونے کی آواز سنائی دی تو

فاریہ کا چہرہ بھی خوشی سے چمکنے لگا۔



دوسری صبح میں پارک میں جانے کے لیے گھر سے نکلی تو دل میں تہیہ کر کے نکلی کہ اس اجنبی سے بالکل بھی بات

نہیں کرنی۔

پارک میں داخل ہوئی تو اچنتی ہوئی نظر ہر طرف دوڑائی۔ وہ کہیں نظر نہ آیا تو مطمئن سی ہو کر واک شروع کر

دی۔ مگر واک کرتے کرتے ہر پاس سے گزرنے والے کو سرسری نظر سے ضرور دیکھی کہ کہیں وہ وہی تو نہیں۔ پارک کا پورا

چکر مکمل کر کے میں داخلی دروازے کے ساتھ بنی ہوئی بیچ پر بیٹھی تو تشویش سی ہونے لگی۔

وہ آج کیوں نہیں آیا۔ کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے باقاعدگی سے مارنگ واک کے لیے آ رہا

تھا، بغیر کوئی ناغہ کیے تو پھر آج کیوں نہیں آیا۔ میرے دل میں یہ سوال سراٹھانے لگا۔

ہوگا اس کا کوئی مسئلہ۔ میں کیوں اس کے متعلق سوچ رہی ہوں۔ میں نے خود کو سرزنش کی اور ویسے بھی میں نے

کون سا اسے بلانا تھا۔ مجھے اس کے آنے سے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے سر جھٹکا۔ میں ایک ماہ سے اسے

ہر روز صبح سویرے اس پارک یا گراؤنڈ میں سیر کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ شروع شروع میں، میں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ وہ گندی رنگت، دلکش نفوش اور درمیانہ قد و قامت کا ایک پرکشش مرد تھا۔ اس کی شخصیت میں سب سے خاص چیز اس کی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ وہ مسکراتا تو اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی اور وہ بھی مسکرانے لگتیں۔ پہلے تو مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑنے لگتی اور وہ پاس سے گزر جاتا۔ جبکہ میں اس کے مسکرانے پر زچ سی ہو جاتی حالانکہ اس کے مسکرانے یاد دیکھنے سے مجھے کبھی عامیانا پن محسوس نہیں ہوا بلکہ ایک اپنائیت اور شفیق سا احساس ہوا۔ جیسے کوئی گہرا دوست دوسرے دوست کو دیکھ کر مسکرائے۔ مگر جب کافی دن تک میں نے اس کی سائل کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے ساتھ السلام علیکم کا اضافہ کر دیا۔ پھر تو میں واقعی جھنجھلانے لگی کہ یہ شخص کیوں خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

پھر جب اس نے ایک دن مجھ سے تھوڑی بات چیت کی تو میرے سارے خدشات اور غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ کیونکہ وہ میرے حسب نسب اور اگلے پچھلوں سب کو جانتا تھا۔ نہ صرف جانتا تھا بلکہ ان کی عزت بھی کرتا تھا اور جو آدمی میرے خاندان کی اتنی عزت کرتا تھا وہ بھلا میری عزت و احترام میں کوئی کمی کیسے آنے دے سکتا تھا۔ ہاں البتہ میرے شوہر کے متعلق اس کے خیالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ اس میں بھی اس کا کوئی تصور نہیں تھا کیونکہ محلے میں جبار کو کوئی بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ویسے بھی لوگ تو خوش اخلاقی سے ہی گرویدہ ہوتے ہیں۔ اتنے خشک مزاج اور عنوت زدہ شخص کو کون منہ لگاتا۔



رات کو کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر ٹی وی دیکھنے کے بعد بچے اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔ جبار نے ٹی وی پر ریسٹنگ لگالی تو میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیونکہ میں اس بے ہودہ کھیل کو ایک منٹ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے۔ ایک دوسرے کو بے دردی سے پینتا اور زخمی کرتا، بلکہ کئی دفعہ تو ایک آدمی کو کئی کئی مارتے اور صرف ہاتھوں سے ہی نہیں بلکہ کرسیوں کا بھی بے دریغ استعمال کرتے اور مار کھانے والا ہولہاں ہو جاتا۔ ایسے کھیل جبار جیسے سنگدل انسان ہی دیکھتے ہوں گے۔ مجھ جیسے حساس اور نرم دل تو بالکل بھی نہیں۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

بیڈ پر کبیل ٹانگوں پر ڈالے نیم دراز ہو گئی اور ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی۔ میں سونے سے پہلے تھوڑی دیر مطالعہ نہ کرتی تو مجھے نیند نہ آتی۔ یہ میری وہ عادت ہے جو بچپن سے میرے ساتھ چلی آرہی تھی اور شاید مرنے تک ساتھ جائے اور اب تو پڑھنے کے ساتھ ساتھ میں نے لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔

یہ بات سچ ہے کہ بہت زیادہ پڑھنے والا بالآخر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ جبکہ جبار کو میرے دونوں شوق زہر لگتے تھے۔ اسے میرا پڑھنا اور لکھنا انتہائی ناپسند تھا۔ کئی دفعہ تو وہ میرے ہاتھ سے کتاب پکڑ کر دور پھینک دیتا اور بعض اوقات مجھے لکھتا ہوا دیکھ کر اس نے مجھ سے کاغذات لے کر پھاڑ دیئے اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے۔ اس کے اس رویے پر میں بہت آزرده ہو جاتی اور کئی کئی گھنٹے ردی رہتی۔ مگر اس پتھر دل کے دل پر میرے آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہوتا بلکہ وہ حکم دیتا کہ رونا ہے تو باہر جا کر رو۔ میری نیند خراب نہ کرو۔

اب میں اس سے چوری چھپ چھپ کر لکھتی جب وہ دفتر چلا جاتا تب یا پھر جب وہ گھر سے باہر جاتا تو بیرونی دروازہ بند کر کے لکھتی رہتی۔ لکھنے سے میری ذہنی پراگندگی اور انتشار میں کمی ہو جاتی اور میری مضطرب رور

سکون پانے لگتی۔

میں اپنے پسندیدہ رائٹر مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ پڑھنے میں مشغول تھی۔ ان کا اندازِ بیاں اتنا دلچسپ اور سحر انگیز ہوتا ہے کہ پڑھنے والا گم ہو جاتا ہے۔ میں بھی پڑھنے میں اس قدر محو تھی کہ جبار کے اندر آنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اچانک اندھیرا ہوا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ لگتا ہے بجلی چلی گئی۔ میں منہ میں بڑبڑائی۔
”بجلی نہیں گئی میں نے لائٹ آف کی ہے۔“ یہ کہہ کر جبار نے زیرِ دواٹ کے بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

”جبار پلیز! پانچ منٹ کے لیے لائٹ جلا دو۔ بس یہ دو آخری صفحے رہ گئے ہیں۔“ میں نے التجا کی یہ جانتے بوجھتے بھی کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔

”بند کرو یہ کتاب۔“ وہ غرایا۔ ”عمر گذر گئی مگر تمہارا یہ بے ہودہ شوق ختم نہ ہوا۔ رات گئے تک ایسے پڑھتی ہو جیسے صبح کوئی امتحان ہو اور اس نے پیپر دینا ہو۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔

میں نے بے دلی سے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میری زندگی کا ہر دن ایک امتحان ہی تو ہے جبار۔ تمہارے ساتھ وقت گزارنا ایک کڑی آزمائش ہی تو ہے جو کب سے شروع ہے اور نہ جانے کب ختم ہوگی۔ میں نے سوچتے ہوئے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ اس کی بارعب آواز سماعت سے ٹکرائی۔

”میں اندر آیا ہوں تو نیند تم پر سوار ہو گئی ہے۔ اگر میں ایک گھنٹہ مزید نہ آتا تو تم مزے سے پڑھتی رہتی۔“ میں چپ لیٹی رہی تو وہ پھر بولا۔

”اُٹھ کر میری ٹانگیں دباؤ۔ سارا دن کام کرتا ہوں۔ تمہاری طرح گھر میں پڑا کتابیں نہیں چاٹتا۔“ اُف کس قدر تحقیر آمیز لہجہ تھا جبار کا۔ میں سلگ اُٹھی۔

”دنیا کا ہر مرد کام کرتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ تم ایسا کون سا انوکھا کام کرتے ہو، جس کا اتنا احسان جنتا ہے۔“ میں نے بھی کہہ دیا۔

”زیادہ چڑچڑ نہ کرو اور ٹانگیں دباؤ۔“ اس نے ایسے حکم دیا کہ پچھلے وقتوں میں کوئی اپنی زر خرید لوٹڈی کو بھی نہ دیتا ہوگا۔

میں طوعاً کرہاً اُٹھی اور اس کی موٹی اور سخت ٹانگیں دبائے لگی جو میرے پتلے اور نازک ہاتھوں کے قابو نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے جبار کو غصے سے دیکھا جو اب آنکھیں موندے سکون حاصل کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب کرخنگی کی بجائے آسودگی چھا رہی تھی۔

”عورت کا اصل کام اپنے مرد کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔ اسے سکون پہنچانا ہوتا ہے۔ سمجھی تم؟“ اب وہ قدرے نرمی سے بات کر رہا تھا۔

میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ کس خدمت اور کس سکون کی بات کر رہا تھا۔

”عورت کا کام ہے مرد کو سکون دینا اور اس کی خدمت کرنا اور مرد کا کیا کام ہے؟ عورت کو بات بات پر بے زنت کرنا اور ہر لمحے اس کی تذلیل کرنا۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا تو وہ پھر آہستگی سے بولا۔

”مرد کا کام ہے کما کر لانا۔ اپنے بیوی بچوں کی کفالت کرنا اور میں بخوبی اپنے فرائض ادا کر رہا ہوں۔ جبکہ تم اپنے فرائض سے روگردانی کر رہی ہو۔ نہ تمہاری توجہ گھر پر ہوتی ہے اور نہ بچوں کی طرف۔ پتا نہیں کس خیالی دنیا میں رہتی ہو۔ کتا میں پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ میں اس کی لمبی چوڑی وضاحت سن کر بے زار ہو گئی۔ پچھلے بائیس تیس سال سے یہی گھسی پٹی فرسودہ باتیں سن کر میرے کان پک گئے تھے۔

”میں نے اپنی پوری زندگی اس گھر اور اپنے بچوں پر بچھاؤ کر دی۔ بدلے میں یہی سب کچھ سنتی آئی ہوں کہ میرا دھیان گھر کے بجائے کہیں اور رہتا ہے۔ افسوس میں آپ کی نظر میں کبھی بھی مکمل گرسختن نہیں بن سکتی۔ چاہے میں جتنی بھی کوشش کروں آپ کو خوش نہیں کر سکتی۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز آنسوؤں سے بھینکنے لگی۔ میں اپنی نم آنکھیں دوپٹے سے پونچھتی ہوئی اس کے برابر لیٹ گئی۔

وہ چند ثانیے خاموش لیٹا رہا۔ شاید میری باتوں کا آج اس پر کچھ اثر ہو رہا ہے۔ میں نے خوش فہمی کا دامن پکڑا۔ اس کی خاموشی طوالت پکڑنے لگی تو میں نے بھی کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں بعد اس کا بھاری بھر کم ہاتھ میری کمر پر گردش کرنے لگا اور اس نے چہرے میرے کان کے پاس لا کر سرگوشی کی۔

”چھوڑو سارے گلے شکوے اور میرے ساتھ لپٹ جاؤ۔“
”میرا موڈ نہیں۔“ میں کسمائی۔

”موڈ بننے ہوئے کون سی دیر لگتی ہے، ابھی بن جائے گا۔ میری طرف پلٹو ذرا۔“ وہ خمار آلود لہجے میں بولا تو میرے دل میں بھی اتھل پھل ہونے لگی۔ اس سے لاکھ اختلاف سہی مگر تھی تو ایک عورت جو فطری تقاضوں سے بہر حال مبرا نہیں تھی۔ میں نے اپنا رخ اس کی طرف موڑا۔ وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے پاس لایا تو اس کے منہ سے انتہائی ناگوار بو آئی جسے محسوس کر کے میں نے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا۔

”کیا دانت برش نہیں کرتے۔“ میں نے ناگوار سے پوچھا۔

”یہی وقت ملتا ہے تمہیں باز پرس کرنے کا۔“ وہ جھنجھلایا۔ ”سارے اموشنز کا بیڑہ غرق کر دیتی ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے زبردستی اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور مجھے ابکائی آتے آتے رہ گئی۔ اس کے غصے کی طرح اس کی محبت بھی ناقابلِ برداشت تھی۔

☆.....

صبح فجر کے وقت اٹھ کر میں نے غسل کیا پھر نماز فجر ادا کی اور پھر لیٹ گئی۔ پورے وجود پر کسلمندی سی طاری تھی۔ جہاں بے سدھ سوراہا تھا۔ اس کے خراٹوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر کرخنگی تھی۔ اس کا منہ تھوڑا کھلا ہوا تھا جس سے بدبودار سانسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ مجھے اس کی طرف دیکھ کر کراہت محسوس ہونے لگی۔ میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ میری پھر سے آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو دیوار گیر کلاک سوا سات بج رہا تھا۔ کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ فروری کا اینڈ تھا۔ فضا میں ابھی صبح اور شام کے وقت خنکی اتر آتی تھی جو طبیعت کو خوشگوار محسوس ہوتی تھی۔

سوسائٹ کا ناظم دیکھ کر میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ ساتھ سوئے ہوئے جبار کو جھنجھوڑا۔ ”اٹھ جائیں آج دفتر نہیں جانا

کیا؟“

وقت دیکھ کر وہ بھی فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں بچوں کو جگانے کے لیے بھاگی۔ بچوں کو جگا کر میں کچن میں گھس گئی۔

تیزی سے ہاتھ چلاتے چلاتے ذہن میں خیال آیا۔ آج پارک بھی نہیں گئی۔ اس خیال کے ساتھ ہی یہ خیال بھی

آیا کہ کیا وہ آج آیا ہوگا؟ کیا اس نے میری غیر موجودگی محسوس کی ہوگی؟

اوہو..... یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ میں دل میں خوب ہنسی۔ بچوں کو ناشتہ کروا کر بھیجا پھر میاں جی کی باری آ

گئی۔ انہیں فارغ کر کے رخصت کیا تو سکون کی سانس لی۔ ویسے بھی جبار کی گھر میں موجودگی سے ایک عجیب سی گھٹن کا

احساس ہوتا تھا۔ ماحول میں ایک کھنچاؤ سارہتا تھا۔ اس کے باہر جاتے ہی آزادی کا خوشگوار احساس رگ رگ میں سرایت

کرنے لگتا تھا۔ وجود ایک دم ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ وجہ بالکل واضح تھی۔ اس کا ہر بات پر نوک ٹوک کر نا اور گھر کے ہر معاملے

میں بے جا مداخلت کرنا۔

پھر میں نے اپنا ناشتہ تیار کیا جو ایک انڈے، دو سلاٹس اور ایک مگ بغیر چینی کی چائے پر مشتمل ہوتا تھا۔ میں ناشتہ

کی ٹرے اٹھائے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ ناشتے کے ساتھ ساتھ اپنا من پسند مارننگ شو دیکھنے لگی۔

دس بجے شریفاں آگئی۔ وہ صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ اپنی دلچسپ باتوں سے بھی خوب انٹرٹینمنٹ کرتی تھی۔

پورے محلے کی خبریں وہ بھی تازہ ترین اس کے پاس ہمہ وقت دستیاب ہوتی تھیں۔

مہوش بھی اپنا چائے والا مگ اٹھائے چلی آئی۔ سگی بہنیں اگر دیورانی جھٹانی بھی ہوں اور دونوں کے گھر بھی

ساتھ ملے ہوئے ہوں تو پھر دونوں کا زیادہ وقت اکٹھا ہی گزرتا ہے، جیسے ہم دونوں بہنوں کا۔ وہ بھی بچوں کو سکول بھیج کر

میرے پاس آ جاتی۔ اس کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا اٹھارہ سالہ ارسلان جو آئی کام کر رہا تھا۔ دوسرا بیٹا عدنان جو میٹرک کے

پہرزدے کر فارغ ہوا تھا۔ دس سالہ بیٹی کرن جو فور تھ کلاس کی طالبہ تھی۔

شریفاں کی تازہ ترین رپورٹیں اور ان پر مہوش کے تبصرے، میرا تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ مہوش بلا کی حاضر

دماغ اور حاضر جواب تھی۔ جس محفل میں ہوتی اسے زعفران زار بنا دیتی، جبکہ میں اس کے برعکس صرف ہنسنے پر زور رکھتی

تھی۔ سچ ہے ہر خوبی ہر کسی میں نہیں ہوتی۔



اگلی صبح وہ پارک میں مل گیا۔ ابھی میں نے اپنا چکر آدھا طے کیا تھا کہ وہ مخالف سمت سے جا گنگ کرتا ہوا آ رہا

تھا۔ میرے پاس سے گذرتا ہوا ایک مسکراہٹ اچھا لانا نہیں بھولا تھا۔ جواب میں بھی مسکرا دی۔ یہ بات ذہن سے بالکل نکل گئی

کہ نہ تو اس کی مسکراہٹ کا جواب دینا ہے اور نہ اور کسی بات کا۔ جب یہ باتیں یاد آئیں تو دیر ہو چکی تھی۔ تاسف ہونے لگا۔

اب میں نے خود پر سنجیدگی طاری کر لی۔ مردوں سے فری ہونے کا مطلب ہے ان کو خواہ مخواہ کا بڑھاوا دینا۔ فوراً اوٹ

پٹانگ سی خوش فہمیاں پال لیتے ہیں۔ میں چکر مکمل کر کے بچ پر آ کر بیٹھی تو وہ پھر سے بوتل کے جن کی مانند حاضر ہو گیا۔

”السلام علیکم!“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

”وعلیکم السلام۔“ میں نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔
 ”کیسی ہیں آپ؟“ وہ بڑی لگاوٹ سے پوچھ رہا تھا۔
 ”اچھی ہوں۔“
 ”لگتا تو نہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یا تو آپ کی طبیعت خراب ہے یا پھر موڈ۔“ یہ کہہ کر وہ دھم سے میرے پاس بیٹھ گیا بغیر اجازت

ل۔

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ دونوں ٹھیک ہیں۔“
 ”تو پھر اتنی رکھائی کس لیے۔ ویسے آپ کل کیوں نہیں آئیں؟“
 ”بس ویسے ہی۔“ میں لا پرواہی سے بولی۔
 ”ویسے آپ پرسوں کیوں نہیں آئے تھے۔“ میں بے اختیار پوچھ بیٹھی۔
 وہ مسکرانے لگا۔ ”پرسوں میں کہیں گیا ہوا تھا۔ چلیں چھوڑیں۔ آپ نے میرا نام تو پوچھا نہیں اس لیے میں خود ہی
 اپنا نام بتا دیتا ہوں۔ میرا نام خادر ہے۔ خادر دنواز اور میں آپ کی گلی سے اگلی گلی میں رہتا ہوں۔ میں ایک ٹریول ایجنسی
 چلاتا ہوں یعنی لوگوں کو بیرون ملک بھیجتا ہوں۔“
 ”ہوں..... اب یقیناً آپ میرا نام پوچھیں گے۔“ میں مسکرائی۔
 ”جی نہیں، بالکل نہیں۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ مسکرا کر بولا۔
 ”میں آپ کا نام نہیں پوچھوں گا کیونکہ میں پہلے سے جانتا ہوں آپ کا نام نورین فلک ناز ہے۔ آپ کے تین
 پیارے پیارے بچے ہیں، شاہ زیب، زوہیب اور بیٹی کا نام غالباً فاریہ ہے۔ آپ کے دونوں بیٹے شام کو اسی گراؤنڈ میں
 کرکٹ کھیلنے آتے ہیں اور میں کئی مرتبہ ان کے ساتھ کھیل چکا ہوں۔ میری ان کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہے۔ ماشاء اللہ
 بڑے قابل اور ہونہار بچے ہیں۔“

میں حیرت سے گنگ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے بولنا بند کیا تو میں نے پوچھا۔
 ”اور کیا جانتے ہیں آپ؟“

”اور..... اور یہ کہ آپ کے شوہر نامدار بہت اکڑا اور بد مزاج ہیں۔ سیدھے منہ کسی سے بات کرنا اپنی شان کے
 خلاف سمجھتے ہیں۔ آپ کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ ویسے اندازہ کر سکتا ہوں۔“
 جبار کے متعلق اس کا تبصرہ حقیقت پر مبنی تھا مگر پھر بھی ایک غیر کے منہ سے یہ سب سننا مجھے اچھا نہیں لگا۔
 ”اوکے..... میں چلتی ہوں۔“ میں اٹھی تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”میری کوئی بات بُری تو نہیں لگی۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔
 میں خاموشی سے باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی تو وہ بھی ساتھ چلنے لگا۔

”میں کیا کروں اپنی اس عادت کا۔ جو محسوس کرتا ہوں وہ بول دیتا ہوں، دل میں نہیں رکھ سکتا۔ میری اس صاف گوئی کی عادت سے کئی لوگ نالاں ہیں مجھ سے۔ کیا آپ بھی مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں۔“ وہ رد ہانسا ہو رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس سا آنے لگا۔ سچ ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔

”نہیں میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔“ میں نے جان چھڑائی۔
 ”تو پھر دوستی پکی۔“ وہ چبکا۔

میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ ”آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔ کیسی دوستی؟“
 میرا پارہ چڑھتا دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ ”میرا وہ مطلب ہرگز نہیں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“
 ”میں آپ کا مطلب بھی سمجھ گئی ہوں اور آپ کو بھی اچھی طرح جان گئی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر۔

☆.....

رات کو کھانے کے بعد میں بچوں کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جبار کھانا کھا کر کسی دوست کے ہاں چلے گئے تھے۔
 ٹی وی پر کامیڈی ڈراما چل رہا تھا جسے دیکھ کر بچے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ خصوصاً فاریہ تو خوب اونچی آواز میں قہقہے لگا رہی تھی۔ جبکہ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ میرے تصور میں بار بار خاور آ جاتا یا اس کی کبھی ہوئی باتیں۔
 ”شاہ زیب!“ میں نے شاہ زیب کو آواز دی۔

”جی امی!“ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

”بیٹا یہ خاور کون ہے؟“ میں نے نارمل سے لہجے میں پوچھا۔

”خاور.... ارے آپ کہیں خاور بھائی کی بات تو نہیں کر رہیں۔“ اب کی بار زوہیب بولا۔ اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

”ہاں شاید وہی ہوں۔ وہ آپ دونوں کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔“

”آپ کو کہاں ملے وہ؟“ شاہ زیب پوچھ رہا تھا۔ وہ بالکل عام سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”مجھے وہ پارک میں ملے تھے۔ وہ بھی مارننگ واک کے لیے آتے ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”امی! خاور بھائی اتنے اچھے ہیں کہ ہم بتا نہیں سکتے۔ ہم سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ

کرکٹ بھی کھیلتے ہیں۔ اس کھیل کے بہت ماہر ہیں۔“ اٹھارہ سالہ زوہیب بالغ ہونے کے باوجود بچوں کی طرح جوش سے بولتا اور جو اسے پسند آ جاتا اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ ویسے بھی وہ بہت باتونی اور ہنس مکھ تھا۔ جبکہ شاہ زیب اس کے برعکس سنجیدہ اور کم گو تھا۔ اکیس سال کا ہو رہا تھا مگر اس میں اس عمر کے لڑکوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہر وقت پڑھائی میں گم رہتا یا پھر شام کو دونوں بھائی اپنا اپنا بیٹ پکڑتے اور گراؤنڈ میں کھیلنے کے لیے چلے جاتے۔ باپ کے ساتھ انسیت تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس میں بھی تصور جبار کا تھا۔ ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ نے بچوں کو اس کے قریب جانے ہی نہیں دیا۔ وہ گھر میں داخل ہوتا تو تینوں بچے سہم جاتے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی کہ باپ کے سامنے کم سے کم جائیں۔ اس لیے اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتے۔ باپ کی گھر موجودگی سے وہ بے آرامی اور بے سکونی محسوس کرتے۔

یہی حال چھٹی والے دن کا تھا۔ چھٹی والے دن دونوں لڑکے صبح ناشتے سے فارغ ہو کر گھر سے نکلتے تو شام کو ہی لوٹتے۔ اس دن تمام وقت میں ہی جبار کے عتاب کا نشانہ بنتی۔ کبھی مجھے بازو سے گھسیٹ کر گھر کی چھتوں پر لگے جالے دکھاتا تو کبھی دروازوں کھڑکیوں پر پڑی ڈسٹ کی تہہ انگلی سے صاف کر کے دکھاتا اور پھر مجھے لعن طعن کر کے انتہائی پھوہڑ اور بدسلقہ عورت ثابت کرتا۔ اس کا اتنا بے عزت کرنے پر بھی اگر میں پرسکون رہتی تو مزید کڑوے کیلے جملے میرے کانوں میں انڈیلتا مثلاً تمہاری تو غیرت ہی مر گئی ہے۔ اپنی کوتاہیاں دیکھ کر اگر کوئی غیرت مند عورت ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرے۔ مگر تم اپنے آپ کو دیکھو ذرا کس ہٹ دھرمی سے میرے سامنے سراٹھائے کھڑی ہو۔ تف ہے تمہاری زندگی پر۔ وہ بکتا جھکتا پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل جاتا اور میں بت بنی کھڑی سوچتی رہ جاتی آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میری قسمت میں جبار جیسا آدمی کیوں لکھ دیا گیا؟ کیوں ماں باپ بیٹیوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ دو چار سال کی بات نہیں بلکہ عمر بھر کا عذاب ہے، جو وہ اپنے جگر گوشوں پر مسلط کرنے جا رہے ہیں۔



اگلے تین دن میں نے خاور سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا اور نہ ہی اس کے سلام کا۔ میرا خیال تھا کہ میری بے اعتنائی دیکھ کر وہ بدل ہو جائے گا اور خود بخود میرا پیچھا چھوڑ دے گا مگر یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ کیونکہ چوتھے دن وہ میرے پاس اسی سنگی بیچ پر بیٹھا تھا۔ میں اس کی موجودگی کو نظر انداز کر کے سامنے دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحوں تک میرے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ مجھ سے کس بات پر خفا ہیں۔“

”میں کیوں آپ سے خفا ہونے لگی بھلا۔“ میں بے پروائی سے بولی۔

”تو پھر منہ پھلائے پاس سے کیوں گزر جاتی ہیں؟“

مجھے اس کی بے باکی پر غصہ تو آیا مگر خاموش رہی۔

”شاید آپ دوستی والی بات پر آپ سیٹ ہیں۔ قصور آپ کا نہیں۔ قصور ہماری نوجوان نسل کا ہے جس نے دوستی جیسے مقدس رشتے کا تقدس پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل پر ایک دن دوستی ہوتی ہے۔ دوسرے دن وہ دوستی محبت میں بدل جاتی ہے۔ تیسرے دن کسی بات پر اختلاف ہوتا ہے۔ چوتھے دن دوستی اور محبت سب ختم اور پھر سے کوئی اور نیا دوست ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔ اور حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ایسے ریڈی میڈ دوست اور عاشق فوراً دستیاب ہو جاتے ہیں انہیں تلاش کرنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ کیوں ایسا ہی ہے نا! آپ کیا کہتی ہیں؟“ وہ نان اسٹاپ بولتا چلا گیا اور میں سب کچھ بھول کر مسکراتی چلی گئی۔

”آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ ایسا ہی ہے۔“ میں نے لقمہ دیا تو وہ پھر سے شروع ہو گیا۔

”محبت میں کے ٹو کی چوٹی سر کرنے والے یہ کہہ کر راستہ بدل لیتے ہیں کہ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ سو موبائل اور انٹرنیٹ پر ہونے والی محبت آغاز ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ خالص محبت کو قلب و روح سے نسبت ہوتی ہے۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا اور پھر سے اسٹارٹ ہو گیا۔

”اشفاق احمد کہتے ہیں، محبت تو یہ ہے کہ کوئی احساس دلانے بنا آپ کے درد کو سمیٹ لے۔ آپ کی کمزوریوں کو

ڈھانپ لے۔ اس میں کوئی وعدہ ہونا انتظار۔ اس میں کچھ طلب کرنے کی نوبت نہ آئے۔ وگرنہ محض رابطے میں رہنا، گفتگو میں محبت کے بلند و بانگ دعوے کرنا زبان کا چسکا تو ہو سکتا ہے محبت ہرگز نہیں۔“

”ارے.... آپ نے تو لگتا ہے محبت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔

”محبت پر ہی نہیں میں نے زندگی کے ہر شعبے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔ میں نے زندگی کا ہر رنگ، ہر رویہ

بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ویسے آپ کا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

اس کے اس سوال پر میں گڑبڑا سی گئی، مگر اگلے لمحے سنبھل گئی۔

میں کوئی ٹین ایچ لڑکی تو ہوں نہیں جو ایسی باتوں پر گھبرا جاؤں۔ اگر وہ اپنی علمیت کا اتنا رعب جھاڑ رہا ہے تو مجھے

بھی تو اپنے اتنے وسیع مطالعے کی لاج رکھنی چاہیے۔ آخر اسے بھی تو پتا چلے کہ اس کے سامنے بیٹھی عورت علم و فراست میں کسی طور بھی اس سے کم نہیں۔

”کیا مشکل سوال کر دیا میں نے۔“ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اب وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”محبت کے بارے میں، میں یہی کہوں گی کہ بلاشبہ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے جو لفظی اظہار کا محتاج نہیں۔ جس

سے دلی تعلق ہو اس کے لیے سرزد ہونے والا رویہ اور طرز عمل آپ ہی اظہار بن جایا کرتا ہے۔ طلب سے ماورایہ جذبہ

روحانی مسرت کا سرچشمہ ہے اور یہ روحانی خوشی تب ہی میسر آتی ہے جب اخلاص نیت کے ساتھ محبت کا سفر طے کیا

جائے۔ بے لوث جذبے سے عاری محبت، محبت نہیں محض مشغلہ دل ہے۔ اور محبت دل لگی کا نہیں بلکہ دل کی لگی کا نام ہے۔“

میں خاموش ہوئی تو خاور چند لمحے حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”ارے.... آپ نے تو مجھے شاکد کر دیا۔ محبت کو اتنے خوبصورت الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ میں تو دنگ

ہو گیا۔ ویلڈن..... ویری گڈ۔“

اس کی تعریف و توصیف سن کر میں لپانے لگی۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے ابھی اس ٹاپک پر اور گفتگو ہو سکتی ہے۔“ وہ شانہ مجھے روکنا چاہ رہا تھا۔

”نہیں خاور صاحب، میں اب چلوں گی۔ پہلے ہی لیٹ ہو گئی ہوں۔ باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔“ میں

نے قدم گیٹ کی طرف بڑھائے تو پیچھے سے اس نے آواز دی۔

”اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ ابھی کچھ گفتگو رہ گئی ہے۔“

اور میں گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ شخص کیوں میرے دل کے بندر وازے پر دستک دینے کی

جسارت کر رہا ہے۔ وہ دروازہ تو میں کب کا بند کر کے اس کی چابی بھی پھینک چکی ہوں۔ اس زنگ آلود لاک کو یہ کھولنے میں

کا میاب ہو سکے گا۔ میں نے خود سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔ ”نہیں کبھی نہیں۔“

☆.....

میاں اور بچوں کو رخصت کر کے میں ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی مگر ذہن کہیں اور ہی تھا۔ آج شریفیوں کی باتوں

میں بھی کوئی دلچسپی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ذہن بار بار بھٹک کر خاور کی کہی باتوں میں جا اٹکتا۔

کتنی خوبصورت باتیں کرتا ہے یہ انسان۔ سامنے والا سننے تو سنتا چلا جائے۔

اس کی باتیں دماغ میں گردش کرنے لگیں تو ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔ آس پاس سے اتنی لا تعلق ہو گئی کہ مہوش کے آنے کا بھی پتہ نہ چلا۔ ویسے بھی اس کے آنے کا پتا کم ہی چلتا تھا کیونکہ دونوں بہنوں کے گھر تو آپس میں جڑے ہوئے تھے ہی، جبکہ لان بالکل سا بچھا تھا۔ بیرونی گیٹ اور پورچ الگ الگ ہونے کے باوجود لان ایک ہی تھا۔ یعنی دونوں گھروں کی درمیانی دیوار نہیں تھی۔ دونوں طرف کے افراد دن، رات کی تیز کیے بغیر کسی بھی وقت ایک دوسرے کے ہاں آ جاسکتے تھے۔

وہ کچھ لحوں تک میرے پاس کھڑی میرا جائزہ لیتی رہی، پھر اس نے میری آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔
”کہاں گم ہو؟ کس بات پر مسکرا رہی ہو؟“

”کہیں نہیں۔“ میں چونکی۔ ”پروگرام بڑا مزاحیہ ہے۔“ میں نے بات بنائی۔

”مگر آج تو بزرگوں کا عالمی دن منایا جا رہا ہے اور اسی ٹاپک پر مارنگ شو کیا جا رہا ہے۔ بڑے بوڑھوں کے دکھ درد سن کے پروگرام کی ہوسٹ بھی رو رہی ہے۔“ مہوش حیرت سے کہہ رہی تھی اور میں نجل ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔
”ہاں تو وہ کوئی اور پروگرام تھا۔ یہ پروگرام تو میں نے ابھی ابھی لگایا ہے۔“ میں نے بھونڈی سی وضاحت پیش کی۔

”سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا چھپا رہی ہو؟“ وہ مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
”میں کیا چھپاؤں گی بھلا اور تم کیوں اتنی تفتیش کر رہی ہو؟“

مجھے یاد آیا کہ میں بڑی بہن ہوں اور رعب جمانے کا حق تو میرا بنتا ہے جبکہ یہ حق ہمیشہ سے وہ استعمال کرتی آئی ہے۔

”اوکے اوکے، میں بھول گئی تھی کہ ایک لکھاری سے بات کر رہی ہوں اور لکھاری کوئی نارمل انسان تھوڑے ہوتے ہیں۔ وہ تو غائب دماغ اور سگی ہوتے ہیں۔ کب ہنسنا شروع کر دیں اور کب رونا۔ پتا تھوڑا چلتا ہے۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولی۔

”صرف طنز کے تیر چلانے آئی ہو یا کچھ اور بھی کہنا ہے۔“ میری سنجیدگی دیکھ کر وہ سنبھلی۔
”ارے ہاں میں تو آپ سب کو انوائیٹ کرنے آئی تھی۔“
”کس خوشی میں؟؟“

”آج کرن کی سالگرہ ہے۔ آج رات کا کھانا تم لوگوں نے ہماری طرف کھانا ہے۔“

”اور کس کس کو بلایا ہے؟“ حالانکہ جواب میں جانتی تھی۔ جبار اور غفار دو ہی بھائی تھے۔ بہن تھی نہیں، لے دے کے ایک ماں باپ تھے جو غفار یعنی مہوش کے گھر رہتے تھے۔ وہ صرف ہمارے ساس سر نہیں تھے بلکہ سکے ماموں اور ممانی بھی تھے۔ یعنی ہم دونوں بہنیں اپنے ماموں کے گھر بیاہ کر آئی تھیں۔

”آپ لوگوں کے علاوہ بلال بھائی اور اس کی فیملی کو بلایا ہے۔ اس کے علاوہ کرن کی چند سہیلیاں ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”کتنے سال کی ہو گئی ہے کرن؟“

”خیر سے پورے دس سال کی ہو گئی ہے ماشاء اللہ۔“

”اللہ اس کی عمر دلا کرے اور اس کی قسمت اچھی کرے۔“ میں نے خلوص دل سے دعا دی۔

”آمین....“ مہوش نے میری آواز میں آواز ملائی۔

”میو کیا بنایا ہے شام کے لیے؟“ میں نے پوچھا۔

”فروٹ چاٹ، دہی بڑے، چکن بروسٹ، پٹاٹو چپس اور سمو سے وغیرہ۔“ وہ فر فر بتانے لگی۔

”ان سب چیزوں میں کھانا کہاں ہے؟“ میں مسکرائی۔

”لوجی جب اتنی چیزیں کھائیں گے تو کھانے کی گنجائش کہاں رہے گی۔“ اس نے ترنت جواب دیا۔

”اور ہاں، تم ذرا جلدی آ جانا فروٹ چاٹ اور دہی بڑے تم نے ہی بنائے ہیں۔“ اس نے آرڈر دیا۔

”اور تم نے کیا کرنا ہے؟“

”باقی سارا کام میں نے ہی تو کرنا ہے۔“ وہ ڈھٹائی سے بولی۔

”مثلاً۔“ میں نے پوچھا۔

”مثلاً بروسٹ اور آلو کے چپس اور.....“

”اور کیا.....؟“

”اور سمو سے تو بازار سے آئیں گے، پھر بھی کافی کام ہوتا ہے بس تم آ جانا۔“

”اوکے، میں چار بجے تک آ جاؤں گی۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ پورے آٹھ بجے پروگرام شروع کر دیں گے۔“

”کیسا پروگرام؟؟“ میں مصنوعی حیرت سے بولی۔

”سالگرہ کا پروگرام اور کیا۔“ وہ شیطانی۔

”اوہ اچھا، میں سمجھی تھی کوئی میوزک کنسرٹ بھی ہو رہا ہے ساتھ۔“

”ہاں تو سب بچے اکٹھے ہوں گے تو کوئی شغل میلہ بھی لگائیں گے نا۔“

”کیسا شغل میلہ.....“ میں اسے پوری طرح تنگ کر رہی تھی۔

”ڈانس وغیرہ کریں گے اور کیسا شغل میلہ..... اور تم میرا دماغ کیوں کھپا رہی ہو۔ مجھے ویسے بھی آج بہت کام کرنا ہے۔“ وہ منہ بسورتے ہوئے چل دی۔

میں اس کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک محظوظ ہوتی رہی۔

☆.....

بچے گھر آئے۔ انہیں کرن کی سالگرہ کے متعلق بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئے۔ جبکہ فاریہ نے ترنت جواب دیا کہ اسے پہلے سے پتا ہے۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے؟“ میں حیران ہوئی۔

”آج سکول میں کرن نے بتایا تھا کہ آج اس کی سالگرہ ہے۔“

”اوہ... اچھا...“

”امی! آج کتنے عرصے بعد خاندان میں کوئی گید رنگ ہو رہی ہے۔ خوب ہلا گلا کریں گے۔“ زوہیب کچھ زیادہ ہی ایکسائینڈ ہو رہا تھا۔

”ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ جلدی سے کپڑے بدل لو میں کھانا لگا رہی ہوں۔ پھر میں نے مہوش کے ہاں چلی جانا ہے۔“

”آپ نے ابھی سے جا کر کیا کرنا ہے؟“ زوہیب نے سوال کیا۔

”بھئی جا کر اس کا ہاتھ بنا نا ہے۔“ میں ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے بولی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہاتھ بنانے کی۔ جب ہمارے گھر کوئی فنکشن ہوتا ہے تو آنٹی کتنا ہاتھ بناتی ہیں آپ کا۔“

زوہیب ہمیشہ کی طرح دل کے پھپھو لے پھوڑنے لگا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا۔ اگر میں تھوڑا کام کر لوں گی تو کونسا گھس جاؤں گی۔ یہاں بھی تو سارا دن کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔“

”جب میں نے کہہ دیا ہے نا کہ آپ پہلے نہیں جائیں گی تو نہیں جائیں گی۔ آپ تیار ہو کر ہمارے ساتھ جائیں گی۔ بالکل ان ٹائم جیسے وہ آتی ہیں۔“ اب کی بار وہ تحکمانہ انداز میں بولا بالکل اپنے باپ کی طرح۔

”زوہیب! تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ دونوں بہنوں کا آپسی معاملہ ہے تم کیوں خواہ مخواہ دخل اندازی کر رہے ہو۔“

شاہ زیب نے زوہیب کو گھر کا تودہ اور زور سے بولا۔

”بھائی تم تو چپ ہی رہو۔ تم تو آنٹی کے کپے چمچے ہو۔ آنٹی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں ہوتی اور وہ امی کو جو مرضی کہتی رہیں وہ تمہیں بھی سنائی نہیں دیتا۔“ زوہیب کا پارہ آہستہ آہستہ اونچائی کی طرف جا رہا تھا۔

”زوہیب منہ بند کرو اور جا کر کپڑے بدل کر آؤ۔“ میں غصے سے بولی تو وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔

”امی آپ نے اسے بہت سرچڑھا رکھا ہے۔ ایک دن پچھتائیں گی۔“ شاہ زیب اپنی جلن نکالنے لگا۔

”شاہ زیب تم تو سمجھدار ہو، برداشت سے کام لیا کرو۔“

”نہیں ہوتا مجھے برداشت جب وہ آپ پر دھونس جاتا ہے اور پابندیاں لگاتا ہے۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ پر رعب جھاڑے۔“

”بچہ ہے ابھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی سمجھدار ہو جائے گا۔“ میں نے اسے بہلایا۔

”اب تو وہ قانون کی نظر میں بھی بچہ نہیں رہا۔ اٹھارہ کو کراس کر چکا ہے۔“

”قانون کی نظر میں نہ سہی، میری نظر میں تو تم دونوں ہمیشہ بچے رہو گے۔“ میں مسکراتے ہوئے بولی تو وہ لا جواب ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔



مہوش کے گھر سرشام ہی رونق جم گئی۔ چاروں لڑکوں نے مل جل کر لاؤنج کو خوبصورت غباروں اور کاغذی

پھولوں کی لڑیوں سے خوب سجایا تھا۔ کھانے پینے کے تمام لوازمات بڑی سی ڈانکنگ ٹیبل پر رکھے تھے۔ جن میں سرفہرست سالگرہ کا خوبصورت بڑا سائیک تھا، جو غفار نے اپیشل آرڈر پر تیار کروایا تھا۔

بچوں کے دادا جان اور دادی جان بھی جج دھجج کر صوفوں پر تمکنت سے براجمان تھے۔ ان کے چہرے اندرونی مسرت سے دمک رہے تھے۔ اپنے پوتے اور پوتیوں کو خوش دیکھ کر وہ بھی نہال ہو رہے تھے۔ ویسے بھی یہ قانونِ فطرت ہے کہ اولاد کی اولاد، اولاد سے زیادہ پیاری لگتی ہے۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں، بس اب بلال بھائی اور اس کی فیملی کا انتظار تھا۔ کرن کی چند ننھی منی پیاری پیاری سہیلیاں تیلیوں کی مانند لہرا رہی تھیں۔ جبکہ کرن بھی نیٹ کے پھولے ہوئے فراق میں کوئی پری ہی لگ رہی تھی۔ فاریہ بار بار بے صبری سے کلاک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ای یہ ماموں وغیرہ کیوں نہیں آرہے؟“

”آجائیں گے۔ شاید پہنچنے والے ہی ہوں۔“ میں نے دلا سادیا۔

”بلال بھائی اپنی ریت توڑنے والے نہیں۔“ مہوش اپنے بھاری بھر کم جسم اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ پورے گھر میں لڑھکتی پھر رہی تھی۔ وہ کام سے زیادہ بھاگ دوڑ سے ہی تھک جاتی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹی کی باتیں سن کر اس نے لقمہ دیا۔

”کوئی بیاہ ہو، شادی ہو، سالگرہ ہو، عقیقہ ہو، بلال بھائی ہمیشہ سب سے اینڈ پیہ آتے ہیں۔“

”مہوش پیٹھ پیچھے بڑا اکڑ رہی ہو۔ بلال کے سامنے تمہاری بولتی بند ہو جاتی ہے۔“ جبار نے چھیڑا۔ سب ہنسنے

لگے تو کھسیانی ہو کر بولی۔

”جی نہیں بھائی جان! میں کسی سے بھی ڈرتی ورتی نہیں۔ جو کہنا ہوتا ہے منہ پر کہہ دیتی ہوں۔“

”کیا واقعی!.....“ جبار کے چہرے پر شرارت ناچ رہی تھی۔

”جی بالکل۔“ وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ جیسے ہی بلال آئے تم نے آج اسے احساس دلانا ہے کہ وہ ہمیشہ دیر سے کیوں آتا ہے۔“

”اب بڑا بھائی ہے، لحاظ آ جاتا ہے۔“ مہوش آنا کانی کرنے لگی تو وہاں موجود بچے بڑے بھی مسکرا رہے تھے۔

”بڑا بھائی ہونے کا یہ مطلب تھوڑی ہے وہ کچھ بھی کرتا پھرے اور اس سے باز پرس کرنے والا کوئی بھی نہ ہو۔“

اب کی بار غفار بولا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ ”لگتا ہے بلال بھائی آ گئے۔“ مہوش

چبکی۔

”ارے آرام سے بیٹھو۔“ غفار نے بازو سے پکڑ کر بٹھایا۔ ”تم نے ذرا موڈ دکھاتا ہے ان کے دیر سے آنے پر۔“

ہم کتنی کوفت اٹھاتے رہے ہیں۔ اس بات کا احساس دلانا ہے۔“ وہ منہ لٹکا کر پھر بیٹھ گئی۔

بلال بھائی اپنی بیگم اور چار بچوں کے ساتھ اندر آئے تو گھر بھر گیا۔ سب سے پہلے وہ ماموں اور ممانی سے ملے۔

اس کے بعد دونوں بہنویوں سے اور پھر بہنوں اور ان کے بچوں کی باری آئی۔

بلال بھائی ہمیشہ کی طرح گرلیس فل، باوقار اور بارعب لگ رہے تھے۔ صحت مند چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں

بال رملی تھیں۔ نہیں وہ ہار مار وڑنا نہیں بھولتے تھے اور صائمہ بھابی ہمیشہ کی طرح آج بھی خاموش اور سہمی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ بہت مولیٰ فصل و صورت کی مالک تھیں، مگر بلال بھائی کے سامنے تو بالکل دب جاتی تھیں۔ شاید ان کے سامنے اپنی لمبائی کی احساس اور شدید ہو جاتا تھا۔ ان کی شاندار پرسنالٹی کے سامنے وہ بھی بھٹی جاتی تھیں۔ بھائی کو بھی اپنی مردانہ وجاہت اور بیوی کی کم صورتی کا احساس تھا۔ صائمہ بھابی کو قبولے کا احسان اتنا بڑا تھا کہ چچا غفور یعنی صائمہ کا باپ تازندگی بلال بھائی کی یہ نیکی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

صائمہ کا رشتہ مانگتے وقت ابا جان اور بلال بھائی کے سیاسی ذہن نے پوری طرح سیاست سے کام لیا۔ بھائی سے صائمہ کا رشتہ مانگتے وقت ابا جان کے ذہن میں دو بڑے مقاصد تھے۔ نمبر ایک بلال بھائی کی صائمہ سے شادی ہو جانے کی صورت میں بلال بھائی اپنے دھیل سے تمام عمر مضبوطی سے جڑے رہتے۔ نمبر دو صائمہ کروڑوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث تھی۔ شادی کے بعد وہ تمام جائیداد اس کے شوہر کی ملکیت ہو جاتی۔

سیاسی خاندان میں ہر فیصلہ سیاست کو مد نظر رکھ کے یعنی اپنے مفاد کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ”مہوش تم آج کچھ چپ چاپ سی ہو خیریت ہے نا!“ بلال بھائی مہوش کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”نہیں بھائی جان.... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ ایک دم موم کی طرح پکھل گئی جبکہ غفار اسے اشارے کر رہا تھا کہ وہ بلال سے بات کرے۔ جبکہ ہم سب زیر لب مسکرا رہے تھے۔ ہم سب کو مسکراتا دیکھ کر وہ چڑ گئی اور دل کڑا کر بولی۔

”بھائی جان! ایک بات تو بتائیں۔“
”پوچھو۔“ بلال بھائی نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کروفر سے پوچھا تو مہوش ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔
”آپ..... ہر..... محفل.... میں اتنی لیٹ کیوں آتے ہیں؟.....“ بلال بھائی کا تاؤ دیتا ہاتھ رک گیا۔ وہ حیرت سے مہوش کو دیکھنے لگے۔

”اگر لیٹ جاتا ہوں تو کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے۔“ وہ پھنکارے تو مہوش کے ہوش اُڑ گئے۔
”نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ کسی کے باپ کا بھلا کیا جاتا ہے۔ آپ کی مرضی ہے آپ جلدی جائیں یا لیٹ جائیں کسی کو کیا۔“

”یہ فضول باتیں ہی سناتی رہو گی یا ایک بھی کاٹو گی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے کہیں اور بھی جانا ہے۔“

”جی بالکل، ابھی کاٹتے ہیں۔ کرن جلدی سے ایک کاٹو۔“
مہوش کی بوکھلاہٹ سے سبھی محفوظ ہو رہے تھے اور پھر کیک اور چند دوسری چیزیں کھا کر بلال بھائی چلے گئے۔ اپنی فیملی کو یہ کہہ کر چھوڑ گئے کہ ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد جاتے ہوئے لے جاؤں گا۔ ان کے جانے کے بعد مہوش کے خوب لتے لیے گئے۔ ہر ایک نے حسبِ حیثیت اس کو مذاق کا نشانہ بنایا۔
”ہم پر تو بوی دھونس جماتی ہو۔ بھائی کے سامنے ساری ہوا نکل گئی۔“ غفار کے ہاتھ آج موقع آیا تھا کیوں جانے دیتا بھلا۔

”ہاں تو میں نے بھائی کے منہ پر ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہر جگہ لیٹ کیوں جاتے ہیں۔ ڈری وری بالکل نہیں۔“ مہوش کی ڈھٹائی واقعی قابلِ تعریف تھی۔

”یہ بات تو میں بھی مانتا ہوں۔ مہوش بالکل نہیں ڈری بس تھوڑی زبان لڑکھائی تھی یا پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔“ جبار کا یہ کہنا تھا کہ سبھی ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ بلال بھائی کی غیر موجودگی میں صائمہ بھابی بھی کھل کر ہنس رہی تھیں۔

”اب بس بھی کرو کیوں میری بیٹی کو تنگ کر رہے ہو سب۔“ اب کے ماموں بولے۔

”دیے مہوش کسی کے قابو آنے والی ہے تو نہیں۔ آج پتا نہیں کیسے آگئی۔“ ممانی نے بھی لقمہ دیا۔

بڑوں کی چھیڑ چھاڑ ختم ہوئی تو بچوں نے ڈیک لگا کر اپنے اپنے ڈانس آئٹمز پیش کیے۔ جبار کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر میرے تینوں بچے بہت خوش تھے۔ باپ کا یہ روپ انہیں کبھی بکھار دیکھنے کو ملتا تھا۔ گھر میں وہ جس قدر غصیلا اور سخت مزاج ہوتا تھا۔ محفلوں میں اتنا ہی بذلہ سخا اور حاضر دماغ ہوتا تھا۔ اپنے برجستہ جملوں سے کسی بھی تقریب میں جان ڈال دیتا تھا۔

☆.....

اگلی صبح حسبِ توقع خاور سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے پاس سے گذرتے ہوئے سلام اچھالا تو میں نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کچھ کیا۔ نتیجتاً اس کی مسکراہٹ اور جاذبِ نظر اور گہری ہو گئی۔

میں اس کی فطرت جان گئی تھی۔ وہ صرف باتوں کی حد تک تیز طرار اور بے باک تھا۔ جہاں تک میرا خیال تھا حقیقت میں وہ قطعی بے ضرر اور معصوم تھا۔ ریاکاری سے پاک، صاف دل اور صاف گو تھا۔ جودل میں آٹافٹ زبان سے کہہ ڈالتا اور مجھے ایسے لوگ ہمیشہ سے پسند رہے ہیں۔ کیونکہ میں خود ایسی ہی ہوں۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک ہر بات لگی لپٹی کے بغیر کہنے والی۔ میں اپنا رازِ مکمل کر کے آئی تو وہ آج پہلے سے بیٹھا تھا۔

”آئیے جناب تشریف رکھیے۔“ اس نے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں اس سے فاصلہ رکھ کے بیٹھ گئی۔

”اور سنائیں میڈم کیسی ہیں؟“ آج وہ خوب چمک رہا تھا۔

”ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیں۔“ میں نے وضع داری نبھائی۔

”آپ کے سامنے ہوں، ملاحظہ کر لیں۔“ وہ کمال ڈھٹائی سے بولا تو میں جزبہ ہو کر رہ گئی۔ بات بدلنے کی

ماطر بولی۔

”آپ کے کتنے بچے ہیں؟“

”جتنے آپ کے ہیں۔“ وہ برجستگی سے بولا۔

”بیٹے کتنے، بیٹیاں کتنی؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”آپ جیسے ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کے بیٹے بڑے ہیں اور

بی چھوٹی ہے جبکہ میرے بیٹے چھوٹے ہیں اور بیٹی بڑی ہے۔“

”اوہ اچھا.... کتنی دیر ہوئی ہے آپ کی شادی کو؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔

”تقریباً پندرہ سال..... اور آپ کی شادی کو؟“ اس نے پوچھ لیا۔

”میری شادی کو اس جون میں بائیس سال ہو جائیں گے۔“

”کیا واقعی؟؟“ وہ حیرانگی سے بولا۔

”جی بالکل۔ اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟“

”ویری سٹریچ، آپ تیس بیس سے اوپر نہیں لگتیں۔“

”جی نہیں، میں پچھلے ماہ پورے چالیس کی ہو گئی ہوں۔“

”ونڈرفل..... آپ ان عورتوں کے لیے ایک مثال ہیں جو تیس سال کی عمر میں چالیس پچاس کی دکھائی دیتی

ہیں۔“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی عمر کے مطابق ہی دکھتی ہوں۔ آپ بنائیں مت۔“ میں ہنستے ہوئے

بولی۔

”میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں آپ کی قسم۔“ وہ روانی میں کہہ گیا مگر پھر بات پلٹنے کو فوراً بولا۔

”آپ کے بڑے بیٹے کی عمر کیا ہے؟“

میرے دل کی دھڑکن اس کی بات سن کر تیز ہو گئی تھی۔ اس کا سوال سن کر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”اکیس سال۔“

”یعنی آپ انیس سال کی عمر میں ماں بن چکی تھیں۔“ وہ حیرانگی سے بولا۔

”جی ہاں۔“

”شادی کے وقت آپ کی عمر غالباً اٹھارہ سال ہوگی۔“

”ہاں جی۔“

”میری نظر میں تو سراسر یہ ظلم ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”اتنی کم عمری میں شادی ظلم ہی کے زمرے میں آتا ہے۔“

”ہمارے ملک کے کئی پس ماندہ علاقوں میں اس سے بھی بڑے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ یعنی اس سے بھی زیادہ

کم عمری کی شادیاں ہوتی ہیں۔“ میں نے تبصرہ کیا۔

”آپ کی عمر کیا تھی؟ جب آپ کی شادی ہوئی تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”ستائیس سال..... میں آپ کی طرح کم عمر نہیں تھا۔“ وہ مسکرایا۔

”ستائیس سال..... اور شادی کو پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ یعنی اب آپ کی عمر بیالیس سال ہو گئی ہے۔“ میں نے

حساب لگایا۔

”جی بالکل۔ میری عمر اس وقت اتنی ہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اگر میں چالیس کی نہیں لگتی تو آپ بھی کسی اینگل سے بیالیس کے نہیں لگتے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔

”اچھا جی، پھر کتنے کا لگتا ہوں۔“

”ہوں..... زیادہ سے زیادہ پینتیس کے۔“

”ویسے کہتے ہیں کہ انسان کی اصل عمر چالیس سال تک ہے۔ اس سے اوپر وہ جتنا بھی جیتا ہے وہ بونس ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اب ہم دونوں بونس پر زندہ ہیں۔“ میں مسکرائی۔

”جی بالکل۔ کئی دفعہ اصل زندگی سے بونس شدہ زندگی زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہے۔“ وہ پر خیال لہجے میں

بولتا۔

”وہ کیسے؟“ میں حیران ہوئی۔

”اچانک کوئی ایسا دوست مل جاتا ہے کہ بیتی ہوئی زندگی سے سارے گلے شکوے بھول جاتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر سینے میں جیسے کوئی اٹھل پھیل سی ہونے لگی۔ میں اُنھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں، خدا حافظ۔“

”او کے..... خدا حافظ.....“ وہ مجھ سا گیا۔

☆.....

سارا دن جسمانی طور پر گھر کے کاموں میں جبکہ ذہنی طور پر خاور کی باتوں میں اُلجھی رہی۔

سچ تو یہ تھا کہ مجھے خاور سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس سے باتیں کر کے میرا من ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ جس

دن سے میں خاور سے ملنے لگی تھی، تب سے میں اپنی طبیعت میں بہت بدلاؤ محسوس کر رہی تھی۔ بات بے بات ہنستی، بچوں

سے ہنسی مذاق کرتی اور جبار کی باتوں پر چلنا کڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا بلکہ اس کی عادت سمجھ کر اگنور کرنے کی کوشش کرتی۔ جبکہ

پہلے میں اس کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر رونے لگتی تھی یا پھر آگے سے بحث و تکرار شروع کر دیتی تھی۔ بچے میرے اس

بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر بہت خوش تھے۔ آج رات بھی ضروری کام نمٹا کر میں اپنے بیڈ پر لیٹی تو پڑھنے کے لیے ایک

کتاب اٹھالی۔

جبار بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا، جبکہ بچے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔

تھوڑی دیر کتاب کے صفحے الٹ پلٹ کرتی رہی۔ آج پڑھنے میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر ورق

گردانی کرنے کے بعد میں نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور سوچنے لگی۔

کیا میں خاور کا دوستی کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لوں؟

کیا ایک اجنبی پر اندھا اعتماد کر لوں؟

کیا وہ اعتبار کے قابل ہے؟

کیا ہمارا معاشرہ مرد اور عورت کی دوستی کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے؟

کیا اس عمر میں، میں یہ دوستی افورڈ کر سکتی ہوں؟

جب اتنے سارے ”کیا“ میرے ذہن میں ناچنے لگے تو میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

یہ سچ تھا کہ خاور مجھے اچھا لگتا تھا۔

یہ بھی سچ تھا کہ وہ میری خشک اور بے رنگ زندگی میں قوس قزح بن کے آیا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ میری گھٹن زدہ زندگی میں مانند روزن تھا، جہاں سے مجھے تازہ ہوا اور آکسیجن مل رہی تھی۔

”کیا کروں؟“ سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہونے لگا۔ آخر کچھ دیر بعد میں ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئی۔

میں نے سوچ لیا کہ خاور سے دوستی کروں گی، مگر ایک حد کے اندر رہ کے۔ اپنی حدود و قیود سے کبھی باہر نہیں

جاؤں گی۔ اپنی عزت اور وقار کو کبھی داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔ زندگی اگر کچھ لمحات آسودگی کے میری جھولی میں ڈال رہی ہے تو

انہیں سمیٹ لوں گی۔ اگر تھوڑی دیر اس کے ساتھ باتیں کر کے مجھے ذہنی اور قلبی سکون ملتا ہے تو کسی کا کیا جاتا ہے۔ آخر

زندگی کی خوشیوں پر تھوڑا حق تو میرا بھی بنتا ہے نا۔ کتنی ہی تاویلیں دے دے کر میں خود کو مطمئن کر رہی تھی، مگر پھر بھی دل

میں ایک خلش تھی جو بے چین کر رہی تھی، مجھے روک رہی تھی۔

اس وقت کسی فلسفی کے کہے گئے یہ الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے:

”زندگی کیا ہے؟ اس کی تہہ تک پہنچنے کی میں نے بڑی کوشش کی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ کبھی تو یہ مجھے پہاڑوں پر

جھومتی نظر آئی اور کبھی ریت کے ٹیلوں کی طرح بالکل بکھری ہوئی۔ میں نے زندگی کی تنہائیوں میں خود کو منادیا مگر میں اپنی ہی

منزل بھول گیا۔ جب میں زندگی کی خوشیوں کے پیچھے بھاگتا رہا تو میرے ہاتھ غم کے سوا کچھ نہ آیا۔ جب میں نے زندگی کو

اپنا نا چھوڑ دیا تو اُمید کی ایک کرن نے پھر سے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔“

☆.....

آج خاور خلاف معمول بجا بجا سا تھا۔ میرے پاس سے گذرتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا، مگر

اس کی مسکراہٹ میں بھی اداسی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کا اداس چہرہ مجھے اچنبھے میں مبتلا کر رہا تھا۔ کیا یہ شخص بھی اداس ہو سکتا

ہے؟ اسے کون سا دکھ غمکین کر رہا ہے، مجھے کریدی لگ گئی۔ سیر ختم کر کے آئی تو وہ اسی بیخ پر گم صم بیٹھا تھا۔ نہ جانے کن

سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔

”ہیلو!“ میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا!“ میں نے استفسار کیا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے پھیکسی سی مسکراہٹ سے مختصر جواب دیا۔

”لگ تو نہیں رہا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔“

”نہیں تو، پریشانی کیسی۔“ وہ ابھی تک میری طرف دیکھنے سے احتراز کر رہا تھا۔

”بیگم سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟“

”یہ کون سی نئی بات ہے۔ روز کا معمول ہے۔“

”روز کا معمول ہے تو کیوں خود پر سوار کر رہے ہیں۔ آپ کو تو عادی ہو جانا چاہیے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔

میں شاید اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا آپ عادی ہو گئی ہیں؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا تو میں گڑبگڑا گئی۔

میری خاموشی کو دیکھ کر پھر بولا۔ ”شاید نہیں۔ انسان جتنا بھی بے حس ہو جائے، اپنی انا کو، غیرت کو مار لے، مگر پھر بھی زبان کی کاٹ دارد دھار سے خود کو زخمی ہونے سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ دنیا کے کسی بھی ہتھیار کا زخم جسم پر لگتا ہے تو وقت کا مرہم آہستہ آہستہ اسے مندمل کر کے مٹا دیتا ہے۔ مگر الفاظ جسم پر نہیں، براہ راست دل اور روح پر وار کرتے ہیں۔“ وہ چپ ہو گیا۔ اس کو اس قدر ملول دیکھ میرا دل کٹنے لگا۔ دونوں کا دکھ سا بچھا تھا۔ وہ بھی شاید میری طرح الفاظ کی تلخی، کاٹ اور ترشی کا سامنا کرتا تھا۔ الفاظ کے نیزوں سے دل کیسے زخمی ہوتے ہیں، یہ مجھ سے بہتر بھلا کون جانتا تھا۔

”آپ کو دیکھ کر کبھی مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ آپ کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں۔“ میں گہرے دکھ سے بولی تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کئی دفعہ غم کا مکروہ چہرہ چھپانے کے لیے اس کے اوپر مسکراہٹ کا نقاب چڑھانا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہر کسی کے سامنے دکھڑے سا کر ہمدردی سمیٹنا میری عادت نہیں۔“ وہ تلخی سے بولا۔
 ”اور اگر کوئی مخلص اور ہمدرد دوست ہمدردی جتنا چاہے تو؟“
 ”آج کے زمانے میں ہمدرد اور مخلص دوست کہاں ملتے ہیں۔“
 ”اگر کوئی مل جائے تو؟؟“

”تو.... میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“ وہ میری بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا شاید۔

”تو پھر آج سے ہماری دوستی پکی۔“ میں مسکرائی۔

وہ حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”مگر آپ تو اس بات پر بہت ناراض ہوئی تھیں۔“

”شاید مجھے بھی ایک مخلص اور ہمدرد دوست چاہیے۔ جس کی سوچ عامیانا نہ ہو۔ جو دوستی کے خوبصورت اور مقدس رشتے کو پامال نہ کرے۔“

”میں آپ کی اُمیدوں پر پورا اتروں گا انشاء اللہ۔ آپ کے عزت و احترام میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دوں گا۔“

وفا پر جذبات سے اس کا چہرہ تھمتانے لگا۔ چند لمحوں پہلے والی اداسی کا نور ہو گئی۔

”مجھ سے ایک وعدہ کریں۔“ میں پھر بولی۔

”جی فرمائیے۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

”ہماری یہ دوستی ہمیشہ دوستی رہے گی۔ دوستی کی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھے گی۔ ہمارا یہ معاشرہ اور مذہب عورت

اور مرد کے مابین دوستی کے رشتے کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہمیشہ اس رشتے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔“

”آپ جیسا چاہتی ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ میں کبھی اپنی حدود و قیود سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ آپ کی

حرمت میرے لیے ہر چیز سے زیادہ مقدم ہوگی۔“ وہ پختہ عزم سے بولا۔ اس کی ہر بات سے سچائی پھلک رہی تھی۔

”اب چلیں۔“ میں نے پوچھا۔

”کہاں؟“ وہ بھولپن سے بولا۔

”اپنے اپنے گھر اور کہاں۔“

”جہاں شریک سفر اپنی پسند کا نہ ہو، محبت کرنے والا نہ ہو، اس کو آپ گھر کہتی ہیں۔“
 ”یہ مت بھولیں کہ شریک سفر محبت کرنے والا نہیں مگر بچے تو ہیں نا محبت کرنے والے اور اتنی محبت کرنے والے
 بچوں کے ساتھ زندگی بخوشی گزاری جاسکتی ہے۔“ میں اٹھتے ہوئے بولی۔
 ”بھئی عجیب ہی منطق ہے آپ کی۔“ وہ بولا۔

اور ہم ندی کے دو کناروں کی طرح ساتھ ساتھ چل پڑے۔ جو ساتھ چلتے ہوئے بھی مل نہیں پاتے۔

.....☆.....

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بچے کمپیوٹر کے آگے بیٹھے کوئی ویڈیو گیم کھیل رہے تھے۔ جبار، غفار کے ہاں
 چلے گئے تھے اور میرے لیے یہ سنہری موقع تھا یعنی لکھنے کا۔ میں کافی عرصہ سے شروع کیا گیا اپنا ناول لکھ رہی تھی، جواب
 اختتامی مراحل میں داخل ہو گیا تھا۔ اتنے میں ڈورنیل کی آواز سنائی دی۔

دو تین منٹ بعد دوسری نیل کی آواز سنائی دی تو میں نے آواز دی۔ ”شاہ زیب، زوہیب باہر دیکھو کون آیا
 ہے۔“

میری آواز سن کر دونوں میں بحث چھڑ گئی کہ دروازہ کھولنے کون جائے گا۔ آخر ہمیشہ کی طرح شاہ زیب نے ہی
 ہار مانی اور وہ دروازہ کھولنے گیا۔ میں لاؤنج میں بیٹھی لکھ رہی تھی، اس لیے اُن کی نقل و حرکت اور بحث و تکرار پر با آسانی نظر
 رکھے ہوئے تھی۔

چند لمحوں بعد شاہ زیب اندر آیا اور ڈرائنگ روم میں ٹھس گیا۔ اس کی لائٹ جلائی اور بیرونی دروازہ کھول کر کسی
 کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر آیا۔

”امی ایک کپ چائے بنا دیں۔“

”کون آیا ہے؟“ مجھے تجسس ہونے لگا۔

”خاور بھائی آئے ہیں۔ وہ کولڈ ڈرنکس نہیں پیتے۔“

میرا دل دھڑک اٹھا۔ بڑی تیزی سے یہ بندہ مسافتیں طے کر رہا ہے۔ میں کچن میں چائے بنانے لگی تو شاہ
 زیب پھر سے آیا۔

”امی چائے میں چینی نہ ڈالیے گا۔ انہیں ذیابیطس ہے پھینکی چائے پیتے ہیں اور ہاں پتی تھوڑی تیز۔“

”کوئی اور بات..... تمہیں تو بہت معلومات ہیں ان کے متعلق۔“

”یہ ہدایات انہوں نے ابھی ابھی دی ہیں۔“ شاہ زیب ہنستے ہوئے بولا۔ ”اچھا میں ان کے پاس جا کر بیٹھ رہا

ہوں۔ چائے تیار ہو جائے تو ڈرائنگ روم کا دروازہ ناک کیجئے گا میں آکر لے جاؤں گا۔“

وہ چلا گیا تو میں سوچنے لگی آج خاور پہلی بار ہمارے گھر آیا ہے، صرف ایک کپ چائے۔ اگر بچوں سے کہوں کہ
 بیکری سے دیگر لوازمات لے آئیں تو وہ سوچ میں پڑ جائیں گے اور اپنی ذات کو مشکوک بنانا مجھے کسی صوت گوارہ نہ تھا۔
 چنانچہ یہی مناسب لگا کہ خانی چائے ہی ٹھیک رہے گی۔

میں نے چائے کپ میں انڈلی۔ کپ ٹرے میں رکھا اور ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کے آگے جا

کھڑی ہوئی۔ اندر سے شاہ زیب اور زوہیب کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ خاور بس ہوں، ہاں میں مختصر جواب دے رہا تھا۔ لگتا ہے موصوف بچوں سے زیادہ فری ہونے کے قائل نہیں۔ میں نے آنہنگی سے دروازے پر ناک کی، اندر خاموشی چھا گئی۔ شاہ زیب نے دروازہ کھولا میرے ہاتھ سے چائے پکڑی اور دروازہ بند کر لیا۔ میں چند ثانیے وہاں کھڑی رہی پھر باہر آ گئی۔ شاہ زیب کے کمرے میں جھانکا، وہاں اب فاریہ کمپیوٹر کے ساتھ مصروف تھی اور بہت خوش بھی تھی کیونکہ ویسے تو اس کی باری آنے والی نہیں تھی۔ مہمان کے آجانے سے دونوں بھائی چلے گئے اور اسے کمپیوٹر کا حق ملکیت مل گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد خاور رخصت ہوا اور دونوں بھائی اندر آئے۔ میں بظاہر لکھنے میں مصروف تھی مگر حقیقتاً اب لکھنے میں دل بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

”چلا گیا مہمان۔“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”ہاں خاور بھائی چلے گئے۔“ زوہیب حلاوت گھلے لہجے میں بولا۔

”کیا باتیں ہو رہی تھیں اندر؟“

”بہت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں خاور بھائی۔“ زوہیب پھر جوش سے بولا۔ ”دنیا بھر کی معلومات جیب میں لیے

پھرتے ہیں۔“

”اچھا جی.....“ میں ہنستے ہوئے بولی۔ حالانکہ یہ بات میں بخوبی جانتی تھی۔

.....☆.....

دوسری صبح خاور میرے ہاتھ بیٹھا مجھ سے گلہ کر رہا تھا۔

”بھئی حد ہو گئی بے مروتی کی۔ میں آپ کے گھر گیا اور آپ مجھ سے ملی تک نہیں۔“ آج وہ اپنے پرانے موڈ

میں واپس آچکا تھا اور خوب چہک رہا تھا۔

”کیا واقعی آپ مجھ سے ملنے گئے تھے۔“ میں حیرت سے بولی۔ ”مگر ہم تو ہر روز صبح ملتے ہیں۔“

”چلیں چھوڑیں..... بات تو یہ ہے کہ بقول غالب۔

نکلنا غلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

میں ہنسنے لگی پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”خاور بچوں کے سامنے ہم دونوں آزادانہ کھل مل نہیں سکتے۔ ان کے سامنے

ہمارے درمیان ہمیشہ ایک جھجک اور ایک حجاب برقرار رہے گا۔“

”اوکے نیم.....“ وہ تعظیم سے سر جھکا کر بولا۔ ”آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہوگی۔ بندہ تو غلام ہے اور غلام کا کام ہے

اپنے آقا کا حکم ماننا۔“

میں پھر سے ہنسنے لگی۔ ”آپ واقعی بہت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں۔ باتوں میں آپ سے کوئی نہیں جیت سکتا۔

اچھا یہ بتائیں اس دن کون سی بات رہ گئی تھی۔ اتنا تو نئی نسل کا مذاق اڑایا تھا کیا ابھی کوئی کسر باقی ہے۔“

”اوہ ہاں، اس دن واقعی موضوع کچھ ادھر ادھر سا رہ گیا تھا۔ میں اپنی بات کو وہیں سے جوڑتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ

رہا تھا کہ موبائل اور انٹرنیٹ پر یومیہ محبت کرنے والے محبت کے اس آزار سے بھی آزاد ہوتے ہیں کہ۔

محبتوں میں عجب ہے دلوں کا دھڑکا سا

نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

حقیقت تو یہ ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ پر پنپنے والی محبت فقط دھوکا ہے۔ جس شخص کو آپ نے دیکھا تک نہ ہو اسے جانتے نہ ہوں۔ اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسی محبتیں کڑھی کے اُبال کی طرح ہوتی ہیں، جس گرم جوشی سے اوپر کو اٹھتی ہیں اسی تیزی سے نیچے بیٹھ جاتی ہیں۔ مذہبی نقطہ نظر سے بھی یہ غلط ہے اور کسی معاشرے کی اخلاقی گراؤ کا کھلا ثبوت ہے۔ بد قسمتی سے ہمارا میڈیا ڈراموں اور اشتہارات کے ذریعے بے حیائی کے اس پہلو کو بڑھا رہا ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”آپ جب کسی موضوع پر بولتے ہیں تو مقرر لگتے ہیں۔ خوب زور و شور سے بولتے ہیں۔ اتنا کہ سننے والا متاثر ہونے لگتا ہے۔“

”میں آپ سے آپ کی رائے پوچھ رہا ہوں۔“ نہ جانے کیوں وہ کبھی کبھی ضدی سا لگتا تھا۔ اپنی ضد پراڑ جاتا تھا۔

”میں یہ بات بڑے انفسوس سے کہوں گی کہ ہماری نئی جزییشن کی ترجیحات میں محبت دوسرے بلکہ اکثر صورتوں میں تیسرے نمبر پر چلی گئی ہے۔ آج کل تو باقاعدہ سوچ سمجھ کر اور آپشن رکھ کر محبت کی جاتی ہے۔ ہماری آج کل کی نسل بہت مادہ پرست ہو گئی ہے۔ وہ سب سے پہلے اگلے بندے کا اسٹیٹس، جاب اور کوالیفیکیشن دیکھتی ہے پھر پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے۔ اور بعض صورتوں میں ”اسٹیٹی“ کی صورت میں ایک بندہ ریز روکھا جاتا ہے۔ ہمارے دور میں ”انے وا“ محبت کا جو رجحان تھا، وہ اب بدل چکا ہے۔

”میری ایک دوست گزرا کالج کی پروفیسر ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ آج کل کی لڑکیوں کے خیالات سن کر وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ کالج میں سیل فون پر پابندی ہے اور اس وجہ سے جو موبائل ان کے ہاتھ لگتے ہیں ان کا پوسٹ مارٹم کرنے پر نہ چلتا ہے کہ ایک محترمہ، ایک ہی وقت میں چار چار لوگوں سے عشق فرما رہی ہیں۔ سیل فون کی محبتوں کو میں پانی کے بلبلے سے تشبیہ دوں گی۔ جو ایک لمحے کو غنی ہیں اور پھر ختم ہو جاتی ہیں۔ ویسے بھی مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں کہ ایک فائل دل کی بھی ہوتی ہے۔ جس میں ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ کتاب نہیں رہتی بلکہ انسائیکلو پیڈیا بن جاتی ہے۔“ بلاشبہ یہ اعزاز موبائل اور انٹرنیٹ کے حصے میں آتا ہے کہ اس نے کتاب محبت کو محبت کا انسائیکلو پیڈیا بنادیا۔ میں خاموش ہوئی تو وہ بولا۔

”بہت خوب، آپ بھی کسی مقرر سے کم نہیں۔ ویسے آج کل کی محبت دیکھ کر میاں مجنوں اور بے چارے رانجھے کو روہیں تڑپتی ہوں گی۔ سوچتے ہوں گے کہ خواہ خواہ محبت میں اس قدر ذلیل و خوار ہوئے۔ آج کے زمانے میں پیدا ہوتے تو محبوب بھی دسترس میں ہوتا اور جان بھی رائگاں نہ جاتی۔“

میں اس کا بے لاگ تبصرہ سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ایک بات پوچھوں؟“ وہ سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی پوچھیں۔“ اسے سنجیدہ دیکھ کر میں بھی سیریس ہو گئی۔

”آپ کا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 ”جی..... کیا مطلب؟“ میں حیران ہوئی۔ ”بھی اتنی دیر سے محبت پر ہی توروشتی ڈال رہی تھی۔“
 ”پہلی نظر کی محبت کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟ کیا ایک ہی نظر میں کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟“
 ”ہوں..... میرے خیال میں نہیں.... جس بندے کو انسان جانتا نہ ہو، سمجھتا نہ ہو، اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔“

”تو آپ کے خیال میں یہ ایک اختیاری جذبہ ہے جو باقاعدہ سوچ کر سمجھ کر پیدا کیا جاتا ہے، خود بخود پیدا نہیں ہوتا۔“

اس کی بات سن کر میں لا جواب سی ہو گئی۔
 ”اس بارے میں میرا نظریہ آپ سے مختلف ہے۔“ وہ پھر بولا۔ ”یہ وہ جذبہ ہے جس پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ کوئی بھی انسان کسی وقت، کسی بھی عمر میں اس جان لیوا روگ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔“
 میں چپ رہی تو وہ پھر بولا۔
 ”ایک بالکل ذاتی سوال آپ سے کر سکتا ہوں؟“
 ”جی کریں۔“ میں جھجکتے ہوئے بولی۔ اب یہ بے باک آدمی پتا نہیں کیا پوچھ بیٹھے۔ ایک دھڑکا سادل کو لگ گیا۔

”آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“ اس بار وہ بھی جھجکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 اس کا سوال سن کر میں سن رہ گئی، پھر سنہلنے ہوئے بولی۔ ”یہ کیسا سوال ہے؟“
 ”اگر آپ جواب نہ دینا چاہیں تو کوئی زبردستی نہیں۔“
 ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میری شادی اس عمر میں ہو گئی تھی، جب میں محبت کا مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے بعد گھر اور بچوں میں ایسی الجھی کہ کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا اور اب تو ایسی باتیں سوچنے کی عمر ہی نکل گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا ایسی باتوں پر یقین ہی نہیں۔ یہ باتیں صرف کتابوں میں یا پڑھنے سننے کی حد تک اچھی لگتی ہیں۔ حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔“ میں قطعی لہجے میں بولی۔

”آپ نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی، اس لیے ایسا بول رہی ہیں۔ اس تپش میں جلنے کا مزہ ہی جانتا ہے جس نے آگ کے اس دریا کو ڈوب کر پار کیا ہو۔“ وہ کھویا کھویا سا کہہ رہا تھا۔
 میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم خلاؤں میں تک رہا تھا۔ ایک درد سا اس کے چہرے پر آکر ٹھہر گیا تھا۔

لگتا ہے یہ شخص محبت کا ڈسا ہوا ہے۔ یہ افسردگی، یہ درد بے وجہ تو ہرگز نہیں۔ میں سوچنے لگی۔
 ”جو سوال آپ نے مجھ سے کیا تھا، وہی سوال میں آپ سے کر سکتی ہوں۔“ میں اکتاتے ہوئے بولی تو وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔
 ”کیسا سوال؟“

”یہی کہ آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے یا یہ کہ آپ کو کسی سے محبت ہوئی ہے؟“ میں نے فوراً اپنی بات کی توصیح کی کیونکہ بقول اس کے محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔

اس کے لبوں پر ایک دکھ بھری مسکراہٹ ابھری۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”آپ کا کیا خیال ہے۔ اندازہ لگائیں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو محبت ہوئی ہے اور اس محبت کی ناکامی سے دل پر گہری چوٹ کھائے بیٹھے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں... ایسا ہی ہے۔“ وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔
”کون تھی وہ؟“

”چلیں چھوڑیں، کبھی فرصت کے لمحات میں بتاؤں گا۔ آج ویسے بھی کافی دیر ہو رہی ہے۔ یہ نہ ہو آپ کو اپنے مجازی خدا سے جھاڑ پڑ جائے اور میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے یہ مجھے گوارہ نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی کھڑی ہو گئی۔

☆.....

گھر پہنچی تو سبھی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ آج اتوار تھا۔ اتوار والے دن چھٹی ہونے کی وجہ سے بچے اور جبار لیٹ ہی اٹھتے تھے۔ چھٹی والی بات ذہن میں تھی اسی لیے آج خاور سے بھی بات چیت تھوڑی طویل ہو گئی تھی۔

میں کچن میں گئی۔ ایک بڑے مگ میں ایک لیٹر پانی لیا۔ اس میں دو لیٹروں کا رس اور دو چمچ شہد ملا کر پانی نیم گرم کیا اور گ اٹھائے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ اس عادت کو میں نے پچھلے چند سالوں سے اپنی روٹین میں شامل کر لیا تھا۔ سردی ہونی یا گرمی میں سیر سے واپس آکر یہ مشروب پیتی اور پھر بچوں کے ناشتے کا انتظام کرتی۔

میں مگ ہاتھ میں اٹھائے بیٹھی خاور کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ مگ سے پانی بھی پیتی جا رہی تھی۔
کتنا گہرا ہے یہ شخص۔ بظاہر لاابالی اور خوش باش نظر آنے والا، مگر اندر سے بہت غمزہ اور ٹوٹا بکھرا۔ ہر انسان کی شخصیت پتا نہیں کتنی تہوں میں لپٹی ہوتی ہے۔ ہر تہہ کے نیچے ایک نیا روپ اور ہر روپ پہلے سے مختلف۔

تھوڑی دیر خاور کے بارے میں سوچتی رہی۔ اب ہم دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار گر چکی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ اس کی باتوں سے، اس کے وجود سے مجھے اپنائیت کی خوشبو آتی۔ اس سے باتیں کر کے مجھے ذہنی اور قلبی سکون ملتا تھا۔ میرا من ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ وہ میرے لیے کڑکتی دھوپ میں مہربان سائے جیسا تھا۔ وہ میرے لیے ایک ایسا شجر تھا، جس کی شفیق چھاؤں تلے بیٹھ کر میں چند لمحے ٹھنڈک اور آسودگی کے حاصل کرتی تھی۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں اٹھ کر بچوں کے کمروں میں جھانک کر انہیں آوازیں دینے لگی۔ جبار بغیر آواز دیئے ہی اٹھ کر باہر آ گیا۔

”آج ناشتے میں کیا بنا رہی ہو؟“ وہ مندی مندی آنکھوں کو کھول کر پوچھ رہا تھا۔

”آلو کے پراٹھے۔“

”ایسا کرو.... ساتھ سوجی کا تھوڑا حلوہ بھی بنا لو۔“ اس نے آرڈر دیا۔
”ٹھیک ہے۔ بنا دوں گی۔“

پتا نہیں یہ بندہ اتنی بھاری بھر کم خوراک کیسے ہضم کر لیتا ہے۔ اس عمر میں بھی تین تین، چار چار پراٹھے اور ساتھ اتنے ہیوی بیٹھے بھی۔ میں دل میں سوچ رہی تھی اور ساتھ ساتھ ہاتھ چلاتے ہوئے ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔
بچے بھی ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ ناشتے کی ٹیبل پر آج ماحول خوشگوار تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آج جبار کا موڈ اچھا تھا۔

”بچوں کیا خیال ہے آج کہیں گھومنے نہ چلیں۔“ وہ بچوں سے پوچھ رہا تھا۔
”ہاں ہاں، ضرور چلیں گے۔ کیوں امی!“ فاریہ جوش سے بولی۔
”ابو! آج گاڑی میں ڈرائیو کروں گا۔“ زوہیب نے بھی اپنی فرمائش بتائی۔
”نہیں، گاڑی شاہ زیب ہی چلائے گا۔“ جبار بولا۔

نہیں ابو..... ہمیشہ بھائی ہی چلاتا ہے۔ آج میں چلاؤں گا۔
”چلو ٹھیک ہے، چلا لیتا، مگر دیکھنا ہم سب کو کہیں اور ہی نہ پہنچا دیتا۔“ جبار نے اس کی ضد کے آگے ہار مانتے ہوئے کہا۔

”ابو آپ بالکل فکر نہ کریں۔ شاہ زیب بھائی سے اچھی ڈرائیونگ کرتا ہوں میں۔“ وہ فخر سے گردن اکڑا کر بولا۔

میں بچوں کو خوش ہوتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آج کا سنڈے اچھا گزرے گا۔

☆.....

اگلی صبح مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو سر میں گرانی محسوس ہوئی اور جسم بھی بخار سے پھنک رہا تھا۔
واش روم سے فارغ ہو کر پھر سے لیٹ گئی۔

سات بجے تو میں نے جبار کو جھنجھوڑا۔ ”جبار اٹھیے۔ بچوں کو اٹھائیے وہ لیٹ ہو جائیں گے۔“
”کیوں؟ تمہیں کیا ہوا؟“ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ لگتا ہے بخار ہو گیا ہے۔“ میں نقاہت بھری آواز میں بولی تو اس نے میرے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ کے تصدیق کر دی کہ ہاں بخار تو ہے۔

”آپ ایسا کریں بچوں کو جگائیں اور پھر ممانی جان کو بلالائیں۔ وہ آپ تینوں کو ناشتہ کروادیں گی۔“
”اب امی اس عمر میں ہمیں ناشتہ بنا کر دیں گی۔ مہوش کو بلالانا ہوں۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا چپل میں پاؤں گھسیڑے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد باہر سے کھڑ پٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں مہوش کی بلند آواز سب سے نمایاں تھی۔ وہ یقیناً اپنے بھاری وجود کے ساتھ کچن سے ڈائننگ ٹیبل تک دوڑیں لگا رہی تھی۔ بچوں اور جبار کو بھیج کر وہ ہانپتی ہوئی میرے بیڈ روم میں آئی۔

”تمہیں آج کیا ہو گیا؟“ وہ مشکوک لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”دیکھ لو، تمہارے سامنے ہوں۔“

”ہاں جبار بھائی بھی بتا رہے تھے کہ تمہیں بخار ہو گیا ہے۔ چہرے سے بھی لگ رہا ہے۔ لال بھسوکا ہو رہا ہے۔“

اب تمہارے لیے کیا بناؤں۔ میرا مطلب ہے ناشتے میں کیا لوگی؟“

”ایک کپ چائے بغیر چینی کے اور ساتھ دو ابلے انڈے۔“

”اوکے.... ابھی بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ لڑھکتی لڑھکتی باہر چلی گئی اور ٹھیک دس منٹ بعد چائے کا گگ اور انڈے

لیے پھر سے حاضر تھی۔

”بھئی داہ.... آج تو تمہاری پھرتی کی داد دینی چاہیے۔ کیا تیزی دکھائی ہے۔“ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”خیر.... اب میں اتنی ست بھی نہیں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔ ”کچھ اور چاہیے تو بتا دو۔ میں ذرا گھر چکر لگانے جا

رہی ہوں۔“

”ہاں، پیناڈول کی ایک گولی لا دو۔“

وہ فٹ سے گولی لے کر آگئی۔

میں نے انڈے کھائے اور چائے سے گولی نگلی اور پھر سے لیٹ گئی۔

”جبار اور بچے چلے گئے کیا؟“

”وہ سب تو کب کے چلے گئے۔ اب دوپہر کو کیا کھاؤ گی؟ تمہارے لیے کوئی نرم غذا بنا دوں گی۔ جبکہ بچے اور

جبار بھائی ہمارے ہاں سے کھانا کھالیں گے۔“

”ایسا کرنا میرے لیے مونگ کی کھجڑی بنالینا۔“

”اوکے، بنا دوں گی۔ میں اب جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد چکر لگاؤں گی۔“ وہ جانے کے لیے دروازے کے

پاس پہنچی تو میں نے آواز دی۔

”مہوش....“

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ پیچھے مڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”شکریہ....“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”ارے.... ارے.... کس بات کے لیے؟ یہ تو میرا فرض بنتا ہے، اس آل رائٹ۔“ پہلی بار وہ مسکرائی۔ وہ چلی

گئی تو میں نے آنکھیں موند لیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھوں کی جگہ دو انگارے دکھ رہے ہوں۔

اتنے میں میرے سیل فون کی بیل ہوئے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔ دیکھا تو کوئی آن فون نمبر جگمگا رہا

تھا۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے کال ڈس کنیکٹ کر کے فون رکھ دیا۔ بیل پھر سے ہونے لگی۔ اب ٹیون میں واضح پیغام

چھپا ہوا تھا کہ یہ ریسو کیے بغیر بند نہیں ہوگی۔ میں نے فون اٹھایا۔ وہی نمبر تھا، جس سے کال آرہی تھی۔

میں نے کال ریسو کر کے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف خاور کی آواز سن کر دنگ رہ گئی۔ وہ مجھ سے

میرا احوال پوچھ رہا تھا۔

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے مل گیا؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے موبائل نمبر کیا چیز ہے۔“ وہ حسبِ عادت شوخ ہو رہا تھا۔

”بتائیے نا، کیسے ملا میرا نمبر۔“

”بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے بتایا تو ہو سکتا ہے آپ ناراض ہو کر فون بند کر دیں، اس لیے پہلے یہ بتائیں کہ آپ کی

طبیعت کیسی ہے؟ آج سیر کرنے کیوں نہیں آئیں؟“

”میری طبیعت آج کچھ نا ساز ہے۔ کوئی سیر لیس بات نہیں۔ معمولی سا بخار ہو گیا ہے۔“

”اوہ..... دیری سیڈ..... آج صبح سے میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ برا ہونے والا ہے اور دیکھئے ہو گیا۔“

”کیا برا ہو گیا، کچھ نہیں ہوا۔ معمولی بخار ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ گئے تھے سیر کے لیے۔“

”ہاں گیا تھا۔ بے دلی سے تھوڑی جاگنگ کی اور واپس آ گیا۔ آج وہاں دل ہی نہیں لگا۔“

”آپ وہاں دل لگانے جاتے ہیں یا واک کرنے۔“ میں اس کی بات کی تہہ تک با آسانی پہنچ گئی تھی اس لیے

چھیڑنے کو بولی۔

”اگر واک کے ساتھ ساتھ دل بھی لگا رہے تو سونے پہ سہاگہ۔ واک کی افادیت ڈبل ہو جاتی ہے۔“ وہ برجستگی

سے بولا۔

کس قدر حاضر دماغ ہے یہ شخص۔ میں دل میں مسکرائی، پھر بات بدلنے کی خاطر بولی۔

”آپ سنا لیں، کیا کر رہے ہیں اس وقت؟“

”ابھی ابھی آکر دفتر میں بیٹھا ہوں۔ سوچا پہلے اپنی پیاری سی دوست کی خیریت دریافت کروں اور واک کے

لیے نہ آنے کا سبب جان سکوں اور آپ اس وقت کیا کر رہی ہیں؟“

”میں اس وقت آپ سے فون پر بات کر رہی ہوں۔“

اس نے قہقہہ لگایا۔ ”بہت خوب..... اس کے علاوہ....“

”کبھی کبھی عجیب سوال کرتے ہیں آپ۔ ایک بیمار انسان کیا کرے گا۔ بستر پر لیٹی آرام کر رہی ہوں۔“

”کوئی دوا لی کہ نہیں؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔

”ایک گولی پینا ڈول کی لی ہے۔ شام تک انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بہت ڈھیٹ ہوں میں مجھے کچھ

نہیں ہونے والا۔“

”اللہ آپ کی عمر دراز کرے، آپ کو کبھی کچھ نہ ہو۔“

”سچ کہہ رہی ہوں۔ میں بہت کم بیمار ہوتی ہوں۔ میجر بیماری تو کوئی ہے نہیں۔ شوگر، بلڈ پریشر، ہیپاٹائٹس وغیرہ

وغیرہ سے کوسوں دور ہوں۔ نزلہ زکام وغیرہ مجھے کبھی نہیں ہوئے۔ ہاں کبھی سال دو سال بعد بخار ہو جاتا ہے۔ اسے

اتارنے کے لیے بھی زیادہ تر دوائیں کرنا پڑتا۔ اپنے حصے کی زکوٰۃ لے کر شرافت سے اتر جاتا ہے۔“

”آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ رشک آ رہا ہے مجھے آپ پر۔“

”ہاں، کم از کم اس معاملے میں تو ہوں۔“

”یہ بہت بڑی بات ہے۔ دنیا میں تندرستی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ اس کی قدر کسی بیمار سے پوچھیں۔“ نہ جانے کیوں مجھے اس کے لہجے میں ایک کرب سا محسوس ہو رہا تھا۔

”ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس عمر میں عموماً لوگ کئی بیماریوں میں گھر جاتے ہیں۔ آپ سنائیں، ان آفات سے بچے ہوئے ہیں نا!“

”میری جان کو ایک ایسا روگ لگا ہوا ہے، جو جان لیوا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تو میں چونک اٹھی۔

”کیسا روگ؟“ میں بے تابی سے بولی۔

۔ ”نہیں ہوتا کسی طبیب سے بھی اس مرض کا علاج
عشق لا علاج ہے بس احتیاط کیجئے“

اس نے فراز احمد فراز کا یہ شعر سنایا تو میں سمجھ گئی کہ وہ کون سے روگ کی بات کر رہا ہے۔

”کیا بہت محبت کرتے تھے اس سے؟ وہ آپ کی زندگی سے نکل کیسے گئی؟ آپ دونوں کے ملن میں کیا چیز رکاوٹ بنی تھی؟ ظالم سماج یا پھر اسٹیٹس کی اونچی دیوار۔“

”ان میں سے کوئی بھی نہیں۔“ وہ ہنسا۔

”تو پھر آپ بچھڑے کیسے؟“ میں بہت حیران ہوئی۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کسی دن فارغ وقت میں سناؤں گا اور ضرور سناؤں گا، یہ وعدہ رہا آپ سے۔ آپ سنائیں آپ کے کیا مشاغل ہیں؟ فارغ وقت میں کیا کرتی ہیں؟ کیا چیزیں پسند ہیں؟ کن باتوں کو ناپسند کرتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔“

”ایک ہاؤس وائف کی زندگی میں فارغ وقت بچتا ہی کتنا ہے۔ بہر حال جب بھی وقت ملتا ہے میں مطالعہ کرتی ہوں۔ اچھی موسیقی سے لطف اندوز ہوتی ہوں یا پھر کبھی کبھار لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔“

”آپ لکھتی ہیں۔“ وہ جوش سے بولا۔ ”یعنی آپ لکھاری ہیں۔ مجھے لکھنے اور پڑھنے والے لوگ بہت پسند ہیں۔ میں خود مطالعے کا بہت شوقین ہوں۔ ہر اچھے شاعر اور مصنف کو پڑھ چکا ہوں۔ فراز احمد فراز میرے فیورٹ شاعر ہیں۔ ان کا ہر شعر مجھے یاد ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اقبال اور مرزا غالب بہت پسند ہیں۔ آپ کیا لکھتی ہیں؟ میرا مطلب ہے ادب کی کس صنف لکھتی ہیں؟“

”میں ناول لکھتی ہوں۔ اب تک دو لکھ چکی ہوں۔ اس کے علاوہ چھوٹے موٹے افسانے لکھ کر ڈائجسٹوں وغیرہ میں بھیجتی رہتی ہوں۔“

”جو دو ناول لکھے ہیں وہ کس موضوع پر ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”دونوں رومانوی ہیں۔ ویسے میرے شوہر کو میرا یہ شوق ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ میرے لکھنے اور پڑھنے کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک میں وقت ضائع کرتی ہوں۔“

”مجھے ترس آ رہا ہے آپ پر۔ جبار جیسے آدمی کی بیوی ہونا آپ کے لیے بڑی زیادتی کی بات ہے۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ”مجھے لگتا ہے اس میں فنون لطیفہ سے دلچسپی کی کوئی حس موجود نہیں۔“

فنون لطیفہ کیا، اس میں کوئی بھی حس موجود نہیں۔ ہر معاملے میں بے حس ہے۔ میرے دل کی بات زبان پر آتے آتے رہ گئی۔

”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ نے ایسے انسان کے ساتھ عمر کیسے گذاردی؟“
 ”بس گزار ہی دی جیسے تیسے کر کے۔ زیادہ گذر گئی ہے، تھوڑی رہ گئی ہے وہ بھی گذر ہی جائے گی۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اپنی ان آنکھوں سے بہت بے جوڑ شادیاں دیکھی ہیں، مگر آپ دونوں میاں، بیوی تو ہر معاملے میں ایک دوسرے کا آپوزٹ ہوں۔ چلیں چھوڑیں اس بات کو۔ یہ بتائیں کس بات کو ناپسند کرتی ہیں؟“
 ”جھوٹ، مکروفریب اور ریاکاری سے سخت نفرت ہے خصوصاً جھوٹ تو کسی صورت برداشت نہیں ہوتا۔ جو دل میں آتا ہے فوراً زبان سے کہہ دیتی ہوں، آپ کی طرح۔ شاید آپ کی یہی خوبی مجھے بھاگنی اور میں آپ کے اتنا قریب آ گئی۔“

”کتنا قریب؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”میرا مطلب ذہنی قربت سے تھا۔“ میں شپٹائی۔

”اوہ.... ہاں.... ذہنی ہم آہنگی تو ہم میں بہت زیادہ ہے۔ ہم دونوں کی ہر عادت حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے سے ملتی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم شاید ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ غلطی سے غلط لوگوں میں پھنس گئے۔“ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا اور میں شرم سے لال ہو گئی۔

فوراً بات بدلنے کے لیے بولی۔ ”اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ نے میرا نمبر کہاں سے لیا تھا؟“

”ارے آپ کی سوئی تو ابھی تک وہیں انگی ہوئی ہے، تو سنیں جناب۔ ایک دن پارک میں آپ ایک خاتون سے مصروف گفتگو تھیں۔ میں نے چپکے سے آپ کا موبائل اٹھایا جو وہیں بیچ پر پڑا ہوا تھا۔ آپ کے موبائل سے اپنے فون پر مس کال کی اور موبائل وہیں رکھ دیا۔ اس طرح آپ کا نمبر میرے موبائل پر آ گیا۔ اتنی ہی بات ہے۔“

”ارے.... آپ تو بہت خطرناک آدمی ہیں۔ آپ سے بچ کر رہنا چاہیے۔“ میں ہنسی۔

”اچھا یہ بتائیں کہ آپ کی تیمارداری کے لیے کوئی ہے کہ میں آ جاؤں۔“ وہ پھر سے شوخ ہوا۔

”میری بہن ہے نا! مجھے کسی اور کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”اچھا.... وہ موٹی.... ہاں بھئی بہن بھی ہے دیورانی بھی ہے۔ ڈبل، ڈبل رشتے ہیں تو خدمتیں بھی تو ڈبل ہی

کریں گی نا۔“

”اس کا نام مہوش ہے، موٹی نہیں۔“ مجھے اس کے اندازِ مخاطب پر غصہ آ گیا۔

”آپ اس روپ میں بھی اچھی لگتی ہیں۔“ وہ لطف لیتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ کو ہنستے اور مسکراتے ہوئے تو بہت دفعہ دیکھا تھا۔ سوچا آج غصے کی حالت میں بھی دیکھ

”کیا آپ کے فون پر میری تصویر بھی آرہی ہے؟“

”فون پر تو نہیں، تصویر کی آنکھ سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔“

”اچھا..... اب فون بند کرتے ہیں۔ کافی لمبی کال ہو گئی ہے۔“

”کیا تھک گئی ہیں..... اوہ میرے ذہن میں نہیں رہا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے اور آپ کو آرام کی ضرورت

ہے۔ اوکے..... بائے..... اپنا خیال رکھیے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

میں موبائل ہاتھ میں پکڑے کتنی دیر مسکراتی رہی۔

☆.....

شام تک میری طبیعت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ آج کے دن کا بڑا حصہ میں نے بستر پر آرام کرتے گزارا

تھا۔ مہوش نے خالہ اور چاچی ہونے کا فرض بخوبی ادا کیا تھا۔ چاہے چارونا چارہ ہی کیا تھا۔

سارا دن بچوں کے کھانے پینے کا ذمہ بھی اٹھایا تھا اور وقفے وقفے سے میری خیریت بھی دریافت کرتی رہی

تھی۔ شام کو جبار آفس سے آئے۔ مجھے بیڈ پر لیٹا دیکھ کر پوچھنے لگے۔ ”کیا بات ہے ابھی تک پڑی ہوئی ہو۔“ لہجے میں وہی

درشتی، حالانکہ یہ بات وہ نرمی سے بھی پوچھ سکتا تھا۔ بلکہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ چلو اٹھو میرے ساتھ چلو، دوالے کر آتے ہیں۔

مگر وہ تو ایسے پوچھ رہا تھا جیسے بیمار ہونا بھی میرا جرم تھا۔ صبح دفتر جاتے وقت یہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ میری طبیعت

ناساز ہے مگر پورے دن میں اس نے ایک مرتبہ بھی فون کر کے نہیں پوچھا کہ اب طبیعت کیسی ہے۔

شروع شروع میں جبار کا یہ سرد رویہ بڑی تکلیف دیتا تھا، مگر آہستہ آہستہ میں اس رویے کی عادی ہوتی چلی گئی۔

اب میں اس سے زیادہ توقعات ہی نہیں باندھتی تھی۔ خود کو محبت کے سہاروں کے بغیر جینے کی عادت ڈال لی تھی۔ ویسے بھی

محبت میرے لیے ایک افسانوی لفظ تھا۔ جس کا میرے خیال میں حقیقتاً کوئی وجود نہیں تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں پیارا اور محبت

جیسے کسی جذبے سے قطعی نا آشنا تھی۔ جبار نے یہ رسی سا جملہ ادا کر کے گویا تمام فرائض ادا کر دیئے۔ وہ کمرے سے باہر نکل

گیا۔

اب یہ یقیناً کپڑے تبدیل کر کے مہوش کے گھر جا بیٹھے گا۔ وہاں کھانا کھانے کے بعد رات بارہ بجے تک محفل

بجے گی۔ خوب ہنسی مذاق ہوگا۔ جب نیند زور کرے گی تو گھر آ کر سو رہے گا۔ میرے متعلق سوچنے کی زحمت ہرگز نہیں کرے

گا۔ لاکھ بلند ہمتی کا دعویٰ کرنے کے باوجود میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ مجھے بے ساختہ خاور کی کہی ہوئی یہ بات یاد آ گئی۔

”انسان جتنا بھی بے حس ہو جائے۔ اپنی انا اور غیرت کو مار لے، مگر پھر بھی زبان کی کاٹ دار دھار سے خود کو

زخمی ہونے سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔“

سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیوار گیر کلاک رات کے نو بج رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھی، واش

روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ فاریہ کے کمرے میں جھانکا، وہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

”امی آپ کا بخارا تر گیا کیا؟“

”ہاں میری جان! اب بہتر ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”فاریہ تم نے کھانا کھالیا ہے۔“

”ہاں امی، میں نے اور بھائیوں نے کھانا کھالیا ہے۔ آنٹی مہوش کے گھر ہی کھایا تھا۔“

”اور آپ کے ابو نے؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”ابو نے بھی کھالیا ہے۔“

”تم گھر میں اکیسے ہو، باقی سب کہاں ہیں؟“

”وہ سب وہیں ہیں۔ میں نے ہوم ورک کرنا تھا اس لیے آگئی۔ وہ لڈو کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے۔“ فاریہ نے

پوری معلومات مہیا کی اور میں اس کا دروازہ بند کر کے کچن میں آگئی۔ ایک مگ چائے کا تیار کیا اور ساتھ دو پاپے لے کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ پاپے کھا کر اور چائے پی کر پینا ڈول کی ایک گولی نگلی اور باہر لان میں آگئی۔ سر سبز گھاس پر چہل قدمی کرنے لگی۔

یہ ہمارا اور مہوش کا مشترکہ لان تھا، اس لئے خاصا وسیع تھا۔ بیرونی گیٹ اور پورچ الگ الگ ہونے کے باوجود لان سا نجھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سارا دن دونوں طرف کے افراد بنا کسی رکاوٹ کے ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے۔ رات بارہ بجے تک کسی ایک گھر میں خوب محفل جیتی۔ لڈو کھیلی جاتی یا پھر تاش کے پتوں سے دل بہلایا جاتا۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا اور ہنسی کے فوارے بھی چھوٹتے رہتے۔ ماموں اور ممانی اپنی آل اولاد کو یوں کھلکھلاتا دیکھ کر کھل اٹھتے اور بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتے۔ جبار اور غفار دونوں بھائیوں کا آپس میں بہت پیارا اور اتفاق تھا۔ جبار بڑا ہونے کے ناتے اور سخت گیر طبیعت کی وجہ سے غفار کو اکثر کسی بات پر جھاڑ پلا دیتا۔ مگر غفار بڑے بھائی کا لحاظ کرتے ہوئے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتا۔ کبھی کسی موقع پر بدتمیزی اور بے ادبی کی جسارت نہیں کی۔ ہمیشہ بڑے بھائی کے عزت و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا۔ غفار ماموں پر گیا تھا۔ وہ ماموں کی طرح نرم دل، خوش مزاج اور خوش اخلاق تھا۔ جبکہ ہم دونوں بہنیں اپنے اپنے خاوندوں کے بالکل برعکس تھیں۔ مہوش آتش مزاج اور حاکمانہ طبیعت کی مالک تھی۔ غفار اس سے دب کر رہتا تھا۔ جبکہ میرا معاملہ الٹا تھا۔ ہاں البتہ میں جبار کی لاکھ کوشش کے باوجود اس سے دب کر نہ رہتی تھی۔ کبھی نہ کبھی کسی بات پر فٹ سے جواب دے دیتی تھی، مگر کبھی کبھاتہ بدینہ زیادہ تر میں اس کی کڑوی کسلی باتیں سن کر خاموش رہتی۔ اس کے ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ گھر کا ماحول کشیدہ نہ ہو جائے اس وجہ سے برداشت کر جاتی تھی۔ یہ تو ہر کوئی جانتا تھا کہ میاں بیوی کی لڑائی سے بچوں پر کتنا منفی اثر پڑتا ہے۔ ان کی ذہنی نشوونما میں کوئی نہ کوئی خلل رہتا ہے۔

میں تھوڑی دیر لان میں ٹہلتی رہی۔ مہوش کے گھر سے قہقہوں کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ میرے دل و دماغ

پر یاسیت سی چھانے لگی۔

چلو جبار تو سدا کا بے حس ٹھہرا، مگر میرے بچوں اور بہن کو تو میری فکر ہونی چاہیے تھی۔ بیٹے اب خیر سے جوان ہو چکے تھے۔ ان کو تو پوچھنا چاہیے تھا کہ امی چلیں ڈاکٹر کے پاس چلیں۔ میں نے سر جھٹکا۔ اس بخار نے مجھے زیادہ ہی نازک مزاج بنا دیا ہے۔ فضول سوچوں کو دماغ میں جگہ دے رہی ہوں۔ پچھلے دو گھنٹوں سے سوئی ہوئی تھی، یقیناً بیٹوں نے کمرے میں جھانکا ہوگا۔ مجھے سوتا دیکھ کر ڈسٹرب کرنا مناسب خیال نہ کیا ہوگا۔ بہن نے بھی ضرور ایک آدھ چکر لگایا ہوگا۔ اب ہے تو معمولی بخار ہی، اس سے زیادہ کیا میری کمزور کرتے۔

میں نے اندرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی آن کیا۔ چند منٹ چینل بدل بدل کر ٹی وی بند کر دیا۔ فاریہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ

ابھی تک پڑھ رہی تھی۔ پھر سے اپنے کمرے میں آگئی۔ بیڈ پر دراز ہو کر ایک ناول اٹھا لیا۔ اس کی ورق گردانی کرتے کرتے کوئی خیال آیا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا اپنا موبائل فون اٹھایا۔ وہ کسی نئے میسج کی آمد کی خبر دے رہا تھا۔ نمبر پڑھا تو خاور کا تھا۔ میں نے کھولا تو یہ خوبصورت شعر آنکھوں کے سامنے آگیا۔

جودل کے آئینے میں ہو وہی ہے پیار کے قابل فراز
ورنہ دید کے قابل تو ہر تصویر ہوتی ہے

فراز کا یہ شعر پڑھ کر میں مسکرانے لگی۔ میں نے اس کے اس خوبصورت ایس ایم ایس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ ایس ایم ایس ڈیلیٹ کیا، فون رکھا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆.....

اگلی صبح آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ جبار پاس ہی بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے کھلے منہ سے خراٹوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

میں ابھی، وضو کیا، نماز پڑھی پھر سورہ یٰسین کی تلاوت کرنے لگی۔ پھر سوچنے لگی آج سیر کرنے جاؤں کہ نہ جاؤں۔ طبیعت تو بالکل ٹھیک لگ رہی تھی، پھر میں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا یہ سوچ کر کہ مشقت کرنے سے کہیں پھر سے بیمار نہ پڑ جاؤں۔ ابھی ایک دو دن مکمل ریست کرنی چاہیے۔ میں نے خود کو سمجھایا اور باہر لان میں جا کر چہل قدمی کرنے لگی۔ چلتے چلتے میرے ذہن میں خاور کا خیال آگیا۔ وہ آج بھی میرا راستہ دیکھتا ہوگا۔ چلودیکھنے دو، اتنی انوائمنٹ بھی مناسب نہیں۔ تھوڑا دور، دور ہی رہیں گے تو ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔ ویسے بھی میرے دل میں اس کے لیے ایک اچھے اور مخلص دوست سے زیادہ کوئی جگہ نہیں تھی اور اس سے زیادہ کی مجھے خواہش بھی نہیں تھی۔ اب اس عمر میں، زندگی کے اس حصے میں خود کو مشکوک کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ اس ڈھلتی عمر میں کوئی اسکیڈنڈل یا افیئر میں انورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی ہمارے معاشرے میں عورت کے کردار پر ایک دفعہ کوئی دھبا لگ جائے تو وہ بے چاری ساری زندگی آنسو بہا کر اس دھبے کو دھو نہیں سکتی۔ جبکہ مرد ایسی غلطیاں بار بار کرنے کے باوجود پوری آن ہاں اور شان کے ساتھ گردن اکڑائے جیتا ہے۔ بلکہ بڑے فخر سے اپنے احباب کو اپنے معاشقوں کی تعداد اور تفصیلات سناتا ہے۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ مذہب میں دونوں کا جرم بھی برابر ہے اور سزا بھی۔ جبکہ ہمارے ہاں عورت سے کوئی چھوٹا موٹا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی سزا اس کی پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے اور اگر وہی گناہ کسی مرد سے سرزد ہو جائے تو نہ صرف بات کو بہت ہلکا لیا جاتا ہے بلکہ وہ ہر سزا اور طعنے سے بھی مبرا ہوتا ہے۔ اور کئی لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ بھی مردوں کی تو فطرت ہی یہی ہے، ادھر ادھر منہ مارنا۔ اب عورت کو تو اپنی عزت کی حفاظت خود کرنی چاہیے۔ یعنی عورت کو شرم و حیا کی دیوی بنا کر پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے اور مرد کو بے شرم بنا کر آزاد اور کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جاؤ جو جی میں آئے کرتے پھرو۔ تمہیں کھلی چھوٹ ہے، کیونکہ تم مرد ہو۔

لان میں پندرہ منٹ واک کرنے کے بعد میں اندر آئی اور ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔ بچوں اور جبار کو اٹھایا۔ میں کچن میں مصروف تھی جب مہوش نے جھانکا۔ ”لگتا ہے آج تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔ سارا کام خود کر لو گی کہ میں ہیلپ کر دوں۔“

”نہیں شکریہ۔ آج میں کافی بہتر ہوں۔“

”اوکے، میں چلتی ہوں۔ میں بھی ناشتہ تیار کرنے لگی تھی سوچا پہلے تمہاری خیر خیریت دریافت کر آؤں۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

بچے تیار ہو کر ناشتہ کر کے اپنے اپنے تعلیمی اداروں کو روانہ ہو گئے۔ اب جبار کا ناشتہ تیار کر کے ان کو روانہ کرنا تھا۔ جبار اس وقت لان میں ماموں اور غفار کے ساتھ بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ میں بھی ٹی وی لگا کر خبریں دیکھنے لگی۔ خبروں میں ایسی گم ہوئی کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ میں اس لیے بے فکری سے ٹی وی دیکھتی رہی کہ جب جبار نے اندر آنا ہے تو پہلے نہانا ہے پھر ناشتہ کرنا ہے، تو جب وہ نہانے کے لیے واش روم میں جائے گا میں اتنی دیر میں ناشتہ تیار کر لوں گی۔ کیونکہ وہ کبھی نہائے بغیر آفس نہیں جاتا تھا۔

حیرت تو مجھے اس وقت ہوئی جب اس نے اندر آ کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ لاؤ ناشتہ، جلدی کرو میں لیٹ ہو رہا ہوں۔

یہ سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ”ابھی بنا دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر کچن میں بھاگی۔

”بنا دیتی ہوں۔“ جبار نے میرے الفاظ دہرائے۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔ ادھر باہر آؤ۔“ وہ زور سے دھاڑا تو آنے کا بیڑا میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

”بس دو منٹ میں بنا دیتی ہوں۔“ میں منمنائی۔

”میں کہہ رہا ہوں باہر آؤ۔“ وہ اور زور سے گرجا۔ میں نے پیڑا پلیٹ میں رکھا۔ چولہا کم کیا اور باہر آ کر مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی ہو گئی۔

”میں نے تمہیں اپنا ناشتہ تیار کرنے کے لیے کیا نائم بتایا ہے؟“

”سوا آٹھ۔“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اب گھڑی کی طرف دیکھ کر بتاؤ کیا وقت ہوا ہے؟“

میں نے کلاک کی طرف دیکھا جو اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہا تھا۔

”ساڑھے آٹھ۔“ میں نے جواب دیا۔

”پندرہ منٹ لیٹ ہونے کی وجہ بتاؤ۔ تم کیسے اتنی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر سکتی ہو؟“

”وہ..... میں..... کبھی تھی پہلے آپ نہائیں گے پھر ناشتہ کریں گے۔“

”میرے نہانے سے تمہارے ناشتے کا کیا تعلق ہے؟“ اسے مجھے ذلیل اور بے عزت کرنے کا موقع مل گیا۔

”کان کھول کر سن لو۔“ وہ پھر سے گرجنے لگا۔ ”میں نہاؤں یا نہ نہاؤں۔ کچھ بھی کرتا رہوں تمہارا کام ہے پورے سوا آٹھ

بجے میرا ناشتہ تیار کر کے میز پر رکھ دینا۔ میرا جب جی چاہے میں کھاؤں۔ آئندہ سوا آٹھ سے ایک منٹ بھی اوپر نہیں ہونا

چاہیے، سنا تم نے۔“ اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی کھڑی کرتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت جبار کی شکل غصے سے مسخ ہو کر کہ یہہ النظر ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی لال آنکھیں ابل کر باہر آ گئی تھیں۔ اس

کے چہرے پر اپنے لیے بے پناہ نفرت دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”بولتی کیوں بند ہو گئی تمہاری۔ سنائیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

”سن لیا ہے۔“ میں زہر میں بچھے ہوئے لہجے سے بولی۔

اس نے میرے لہجے میں چھپی ہوئی تلخی کو محسوس کر لیا تھا، پھر سے بولنے لگا۔

”تمہاری یہ اکڑنوں میں ختم کر کے چھوڑوں گا۔ بڑا مان ہے نا تمہیں خود پر۔ ایک دن تمہارا سر قدموں پہ

جھکاؤں گا۔“

”بائیس سالوں میں تم مجھے جھکا نہیں سکے، اب کیا جھکاؤ گے۔“ میں استہزائیہ انداز میں بولی تو وہ پھٹ پڑا۔

”دفعہ ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ ایک منٹ میں میرا ناشتہ تیار کر کے لے آؤ۔“

میں کچن میں جا کر پراٹھے بنانے لگی۔ غصے سے میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس قابلِ نفرت انسان سے دُور چلی جاؤں۔ اتنی دور کہ جہاں سے یہ میری پرچھائیاں بھی نہ پاسکے۔ اس وقت مجھے جبار سے انتہائی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ جس نے بیماری کی حالت میں مجھے پوچھا تک نہیں تھا اور اب اتنی معمولی بات پر اتنی تضحیک کر ڈالی تھی۔ میں نے پراٹھے تیار کیے اور جا کر اس کے آگے بیچ دیئے۔ خود اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ رور و کر اپنے آنسوؤں سے تکیہ بھگونے لگی۔

”اندر کیا کر رہی ہو، باہر آؤ۔“ اس کی کرخت آواز کانوں سے ٹکرائی۔ میں سنی اُن سنی کر کے لیٹی رہی۔

وہ بکتا جھکتا ناشتہ کر کے تیار ہو رہا تھا پھر خاموشی چھا گئی۔ میں سمجھی شاید چلا گیا ہے۔ ابھی میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”میں نے تمہیں آواز دے کر باہر بلایا تھا۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور آنسو صاف کرنے لگی۔

”کیا کوئی مر گیا ہے جس کو یاد کر کے رور ہی ہو۔ اپنے بند دماغ کی کھڑکیاں کھول کر سن لو۔“ وہ پھر انگلی کھڑی کر کے بولا۔ ”آئندہ جب بھی مجھے کھانا یا ناشتہ دو تو میرے پاس اس وقت تک بیٹھنا ہے جب تک میں کھانا ختم نہ کر لوں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑے تو تمہیں آوازیں دے کر نہ بلانا پڑے، سمجھی تم۔“ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر دروازہ زور سے بند کر کے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بلند آواز میں رونے لگی۔ ہاں ہاں میں مرنے والوں کو رور ہی تھی، جو میری جان اس عذاب میں ڈال کر خود اپنی جان چھڑا کر چلے گئے تھے۔ میں اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رور ہی تھی۔ میں کافی دیر تک اونچی آواز میں روتی رہی۔ اپنی بلند ہمتی اور حوصلے کے باوجود کبھی کبھی میں جبار کے ظلم و ستم کے سامنے ریت کی دیوار کی مانند ڈھے جاتی تھی۔ پھر صبر برداشت کے سارے بندھ ٹوٹ جاتے تھے۔ پھر رو، رو کر اپنے اندر کی بھڑاس نکالتی۔ بہت سارا رو لیتی تو من شانیت ہو جاتا اور زندگی کی لگی بندھی روٹین میں پھر سے بھنور کی طرح چکرانے لگتی۔

آج بھی رو دھو کر صبر آ گیا تھا۔ اُٹھ کر باہر آ گئی۔ چائے کا کپ بنایا ساتھ دوپاپے لیے لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ چائے پی کر طبیعت کچھ پرسکون ہو گئی تھی۔ بے تحاشا رونے سے آنکھیں سوج گئی تھیں اور اب ان میں جلن سی ہو رہی تھی۔ میں بے دلی سے ٹی وی کے چینل بدل رہی تھی کہ میرے موبائل کی پیپ بجنے لگی۔

اٹھا کر دیکھا تو خاور کی کال آرہی تھی۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر کال انٹینڈ کر کے فون کان سے لگا لیا۔
”ہیلو!“

”السلام علیکم!“ اس کی آواز سنائی دی۔

”وعلیکم السلام۔“ میں نے سلام کا جواب دیا۔

”کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”بخار اتر نہیں ابھی کیا؟“

”اتر گیا ہے۔ آج بالکل صحت یاب ہوں۔“

”لگتا تو نہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”تو پھر آپ کی آواز آپ کے الفاظ کا ساتھ کیوں نہیں دے رہی؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ ہاں شاید میرا گلا خراب ہو گیا ہے۔“ میں نے بات بنائی۔

”افسوس کہ آپ کو جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا۔“ وہ پھسکی سی ہنسی ہنسا۔

”کیا مطلب؟ میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔“ میں کمزوری آواز میں بولی۔

”چلیں اب جلدی سے بتادیں کہ کیا ہوا ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“ میں ہنناک آواز میں بولی۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتیں۔“ اس نے شاید میری آواز میں گھلی نمی محسوس کر لی تھی۔

اس کے مسلسل استفسار پر میرا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔

”کیا شوہر نامدار سے جھگڑا ہوا ہے؟“

میں خاموش آنسو پیتی رہی تو وہ پھر بولا۔ ”سمجھ گیا، آج آپ نے پھر سے الفاظ کے نشتر اپنی روح پر سبے ہیں

اور اب ان زخموں کی تکلیف سے بلبلارہی ہیں۔“

اس کی اس بات پر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ گھبرا گیا۔

”ارے ارے..... آپ تو بڑی باہمت خاتون ہیں۔ چپ ہو جائیں خدا کے لیے..... ورنہ دیکھیں میں بھی رونا

شروع کر دوں گا اور میرے دفتر میں کام کرنے والے ملازم لڑکے میرا خوب مذاق اڑائیں گے۔“

اس کے بہلانے کا اتنا خوبصورت انداز دیکھ کر میں خاموش ہو گئی، مگر ہچکیاں ابھی تک جاری تھیں۔

”اچھا یہ بتائیں، ہٹلر شام کو واپس کب آتا ہے؟“

”ہٹلر.....“ میں بڑی حیران ہوئی۔ ”کون، ہٹلر؟“

”آپ کا شوہر اور کون؟ اس بندے کو اس سے زیادہ خوبصورت نام میں دے نہیں سکتا۔“ اس نے یہ بات اتنی

بے ساختگی سے کہی کہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگا، پھر بولا۔

”ایک بات کہوں۔“ وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔

”جی۔“ میں اس کی خوبصورت مردانہ آواز میں کھو گئی۔

”آپ ہنسی رہا کریں۔ کیونکہ آپ ہنسی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر میرے دل میں گلاب

کھلنے لگے۔ وہ پھر بولا۔ ”آپ روتے ہوئے اچانک سے ہنسنے لگی ہیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں پتا ہے کون سا منظر جگر گانے لگا ہے۔“

”کون سا؟“ میں نے پوچھا۔

”جیسے تیز برستی موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور پھر اچانک دھوپ نکل آئے۔ بارش کے ساتھ دھوپ، کتنا

دلفریب نظارہ ہوتا ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟“

”ہاں، واقعی دلکش منظر ہوتا ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

”اچھا یہ بتائیں آج سیر کے لیے کیوں نہیں آئیں؟“

”بس دل نہیں چاہا۔“ میں نے بات بنائی۔

”کیوں دل نہیں چاہا؟“

”بس نہیں چاہا تو نہیں چاہا۔ آپ تو پیچھے پڑ جاتے ہیں۔“

”کل کا کیا پروگرام ہے؟ کل جی چاہے گا جانے کو کہ نہیں۔“

”اب کل کا پروگرام میں آج کیسے بتا سکتی ہوں۔“

”تو پھر کل ضرور آئیے گا۔“ وہ اپنائیت سے بولا۔

”کوشش کروں گی۔“

”کوشش نہیں۔ آپ نے کل ضرور آنا ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ آئیں گی نا!“

”ہاں، آؤں گی۔“ میں جھکتے ہوئے بولی۔ ”کل کوئی خاص بات ہے۔“

”ہاں کل کا دن خاص ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“ میں تجسس میں پڑ گئی۔

”وہ ایسے کہ کل ہم سیر کرنے کے بجائے صرف باتیں کریں گے۔ اپنی اپنی بیتی ہوئی زندگی کے متعلق ایک

دوسرے کو بتائیں گے۔“

”ایک گھنٹے میں ہم دونوں اپنی گذری ہوئی زندگی پر روشنی ڈال سکیں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”تو ایسا کریں گے، ایک دن میں اپنی کہانی سناؤں گا۔ دوسرے دن آپ اپنی آپ بیتی سناؤا لیے گا۔“ اس نے

بڑی آسانی سے مسئلہ حل کر دیا۔

”اوکے، یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں خوشدلی سے بولی۔ ”تو پھر کل آپ کی باری ہے۔“

”جو حکم جناب کا۔“

”اوکے، اب فون بند کرتی ہوں کل صبح ملاقات ہوگی، سی یو۔“

”خدا حافظ، اپنا خیال رکھیے گا۔“

فون بند کر کے میں کتنی دیر اس کے متعلق سوچتی رہی۔ کل میں اس اسرار میں اپنے شخص سے پوری طرح واقف ہو جاؤں گی۔ اس کی زندگی کا ہر پہلو میرے سامنے بے نقاب ہو جائے گا۔

.....☆.....

اگلی صبح میں نے غسل کر کے سفید سوٹ زیب تن کیا۔ اپنے فیورٹ پر فیوم کا خود پرچھڑکاؤ کیا۔ جبار کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے میں نے اسٹور میں رکھی الماری میں لگے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال بنائے۔ تراشیدہ شولڈر کٹ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ میں یہ خصوصی اہتمام کسی اور کے لیے کر رہی ہوں۔ میرے چہرے کی یہ چمک اور تازگی کسی اور کے دم سے ہے۔ میں نے خود کا بغور جائزہ لیا۔ سفید شلوار سوٹ میں کھلے بالوں کے ساتھ، میں بہت اسارٹ اور کم عمر نظر آ رہی تھی۔ چہرہ کسی اندرونی مسرت سے دمک رہا تھا۔

لاحول ولا قوۃ..... میں نے جلدی جلدی بال سمیٹ کر انہیں پونی میں باندھا اور اپنے آپ کو سرنش کرنے لگی۔ بھلا یہ میں کیا بے سرو پا باتیں سوچ رہی ہوں۔ میں کیوں کسی کے لیے تیار ہونے لگی۔ میں کیا اتنی کمزور ہوں..... ہر گز نہیں۔ میں بہت مضبوط کردار کی مالک ہوں۔ میں ایک میچورڈ اور باعزت عورت ہوں۔

بال سمیٹ کر سفید دوپٹہ اچھی طرح سر پر لپیٹا اور گھر سے باہر آ گئی۔ پارک میں داخل ہوئی تو خاور اسی بچ پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہو گیا۔

میری نظر خاور پر پڑی تو میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے بھی سفید شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی اور وہ ان کپڑوں میں بڑا ہینڈسم لگ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچی تو وہ والہانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اپنے لیے ستائش دیکھ کر میری نظریں جھک گئیں۔ میں فائٹ بیٹھ گئی۔

”بیٹھ جائیں۔“ میں نے اسے بھی بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا تو بولا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا تھا کہ میں آج سفید سوٹ پہن کر آ رہا ہوں۔“ وہ شرارت سے بولا تو میں شپٹا اٹھی۔

”مجھے کیسے پتا ہونے لگا اور یہ میں آپ کے لیے پہن کر نہیں آئی، میرا فیورٹ کمر ہے۔ میں زیادہ تر یہی کمر پہنتی ہوں خصوصاً گرمیوں میں۔“

”اوہ اچھا۔“ وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ ”ویسے میرا بھی یہ فیورٹ کمر ہے۔ میں بھی موسم گرما میں صرف سفید رنگ ہی پہنتا ہوں۔ ہماری عادتیں کتنی ملتی جلتی ہیں، ہیں نا!“ اس نے تصدیق چاہی۔

میں خاموش رہی، مگر بے چینی سے پہلو بدلتے لگی۔

”ویسے آپ سفید سوٹ میں بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔“ وہ تھوڑا سا میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں بولا تو میرا چہرہ متمنائے لگا۔

”اب کہانی سنانا شروع کریں نا۔“ میں اس کا دھیان بٹانے کو بولی۔

”کہانی، کیسی کہانی۔ ارے میں آپ کو کہانیاں سنانے والا لگتا ہوں کیا۔“

”خاور پلیز بی سیریس۔ آپ کو پتا ہے میں کس کہانی کی بات کر رہی ہوں۔“

”اوہ اچھا..... آپ میری پچھلی زندگی کی کہانی سننا چاہتی ہیں۔ اوکے سناتا ہوں۔“ وہ خلا میں دیکھنے لگا جیسے بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ موزوں کر رہا ہو۔ اس نے گلا کھنکھارا۔

”میں بات شروع کرنے سے پہلے آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا۔ امید ہے آپ اس سوال کا جواب بالکل صحیح اور درست دیں گی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا تو میں پریشان ہو گئی۔

”کیسا سوال؟“

”وہ سوال یہ ہے کہ..... آپ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی نظر آتی ہیں۔ اس کم عمری اور سمارٹنس کا راز کیا ہے۔“ اس کا سوال سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”خاور! یہ کیسا بے تکا سوال ہے۔“ اب میں ہنس رہی تھی۔

”اوکے میں سمجھ گیا۔ آپ نہیں بتانا چاہتیں۔ اپنا سیکرٹ ہر کسی کو تو ہڑا بتایا جاتا ہے۔“

’ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ سب گاڈ گفٹ ہے۔‘ میں اس موضوع سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔

”اوکے آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں اور اب میں اپنی گزری ہوئی زندگی پر روشنی ڈالوں گا۔“ اور پھر وہ اپنی زندگی کی داستان سناتا چلا گیا اور میں سنتی چلی گئی۔ اس کا انداز بیان اتنا دلچسپ اور بے ساختہ تھا کہ میں گرد و پیش سے لائق ہو کر اس کی کہانی میں کھو گئی۔ وقت گزرنے کا قطعی احساس نہ ہوسکا۔



میں نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مجھ سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا تھا۔ شروع ہی سے غصیلا اور ضدی تھا۔ والد صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے سول انجینئرنگ کی تھی۔ اسی طرح میرے دونوں بھائی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک نے کیمسٹری میں باہر سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے اور ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ دوسرے والد کی طرح سول انجینئر ہیں اور ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ میری واحد بڑی بہن بھی گریجویٹ ہیں اور انہیں بھی آگے پڑھنے کا ارمان تھا، مگر امی کو ان کی شادی کی جلدی تھی اس لیے وہ مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکیں۔ گھر میں واحد میں ایک بچہ تھا جسے تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ سکول کی حد تک بس پاس ہو جاتا تھا۔ ہاں اتنی محنت ضرور کرتا کہ کبھی کسی مضمون میں فیل نہیں ہوا۔

البتہ مجھے کم نمبروں کی وجہ سے ایک عام سے کالج میں داخلہ ملا۔ وہاں کا ماحول اچھا نہیں تھا۔ سیاست تھی اور اکثر کلاسز بند رہتی تھیں، اس لیے میرا رہا سہا دل بھی ندر ہا اور میں نے بمشکل انٹر کر کے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت والد صاحب نے کہا تھا کہ بیٹا اگر پڑھو گے نہیں تو روزگار کے بجائے ٹیکسی رکشا چلانا پڑے گا۔ اس وقت تو میں نے کان نہیں دھرے۔ مگر آنے والے وقت میں اُن کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

اگرچہ مجھے بڑے بھائی کے توسط سے ایک پرائیویٹ کمپنی میں ریکارڈ کیپر کی جاب مل گئی تھی۔ یہ نوکری میرے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ دوسرے اس میں تنخواہ بہت معمولی تھی۔ میرا کیلے کا گذر اتو با آسانی ہو جاتا تھا مگر شادی کے بعد اس تنخواہ سے پورا گھر چلانا ناممکن تھا۔

بڑے تینوں بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ والد صاحب نے پانچ مرلہ کا گھر تین پورشن کی شکل میں اس طرح بنوایا تھا کہ ہر پورشن کی سیڑھی الگ سے اوپر جاتی تھی۔ بڑے دونوں بھائی اوپر والے پورشنز میں اپنی اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ جبکہ میں، امی اور ابو کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر رہتا تھا۔ اب امی کو میری شادی کا ارمان تھا۔ میرے برسرِ روزگار ہوتے ہی امی کو میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ دونوں میاں بیوی اپنی زندگی کے اس فرض کو جلد از جلد ادا کر کے ایک آخری فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ یعنی میری شادی کر کے امی ابو حج کرنا چاہتے تھے۔

میں اپنی تنخواہ کے پیشِ نظر شادی کے جھنجھٹ میں ابھی پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر سب نے میری ایک نہ سنی اور خالہ زاد صوفیہ کو زبردستی میری دلہن بنا دیا گیا۔ صوفہ خوش شکل مگر تیز طرار لڑکی تھی، جو بعد میں انتہائی بد زبان اور جھگڑالو بھی ثابت ہوئی۔

امی، ابوصوفیہ کی شکل میں بلا میرے گلے ڈال کر حج کرنے چلے گئے۔ شادی کے ابتدائی چند مہینے تو بخیر و عافیت کٹ گئے مگر پھر آہستہ آہستہ صوفیہ کی اکھڑ مزاجی کھلنے لگی۔ اگر وہ طبیعت کی تیز تھی تو میں بھی غصے میں تیز رہتا تھا۔ اس کی بدکلامی میری برداشت سے باہر ہو جاتی تھی۔ میں بھی ایک کی چار سناٹا تھا اور بعض اوقات تو میرا ہاتھ بھی اٹھ جاتا تھا۔ میرے والدین اس صورتحال کو لے کر بہت پریشان رہتے تھے۔ چونکہ وہ امی کی رشتہ داروں میں سے تھی، امی اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں تو وہ ہتھ سے اکھڑ جاتی۔ امی کو بھی بے نقط سنائی۔ وہ امی کو اپنی بربادی کی ذمہ دار گردانتی۔

ابو بے چارے چپ چاپ سنتے رہتے یا پھر گھر سے باہر نکل جاتے اور پھر ایک دن ایسے گئے کہ مردہ حالت میں واپس آئے۔ سڑک کر اس کرتے ہوئے اتنا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا کہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

ابو کے جانے سے میری مشکلات میں گوناگوں اضافہ ہوا۔ وہ گھر کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ ڈالتے تھے۔ فروٹ اور گوشت بھی انہی کے ذمے تھا۔ ورنہ میری قلیل آمدنی میں گھر چلانا بہت مشکل تھا۔ ابو کے جانے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ میرے لیے کیا کرتے۔ میری کتنی ذمہ داریاں انہوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کسی کے چلے جانے کے بعد اس کی قدر ہوتی ہے۔

شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ ان پانچ سالوں میں تین بچے دنیا میں آ گئے تھے، ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ بچوں کی آمد سے اخراجات ڈبل ہو گئے، جبکہ تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا تھا۔ ابو کی وفات کے وقت ان کے دفتر سے ریٹائرمنٹ کے وقت جو رقم ملی تھی وہ انہوں نے اپنے بینک اکاؤنٹ میں رکھوائی تھی اور اس رقم کے منافع سے ہی وہ میری مدد کیا کرتے تھے یا اپنا اور امی کا ذاتی خرچ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے بیٹوں کے بچوں کو بھی جیب خرچ دیا کرتے تھے۔ آپنی کو بھی عید پر کپڑے وغیرہ یا دیگر تحائف دیتے رہتے تھے۔ ابو کے گزرنے کے بعد وہ تیس لاکھ ہم تینوں بھائیوں نے آپس میں برابر، برابر تقسیم کر لیا اور طے یہ کیا کہ امی کو تینوں بھائی ہر ماہ ایک لگا بندہ جیب خرچ دیں گے اور آپنی کو بھی حسبِ توفیق تینوں بھائی الگ الگ عیدی دیں گے۔ میں نے اپنے حصے کی رقم بینک میں رکھوا دی۔

میرے دونوں بھائی مالی حیثیت میں مجھ سے مستحکم تھے۔ میرے بل وغیرہ وہی ادا کر دیتے تھے مگر وہ میرے بیوی بچے تو نہیں پال سکتے تھے اور خود مجھے بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ پریشانی کے عالم میں، میں نے کمپنی والوں سے تنخواہ بڑھانے کی بات کی جو جھگڑے پر آخر ختم ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ جب تک جاب تھی اس

کی قدر نہیں تھی، جب جاب نہیں رہی اور اس کی تلاش میں دھکے کھانے پڑے، تب جا کر اندازہ ہوا کہ میں نے کفرانِ نعمت کیا تھا۔ بے شک تنخواہ کم تھی مگر گزارہ تو ہو رہا تھا۔ بجائے اس کے میں اور صوفیہ اخراجات پر قابو پاتے، میں نے مزید کے چکر میں جاب ہی گنوا دی۔

میرا خیال تھا مجھے دوسری جاب آسانی سے مل جائے گی۔ مگر اس کے بعد بے روزگاری کا ایک طویل دور شروع ہو گیا، جو آج مجھے کسی بھی ملک خواب کی طرح لگتا ہے۔ دفتر بہ دفتر جاب کے لیے مارا مارا پھرتا رہا، مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ بھائیوں نے بھی کوشش کی مگر نہ جانے کیا بات تھی، جہاں جاتا انکار ہو جاتا۔ یا کوئی ایسا مسئلہ سامنے آ جاتا کہ ملازمت ملنے سے رہ جاتی۔ ایک بار تو اپائنٹ منٹ لیٹر بھی مل گیا تھا کہ اچانک کمپنی کے مالک بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا اور کمپنی ہی بند ہو گئی۔

تنگ آ کر میں نے محنت مزدوری کا سوچا۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ بچپن سے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ کبھی کوئی سختی نہ دیکھی تھی، اس لیے جوانی میں مشکل پیش آئی تو عادت نہ تھی اس لیے نہ کر سکا۔ آخر ایک دن صوفیہ نے مشورہ دیا کہ ٹیکسی بنالو۔ میں سن کر بھڑک اٹھا۔ ”تمہارا دامغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں ٹیکسی چلاؤں گا۔ سول انجینئر عابد ڈار کا بیٹا ٹیکسی چلائے گا۔“

”تو ٹیکسی چلانا کون سی بری بات ہے۔ آپ محنت کا کام کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ بھی تو محنت ہی ہے۔“ اس نے ترنت جواب دیا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے غور کیا تو صوفیہ کی بات مجھے درست لگی۔ ٹیکسی چلانا بھی تو محنت کا کام تھا پھر اس میں محنت تھی مگر مشقت نہیں تھی۔ مجھے ڈرائیونگ آتی تھی اور میرے پاس لائسنس بھی تھا۔

میں نے بھائیوں سے مشورہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری مخالفت کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ان کا بھائی ٹیکسی چلائے گا تو ان کی بے عزتی کے مترادف ہو گا۔ مگر انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ سارے کام اچھے ہوتے ہیں۔ اس میں آدمی اپنی محنت اور قابلیت سے جگہ بناتا ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا امکان بھی تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ رقم میرے پاس پہلے سے موجود تھی۔ ابا جان والا دس لاکھ بینک میں پڑا تھا۔

میں نے مناسب گاڑی کی تلاش شروع کر دی۔ میں یلو کب لینا چاہتا تھا، مگر مارکیٹ میں موجود تمام یلو کب پرانی ہو چکی تھیں۔ کیونکہ وہ گذشتہ بائیس سال سے مسلسل ٹیکسی کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ پھر ایک دوست کے توسط سے یلو کب لی جو ایک صاحب نے اپنے استعمال کے لیے رکھی تھی اور وہ بھی کم استعمال ہوئی تھی۔ گاڑی اچھی حالت میں تھی۔ بڑی گاڑی تھی، اس لیے مناسب قیمت میں مل گئی۔ کچھ رقم اس کے اوپر لگائی اور گاڑی بہترین حالت میں آ گئی۔ یوں میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ ان دنوں سی این جی کا بحران شروع ہوا تھا اور ہفتے میں دو دن سی این جی اسٹیشن بند رہنے لگے تھے۔ میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ ایک سلنڈر اضافی لے لیا اور اسے بھروا کر رکھ لیتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی اسے فٹ کر لیتا، مگر اس کی نوبت کم آتی تھی۔

بے روزگاری سے تنگ آ کر جب میں نے ٹیکسی چلانے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس شعبے میں مجھے اتنے انوکھے اور عجیب و غریب تجربات ہوں گے، جن کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ٹیکسی میں موت سے لے کر پیدائش تک سب دیکھا۔ ایک بہت نوجوان آدمی جو میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا، گپ شپ لگا رہا تھا اچانک ہی ساکت ہو گیا اور جب میں نے ٹیکسی روک کر اسے چیک کیا تو وہ دنیا سے گزر چکا تھا۔ اسی طرح ایک دروزہ میں مبتلا خاتون نے ٹریفک جام کی وجہ سے میری ٹیکسی میں بچے کو جنم دیا۔ خوش قسمتی سے اس کی ماں اور ایک دوسری خاتون ساتھ تھیں اور اللہ نے خیریت کی کہ اسپتال پہنچنے پر زچہ اور بچہ دونوں سلامت رہے تھے۔ اس دن سیٹ کور سے میں نے ٹیکسی کے پچھلے حصے کا پردہ کیا تھا۔

ایک دن ایک اوباش جوڑا یعنی ایک مرد اور ایک عورت نے میری ٹیکسی ہار کی۔ میں سمجھا دونوں میاں بیوی ہیں، کہیں کام سے جا رہے ہیں۔ بیچ راستے میں انہوں نے اچانک بوس و کنار شروع کر دیا۔ میں نے بیک مرر میں دیکھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے جنونی انداز میں ایک دوسرے کو کس کر رہے ہیں تو میں پسینے میں تر ہتر ہو گیا۔

”اے..... یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں نے سخت لہجے میں پیچھے مڑ کر کہا تو مرد پھر کر بولا۔

”دھیان سے گاڑی چلاؤ۔ تمہیں اس سے کیا ہم جو مرضی کریں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سے مصروف ہو گئے۔

میرا تو دماغ گھوم گیا۔ گاڑی کو بریک لگا کر سائیڈ پر کھڑی کی اور باہر نکل کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

”باہر نکلو۔“ میں غرایا تو وہ دونوں گھبرا گئے۔ فوراً نیچے اتر آئے۔

”ناؤ گیٹ لاسٹ۔“ میں دھاڑا تو وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک طرف کو چل دیے۔

میں بیچ و تاب کھاتا ہوا گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارٹ کرنے لگا۔ بیہودگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں بڑبڑاتا ہوا گھر آ گیا۔ یہ چند واقعات ایسے ہیں جو میں شاید ساری زندگی بھی فراموش نہ کر سکوں۔ یہ واقعات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کیا کیا نہیں دیکھا۔

شروع شروع میں کام اتنا زیادہ نہیں تھا۔ میری رہائش ایک پوش علاقے میں ہے اور یہاں اکثر گھروں میں ایک سے زیادہ گاڑیاں ہیں، اس لیے ٹیکسی کی ضرورت اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے میں نزدیک ہی ایک ایسے علاقے کے اسٹاپ پر کھڑا ہونے لگا جہاں لوگ تو کھاتے پیتے رہتے تھے، مگر فلیٹ یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے گاڑی نہیں رکھ سکتے تھے۔

یہاں ٹیکسی کا کام خوب چلتا تھا۔ کم تعلیم کے باوجود میری شخصیت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اللہ نے اچھی شکل و صورت دی ہے۔ میرے گھرانے کا علمی پس منظر اور شائستگی مجھ میں بھی آئی ہے۔ میں بچپن سے اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا ہوں۔ اچھی شاعری اور نثر پڑھنے کا شوق ہے۔ ہمیشہ رات کو جب تک تھوڑی دیر کسی کتاب کا مطالعہ نہ کر لوں، نیند نہیں آتی۔ میں ہمیشہ صاف ستھرا اور ویل ڈریس رہتا اور گاڑی کو بھی خوب چکا کر رکھتا تھا۔ پھر کسٹمر سے اس طرح پیش آتا کہ جو ایک مرتبہ میری گاڑی میں بیٹھتا تھا وہ لازمی میرا نمبر لے لیتا تھا۔ اس کے بعد جب اسے میری ضرورت ہوئی کال کر کے گھر بلا لیتا۔ یوں مجھے جلدی ہی پکی سواریاں میسر آ گئیں۔ ایک دولت مند فیملی نے مجھے سکول سے بچے لانے اور لے جانے کے لیے رکھ لیا۔

اس خاندان کے کمانے والے مرد ملک سے باہر تھے اور گھر میں صرف خواتین، بچے اور ایک بزرگ آدمی تھے جو بچوں کے دادا جان تھے۔ جب میں بچے لینے یا چھوڑنے جاتا تو یہ بزرگ میرے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے میں یہ ذمہ

داری لینے پر آمادہ ہوا تھا۔ بڑے میاں کی وجہ سے میری ذمہ داری صرف ڈرائیور کی حد تک محدود تھی۔ کیونکہ خدا نخواستہ اگر کوئی واردات ہو جاتی تو کون میری بات کا یقین کرتا کہ میں اس میں ملوث نہیں تھا۔ اس لگی بندھی ڈیوٹی سے مجھے اتنا مل جاتا تھا کہ ٹیکسی کی گیس اور مرمت کا خرچ اسی سے نکل آتا تھا اور باقی کمائی خالص ہو جاتی۔ شروع میں بچوں کو لے جاتا اور لے آتا، پھر گھر کی خواتین کو بھی لانے لے جانے لگا۔ میری وجہ سے انہوں نے اپنے ڈرائیور کو نوکری سے نکال دیا۔ مجھے اس کا افسوس ہوا مگر اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ میں ایک طرح سے ان کا بغیر تنخواہ کا ڈرائیور ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بھی فائدے میں تھے کہ جتنا استعمال کرتے تھے اتنا ہی معاوضہ دیتے تھے اور گاڑی کا خرچ بھی بچتا تھا۔ جلد ہی میں صرف اسی خاندان کے لیے انگیج ہو کر رہ گیا اور دن میں دو، تین بار لازمی جانا ہوتا تھا۔ بڑے میاں جن کا نام حاجی عبدالکریم تھا۔ ان سے میرا بہت اچھا تعلق بن گیا تھا، میں ان کو بلا جھک انکل کریم کہتا تھا۔ وہ بھی مجھے اپنے بیٹوں کی طرح سمجھنے لگے تھے۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ میں ایک طرح سے ان کا فیملی ممبر بن گیا تھا۔ صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں میری طلبی کم ہوتی تھی۔ ان دنوں میں دوسری سواریاں دیکھ لیتا تھا۔

میں نے محنت کی اور ایمانداری سے کام لیا تو اللہ نے جلد اس کا صلہ دیا اور میں اپنی سابق آمدنی سے دو گنا سے بھی زیادہ کمائے لگا۔ عید اور شادیوں کے سیزن میں آمدنی مزید بڑھ جاتی تھی۔ پھر میں گھر میں زیادہ وقت دے سکتا تھا۔ صوفیہ اور بچوں کو کہیں لانا لے جانا ہوتا تو اپنی گاڑی موجود تھی ورنہ پہلے بھائیوں سے لینی پڑتی تھی۔ سب سے بڑھ کر اب مجھے بھائیوں سے مدد نہیں لینی پڑتی تھی۔ میری خوددار طبیعت کو پہلے بھی یہ بات کھلتی تھی، اس لیے اب میں مطمئن تھا۔ صرف اچھے طریقے سے گزارہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ میں کچھ نہ کچھ بچت بھی کرتا رہتا تھا۔ گھر کے حالات ٹھیک ہوئے تو لڑائی جھگڑوں میں بھی واضح کمی آئی۔ امی بھی اب خوش اور مطمئن تھیں۔ صوفیہ کبھی کبھار فطرت سے مجبور ہو کر کسی نہ کسی بات کی آڑ لے کر لڑائی شروع کر دیتی، مگر اب لڑائی میں پہلے جیسی شدت نہ ہوتی اور پھر وہ امی کے سمجھانے پر فوراً پسپائی اختیار کر لیتی۔ ملازمت چھوٹنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ جب میں سکون سے زندگی گزار رہا تھا اور خوش تھا۔



میں عام طور سے صبح سات بجے نکلتا تھا۔ پہلے بچوں کو سکول چھوڑتا اور اس کے بعد اسی فیملی کے ساتھ کچھ کام اور نمٹاتا۔ پھر بچوں کو اسکول سے لا کر واپس گھر آتا۔ کھانا وغیرہ کھا کر کچھ دیر آرام کرتا، ورنہ کال آنے پر چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد میں شام سات آٹھ بجے تک باہر رہتا اور پھر گھر آ جاتا۔ اس کے بعد صرف جاننے والوں کی کال پر جاتا اور رات دس بجے کے بعد اپنا موبائل بند کر دیتا۔ صرف ایک نمبر اور تھا جو اسی فیملی کو دیا ہوا تھا۔ تاکہ وہ کسی ایمر جنسی میں مجھے کال کر سکیں۔ ایک دن امی نمبر پر مجھے کریم انکل کی کال آ گئی۔ میں نے فون کان سے لگایا۔

”جی کریم انکل۔“

”خادو بیٹا! آج تمہیں اپنے لئے نہیں بلکہ کسی اور کے لیے بلارہا ہوں۔“

”جی حکم کریں انکل..... کہاں جانا ہے؟“

”بیٹا! میرا ایک گہرا دوست تھا فاروق احمد۔ کافی عرصہ پہلے اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی تین بیٹیاں ہیں بیٹا

کوئی نہیں۔ بیوی یعنی لڑکیوں کی والدہ اکثر بیمار رہتی ہے۔ تینوں لڑکیاں ماشاء اللہ پڑھی لکھی اور باشعور ہیں۔“

”کریم انکل! آپ ان کا ایڈریس بتائیں۔“ کریم انکل کے منہ سے ان تین بہنوں کی تعریف سن کر میں بغیر دیکھے ان سے متاثر ہو گیا اور دل میں ان کے لیے عزت و احترام پیدا ہونے لگا۔ پھر کریم انکل نے ان کا ایڈریس سمجھایا۔ جو ہمارے شہر کے پوش علاقے کا تھا۔ میں فنانٹ نہادھو کر تیار ہوا۔ ناشتہ کیا اور مطلوبہ پتے پر پہنچ گیا۔ جو ہمارے گھر سے پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر تھا۔

مکان تین منزلہ اور شاندار تھا۔ میں گھر کے آگے گاڑی کھڑی کر کے سوچنے لگا۔ اب کیا کروں.....
تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے ڈور بیل کا بٹن دبایا اور خود سائیڈ پر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے ایک بیس بائیس سال کی لڑکی نے دروازے سے جھانکا۔

”مس مجھے کریم صاحب نے بھیجا ہے۔“ میں بڑے شائستہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

”جی اچھا، میں ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔

میں سوچنے لگا۔ تین بہنوں میں اگر یہ سب سے بڑی ہے تو باقی دو تو ابھی کم سن ہی ہوں گی۔ بے چاری بغیر باپ اور بھائی کے زندگی گزار رہی ہیں۔ مرد کے سہارے کے بغیر عورتوں کا زندگی گزارنا کتنا کٹھن ہے۔ یہ میں بخوبی سمجھتا تھا۔ چند ثانیوں بعد لڑکی کا چہرہ دوبارہ دروازے پر نمودار ہوا۔

”بھائی دس پندرہ منٹ ویٹ کریں۔ آپ تیار ہو رہی ہیں۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولی اور پھر سے غائب ہو گئی۔

میں گاڑی کا ایر کنڈیشنر آن کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تو گویا وہ اس لڑکی کی بڑی بہن ہے، جو میرے ساتھ جائے گی۔ میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیں۔ گاڑی کے دروازے کا شیشہ کسی نے کھٹکھٹایا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ اتنی دیر تک وہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دس بارہ سال کا لڑکا تھا۔
”سوری میں لیٹ ہو گئی۔ آپ کو زحمت تو ہوئی ہوگی۔“ وہ اپنی سریلی آواز میں معذرت کر رہی تھی۔

”نہیں میڈم! ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔“ میں خوشدلی سے مسکرایا۔ میں نے بیک مرر سے جائزہ لیا۔ وہ بیس تینتیس سال کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ ساتھ بیٹھا بچہ اس کا بیٹا لگ رہا تھا، کیونکہ اس کی شباهت اس عورت سے ملتی تھی۔

”میڈم! کہاں جانا ہے؟“ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”لا ہو رہا ہے۔“

”اوکے۔“ میں نے گاڑی گلی سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”لا ہو کس جگہ؟“

”جنال ہسپتال کے پاس۔ وہاں ایک ہوسٹل ہے جہاں میں نے اپنے بیٹے کو داخل کروانا ہے۔“

”جی اچھا۔“ یعنی اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ بچہ اس کا بیٹا ہے۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر گاڑی مین روڈ پر فراٹے بھرنے لگی تو میں پھر بولا۔

”مجھے کریم صاحب نے بھیجا ہے۔ ان کی باتوں سے محسوس ہوا ہے کہ وہ آپ لوگوں سے خصوصی انیٹ رکھتے

”ب۔“

”ہاں کریم انکل.... واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔ ابو کے بہت اچھے دوست تھے۔ ان کے گذر جانے کے بعد

ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ بڑے اچھے الفاظ میں آپ کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کی شرافت اور نیک نیتی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ انہوں نے ہمیں تاکید کی ہے کہ کہیں بھی آنے جانے کی ضرورت پیش آئے، کوئی سا بھی وقت ہو، ہم بلا خوف و خطر آپ کے ساتھ سفر کر سکتی ہیں۔“

”ذرا نوازی ہے اُن کی، ورنہ میں اس قابل کہاں۔“ میرے دل میں کریم انکل کے لیے احترام پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ بلاشبہ وہ بہت عظیم انسان تھے۔

اس کے بعد کا سفر تقریباً خاموشی سے ہی کٹا۔ وہ لڑکا بھی زیادہ تر خاموش رہا۔ اس کا چہرہ اداس تھا، شاید اس لیے کہ اس کی ماں اسے اپنے سے دور کر کے بورڈنگ میں بھیج رہی تھی۔ مجھے اس بچے پر ترس آ رہا تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ یہ ان کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اس کا باپ بھی آسانی سے مان گیا ہو گا جیسی تو وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے جا رہی تھی۔ بچوں کے مستقبل کا کوئی بھی فیصلہ کوئی ایک فریق تھوڑا ہی کر سکتا ہے۔ والدین مل کر صلاح مشورے سے کوئی حل نکالتے ہیں۔ ویسے ہمارے ہاں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی بچہ ہاتھوں سے ٹکٹا دکھائی دے یا آوارہ گردی کا شکار ہونے لگے تو فوراً فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اسے ہوشل میں داخل کروادیا جائے۔ ٹھف اور پنکچو نیل روٹین لائف گزارے گا تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔ مگر یہ بچہ تو بہت شریف اور سہا ہوا سالگ رہا تھا، تو پھر اسے ہوشل میں جمع کروانے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ میں انہی خیالات میں الجھا الجھا رہا ہوں پتہ نہیں چلتا۔

”جی میڈم اب آگے کہاں جانا ہے؟“ راوی روڈ پر پہنچ کر میں نے پھر پوچھا۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا اس کے ساتھ بیٹھا اس کے کندھے پر سر رکھے طور ہاتھ۔ میری بات سن کر چونکی۔

”گلبرگ ایم بلاک، کوٹھی نمبر 103۔ پہنچ جائیں گے نا!“ اس نے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں، پہنچ جاؤں گا۔ جہاں کوئی مشکل پیش آئی تو آپ ہیں نا، بتا دیجئے گا۔“

”جی جی، ضرور۔“ وہ مسکرائی۔

آدھے گھنٹہ بعد ہم اس کے مطلوبہ پتے پر پہنچ گئے۔ پہنچنے سے چند منٹ پہلے میں نے ازراہ تجسس پوچھا۔

”میڈم آپ تو کبھی تھیں جناح ہسپتال کے پاس جانا ہے، جہاں کوئی ہوشل ہے۔ اب ارادہ بدل گیا ہے کیا؟“

”نہیں، ارادہ تو نہیں بدلا۔ یہ میری بہن کا گھر ہے۔ پہلے ہم یہاں اتریں گے۔ تھوڑی دیر ریٹ کریں گے پھر بہنوئی کو ساتھ لے کر ہوشل جاؤں گی، کیونکہ ان کی وہاں کافی جان پہچان ہے۔ ان کے دوست وہاں ٹیچر ہیں، اس لیے کچھ سہولت ہو جائے گی۔“

پتا نہیں کیوں میں اس بچے کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہا تھا اور دل سے چاہتا تھا کہ اس کی ماں کا ارادہ بدل جائے۔ اسے ہوشل میں داخل نہ کروائے، واپس گھر لے جائے۔ 103 نمبر کوٹھی کے گیٹ کے آگے گاڑی کا ہارن بجایا تو کوٹھی کے چوکیدار نے چھوٹے دروازے سے جھانک کر مہمانوں کو پہچانا اور پھر بڑا گیٹ کھول دیا۔

گھر اپنے مکینوں کی خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ خوبصورت پورچ کے ساتھ سرسبز و شاداب لان تھا۔ میں نے

گاڑی پورچ میں کھڑی کی تو وہ عورت اپنے بچے سمیت اتر کر مجھے یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔
 ”آپ تھوڑی دیر ادھر زکیں۔“

”جی اچھا۔“ میں نے سر ہلایا۔

وہ دونوں اندر چلے گئے تو میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر نور جہاں کے پرانے گانے سننے لگا۔ گاڑی کا اے سی
 آن تھا۔ باہر خاصی گرمی تھی اس لیے اندر کے خنک ماحول میں موسیقی سننا باہر نکلنے سے بہت بہتر تھا۔
 چند منٹوں بعد ایک تیس بتیس سالہ شخص باہر آیا جو صورت سے ہی ہنس مکھ اور زندہ دل لگ رہا تھا۔ اس نے ہلکے
 نیلے رنگ کی ٹی شرٹ کے ساتھ بلوٹراؤزرز پہن رکھا تھا۔ جو اس کے سرخ و سفید رنگ پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ میری
 طرف جھکا تو میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔

”آئیے جناب اندر تشریف لائیں۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں جناب، میں گاڑی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اندر چلیں کوئی ٹھنڈا گرم پیتیں۔ آئیں پلیز!“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو
 مجھے اس کے ساتھ اندر جانا ہی پڑا۔ وہ مجھے اپنے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ جو داخلی دروازے کے
 بالکل ساتھ تھا۔

ڈرائنگ روم کا اے سی چل رہا تھا۔ میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ صاحب اپنے ملازم کے ساتھ مسکراتے
 ہوئے آگئے۔ ملازم ٹی ٹرائی دھکیلتا ہوا لا رہا تھا جس پر انواع و اقسام کی بیکری آئٹمز اور مشروبات تھے۔
 ”لیجئے.... بسم اللہ کیجئے۔“

”ارے.... آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا۔“

”اب آپ تکلف کے چکروں میں پڑ رہے ہیں۔ یہ رسمی کلمات چھوڑیے اور شروع ہو جائیے۔“ وہ ہنستے ہوئے
 بولا تو میں بھی مسکرانے لگا۔ بلاشبہ وہ ایک خوش اخلاق اور مہمان نواز انسان تھا۔ میں نے پلیٹ میں چند چیزیں رکھیں اور
 ساتھ کولڈ ڈرنک اٹھالی۔

وہ صاحب خود ہی اپنے بارے میں بتانے لگے۔ ”میرا نام ارسلان صدیقی ہے۔ ماؤنٹ شپ کے نزدیک میرا
 جوتے بنانے کا کارخانہ ہے، جہاں بہت اعلیٰ معیار کے مردانہ جوتے تیار کیے جاتے ہیں۔ آپ کو بھی ایک دو جوڑی گفٹ
 کروں گا۔ آپ اپنے پاؤں کا نمبر بتائیں۔“ ارسلان صاحب تو واقعی راہ چلتے لوگوں کو اپنا بنا لیتے تھے۔ غضب کے خوش
 گفتار اور باتونی تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مجھ سے یوں گھل مل گئے جیسے برسوں سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ سچ تو
 یہ ہے کہ میں ان کی کمپنی میں بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی دلچسپ گفتگو سامنے والے کو بور
 ہونے ہی نہیں دیتی۔

ویسے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اتنی آزدیہنا سمجھ سے بالاتر تھا۔ یا تو وہ میری پرسنالٹی سے متاثر ہو گیا تھا یا پھر ان کی
 سالی صاحبہ نے ان کے سامنے مجھے اچھے الفاظ سے پیش کیا تھا۔

”خیر سے کتنی دیر ہوگئی ہے شادی کو؟“ میں نے ارسلان صاحب کی کھلی ذلی طبیعت کو دیکھتے ہوئے کھلا ڈالا سوال

کر ڈالا۔

”چھ سال ہونے کو آ رہے ہیں اس سانحے کو رونما ہوئے۔“

”سانحہ.... کیا کہہ رہے ہیں ارسلان صاحب۔“ میں مسکرایا۔ ”کیا کسی قسم کی زور بردستی کی گئی تھی۔ میرا

مطلب ہے آپ کی رضامندی شامل نہیں تھی۔“

”نہیں بھائی، یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ میں کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہتا۔“ یہ کہہ کر اس نے بلند بانگ

قہقہہ لگایا تو میں بھی بے ساختہ ہنسنے لگا۔

میری ہنسی کو اچانک بریک لگ گئے جب دونوں خواتین اندر تشریف لے آئیں۔ ایک تو میری ہم سفر تھی جبکہ

دوسری اس کی چھوٹی بہن اور ارسلان صاحب کی بیگم ہی ہو سکتی تھیں۔ بڑی بہن کی نسبت چھوٹی بہن تھوڑی فزہبی مائل تھی۔

ویسے دونوں بہنوں کی شباہت ملتی جلتی تھی۔

دونوں اندر آ کر ہمارے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اس فیملی میں پردے کا رواج نہ تھا۔ خاصا پڑھا لکھا اور

روشن خیال خاندان تھا۔

”بیجے ہماری پورے گھر والی اور آدھے گھر والی دونوں آ گئیں۔ یہ ہماری بیگم ہیں شاہینہ اور ان سے آپ پہلے

ہی مل چکے ہیں، ان کا نام تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔“ ارسلان صاحب کا اشارہ سالی صاحبہ کی جانب تھا۔

دونوں بہنیں بیٹھی مسکرا رہی تھیں، بڑی بولی۔

”اوہ آئی ایم سوری، میں نے انہیں اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔ میرا نام روزینہ ہے اور میں گورنمنٹ گرلز کالج میں

لیکچرار ہوں۔ ہم تین بہنیں ہیں، بھائی کوئی نہیں۔ دو آپ کے سامنے بیٹھی ہیں جبکہ تیسری گھر میں امی کے پاس ہے۔ اس کو

بھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ وہ سائیکالوجی میں ماسٹر کر رہی ہے۔ اس کا لاسٹ ایئر چل رہا ہے اور اس کا نام ارینہ ہے۔“ وہ

اس طرح اپنا اور اپنی بہنوں کا تعارف کروا رہی تھی جیسے میں ان کے لیے کوئی بہت اہم ہستی تھا۔ ان کی اس قدر اپنائیت دیکھ

کر میں شرمندہ سا ہو رہا تھا۔

”ارسلان بھائی میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔ یہ نہ ہو ہوٹل میں ملنے ملانے کا ناٹم ختم ہو جائے اور پھر

ہمیں شام ہونے سے پہلے گھر بھی واپس پہنچنا ہے۔“

”دوپہر کا کھانا کھائے بغیر تو میں یہاں سے ملنے نہیں دوں گا۔ شاہینہ جلدی جلدی کھانا تیار کرو۔ روزینہ باجی

تمہیں ہیلپ کریں گی۔ ہے ناروزینہ باجی!“ اس نے روزینہ سے تائید چاہی مگر روزینہ نے صاف انکار کر دیا۔

”دیکھئے ارسلان بھائی ہمارے پاس کھانا کھانے کا بالکل وقت نہیں اور پکانے کا تو بالکل بھی نہیں، اس لیے

انہیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔ پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکے ہیں۔ ڈیڑھ بج رہا ہے، پلیز جلدی کریں۔“

”شاہینہ ایسا کرو، بچوں کو تیار کر لو۔ بچوں کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔ ہم اپنی گاڑی میں جائیں گے اور روزینہ

باجی خاور صاحب کے ساتھ بیٹھ جائیں گی۔ سعد کو ہوٹل میں داخل کروا کر کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے پھر یہ

لوگ جو گورنوالہ کی جانب روانہ ہو جائیں گے اور ہم گھر آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں ابھی بچوں کو لے کر آتی ہوں۔“ شاہینہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، جبکہ روزینہ بھی اس کے

ساتھ ہی چلی گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ روزینہ کا بیٹا سعد جو تمام راستہ مرجھایا ہوا سہا سہا لگ رہا تھا، اب اپنے خالہ زاد بچوں کے ساتھ خوب چپک رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں بچے اس سے خاصے چھوٹے تھے مگر پھر بھی وہ ان کے ساتھ شرارتیں کر رہا تھا۔ انہیں ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گیا۔ سعد اپنی خالہ اور خالو کے ساتھ اُن کی گاڑی میں ان کے بچوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

روزینہ میری گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس وقت میرے دل میں وہ خواہش پیدا ہوئی جو اس سے قبل کبھی نہیں جاگتی تھی۔ اس وقت میرا دل خواہش کر رہا تھا کہ کاش یہ خوبصورت اور گرلےس فل عورت پچھلی سیٹ کے بجائے میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر میرے مد مقابل بیٹھے۔ جب وہ پیچھے بیٹھ چکی تو میں نے خود کو لامتناہی کی آخر ہوں تو میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہی نا۔ وہ میرے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی ہے۔ میرا، اس سے رشتہ ہی کیا ہے۔ یہ دل بھی کبھی کبھی اوٹ پٹانگ خواہشات کرنے لگتا ہے، جن کا پورا ہونا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

ہم جناح ہسپتال کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے جا رہی تھیں۔ میں نے بیک مرر سے ایک اچنتی نظر اس پر ڈالی۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے جانے کن سوچوں میں غم تھی۔ اس کے تراشیدہ بال کندھوں پر بکھرے پڑے تھے۔ سن گلاسز سر پر لٹکائے وہ بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ میں دل میں اس کے ملکوتی حسن کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”میڈیم۔“ میں نے آہستگی سے پکارا۔

”جی۔“ وہ چونکی۔ ”آپ نے مجھے پکارا ہے۔“

”جی ہاں، ایک بات پوچھ سکتا ہوں، اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو.....“

”جی پوچھیں۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”سعد کے پاپا..... میرا مطلب ہے آپ کے شوہر سعد کو ہوسٹل میں داخل کروانے پر راضی ہیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔“

میری بات سن کر اس کے مسکراتے چہرے پر سنجیدگی کے بادل چھا گئے۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

میں خفت سی محسوس کرنے لگا۔ شاید میں کوئی غلط سوال کر بیٹھا تھا۔ میں بات بدلنے کی خاطر بولا۔ ”سعد کے علاوہ آپ کے اور کتنے بچے ہیں؟“

”کوئی نہیں، بس یہی ہے۔“ وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

”بس ایک بچہ ہے اور اسے بھی خود سے دُور کر رہی ہیں۔“ میں سن کر خاموش نہ رہ سکا، فٹ سے کہہ دیا۔ پھر اپنی بات کا ری ایکشن دیکھنے کے لیے آئینے میں دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

”میری سعد کے پاپا سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ اس شخص کا سعد سے یا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“

”اوہ..... سوری.....“ مجھے واقعی افسوس ہوا تھا۔ اس عورت کی قسمت اس کی طرح خوبصورت نہ تھی۔ ماحول

یکدم سوگوار سا ہو گیا تھا۔

”کتنی دیر ہو گئی ہے اس بات کو؟“ میں نے پوچھا۔

”آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ اس وقت سعد صرف تین سال کا تھا جب اس نے مجھے طلاق دے دی تھی اور بیٹا بھی ساتھ ہی لکھ دیا تھا۔“ وہ گھمبیر لہجے میں بتا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے وہ اپنی اولاد سے کیسے دست بردار ہو گیا تھا۔

”چلیں چھوڑیں یہ باتیں۔ میں اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

اس کے بعد میں نے بھی کوئی بات نہیں کی اور اس کی طرف سے بھی خاموشی ہی رہی۔ میں نے انجانے میں شاید اس کے زخم سے کھرٹا تار دیا تھا، جس کی تکلیف وہ محسوس کر رہی تھی۔ میں تاسف سے سر ہلانے لگا اور سوچنے لگا۔

”یہی ہے یہ زندگی کیا کیا امتحان۔“

باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ ہوٹل پہنچ کر وہ سب دفتر میں چلے گئے اور میں سکول کے لان میں بیٹھ کر عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ خاصی بڑی اور پر شکوہ عمارت تھی۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد وہ سب باہر نکلے اور پھر گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں قریب ہی ایک اچھے سے ریسٹوران میں پہنچے جہاں ارسلان صاحب نے سب کو بہت اچھا کھانا کھلایا۔ اس کے بعد دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ وہ اپنے گھر کی طرف اور ہم بذریعہ موٹر وے گوجرانوالہ کی طرف عازم سفر ہوئے۔ دونوں ماں بیٹا پیچھے بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

”ہاں تو سعد میاں ہمیں بھی تو بتائیں کیا بنا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔

سعد تو کچھ نہ بولا البتہ اس کی ماما نے پوری بات تفصیل سے بتائی کہ سعد کا ایڈمیشن ہوٹل میں ہو گیا ہے۔ ہوٹل والوں نے ضروری اشیاء کی ایک لسٹ بنا کر دی ہے اور اب سعد کو ان تمام ضروری چیزوں کے ساتھ ایک ہفتے بعد دوبارہ چھوڑنے آنا ہے، پھر وہ یہی رہے گا۔ البتہ ہر ہفتے کے دن اس کی خالہ یا خالو سے اپنے گھر لے جائیں گے اور اتوار کی شام واپس چھوڑ جائیں گے اور ہر مہینے کے بعد دو دن کے لیے گوجرانوالہ جائے گا۔“ بات ختم کر کے اس نے بیٹے کے گال پر پیار کیا۔

”ہاں بھئی سعد اگر ہر ہفتے تم خالہ کے گھر جاؤ اور ایک دن وہاں گزار دو تو پھر پریشانی والی تو کوئی بات نہیں، ہے نا!“ میں نے پھر سعد کو مخاطب کیا، مگر وہ اب بھی خاموش ہی رہا۔

”ہاں اسی وجہ سے میں بھی بے فکر ہوں۔“ اب کی بار بھی روزینہ نے جواب دیا۔ ”اگر شاہینہ اور ارسلان کا آسرا نہ ہوتا تو میں اتنا بڑا فیصلہ شاید کبھی نہ کر پاتی۔ اللہ اسے خوب کامیابیاں عطا کرے۔“ اس نے بیٹے کے لیے دعا کی تو میں نے بھی صدق دل سے آمین کہا۔

شام ہونے سے پہلے ہم گوجرانوالہ پہنچ گئے۔ انہیں ان کے گھر چھوڑا اور خود بھی اپنے گھر کی راہ لی۔ روزینہ نے بڑا اصرار کیا کہ اندر آ کر ایک کپ چائے پینے کے لیے، مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پھر کبھی سہی۔ روزینہ نے ایک کاغذ پر اپنا موبائل نمبر لکھ کر دیا اور میرا نمبر لے لیا کہ اگر ضرورت پڑی بلانے کی تو فون کر لو گی۔

یہ آج سے دس بارہ سال پرانی بات ہے۔ اس وقت موبائل آج کل کی طرح اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔ میں گھر

ہا ہا تو امی کو اپنا منتظر پایا۔ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھا پھر بچوں سے گپ شپ کی۔ نہا کر تازہ دم ہوا اور نیوز چینل لگا کر ٹہریں سننے لگا۔ اچانک ذہن میں بات آئی فوراً واش روم میں گیا۔ اتارے گئے کپڑے شٹلنے لگا۔ ان کی جیبوں سے ضروری کاغذات، آئی ڈی کارڈ اور پیسے نکال کر باہر لایا۔ ان کاغذوں میں روزینہ کے فون نمبر والی پرچی بھی موجود تھی۔ میں نے وہ نمبر اپنے فون میں سیف کیا اور پرچی پھاڑ کر پھینک دی۔ اب میرے مستقل گاہکوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔



پانچ چھ دن بعد مس روزینہ کی کال آئی۔ میں نے ریسپونڈ کر کے کان سے لگایا تو اس کی مترنم آواز کانوں میں رس مھولنے لگی۔

”کیسے ہیں خاور صاحب؟“

”ٹھیک ٹھاک۔ آپ سنائیں۔“ اس کی آواز نے میرے اعصاب پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

”فٹ اینڈ فائن۔“ وہ چبکی، تو میں نے اعتراف کیا کہ وہ واقعی بہت فٹ اور بہت فائن ہے۔

”آپ کو یاد ہے نا کہ سعد کو ہوسٹل چھوڑنے جانا ہے۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”جی جی..... مجھے یاد ہے۔“

”میں نے اس کا مطلوبہ سامان پورا کر لیا ہے۔ تو کیوں نہ کل اسے چھوڑ آئیں۔“ وہ مجھے سے رائے پوچھ رہی تھی۔

تھی۔

”جیسا حکم آپ کا۔“ میں تابعداری سے بولا تو وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی کی آ بشار تھی تو وہ بولی۔ ”خاور

صاحب اتنی عاجزی سے نہ بولا کریں۔“

”یہ میرے پیسے کا تقاضا ہے میڈم۔“ میں پھر سے مہذب لہجے میں بولا۔

”اوکے، آپ اپنے پروفیشنل تقاضے نبھاتے رہیں۔ تو پھر صبح نو ساڑھے نو بجے تک آ جائیے گا۔“

”اوکے، ضرور میڈم۔“

میں فون بند کیے کتنی دیر سیٹ ہاتھ میں پکڑے اس کی باتوں میں کھویا رہا۔ اس کی مترنم ہنسی کی پھوار میری روح کو بھگوتی رہی۔ کتنی مٹھاس تھی اس کے لہجے میں۔ بولتی تو یوں لگتا جیسے کانوں میں کوئی شہدائیل رہا ہو۔ اگر گھر میں بدمزاج اور بدزبان بیوی ہو تو شوہر بے چارے اسی طرح میٹھی آوازوں میں کھوجاتے ہیں جیسے اس وقت میں کھویا ہوا تھا۔

دوسری صبح میں نے بچوں کو سکول چھوڑا اور خود تیار ہونے لگا۔ صوفیہ کو تاکید کی کہ بچوں کو وقت پر سکول سے لے آنا۔ آج لاہور کی بکنگ ہے مجھے آتے آتے شام ہو جائے گی۔

میں نے نہا کر اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا۔ پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا تو صوفیہ بول اٹھی۔

”آج کوئی خاص پسنجر مل گیا ہے؟“ وہ مشکوک انداز میں مجھے گھور رہی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرے لیے ہر سواری خاص ہی ہوتی ہے۔“

”اتنا اہتمام پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔“ وہ بغور میرا جائزہ لے رہی تھی۔ مگر مجھے اس کی سکوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے

گاڑی کی چابی اٹھائی۔ امی کو سلام کیا اور ڈھیروں وعائیں لیں اور گھر سے باہر آ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں، میں ان کے گھر کے آگے کھڑا ڈورنیل بجار ہا تھا۔ اب کی دفعہ بھی وہی ہنستی مسکراتی لڑکی دروازے پر نمودار ہوئی۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ تینوں بہنیں خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مزاج بھی ہیں۔ اس لڑکی نے مجھے دیکھتے ہی جھٹ سے سلام کیا اور میں نے بھی فٹ سے جواب دیا۔ پھر وہ اندر دوڑ گئی۔ میں مسکراتا ہوا ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اب دیکھئے نامہ بر کتنا انتظار کروا رہا ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر دروازے پر تھی۔

”بھائی جان، آپ کی کہتی ہیں صرف دس منٹ۔“ یہ کہہ کر وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی اور میں گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس کے منہ سے اپنے لیے بھائی جان کا لفظ سن کر بہت اچھا لگا تھا۔ کتنی اپنائیت سے اس نے بھائی جان کہا تھا۔ میری نظریں دروازے پر ہی جمی تھیں۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ ماں بیٹا نکلتے دکھائی دیئے۔ روزینہ نے ہاتھ میں ایک بڑا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا، جو خاصا وزن لگ رہا تھا۔ سعد نے بھی دو شاپر اٹھا رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں فوراً باہر نکلا۔ روزینہ کے ہاتھ سے سوٹ کیس پکڑا۔ گاڑی کی ڈکی میں سوٹ کیس اور شاپر رکھے۔ دونوں ماں بیٹا حسب معمول پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور ہم تخت لاہور کی جانب گامزن ہو گئے۔ پچھلی دفعہ کی نسبت آج سعد با اعتماد اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ راستہ بھر ماں سے باتیں کرتا رہا اور میری باتوں کے جوابات بھی دیتا رہا۔ اس کی ماما سے زیادہ تر وہاں رہنے کے متعلق ہی ہدایات دیتی رہیں۔

بالآخر ہم لاہور پہنچ گئے۔ سعد کو ہوشل میں چھوڑا۔ ضروری امور تو پہلے ہی منٹ چکے تھے صرف سعد کو ان کے حوالے کرنا تھا۔ اس دفعہ میں بھی اندر دفتر میں ان کے ساتھ تھا۔ رخصت ہوتے وقت روزینہ نے سعد کو گلے لگا کر پیار کیا تو ابدیدہ ہو گئی، مگر بچے کے سامنے اپنے آنسو چھپا گئی۔ خود بھی بہادر بنی رہی اور اسے بھی بہادر بننے کی نصیحت کی۔ پرسنل صاحب سے بھی درخواست کی کہ سعد کا خصوصی خیال رکھا جائے۔ پرسنل صاحب نے اس سے متعلق بہت یقین دہانی کرائی اور پھر ہم ہوشل سے باہر آ گئے۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر وہ بولی۔ ”کیا خیال ہے تھوڑی دیر شاہینہ کے ہاں نہ چلا جائے۔ اب آئے ہیں تو ان سے بھی ملتے چلیں۔“ وہ پھر سے میری مرضی پوچھ رہی تھی۔ یوں جیسے میں اس کا ڈرائیور نہیں بلکہ اس کی فیملی کا کوئی فرد تھا۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی دبائی اور بولا۔ ”میڈیم یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے نا۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اوہ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آپ تو حکم کے غلام ہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”ہے نا!“ اس نے تصدیق چاہی۔

”جی بالکل۔“ میں نے سر جھکایا۔

”تو پھر چلیں۔ گلبرگ چلتے ہیں۔“ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اور میرے دل میں پھر وہی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر میرے مد مقابل بیٹھتی۔ میں نے سر جھٹکا، خود کو سرنش کی اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ گاڑی اشارٹ کی اور گلبرگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تمام راستہ خاموشی چھائی رہی نہ اس نے کوئی بات کی اور نہ میں نے کوئی بات چھیڑنی مناسب سمجھی۔ ایک دو دفعہ میں نے بیک مرر میں دیکھا تو اسے افسردہ چہرے کے ساتھ پشت سے ٹپک لگائے دیکھا۔ شاید اکلوتے بیٹے کی جدائی کا سوچ کر افسردہ تھی۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اسے بیٹے کو خود سے دور کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ ایسی کون سی مجبوری تھی

جواسے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔

شاہینہ، بہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ ایک ملازمہ اور ایک چوکیدار تھے جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ بچے اس کے سکول اور شوہر نامدار فیکٹری جا چکے تھے۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا اور ملازمہ کے ہاتھ کافی لوازمات اور کولڈ ڈرنکس بھیجی گئیں۔ جب تھوڑی دیر بعد ملازمہ برتن اٹھانے آئی تو اس نے اطلاع دی کہ باجی نے صاحب کو فون کر دیا ہے، وہ ایک گھنٹے تک آجائیں گے۔

میں نے سوچا ایک گھنٹے تک کمر سیدھی کر لیتا ہوں۔ صوفے کے کشن کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ اے سی چل رہا تھا۔ ماحول ایک دم خنک ہو رہا تھا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی اور پھر ارسلان صاحب کی آواز پر ہی آنکھ کھلی۔ وہ میرے پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں فوراً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کھڑے ہو کر ان سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے کیا تو وہ گلے لگ گئے۔

”بھئی یہ غیروں کی طرح صرف مصافحے پر غر خانا کوئی اچھی بات نہیں۔“ ان کی بات سن کر میں تو ان کا گرویدہ ہو گیا۔ کیا لوگ تھے۔ آج کے دور میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ پھر وہ میرے ساتھ بیٹھے اور باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو کسی بھی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے فیملی بیک گراؤنڈ سے لے کر ان کی تعلیم تک اور ان کی شادی سے لے کر کاروبار تک کا ذکر شامل تھا۔ بڑے باتونی آدمی تھے۔ ان کی زبان کو بریک اس وقت لگے جب ملازمہ نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہے، آکر کھا لیں۔

”چلیں خاورد صاحب انھیں کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ کھڑا ہو کر بولا۔

”کہاں جانا ہے؟“ میں قدرے حیران ہوا۔

”ڈائننگ ٹیبل پر، کچن میں اور کہاں جانا ہے۔“

”نہیں نہیں، ارسلان صاحب یہ بالکل بھی مناسب نہیں۔ آپ میرا کھانا یہیں ڈرائنگ روم میں بھجوادیں۔“

اس نے اصرار کیا مگر میرے منع کرنے پر مان گیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کا کھانا بھیج رہا ہوں۔ خوب ڈٹ کر کھائیے گا۔ شرمانا بالکل نہیں۔“

”جی جی بالکل، خوب ڈٹ کر کھاؤں گا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“ وہ چلا گیا تو میں ڈرائنگ روم کے ڈائننگ والے حصے میں آیا جہاں کنگ سائز کا ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں رکھی تھیں اور ان کے ساتھ ہی دیوار کے پاس چھوٹا سا واش بیسن لگا ہوا تھا۔ میں نے بین پر ہاتھ اور منہ دھویا۔ بال بنائے۔ گھوم پھر کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا، جس کی ہر چیز نفاست اور امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اتنے میں ملازمہ کھانا لے کر آ گئی جو مٹن قورمہ، چپاتی اور کھیر پر مشتمل تھا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ کھانے کے فوراً بعد چائے آ گئی اور اس وقت واقعی چائے کی طلب بھی محسوس ہو رہی تھی۔

چائے کے ساتھ ہی ارسلان صاحب بھی تشریف لے آئے۔

”سوچا کھانا تو نہیں آپ کے ساتھ کھاسکا چلو چائے ہی آپ کی کپنی میں پی لوں۔“ وہ میرے سامنے بیٹھ گئے

اور اپنا کپ اٹھالیا۔

”جی بہت اچھا کیا آپ نے۔“ میں نے ان کا دل رکھنے کو کہا۔

”رمضان تم ایسا کرو۔ ٹی وی لاؤنچ میں رکھے رینک کے اوپر دو ڈبے پڑے ہیں وہ لے آؤ۔“ انہوں نے اپنے

ملازم کو کہا تو وہ ”جی اچھا جی“ کہہ کر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں جوتوں والے دو ڈبے تھے۔ وہ ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا تو ارسلان صاحب بولے۔

”لہجے خاور صاحب آپ کے لیے اس ناچیز کی طرف سے حقیر سا تحفہ، قبول کریں۔“

”کیا؟“ میں دنگ رہ گیا۔ ”کیسا تحفہ ارسلان صاحب۔“

”بھائی میرے جوتوں والے ڈبوں کے اندر جوتے ہی ہوں گے نا! اور آپ کیا سمجھتے ہیں میں نے پچھلی مرتبہ آپ سے آپ کے پاؤں کا نمبر ایسے ہی پوچھ لیا تھا، بغیر کسی وجہ کے۔ میں نے آپ کو کہا تو تھا کہ میں اپنی فیکٹری کے تیار کردہ جوتے آپ کو تحفے میں دوں گا۔“

”ارسلان صاحب آپ نے بہت زیادہ کر دیا۔ میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔“

”کیسی شرمندگی..... دیکھیں آپ ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں اب۔ آپ ڈبے کھول کر جوتے پہن کر دیکھیں۔ ڈیزائن پسند نہ آئے یا سائز ٹھیک نہ ہو تو ڈونٹ وری، تبدیلی کر لیں گے۔ گھر کی بات ہے۔“

میں ڈبے کھول کر جوتے دیکھنے لگا جو واقعی اعلیٰ معیار کے انتہائی آرام دہ تھے۔

”پاؤں میں ڈال کر دیکھیں جناب۔“ ارسلان صاحب بولے۔

میں نے باری باری دونوں جوڑے پاؤں میں ڈالے۔ اٹھ کر چند قدم چل کر دیکھا۔ دونوں ایک دم فٹ تھے۔

”جوتے تو بہت اچھے ہیں مگر ارسلان صاحب.....“

”جوتے اچھے ہیں تو کیا میں اچھا نہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”آپ تو اتنے اچھے ہیں کہ میرے پاس تعریف کرنے کے لیے الفاظ نہیں۔ مگر آپ کی اس قدر محبت وہ بھی

ایک انجان آدمی سے..... میری سمجھ سے باہر ہے۔“ میں نے دل میں آئی بات منہ پر کہہ دی۔

میری بات سن کر وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ”دیکھئے خاور صاحب انسان کو پہچاننے کے لیے ایک ملاقات ہی کافی ہوتی

ہے۔ میرے بارے میں مشہور ہے کہ میں مردم شناس ہوں۔ چہرہ دیکھ کر انسان کو جان لیتا ہوں۔ آپ سے مل کر، باتیں کر

کے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹیکسی آپ شاید کسی مجبوری کے تحت چلا

رہے ہیں۔ بہر حال کوئی کام بھی برا نہیں ہوتا۔ اسے کرنے والا اچھا یا برا ہوتا ہے۔“

اس غیر سنجیدہ انسان کے منہ سے اتنی سنجیدہ بات سن کر بہت اچھا لگا۔ میں اس سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔

”ارسلان صاحب آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ ایک دم اچلے اور صاف سترے۔“

”خاور صاحب میرا بھی آپ کے بارے میں یہی خیال ہے اور ہاں آئندہ کبھی اپنے آپ کو غیر مت کہیے گا۔“

آج سے آپ میرے دوست ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھیے گا۔“ فوراً جذبات سے میری آنکھیں بھرا آئیں۔

اتنے میں ملازم نے آکر پیغام دیا کہ روزینہ بی بی کہہ رہی ہیں کہ اب چلنا چاہیے۔

میں اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”او کے ارسلان صاحب، پھر ملیں گے۔“

”ضرور..... انشاء اللہ۔“ وہ میرے گلے ملے اور پھر میرے ساتھ پورچ تک آئے۔ اتنے میں روزینہ اور اس کی

بہن شاہینہ بھی باہر آگئیں۔ ایک دوسرے سے گلے ملیں اور پھر روزینہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اگلی سیٹ پر ملازم میرے جوتے

رکھ گیا تھا۔ میں گاڑی ریورس کر کے باہر لے آیا اور پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ ارسلان صاحب کی محبت دیکھ کر دل بوجھل سا ہو گیا تھا۔ اتنا میر ہونے کے باوجود گھمنڈ یا تکبر پاس سے نہیں گزرا تھا اس بندے کے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی تک دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بغیر کسی غرض اور مطلب کے کسی غیر سے اس قدر محبت اور اپنائیت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان کافی دیر خاموشی رہی تو گفتگو کا آغاز روزینہ نے کیا۔

”خاور صاحب! آپ شادی شدہ ہیں نا!“

”جی میڈم، آئی ایم میریڈ۔“

”بچے کتنے ہیں؟“ اس کا اگلا سوال۔

”تین بچے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔“

”کتنا عرصہ ہو گیا ہے شادی کو؟“

”سات سال۔“

”بیوی کیسی ہے آپ کی؟“ اس کے لہجے سے اشتیاق چھلک رہا تھا۔

”جیسی بیویاں ہوتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”خوفناک، بد مزاج، بڑائی بھگڑے کی ماہر۔“

”ارے ارے.... یہ آپ نے بیویوں کا کیا نقشہ کھینچ دیا۔“ وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔

”اسی فیصد تو ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ اس کو ہنستا دیکھ کر میں بھی مسکرانے لگا۔

”اور باقی بیس فیصد کیسی ہوتی ہیں؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”آپ جیسی....“ میں نے برجستہ جواب دیا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

میں نے آئینے میں دیکھا تو اس کے چہرے پر تو سقرح کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پھر طویل خاموشی کا وقفہ آ گیا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی بات شروع کرے، مگر اس نے تو چپ رہنے کی قسم کھالی تھی۔ کہیں اسے میری بات بری تو نہیں لگ گئی۔ میرے دل میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔

خاصے پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ ہیں۔ ایسی باتوں کو برا نہیں سمجھتے اور میں نے کون سی غیر معمولی یا غیر اخلاقی بات کی ہے۔ میں خود کو تادلیس دے دے کر تسلی دے رہا تھا۔ پھر میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی ڈالا۔

”میڈیم! آپ کو میری کوئی بات بری تو نہیں لگی۔“

”ارے نہیں، بالکل نہیں۔ آپ تو بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی تو میری بھی جان میں جان آئی۔

”آپ کو کیسے فیل ہوا کہ مجھے کوئی بات بری لگی ہے۔“

”وہ.... آپ ایک دم سے چپ ہو گئیں تو میں نے سوچا شاید.....“

”میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ بقول آپ کے میرا شمار بیس فیصد والی عورتوں میں ہوتا ہے تو پھر مجھے تو اپنے گھر میں

خوش و خرم اور آباد ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ میں طلاق کا طوق گلے میں ڈالے ماں، باپ کی دہلیز پر بیٹھی ہوں۔“ وہ افسردہ ہو گئی۔

پتا نہیں کیوں اسے غمگین دیکھ کر میرا دل بھی بوجھل ہو جاتا تھا اور اسے خوش دیکھ کر میں بھی مسکرانے لگتا تھا۔ اب اسے اداس دیکھ کر سوچ رہا تھا ایسی کون سی بات شروع کروں جس سے اس کا من بہل جائے۔

”آپ کے بہنوئی ارسلان صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔“

”ہاں ارسلان واقعی بہت اچھا ہے۔ غیروں میں سے ہے۔ میرا مطلب ہے شاہینہ کی شادی سے پہلے ہمارا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاہینہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پڑھتی تھی اور یہیں ہوٹل میں رہتی تھی۔ ارسلان بھی پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور پھر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہماری طرف سے تو کوئی مخالفت نہیں ہوئی کیونکہ مخالفت کرنے والے ہوتے ہیں بھائی یا پھر والد اور ہم ان دونوں رشتوں سے محروم ہیں۔ ہاں البتہ ارسلان کے والدین اور بہن بھائیوں نے خاصی مخالفت کی تھی۔ مگر ارسلان کی اٹوٹ محبت کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی اور سب کو مانتے ہی بنی اور شادی کے بعد بھی ارسلان کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ وہ ہم دونوں بہنوں کو بھی اپنی بہنیں سمجھتا ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے ہمارا بھائی تو نہیں، مگر بھائی جیسا ضرور ہے۔“ اس نے بات ختم کی تو میں ارسلان کا پہلے سے بھی زیادہ فین ہو چکا تھا۔

پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ..... ہم دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے کہ روزینہ کی خوبصورت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”خاور صاحب!“

”جی میڈم۔“

”آپ مجھے گاڑی چلانا سکھائیں گے۔“

اس کی بات سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں خاموش رہا تو وہ پھر بولی۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”اگر آپ سیکھنا چاہتی ہیں تو ضرور سکھاؤں گا۔“

”میں سوچ رہی ہوں کہ گاڑی خرید لوں، لیکن اس سے پہلے ڈرائیونگ سیکھنی پڑے گی اور بھلا آپ سے بہتر کون

مجھ ڈرائیونگ سکھا سکتا ہے۔ ہے نا!“

اس کی بات سن کر میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا۔

”یہ تو ذرہ نوازی ہے آپ کی.... ورنہ بندہ کسی کام کا نہیں۔“

”آپ کی باتیں سن کر ایسا لگتا ہے جیسے آپ شاعر ہیں۔ کیا میرا اندازہ درست ہے۔“

”شاعری کرتا تو نہیں البتہ پڑھتا شوق سے ہوں۔ تمام اچھے شاعروں کو پڑھ چکا ہوں۔“

”ارے واہ آپ تو خاصے باذوق انسان ہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے منہ سے شعر و شاعری کی باتیں عجیب سی لگتی

ہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا۔ ایک باذوق اور تعلیم یافتہ انسان ٹیکسی ڈرائیور نہیں ہو سکتا کیا۔“

”ہو سکتا ہے.... کیوں نہیں ہو سکتا۔“ میرے برجستہ جواب سے وہ بوکھلا گئی۔

باتیں کرتے کرتے کیسے سفر کٹ گیا، محسوس ہی نہ ہوا۔ ان کے گھر کے آگے گاڑی کھڑی کی تو بولا۔

”بیچے میڈم آپ کا گھر آ گیا۔“

”آپ گاڑی سائیڈ پر کر کے بند کریں اور نیچے اتریں۔“ اس نے گویا حکم دیا۔

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ آپ میرے ساتھ گھر کے اندر جا رہے ہیں اور وہاں ہم اکٹھے بیٹھ کر ایک ایک کپ چائے کا پیئیں

گے۔“

”اوہ..... نہیں میڈم آپ تکلف میں نہ پڑیں۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

”آج تو آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔ نو اگر مگر نوٹال مٹول۔“

”اوکے۔ اگر آپ ضد کر رہی ہیں تو.....“ میں نے گاڑی کھڑی کی اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ دروازے پر

پہنچ کر اس نے بیل بجائی تو اسی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ بہن کے ساتھ مجھے کھڑا دیکھا تو تھوڑی حیران ہوئی، پھر مسکرانے لگی۔ روزینہ اندر داخل ہو گئی مگر میں باہر کھڑا تھا۔ کسی کے گھر میں جاتے ہوئے جھک ہو رہی تھی۔ روزینہ نے پلٹ کر دیکھا تو بولی۔

”آئیے نا، رک کیوں گئے۔ آپ تو عورتوں کی طرح بی ہو کر رہے ہیں۔ ابھی یہاں آپ کی عزت کو کوئی خطرہ

نہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور میں جھل سا ہو کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ گھر باہر سے تو خوشنما تھا ہی، اندر سے بھی بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ یہ تقریباً پانچ مرلے کا تین منزلہ گھر تھا۔ چلی منزل پر دو بیڈروم، ایک کچن اور ایک ڈرائنگ روم تھا۔ وہ مجھے ٹی وی لاؤنچ میں لے گئی جہاں ایک معمر خاتون صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ بزرگ خاتون شکل و صورت سے ان کی امی لگ رہی تھی۔ روزینہ نے میرا تعارف اپنی امی سے کروایا۔

”امی یہ خاور صاحب ہیں۔ بہت شریف اور اچھے انسان ہیں۔ اور خاور صاحب یہ میری امی ہیں۔ بیمار رہتی

ہیں۔ شوگر کی مریضہ ہیں۔ ہفتے میں دو دفعہ ان کے گردے واش کرواتے ہیں۔“ میں نے بڑی بی کے سامنے سر جھکایا تو انہوں نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

”یہ میری سب سے چھوٹی بہن ارینہ ہے۔“ وہ نٹ کھٹ نظر آنے والی لڑکی پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔ یہ ارینہ ہے اور یہ سائیکالوجی میں ماسٹر کر رہی ہے۔ لاسٹ اسیر میں پڑھ رہی ہے۔“

ارینہ اور روزینہ دونوں حیران ہو گئیں۔ ”آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟“ روزینہ نے حیرت سے پوچھا۔

”لاہور آپ نے ارسلان صاحب کے گھر میں بتایا تو تھا۔“

”اوہ..... اچھا..... میں بھول گئی تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”ویسے آپ کی یادداشت تو غضب کی ہے۔“

”آپ کہہ سکتی ہیں۔“ میں اعتماد سے بولا۔

”چلے ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ ارینہ تم دو کپ چائے بنا کر لے آؤ اور ہاں چائے کے ساتھ کچھ ہلکا

پھلکا تل لو۔ خاور صاحب پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے ہیں۔“

”خالی چائے ہی ٹھیک ہے۔ کسی تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔“

ہم، انگ روم میں آ بیٹھے۔ ڈرائنگ روم بھی بہت صاف ستھرا اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔
 ”بی خاور صاحب.... اب بتائیں کن شعرا کا کلام آپ شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں بھی اردو ادب کی لیکچرار ہوں۔ آپ سے گہرا تعلق اور وابستگی ہے۔“
 ”ویسے تو میں نے ہر معروف شاعر کو پڑھ رکھا ہے مگر فراز احمد فراز، حبیب جالب، مرزا غالب اور علامہ اقبال میرے لیورٹ ہیں۔“

”بہت خوب، یہ سب بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ ان سب کو میں نے پڑھا ہے۔ مگر اردو ادب میں جو مقام و مرتبہ غالب کا ہے وہ کسی دوسرے شاعر کا نہیں۔“
 ”جی بالکل۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کی تائید کی۔ ”غالب کا کلام بہت اچھوتا اور دل کو چھو لینے والا ہے۔“ میں پپ ہوا تو وہ بولی۔

”مرزا اسد اللہ خاں غالب، اپنے عہد سے لے کر آج تک اپنے اچھوتے طرزِ بیاں کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری عام فہم ہونے لے اور بہت خاص، بہت منفرد ہے۔ بقول ان کے۔

ہائے جاں ہے غالب! اس کی ہر بات
 مہارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا
 کسی اور کی نہ، ارشاد فرماتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
 لہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
 ان کا اشارت آمیز شعر جس میں اپنے متعلق کہتے ہیں۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
 کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟“

”اب اس نے غالب کو بہت اچھے انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔“ میں روزینہ کے اندازِ گفتگو سے واقف ہو کر ہنس رہی تھی۔

”اس نے مسکرا کر کہا اور اتنے میں ارینہ چائے لے کر آ گئی۔ وہ چائے رکھ کر واپس چلی گئی تو روزینہ نے اچھا لہجہ میں لپ اٹھا کر مجھے پیش کیا۔ پھر اپنا کپ اٹھا کر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آج ہم آپ کے فیورٹ شاعر، مولانا مبین ٹائٹل کریں گے۔ اب بات کرتے ہیں احمد فراز کی۔“

احمد فراز کو فیض صاحب کے بعد اس عہد کا مقبول ترین شاعر کہا جاتا ہے۔ جوان ہوں یا بوڑھے، خواتین ہوں یا مرد، ان کی دہان انگیز شاعری کے دلدادہ ہیں۔ ان کے کلام میں قدیم شعراء کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے فارسی، ہندی، فارسی پر انہیں مکمل دسترس حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں فارسی کی تراکیب بہت نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی فیض صاحب کی طرح ایک باغی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ فیض صاحب نے مزاج کی مثالیں، مطابق باغیانہ نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں اور احمد فراز کی باغیانہ آواز میں تلخی، ترشی اور شعلوں جیسی سنگتی کیفیت

پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک رومان پرورا احساس بھی محسوس ہوتا ہے۔ فیض صاحب نے ان کے کلام کے متعلق کہا تھا کہ ”بیک وقت غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی وسیع دنیا سے آگہی اور اس کی تفسیر ایک مشکل کام ہے، مگر احمد فراز اس میں بہت کامیاب ہیں۔“

وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوئی۔ چائے کے دو تین گھونٹ بھرے اور پھر کہنے لگی۔
 ”فراز اپنے عہد کے بے حد مقبول شاعر تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان کی کتابیں ساتھ لیے پھرتے تھے۔ فراز کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کے اشعار پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ خود آپ کی آپ بیتی ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کر یاد آیا ہے
 کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں

یا پھر یہ کہ۔

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
 ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

یا پھر۔

لاکھوں چاہنے والے ہوں جس کے فراز
 وہ کیا محسوس کرے گا ایک ہماری کمی کو
 وہ رک گئی۔ ”کہیں میں آپ کو بورتو نہیں کر رہی۔ عادت ہو گئی ہے نالیکچر دینے کی۔“ یہ کہہ کر وہ تہقیر لگا کر ہنسنے لگی۔

میں جو اس کی خوبصورت باتوں میں کھو گیا تھا، چونکا۔ ”اگر آپ اتنے دلچسپ انداز میں لیکچر دیتی ہیں تو میں یہ لیکچر تمام عمر سننے کے لیے تیار ہوں۔“

میری بات سن کر وہ جھینپ گئی۔ مجھے بھی اپنی حماقت کا فوری احساس ہو گیا، فوراً بولا۔ ”آپ بہت خوبصورت گفتگو کرتی ہیں۔ دل چاہتا ہے آپ بولتی رہیں اور میں سنتا رہوں۔“

”شکریہ، اس عزت افزائی کے لیے۔“ وہ مسکرائی اور اپنا خالی کپ میز پر رکھا اور پھر مجھے بھی یاد آیا کہ میں بھی خالی کپ پکڑے کب سے بیٹھا ہوں۔ میں نے بھی کپ میز پر رکھا اور بولا۔

”میڈم..... اگر آپ کے پاس تھوڑا وقت اور ہے تو باقی دو شاعروں پر بھی تھوڑی روشنی ڈال دیں۔ نوازش ہو گی۔“ میں بڑے مودبانہ انداز میں بولا تو وہ ہنسنے لگی۔

”اتنی تابعداری تو آج تک میرے کسی شاگرد نے بھی نہیں دکھائی۔“

”تو پھر مجھے بھی آج سے اپنا شاگرد ہی سمجھ لیں۔ آپ کی فصاحت و بلاغت سے تھوڑا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں مذاق کرتے ہیں۔ آپ تو خود بڑے باشعور اور باذوق انسان ہیں۔“

”دیکھیں.... اب آپ کس نفسی سے کام لے رہی ہیں۔ آپ علم و ادب کا بہتا ہوا دریا ہیں اور میری مثال آپ کے

سامنے ایک قطرے کی سی ہے۔ ہاں تو باقی دو شاعروں کے متعلق کیا کہتی ہیں۔“
”باقی دو شاعر.....“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”ڈاکٹر اقبال اور حبیب جالب۔“ میں نے فٹ سے یاد دلایا۔

”ڈاکٹر اقبال کے متعلق جہاں تک سوال ہے تو وہ ایک ایسی شخصیت تھے جن کی زندگی کا ہر گوشہ ہمارے سامنے رخ روشن کی طرح عیاں ہے۔ شاعر مشرق، مفکر اسلام کے کلام نے ہم ہندوستانی مسلمانوں پر تو کوئی خاص اثر نہیں کیا۔ حالانکہ اقبال کے عاشقوں اور مداحوں کی کمی نہیں ہے، جو اٹھتے بیٹھتے اقبال کے اشعار پڑھتے اور سردھنتے رہتے ہیں۔ علامہ کا احترام بھی ہم سب مسلمان کرتے ہیں اور ان سے دلی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے کلام اور فلسفے کو زندگی میں اپنانے کا تعلق ہے، اس معاملے میں ہم سب صفر ہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کا شہرہ ساری دنیا میں ہے۔ اہل ایران اقبال کو فارسی کا نامور اور صفِ اول کا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اقبال کا کلام ایران میں عام ہے بلکہ پاکستان سے زیادہ مقبول ہے اور ایرانی اقبال کو اپنا ہی شاعر سمجھتے ہیں۔ کاش ہماری قوم بھی اقبال کے کلام کی روح کو سمجھے اور اللہ تعالیٰ اس کو کلامِ اقبال سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔“

”آمین.....“ میں نے بھی صدقِ دل سے آمین کہا اور اب تھوڑا ذکر حبیب جالب کا بھی ہو جائے۔ میں نے فرمائش کر دی جو اس نے پوری بھی کر دی۔ وہ بولنے لگی۔

”حبیب جالب کو باغی شاعر کہا جاتا ہے۔ موجودہ نظام سے انہیں نفرت تھی۔ انہیں زیادہ شہرت صدر ایوب کے زمانے میں ملی۔

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

ایسی نظم لکھنا بڑی جرأت کی بات تھی۔ ایک آمر کو اس طرح للکارنا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہ نظم کسی جگہ شائع تو نہیں ہوئی مگر سینہ بہ سینہ پاکستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ یہ سچ ہے کہ جالب ایک نڈر اور بے خوف شاعر تھا۔ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز سننے والوں کے اندر ایک ہیجان اور جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔ ان کا یہ شعر میرا پسندیدہ ہے۔

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں، یہی بات بڑی بات ہے پیارے

انہوں نے اپنے عہد کے ہر آمر کے خلاف بے خوف ہو کر آواز اٹھائی تھی۔ ایوب کے بعد جنرل یحییٰ خاں نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے یہ غزل کہہ ڈالی۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص تخت نشین تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقین تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

کوئی شعلہ، کوئی شبنم، کوئی مہتاب جیہیں تھا
اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لیے دل کو
اک زمانے میں مزاج اُن کا سر عرش بریں تھا
چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے، کوئی زندان تو نہیں تھا
لیجے آپ کی فرمائش پوری کردی۔“ وہ مسکرائی۔

”بہت شکریہ آپ کا۔“ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔“
”کوئی بات نہیں۔ آپ جیسے نفیس اور با ذوق لوگ ہر روز کہاں ملتے ہیں۔“ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

”اب تو یہ آنا جانا اور ملنا ملنا ہوتا رہے گا۔ ظاہر ہے آپ جہاں بھی جائیں گی میرے ساتھ ہی جائیں گی۔“ میں
پورے یقین سے بولا تو وہ مسکرانے لگی۔ ”آف کورس آپ کے ہوتے ہوئے کسی اور کے ساتھ کیوں جاؤں گی۔“ اس نے
کچھ اس انداز سے کہا کہ دل خواہ خواہ خوش گمانیوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔

”جب بھی آپ کو میری ضرورت پڑے مجھے کال کر لیں۔ میرا نمبر تو ہے نا آپ کے پاس۔“
”یقیناً ہے، جیسی تو آپ کو آج صبح فون کر کے بلایا تھا۔“ وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی اور میں اس کی بات سن کر
شرمندہ ہو گیا۔

”اوہ ہاں..... یہ بات ذہن سے ہی نکل گئی۔ اوکے میں چلتا ہوں۔“ وہ دروازے تک میرے ساتھ آئی۔
”خدا حافظ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے جواباً کہا اور دروازے میں کھڑی رہی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔
دیکھا تو وہ ابھی تک دروازے میں کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے پیچھے ہو کر دروازہ بند
کر دیا۔

میں رات کو اُٹھ بچے گھر پہنچا۔ نہا کر کپڑے بدلے، کھانا کھایا۔ تھوڑی دیرامی اور بچوں کے پاس بیٹھائی دی
دیکھتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کیں تو روزینہ کا خوش جمال چہرہ نظروں کے آگے آ گیا۔ اس کا
مسکرانا، اس کا ہنسا، اس کا دیکھنا۔ ساتھ ہی اس کی خوبصورت آواز اور عالمانہ گفتگو کانوں میں رس گھولنے لگی۔
کیا عورت ہے یار ہر لحاظ سے مکمل۔ اس کے خاندن نے اسے کیوں چھوڑا ہوگا۔ آخر کیا بات ہوگی۔ ویسے تھا کوئی
بدقسمت انسان جو ایسے ہیرے کی قدر نہ کر سکا۔



دوسرے دن تمام وقت کھویا کھویا سا رہا۔ طبیعت بے چین سی رہی۔ بار بار دل میں خواہش ابھرتی کہ روزینہ کے
پاس جاؤں، اس کے پاس بیٹھوں، اس کی باتیں سنوں اور اس کی طرف دیکھتا رہوں۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود حیران تھا۔
اس دن بھی مجھے لاہور کی سواری مل گئی۔ اسے لاہور چھوڑ کر واپس خالی آنا تھا۔ لاہور سے واپس آتے ہوئے تمام راستہ اس
کی یادیں میرے ہمراہ رہیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ گھر اپنے جانے کے بجائے اس کے گھر چلا جاؤں۔ مگر جاتا تو کس بہانے

سے، کس حق سے جاتا۔

تیسرے دن حالت پہلے سے زیادہ نازک ہو گئی۔ یہ خواہش اور زیادہ زور پکڑنے لگی کہ جا کر اس کا دیدار کروں۔ کیسے جاؤں، کیا کروں۔ اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔ اتنا کمزور تو میں کبھی نہ تھا کہ نفس کے بے لگام جذبوں کے سامنے سر جھکا دیتا۔ تو پھر اب نہ جانے کیوں نفس کی سرکش لہروں کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہو رہا تھا۔ خود سے لڑتے لڑتے جسم بخار کی حدت سے پھکنے لگا۔ دوپہر تک گھر آ گیا اور بستر پر گر گیا۔ شام تک طبیعت کافی بگڑ چکی تھی۔ امی نے واویلا مچایا تو بڑے بھائی زبردستی ساتھ گئے اور ایک اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کر دوائی لائے۔

چوتھے دن طبیعت کافی حد تک سنبھل چکی تھی، مگر کام پر جانے کو دل نہ چاہا۔ ویسے بھی نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ موبائل ہاتھ میں پکڑتا، روزینہ کا نمبر نکالتا، دل چاہتا ڈائل کروں مگر ہمت نہ ہوتی۔ اگر ڈائل کر لیتا تو وہ ریسپونڈ کرتی تو کیا کہتا۔

پھر دل میں دعائیں مانگتا کہ اللہ کرے اسے کہیں جانے کی ضرورت پیش آ جائے اور وہ مجھے کال کر کے بلائے۔ آخر چھ دن میری دعائیں رنگ لائیں۔ اس کی کال آئی تو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ فوراً مسرت سے آواز کانپ رہی تھی۔

”جی میڈم۔“ میں نے کانپتی آواز سے کہا۔

”کیسے ہیں خاور صاحب؟“ اس کی مترنم آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔

”اب ٹھیک ہوں میڈم۔“ میں بوکھلا کر بولا تو وہ چونکی۔

”کیا مطلب؟ کیا آپ بیمار تھے؟“

میں اپنی حماقت پر شٹایا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ ”جی ہاں، بخار ہو گیا تھا۔“

”کب؟“

”دو دن پہلے۔ مگر اللہ کے فضل سے بالکل صحت یاب ہوں۔“ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنا ارادہ نہ بدل دے۔

”مجھ ناچیز کو کیسے یاد کیا؟“

”لاہور جانا تھا۔ سعد کے ہوٹل سے فون آیا ہے کہ وہ مجھے بہت یاد کرتا ہے۔ ملنے کی ضد کر رہا ہے۔ سوچا کہ جا کر مل آؤں۔ ابھی نیا نیا ہے، آہستہ آہستہ دل لگا لے گا۔ اب آپ کی طبیعت خراب ہے تو پھر دو دن ٹھہر جاتے ہیں۔“

”نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ ہم آج ہی چلتے ہیں۔ بچہ ہے پریشان ہو رہا ہوگا اور میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے بتایا ہے نہ کہ معمولی سا بخار تھا۔“

”اچھا..... تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ آدھے گھنٹے تک آجائیں۔ میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔“

”اوکے میڈم، میں آ جاتا ہوں۔“ فون بند کر کے دل چاہا کہ ایک زوردار نعرہ ماروں۔ پھر خود پر کنٹرول کیا کہ صوفیہ اور امی کیا سوچیں گی۔ ویسے بھی اب میں بیس تینتیس سال کا میچورڈ مرد ہوں، کوئی اٹھارہ بیس سال کا کھنڈر لاڑکا نہیں جو ہلڑ بازی کرتا پھروں۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں ان کے دروازے کے آگے کھڑا تھا۔ ڈور بیل کے نتیجے میں پھر وہی لڑکی نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور غائب ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ شعلہ جوالہ بنی دروازے سے نکلی۔ وہ ہلکے پیلے رنگ کے سوٹ میں آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے بہت جاذب نظر لگ رہی تھی۔ میں ہونٹ بنا گاڑی کے پاس کھڑا اسے تنکے جا رہا

تھا، حالانکہ کسی کو خصوصاً کسی عورت کو یوں بے باک نظروں سے گھورنا بد اخلاقی اور بد تہذیبی سمجھا جاتا ہے اور وہ بھی ایسی نفیس اور با ذوق خاتون کو۔ جب وہ میرے پاس آکر ”السلام علیکم“ بولی تو تب میں ہوش کی دنیا میں واپس آیا۔ فٹ سے پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھ چکی تو آکر اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ بیک مرر کو اس کے چہرے پر فوکس کیا اور گاڑی اشارت کرنے لگا۔

راستہ بھر ہم سیاست اور ملکی حالات پر بات چیت کرتے رہے۔ تمام راہ میں اسے آئینے میں چوری چھپے دیکھتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے میری چوری پکڑ لی، یعنی جب میں اسے دیکھتا عین اسی وقت وہ بھی دیکھنے لگتی۔ میں نخل سا ہو کر نظریں چرانے لگتا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ جاتی۔

اسی طرح لاہور پہنچ گئے۔ سعد سے ملے۔ روزینہ نے اسے ڈھیروں پیار کیا اور دلاسا دیا۔ کچھ وقت اس کے ساتھ گزار کر ہم باہر نکل آئے۔ اب سعد خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ماں سے دور کبھی اتنی دیر رہا نہیں تھا، جس کی وجہ سے اپ سیٹ تھا۔ نکلنے کے وقت میں نے بھی سعد کو پیار کیا، اسے سمجھایا۔ باہر آئے تو میں نے پوچھا۔

”جی میڈم، ارسلان صاحب کے ہاں جانا ہے کہ سیدھے گھر واپس چلیں۔“

”ہوں..... میرا خیال ہے آج سیدھے گھر ہی واپس چلتے ہیں۔“

”اوکے.....“ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں نے گاڑی کو جرناوالہ کی طرف موڑ دی۔

راستے میں جب مرید کے قریب پہنچے تو روزینہ نے کہا کہ خاور صاحب گاڑی روکیں۔

”خیریت۔“ میں نے پوچھا۔

”بالکل خیریت ہے۔ دوپہر کے تین بج رہے ہیں۔ لُج کریں گے۔“

میں نے دیکھا کہ اس نے ایک ریسٹورنٹ کے پاس ہی گاڑی رکوائی تھی۔ میں نے گاڑی ہوٹل کے آگے جا کر پارک کی اور دونوں ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل کا ہال کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا اور یہاں بہت پرسکون ماحول تھا۔ زیادہ ٹیبل خالی پڑے تھے۔ جن پر بیٹھے لوگ بھی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم بھی ایک کونے والی ٹیبل کی طرف بڑھے۔

ہم بیٹھ چکے تو ایک بیواہماری طرف لپکا۔

”جی سر!“ وہ میری طرف متوجہ تھا۔

”بھائی میڈم سے پوچھو۔“ میں نے روزینہ کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں خاور صاحب، آج آپ آرڈر کریں۔“ وہ مسکرائی۔

”اب مجھے کیا پتا آپ کو کھانے میں کیا کیا پسند ہے۔“ میں زور سے ہورہا تھا۔

”جو آپ کو پسند ہے وہی میں کھالوں گی۔ بے دھڑک ہو کر منگوائیں۔“

”اچھا۔“ میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر میں نے منن کڑاہی اور چکن بریانی کا آرڈر دے دیا۔ وہ آرڈر لے کر چلا گیا

وہ میرے بچوں کے متعلق، صوفیہ کے متعلق پوچھنے لگی۔ میرے دل میں بھی بار بار خیال آتا کہ میں اس سے اس کے سابقہ ٹوہر کے متعلق پوچھوں کہ وہ کیا کام کرتا تھا، کیسا آدمی تھا، طلاق کس وجہ سے ہوئی، مگر یہ باتیں میرے لبوں تک آتے آتے مٹ توڑ دیتیں۔ مجھے ڈرتھا کہ کہیں میری کسی بات سے اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے اور ویسے بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس

موضوع کو چھیڑنا پسند نہیں کرتی تھی۔

کھانا آگیا۔ ہم دونوں چپ چاپ کھانا کھاتے رہے۔ میں اپنی جیب کا حساب لگا رہا تھا کہ میری جیب میں اتنی سکت ہے کہ کھانے کا بل ادا کر سکے یا نہیں۔ اب میرے سامنے وہ بل ادا کرتی تو میری مردانہانہ مجروح ہوتی اور اگر میں بل ادا کرتا تو میری جیب دہائی دیے لگتی۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا کہ بل بہر حال میں ہی دوں گا۔ کھانے کے بعد جب ویٹر ایک پلیٹ میں بل رکھ کر لایا تو میں نے جلدی سے بل اچک لیا۔ روزینہ کا ہاتھ بڑھا ہی رہ گیا۔

”ارے خاور صاحب، بل میرے حوالے کریں۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں۔ بس دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے بل دیکھا اور جیب سے والٹ نکال کر پیسے نکالنے لگا۔

”خاور صاحب پلیر، آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی بات سنی آن سنی کرتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کیا، اسے پیسے دیئے اور کہا کہ باقی بطور ٹپ رکھ لو۔

”چلیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا تو میری ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

”ارے..... آپ کو کیا ہوا؟“ میں نے حیران ہونے کی ادا کاری کی۔

”آپ نے میری بات کیوں نہیں سنی۔“ وہ غصے سے بولی۔

”کون سی بات؟“

”آپ جانتے ہیں کون سی بات۔“

”اچھا، وہ بل والی بات..... تو اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ آپ نے دیا یا میں نے دیا یا بات تو ایک ہی ہے نا۔“

”مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔“ اس کا موڈ ہنوز خراب تھا۔

”تو پھر آپ کا موڈ بحال کرنے کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟“

”آپ شرافت سے یہ پیسے رکھ لیں۔“ اس نے پیسے میری طرف بڑھائے۔

”دیکھیں آج تو میں بل ادا کر چکا ہوں۔ آئندہ کبھی کسی ہوٹل میں کھائیں گے تو بل آپ ادا کر دیجئے گا۔“ میں نے آسان ساحل اس کے سامنے رکھا۔

”کئی بات ہے نا!“

”بالکل کئی بات۔“

”چلیں تو پھر ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے پیسے واپس پرس میں رکھے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر پھر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ تھوڑا آگے گئے تو روزینہ کو جیسے کچھ یاد آگیا۔

”خاور صاحب!“

”جی میڈم۔“

”میں نے آپ کو کہا تھا کہ مجھے گاڑی چلانا سکھا دیں۔“

”ہاں تو میں نے کب انکار کیا ہے۔ جب آپ کہیں گی میں سکھا دوں گا۔ مگر میڈم اس کے لیے آپ کو تھوڑی مشکل پیش آئے گی۔“

”وہ کیا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”وہ یہ کہ ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے آپ کو میرے ساتھ میرے برابر بیٹھنا پڑے گا۔ بیٹھ جائیں گی آپ؟ میرا مطلب ہے آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لیکچرار اور میں ٹھہرا ایک ٹیکسی ڈرائیور۔ دونوں میں کوئی تال میل نہیں۔“

میری بات سن کر اُسے چپ لگ گئی۔ میں آئینے میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اچانک وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”خاور صاحب! گاڑی روکیں۔“

”جی۔“ میں حیران ہوا۔

”میں نے کہا ہے گاڑی روکیں۔“ وہ تھکسانہ انداز میں بولی تو میں ڈر گیا۔ سائیڈ پر کر کے گاڑی روک دی۔ اس نے پچھلا دروازہ کھولا اور اگلا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

”چلائیں گاڑی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو میں نے گاڑی چلا دی۔

”اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے نا! اب تو میں آپ کے برابر بیٹھی ہوں۔ اب تو ہم دونوں کے بیچ کوئی فرق نہیں ہے نا!“ اب کی بار وہ بڑے دھیمے لہجے میں بڑی لگاؤ سے پوچھ رہی تھی اور میرے دل میں جیسے جلت رنگ سے بج اٹھے۔ دل کی دھڑکن بھی اس کی قربت سے تیز ہو گئی۔

”ہاں تو اب سکھائیے۔“ وہ اپنی ضد پراڑی گئی۔

”دیکھئے گاڑی چلانے کے لیے تھوڑا وقت لگے گا۔ ایک دن میں کوئی بھی نہیں سیکھ سکتا۔ آج میں آپ کو کچھ اہم چیزیں اور اصول سمجھا دیتا ہوں۔ ایسا کرتے ہیں میں ہر روز شام کو فارغ ہو کر آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ پھر آپ کی گلی میں اور اس سے اگلی دو تین گلیوں میں گاڑی چلانے کی پریکٹس کروادیا کروں گا۔ ایک ماہ کے اندر اندر آپ ایک ماہر ڈرائیور بن جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گئی۔

باتیں کرتے کرتے ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے پھر آج چائے پلانے کی آفر کی مگر میں نے جواب دیا کہ

کل۔

”اوکے..... سی یو.....“ وہ بیک جھلاتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئی اور میں ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے کوچے سے نکل آیا۔ اس کے بعد یہ میرا معمول بن گیا۔ میں ہر رات اس کے گھر جاتا، اسے آدھا گھنٹہ ڈرائیونگ سکھاتا۔ اس کے بعد اکثر رات کا کھانا بھی وہیں کھانے لگا۔ رات گئے تک میں وہیں بیٹھا اس کی فیملی کے ساتھ گپیں مارتا رہتا۔ اس کی امی اور چھوٹی بہن مجھ سے بون گھل مل گئیں جیسے میں اُن کی فیملی کا حصہ تھا۔ اس کی ماں بہت شفیق اور نرم دل خاتون تھیں۔ وہ مجھے بیٹے کی طرح چاہنے لگیں۔ وہ رات کو آٹھ نو بجے تک اپنے کمرے میں چلی جاتیں۔ ارینہ بھی پڑھائی کرنے کے لیے اوپری

منزل پر اپنے کمرے میں چلی جاتی تو ہم دونوں اکیلے بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ کبھی لاؤنج میں تو کبھی ڈرائنگ روم میں۔ مجھے ایسے لگتا جیسے میرے دو گھر ہوں۔ ایک گھر جہاں صوفیہ اور بچے رہتے تھے اور دوسرا گھر جہاں روزینہ اور اس کی امی وغیرہ رہتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے جذبات سمجھتے تھے۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کو گنگنل دے چکے تھے مگر لبوں سے کبھی کسی بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید پہلے آپ پہلے آپ والی صورت حال تھی۔

پچھلے پندرہ دن سے وہ مجھ سے گاڑی چلانا سیکھ رہی تھی اور سکھاتے وقت کئی دفعہ ایسے ایمان شکن لمحات پیدا ہو جاتے کہ دونوں کے دل اٹھل پھٹھل ہونے لگتے۔ میں اس کی اتنی قربت سے پکھننے لگتا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور ایک کیف آور سانسور دل و دماغ پر چھانے لگتا۔ کبھی ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے مس ہو جاتے تو کبھی بازو۔ ان پندرہ دنوں میں وہ کافی حد تک سیکھ چکی تھی۔ وہ ایک ذہین عورت تھی اور کہتے ہیں اگر عورت حسین ہونے کے ساتھ ذہین بھی ہو تو خاصی خطرناک ہوتی ہے۔

اس رات بھی انہی اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا چکی تھیں۔ اریندا پر ی منزل پر اپنے کمرے میں چلی گئی تو ہم اکیلے رہ گئے۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے بھی چلنا چاہیے۔“ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے دروازے تک آئی۔ ابھی میں نے بیرونی دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس نے غمور آواز میں آہستگی سے پکارا۔ ”خاور!“

”جی۔“ میرے جاتے ہوئے قدم رک گئے۔ میں اس کی طرف پلٹا۔ وہ میرے بالکل پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اتنی پاس کہ اس کی سانس میری سانسوں میں گڈبڈھونے لگیں۔ میں مدہوش ہونے لگا۔

”آئی لو یو۔“ اس نے سرگوشی کی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے سختی سے اس کو ہٹھکنج لیا اور بے تحاشا اس کے گالوں اور ہونٹوں کو چومنے لگا۔

”آئی لو یو۔“ میں کہتا جا رہا تھا اور چومتا جا رہا تھا۔ جب میری حالت غیر ہونے لگی تو میں نے اسے خود سے الگ کیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر چند منٹ تک میں گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرتا رہا پھر گھر کی راہ لی۔ گھر جا کر بھی ساری رات کروٹیں بدل بدل کر گزار دی۔ وہ کیف آور کیفیت جیسے دماغ پر مسلط ہو گئی تھی۔ اس سے اگلے دن بھی اسی سرشاری میں گزر گیا۔ وہ خوبصورت لمحات جیسے میری یادداشت میں فریز ہو گئے تھے۔ سارا دن عجیب سی بے چینی اور کسلبندی طبیعت پر چھائی رہی۔ وقت کاٹنے نہ کٹ رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے رات ہوئی۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور منزل مقصود پر پہنچ گیا۔

آج دروازہ روزینہ نے خود کھولا تھا۔ وہ بھی شاید مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ میں نظروں سے اسے پتتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میری نگاہوں کی وارفتگی سے اس کا چہرہ گلزار ہو رہا تھا۔ آج میری ہر حرکت سے اضطراب چھٹک رہا تھا۔ کھانا بھی مجھ سے ٹھیک سے نہ کھایا گیا۔

”کیا بات ہے خاور صاحب! طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔ ٹھیک سے کھا کیوں نہیں رہے۔“ روزینہ میری حالت سے باخبر ہونے کے باوجود انجان بنی پوچھ رہی تھی۔

”طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے، بس آج بھوک نہیں ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

میں جلد سے جلد تنہائی چاہتا تھا۔ آخر آنتی اور ار مینہ اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں تو میں نے روزینہ کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ وہ کہتی رہ گئی ارے ارے، یہ کیا کر رہے ہیں آپ، کوئی دیکھ لے گا۔ حالانکہ یہ بات وہ بخوبی جانتی تھی کہ دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں لا کر میں نے اسے ساتھ لپٹا لیا۔ شادی شدہ ہونے کی وجہ سے عورت کا وجود میرے لیے نئی بات نہ تھی مگر روزینہ کا لمس میرے لیے اچھوتا اور نیا تھا۔ اس کی قربت سے میرے حواس پر وہ نشہ طاری ہو جاتا تھا، جس سے میں قطعی نا آشنا تھا۔

اس نے بمشکل خود کو میری گرفت سے آزاد کیا۔ ہم دونوں ہیجان میں ڈوبے گہری سانسیں لے رہے تھے۔

”روزینہ.....“ میں نے بوجھل آواز میں پکارا۔

”ہوں.....“ اس نے ہٹکارا بھرا۔

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یقین کرو آج سارا دن تڑپ کر گزارہ ہے۔ پلیز مجھے اپنی زندگی کا حصہ بنالو۔“ میں اس کے سامنے التجا کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔

”حالت میری بھی تم سے مختلف نہیں ہے خاور..... مگر.....“

”چھوڑا اگر مگر کو۔ آؤ ایک دوسرے میں گم ہو جائیں۔ اس دنیا میں چلے جائیں جہاں ہمیں بھی ایک دوسرے کی خبر نہ ہو سکے۔“ میں اس کے ساتھ پھر سے لپٹ گیا۔

پھر وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی اور وہاں ہم نے واقعی اس دنیا کی سیر کی جہاں سوائے سکون اور مدہوشی کے اور کچھ نہ تھا۔ ہم دونوں خود کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے حسین رات تھی جو میں کبھی بھول نہ سکوں گا۔ ہوش کی دنیا میں واپس آئے تو ایک دوسرے کی جان بن چکے تھے۔ دلوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی چومی اور رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

”کافی وقت گزر گیا ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔“

”آج نہ جاؤ۔“ وہ نشلی آواز میں بولی۔

”دل تو میرا بھی نہیں چاہ رہا۔ مگر کیا کروں مجبوری ہے۔“

”گھر فون کر کے کوئی بہانہ کر دو۔“ اس نے تجویز دی جو میرے دل کو لگی اور میں نے گھر فون کر کے صوفیہ کو بتا دیا کہ آج رات میں گھر نہیں آسکوں گا۔ دوستوں کی گید رنگ ہے، رات انہی کے ساتھ گزاروں گا۔

”اب خوش۔“ میں نے فون بند کر کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

”ہاں خوش ہوں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔“

”خاور.....“

”ہوں.....“ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”وعدہ کرو مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے۔“

”وعدہ رہا صنم۔“ میں گنگنا نے لگا۔

”سیریس ہو کر جواب دو۔ میں بہت سیریس ہو کر پوچھ رہی ہوں۔ ایک مرد کے ہاتھوں پہلے ٹوٹ چکی ہوں۔“

بڑی مشکل سے کرچیاں سمیٹ کر اپنی ذات کو پھر سے جوڑا ہے۔ پھر سے ٹوٹنے کی ہمت نہیں ہے اور اگر خدا نخواستہ ٹوٹ گئی تو دوبارہ کبھی جڑ نہ سکوں گی۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور آواز بھر گئی۔

”روز..... میں تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ کبھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گا۔ تم نے میرا دامن جن خوشیوں سے بھرا ہے، آج سے پہلے میں قطعی ان سے نا آشنا تھا۔ عورت کی محبت کیا ہوتی ہے، یہ مجھے آج پتا چلا ہے۔“ وہ مجھ سے دیوانہ وار لپٹ گئی اور پھر پوری رات محبت کے سمندر میں ہم ڈوبتے رہے، ابھرتے رہے۔ ابھرتے رہے، ڈوبتے رہے۔ میں رات کے چار بجے وہاں سے نکل آیا، کیونکہ ساڑھے چار بجے تک آنٹی نماز کے لیے اٹھ جاتی تھیں۔

گھر آیا تو امی بھی اٹھ کر نماز کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہیں سلام کیا۔ اپنے کمرے میں آیا۔ صوفیہ اور بچے ابھی سو رہے تھے۔ میں بستر پر گر اور پھر ایسا بے سدھ سو یا کہ دوسرے دن بارہ بجے آنکھ کھلی۔

صوفیہ نے اس لیے جگا نا مناسب نہ سمجھا کہ دوستوں کے ساتھ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ جب آنکھ کھلی تو دیوار گیر کلاک دوپہر کے بارہ بجارہا تھا۔ ہڑ برا کر اٹھ بیٹھا۔

”صوفیہ..... صوفیہ.....“ صوفیہ کو زور زور سے آوازیں دینے لگا۔

”کیوں شور مچا رہے ہو؟ کون سا پہاڑ گر پڑا ہے سر پر۔“ وہ دندنا تی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”یہ کیا طریقہ ہے بولنے کا، کیسے بول رہی ہو؟“ میرا پارہ چڑھنے لگا۔

”اب ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔ ”زور زور سے آوازیں دے رہے تھے۔ بس پوچھا ہے کہ کیا کام ہے اور کیا کہہ دیا ہے۔“

یہ عورت نہیں بدلنے والی..... یہ سوچ کر میں نے موضوع بدلا۔ ”میرے لیے فوراً ناشتہ تیار کرو۔ میں نہانے جا رہا ہوں۔ آج شادی والوں کی بکنگ ہے۔ ساڑھے بارہ ان کے گھر پہنچنا ہے۔“ وہ پاؤں پختی ہوئی باہر چلی گئی اور میں واش روم میں گھس گیا۔

☆.....

اس طرح روزینہ میری زندگی میں آئی اور میری زندگی کا حصہ بن گئی۔ میرے جینے کی وجہ بن گئی۔ وہ واقعی بہت باکمال عورت تھی۔ انتہائی نفیس، سلجھی ہوئی، شائستگی سے آراستہ، غصہ اسے بہت کم آتا تھا اور اگر کبھی آ بھی جاتا تو پھر بھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتی۔ بدتمیزی یا گنوار پن تو بہت دور کی بات تھی۔ اسے پا کر مجھے تو گویا دنیا جہان کی دولت مل گئی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے میرے مالی سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ فنانسی طور پر مکمل آزاد اور خود مختار تھی۔ اس کی تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس کے علاوہ شیخوپورہ کے نواح میں ان کی کافی زمین تھی جو انہوں نے بچے پردی ہوئی تھی، جہاں سے ٹھیک ٹھاک آمدنی آتی تھی۔ جوان دونوں بہنوں کے علاوہ ان کی ماں کے علاج معالجے کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔ مالی طور پر وہ مکمل آسودگی سے بھرپور زندگی گزار رہی تھیں۔

میری وہی روٹین تھی۔ شام کو سات اٹھ بجے جاتا اور رات کو دس گیارہ بجے تک گھر آ جاتا۔ میرے اور روزینہ کے تعلق کو مہینہ ہونے کو آ رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر گاڑی چلانا سیکھ چکی تھی۔ انہی دنوں سعد بھی ہوٹل سے گھر آیا ہوا تھا۔ اس کی موجودگی میں، میں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر جاتا اور واپس آ جاتا۔ کھانا بھی گھر آ کر کھاتا۔ مبادا اسے کسی بات

پر شک نہ ہو جائے کہ میرے اس کی ماں سے کوئی خفیہ تعلقات ہیں۔ ویسے اب اس کا رویہ میرے ساتھ دوستانہ ہو گیا تھا۔ انکل، انکل کہتے اس کی زبان نہ تھکتی تھی۔

تیسرے دن وہ واپس لاہور چلا گیا تو میں نے سکون کی سانس لی۔ اس رات ہمیں تنہائی ملی تو روزینہ نے میری پیش قدمی روکتے ہوئے کہا۔

”خاور! میں نے آج آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”چلو، اندر بیڈروم میں چل کر کرتے ہیں۔“ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”نہیں، بیڈروم میں نہیں۔ یہیں لاؤنج میں بیٹھ کر سنیں۔“ اس کی سنجیدگی دیکھ کر میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”کیا بات ہے روز؟ کیا کوئی اہم بات ہے۔“

”ہاں، بہت اہم ہے۔“ وہ اسی لمحے میں بولی۔ آج سعد کے جانے کے بعد امی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا

تھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ خاور تمہیں کیسا لگتا ہے؟

میں نے کہا کہ امی اچھے انسان ہیں۔

انہوں نے کہا۔ ”بیٹی وہ جتنا بھی اچھا ہو، تمہارے ساتھ اس کا کوئی رشتہ تو نہیں۔ دنیا والے کسی غیر مرد کا کسی

ایسے گھر میں آنا جانا پسند نہیں کرتے جہاں کوئی مرد نہ ہو۔ تم سمجھ رہی ہونا، میری بات۔“

”جی، امی سمجھ رہی ہوں۔ آپ کھل کر کہیں کیا کہنا چاہتی ہیں۔“

”بیٹی..... یا تو اس سے نکاح کر لو۔ اچھا انسان ہے۔ میں منع نہیں کروں گی۔ اس سے بات کرو اور اگر وہ نہیں

مانتا تو اس سے ہر قسم کا تعلق ختم کرو۔ اس میں ہم سب کی بہتری ہے۔“

”مگر امی وہ تو پہلے سے شادی شدہ ہے۔ تین بچوں کا باپ ہے۔“

”ہاں تو پھر کیا ہوا۔ اسلام نے مرد کو چار، چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے اور تم کون سا اس پر بوجھ بننے جا

رہی ہو۔ صرف اس کے نام کی چادر ہی اوڑھو گی نا۔“

میری خاموشی پر امی پھر بولیں۔ ”دیکھو بیٹی تم عاقل بالغ، پڑھی لکھی اور سمجھدار ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ مرد اور

عورت جب تنہا ہوتے ہیں تو ان کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ جو ان کو ورغلا تا ہے۔ اس سے پہلے کہ شیطان

کا میاب ہو جائے تم دونوں اس مقدس اور مضبوط رشتے میں بندھ جاؤ۔ میں نے ساری بات آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔

اب آپ بتائیں آپ کا جواب کیا ہے۔“ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میں بت بنا بیٹھا تھا۔

”آپ بولتے کیوں نہیں؟ یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ایسا زیادہ دن تک نہیں چل سکتا۔ لوگوں نے نوٹس

لے لیا تو باتیں بنائیں گے۔ ہمارے کردار پر انگلی اٹھائیں گے۔ رشتہ داروں میں بھی چمکیوئیاں شروع ہو جائیں گی۔ کہتے

ہیں نا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ تو پھر سمجھ لیں کہ ایسے معاملات زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکتے۔ اس سے پہلے کہ

ہمارا تعلق سب پر ظاہر ہو جائے ہمیں کوئی حل نکالنا ہوگا۔“ وہ اناش ہوئی تو میں بولا۔

”روز..... تم یہ بات بخوبی جانتی ہو کہ میں تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں زندگی سے نکال

نہیں سکتا۔“

”تو پھر.....“ اس نے پوچھا۔

”تو پھر یہ کہ میں تم سے نکاح کروں گا۔“ میں فیصلہ کن لہجے میں بولا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”سچ.....“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”بالکل سچ..... تمہاری جان کی قسم.....“

”شکریہ میری جان..... تم نے میرے دل سے اتنا تمہاری بوجھ ہٹا دیا۔“ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور میں وقتی طور پر سب کچھ بھول گیا۔

.....☆.....

دو چار دن سکون سے گزر گئے۔ روزینہ نے پھر نکاح کی بات چھیڑ دی۔

”خاور کب لا رہے ہیں آپ نکاح خواں کو؟ ایک نکاح خواہ لے آئیے اور دو گواہ۔ بس اللہ اللہ خیر صلا۔“ وہ بچوں کی طرح بے صبری ہو رہی تھی۔

”لے آؤں گا یا ر۔ صبر سے کام لو۔ ایسے کام چنگی بجاتے تھوڑی ہو جاتے ہیں۔“

”مگر کب۔“ اس نے پوچھا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں جتنا اس کام کو آسان سمجھ رہا تھا، اتنا آسان یہ تھا نہیں۔ نکاح کرنے کے لیے پہلی بیوی کی اجازت ضروری تھی جو وہ اپنی زندگی میں کبھی نہ دیتی۔ اور پھر میں نے اپنی امی سے بھی بات کر کے ان کو بھی رضامند کرنا تھا۔ کہنے کو تو میں نے روزینہ سے کہہ دیا تھا کہ میں تم سے نکاح کروں گا۔ مگر یہ سب کیسے ہو گا یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو ابھی اپنے گھر میں کسی قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ میں جانتا تھا جس دن صوفیہ کے کان میں اس بات کی جھنک بھی پڑ گئی ایک قیامت برپا ہو جانی ہے۔ اس نے پورا گھر سر پر اٹھا لینا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا مگر کب تک۔

”کیا سوچنے لگے؟“ روزینہ پوچھ رہی تھی۔ ”میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا۔“

”کیا پوچھا تھا بھلا۔“ میں واقعی بھول گیا تھا۔

”میں نے پوچھا تھا کہ کب ہمارا نکاح ہو گا۔ اب مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔ میں جلد سے جلد گناہوں کی اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہوں۔“

”کل امی سے بات کروں گا۔ وہ صوفیہ سے بات کریں گی۔“

”تو پھر..... کیا وہ مان جائے گی؟“

”اتنی آسانی سے تو نہیں مانے گی مگر تم فکر نہ کرو میں منالوں گا۔“ میں پورے یقین سے بولا۔

”کیا واقعی آپ منالیں گے؟“

”انشاء اللہ۔“ میں پورے عزم کے ساتھ بولا تو وہ خوش ہو گئی۔

.....☆.....

اس سے اگلے دن کوئی بنگ نہ تھی۔ آج فارغ تھا اور ویسے بھی آج میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ آج ہر حال میں امی سے بات کروں گا۔

قدرت نے موقع خود ہی فراہم کر دیا۔ بچوں کو سکول چھوڑ کر آیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر صوفیہ محلے میں درزن کے ہاں چلی گئی۔ اس نے کچھ کپڑے سلنے کے لیے دیئے تھے۔ جبکہ امی سستانے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں بھی امی کے پیچھے چلا آیا۔

”ارے خاور بیٹا آؤ بیٹھو۔“ امی مجھے پیچھے آتا دیکھ کر حیران ہوئیں۔

میں ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”امی، مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے تمہید باندھی۔

”وہ تو میں تمہیں دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی۔ ہاں کہو۔“

”امی، آپ جانتی ہیں ناکہ صوفیہ سے میری کبھی نہیں بنی۔ وہ کبھی بھی ایک اچھی بیوی ثابت نہیں ہوئی۔“

”ہاں بیٹا، جانتی ہوں مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔“ امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”مگر امی، قسمت بدلی بھی تو جاسکتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ امی کا ماتھا ٹھکا۔ ”اب تین بچوں کا باپ ہو کر تم قسمت بدلنے جا رہے ہو۔ دماغ تو ٹھیک ہے نا

تمہارا۔“

”امی، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں دوسری شادی کروں گا۔ مجھے بھی خوش رہنے کا پورا حق ہے۔“

”ارے لڑکے تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ جانتا ہے کیا کہہ رہا ہے۔“ امی کا پارہ ہائی ہوتا چلا گیا۔

”اچھی طرح جانتا ہوں۔ دوسری شادی کا کہا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے دو، دو شادیاں کی ہیں۔ میں

کوئی دنیا کا پہلا مرد نہیں جو دوسری شادی کرنے جا رہا ہوں۔“

”خاور بیٹا! ہوش کے ناخن لو۔ صوفیہ کو پتا چلا تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دینا ہے۔“ اب کی بار امی قدرے نرمی

سے بولیں تو میں نے بھی نرم لہجے میں جواب دیا۔

”امی صوفیہ کو تو بتانا ہی پڑے گا۔ میں اس سے چوری شادی نہیں کر سکتا اور پھر میں صوفیہ کو طلاق تھوڑا ہی دوں

گا۔ وہ اسی طرح، اسی گھر میں بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہے گی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”ہوں..... کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایک فیملی کے اخراجات تم بمشکل پورے کرتے ہو۔ دوسری کے کہاں سے

کرو گے۔ اے بیٹا یہ امیروں کے چو نچلے ہیں۔ غریب آدمی دو شادیوں کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”امی وہ کالج میں لیکچرار ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے اس کا۔ اسے صرف میرا سہارا چاہیے اور کچھ

نہیں۔“

”کالج میں لیکچرار ہے، کھاتے پیتے گھرانے سے ہے تو پھر تم ہی کیوں؟ شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ۔

کوئی اور کیوں نہیں؟ اسے رشتوں کی کیا کمی ہوگی۔“

”امی، دراصل وہ طلاق یافتہ اور ایک نو دس سال کے بچے کی ماں ہے۔“ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی

سے جواب دیا۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ امی بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

”امی پلیز مان جائیں۔ اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر پلیز۔“ لوہا گرم دیکھ کر میں نے فوراً ایووشنل چوٹ لگائی۔
 ”بیٹا تمہاری خوشی کی خاطر اگر میں مان بھی جاؤں تو صوفیہ ہرگز نہیں مانے گی۔ وہ ایک فساد برپا کر دے گی۔“
 ”امی اگر آپ میرا ساتھ دیں گی تو ہم دونوں مل کر اسے منالیں گے۔ اگر منت سماجت سے نہ مانے گی تو ڈرا دھمکا کر منائیں گے۔“

”ڈرا دھمکا کر۔“ امی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”ہاں، ڈرا دھمکا کر۔ میرا مطلب ہے طلاق کی دھمکی دے ڈالوں گا۔ طلاق کا لفظ سن کر مجھے نہیں لگتا کہ وہ مزید مخالفت کرے گی۔ طلاق کی لعنت سے ہر عورت ہر صورت بچنا چاہتی ہے۔“
 ”یعنی تم اسے بلیک میل کرو گے۔ ایک عورت کے عشق نے تمہیں اتنا اندھا کر دیا ہے کہ تم اپنے بچوں کی ماں کو بلیک میل کرو گے۔ نف ہے تم پر۔“ امی کا موڈ پھر سے بگڑ گیا تھا۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ایک مرحلہ تو طے ہو گیا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ طے کرنا باقی تھا اور وہی مشکل مرحلہ تھا۔ صوفیہ کے واپس آنے تک میں ذہنی طور پر خود کو تیار کر چکا تھا۔ صوفیہ اندر کمرے میں میرے پاس آ کر بیٹھی تو میں نے بات چھیڑ دی۔ پہلے چند لمحوں تک تو اسے میری باتوں کا یقین ہی نہ آیا۔ وہ ہونق بنی میری طرف بے یقینی سے دیکھتی رہی اور جب اسے یقین ہوا کہ میں سیریس ہوں، مذاق نہیں کر رہا تو اس نے وہ آہ و بکا اور گریہ زاری کی کہ درود یوار لرز اٹھے۔ میرے ہاتھوں کے بھی طوطے اڑ گئے۔ اس کاری ایکشن میری توقع سے کہیں زیادہ شدید تھا۔

یہ ہنگامہ سن کر امی بھی دوڑی چلی آئیں۔ اوپر والی دونوں منزلوں سے بھابھیاں بھی بھاگی بھاگی آئیں۔ شکر ہے کہ بھائی اس وقت اپنے اپنے آفس اور بچے سکولوں کالجوں میں جا چکے تھے۔ ورنہ سبھی یہ دلچسپ تماشادیکھتے۔ میں نے یہ صورت حال دیکھی تو گھر سے باہر نکل گیا۔ گاڑی میں بیٹھا اور ادھر ادھر آوارہ گردی کرنے کے بعد سیدھا روزینہ کے ہاں جا پہنچا۔ روزینہ نے دروازہ کھولا تو میں حیران ہوا۔ ”آج کالج نہیں گئیں کیا؟“

”نہیں، آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ فون کر کے چھٹی لے لی ہے۔“

”کیا ہوا ہے طبیعت کو؟“ میں پہلے ہی پریشان تھا، اور ہو گیا۔

”کچھ خاص نہیں، سر میں درد ہے۔“

آئیٹی حسب معمول لاؤنج میں بیٹھی تبیج پڑھ رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا تو بڑے تپاک سے جواب دیا۔ میں آئیٹی کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور آئیٹی خوشدلی سے جواب دیتی رہیں۔ جبکہ روزینہ خاموشی سے پاس بیٹھی سنتی رہی۔ وہ بھی ذہنی طور پر پریشان نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آئیٹی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے پوچھا۔
 ”کیا بات ہے؟ پریشان لگ رہی ہو۔“

”نہیں تو۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پریشان تو آپ لگ رہے ہیں۔“ اس نے الٹا مجھ

سے پوچھا۔

”ہاں یا آج واقعی بہت پریشان ہوں۔“ پھر میں نے ساری صورت حال اس کے آگے رکھ دی۔ سن کر وہ بھی

پریشان ہو گئی۔

”اب کیا ہوگا؟ آپ کی بیوی تو واقعی بڑی جھگڑالو عورت ہے۔“
 ”جھگڑالو لفظ تو بہت چھوٹا ہے اس کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”اب آپ کیا کریں گے؟“ وہ رو ہانسی ہو کر پوچھ رہی تھی۔
 ”پیارے سمجھاؤں گا، سمجھ گئی تو ٹھیک ہے ورنہ طلاق دے دوں گا۔“
 ”نہیں، آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ میری وجہ سے آپ اسے طلاق نہیں دیں گے۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

”ریلیکس یار، یہ سب اسے ڈرانے کے لیے کہوں گا۔ میرا طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہیں۔“
 ”خاور! اگر کبھی ایسا وقت آیا کہ اسے طلاق دیئے بغیر آپ مجھے حاصل نہ کر سکیں تو میں آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جاؤں گی مگر کسی دوسری عورت کی زندگی تباہ نہیں ہونے دوں گی۔ میں جانتی ہوں طلاق یافتہ عورت کن حالات کا سامنا کرتی ہے۔ کیسے کیسے سوالوں کے جواب دینے پڑتے ہیں اُسے۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی تو میں اُسے چپ کرانے لگا۔ اسے اپنے ساتھ لگا کر تھکیاں دینے لگا۔ اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”خاور، مجھ سے وعدہ کریں۔“

”کیسا وعدہ جان؟“
 ”آپ کبھی اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“
 ”اس کے لیے اگر تمہیں کھونا پڑے، تب بھی۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
 ”ہاں تب بھی۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی تو میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

☆.....

رات کو میں گھر پہنچا تو ماحول خاصا کشیدہ تھا۔ کسی نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ صوفیہ نے رورود کر آنکھیں سجالی تھیں۔ بچے بھی کھینچے کھینچے سے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے بچوں کے میرے خلاف کان بھرے ہیں۔ صرف امی نے مجھ سے کھانے کے متعلق پوچھا۔ ”مجھے بھوک نہیں۔“ میں نے یہ کہا تو وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ امی اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئیں تو میں بھی اُن کے پاس بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔
 ”امی!“

”ہوں۔“

”صوفیہ کے رویے میں کوئی چلک پیدا ہوئی کہ نہیں؟“
 ”ابھی تک تو نہیں اور سچ پوچھو تو مجھے اس کی کوئی امید بھی نظر نہیں آتی۔ تم جانتے تو ہو وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔“

”امی میں یہ شادی ہر صورت کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔“
 ”بیٹا تم شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ ہو اور ہمارے معاشرے میں شادی شدہ انسان کو سمجھوتے کے تحت زندگی گذارنی پڑتی ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔“

”بہت گذار لی سمجھوتے کے تحت زندگی، اب نہیں گذاروں گا۔ مجھے بھی خوش رہنے کا پورا حق ہے۔ امی کیا آپ نہیں چاہتیں کہ میں خوش رہوں۔ باقی زندگی آسودگی سے گذاروں۔“

”اور اگر وہ نہ مانی تو.....“ میرے اس سوال پر امی نے خاموش ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں خاموشی سے ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اپنے کمرے میں گیا تو صوفیہ سو رہی تھی یا سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ بچے اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ میں بیڈ پر لیٹا تو صوفیہ کو آواز دی۔ وہ میری طرف پیٹھ کئے سوتی بنی رہی۔ یعنی یا تو وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی یا پھر واقعی سو رہی تھی۔ مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سو نہیں رہی بلکہ سونے کی اداکاری کر رہی ہے۔

اگلی صبح بچے سکول چلے گئے۔ امی ناشتہ کر کے حسب معمول اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ فجر ٹائم اٹھتی تھیں، اس لیے ناشتے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتی تھیں۔ میں نے اور صوفیہ نے بھی خاموشی سے ناشتہ کیا۔ نہ اس نے کوئی بات کی اور نہ میں نے کوئی بات چھیڑی۔ ناشتے کے بعد وہ برتن سمیٹنے لگی تو میں نے اسے کہا۔

”صوفیہ یہ برتن کچن میں رکھ کر اندر کمرے میں آ جاؤ۔“ وہ سن کر خاموشی سے برتن اٹھاتی رہی اور میں کمرے میں آ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ میرے سامنے آ بیٹھی۔ میں سگریٹ پی رہا تھا۔ سگریٹ میں زیادہ نہیں پیتا تھا۔ بس کھانا کھانے کے بعد ایک دو پی لیتا تھا۔ میں سگریٹ پیتے ہوئے اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ الیش ٹرے میں سلا اور اپنی بات کا آغاز کیا۔

”صوفیہ میں تم سے جو بھی بات کروں گا وہ تم قتل سے، توجہ سے سنو گی۔ کل کی طرح ہنگامہ برپا نہیں کرو گی۔ سمجھ رہی ہونا میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پھر بات شروع کی۔
”دیکھ صوفیہ، میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم آسانی سے مان جاؤ گی تو تمہارے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہوں گی اور اگر مشکلیں پیدا کرو گی تو تمہاری زندگی بھی بہت مشکل ہو جائے گی۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اپنی بات کا رد عمل اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتا تھا۔

اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہنے لگے۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے روتی چلی گئی۔ اس کا رویہ میری توقع کے برعکس تھا۔ بجائے واویلہ مچانے کے اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ اسے روتا دیکھ کر میرا دل پیسجنے لگا۔ بے شک مجھے اس سے محبت نہ تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی زبان کے نشتروں سے میری روح کو گھائل ہی کیا تھا، مگر پھر بھی وہ میرے بچوں کی ماں تھی۔ میرے لیے قابل قدر تھی۔ مجھے خود پرندامت ہونے لگی۔ مجھے لگا شاید میرا بات کرنے کا انداز ٹھیک نہیں۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”صوفیہ پلیز مان جاؤ۔ تمہاری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔“ میں اپنے لہجے میں نرمی سمو کر بولا۔ ”تم بچوں کے ساتھ ایسے ہی رہو گی جیسے اب رہ رہی ہو۔ تمہیں خرچا پانی اسی طرح ملتا رہے گا، جیسے اب ملتا ہے۔ میں گھر میں اسی طرح آتا جاتا رہوں گا۔ میرے شادی کرنے سے تمہاری یا بچوں کی زندگی ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوگی۔“

وہ چپ چاپ سنتی رہی اور آنسو تو اتر سے بہتے رہے۔ جب کافی دیر تک اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ روزمرہ کے معمولات نمٹائے اور شام کو کوئے جاناں پہنچ گیا۔ روزیہ کل کی نسبت آج خوش دکھائی دے رہی تھی۔ آج میرا دل بھی مطمئن تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے صوفیہ کو پچاس فیصد راضی کر لیا ہے۔ باقی پچاس فیصد بھی جلدی کر لوں گا۔

”خادر چلو آج کہیں باہر چلتے ہیں۔ کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔“
”جو حکم میڈم کا۔“ میں نے سر جھکایا تو وہ ہنستی چلی گئی۔

پہلے ہم ایک خوبصورت پارک میں گئے۔ وہاں گھومتے پھرتے رہے۔ پھر ایک اچھے سے ریستورانٹ میں کھانا کھانے کے لیے گئے۔

”آج میں اپنی مرضی کا مینیو منگواؤں گی۔“ وہ بچوں کی طرح چپک رہی تھی۔
”جی بالکل میڈم۔“ میں مسکرایا۔

”یہ آج کیا میڈم میڈم لگا رکھا ہے۔“

”میڈم تو آپ ہیں۔ آپ کالج میں اردو ادب کی اتنی قابل معلمہ ہیں اور میں ٹھہرا معمولی پڑھا لکھا ایک ٹیکسی ڈرائیور۔ میرے لیے تو آپ میڈم ہی ہیں نا!“

”چھوڑو بھی یہ میڈم میڈم کی رٹ لگانا۔ میں تمہارے لیے روز ہوں صرف روز۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولی تو مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہونے لگا۔

”اچھا یہ بتائیں صوفیہ مانی کہ ابھی نہیں؟“

”مکمل طور پر تو نہیں مانی مگر اُمید ہے جلدی مان جائے گی۔“

”کیا واقعی؟“ وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ ”آپ کو یقین ہے وہ مان جائے گی۔“

”ہنڈرڈ پرسنٹ۔“ میں پورے یقین سے بولا۔

”اوہ شکر ہے خدا کا۔“ میرے دل میں کتنے دوسے ہر روز سر اٹھاتے ہیں۔ تو اب میں امی کو تسلی دے دوں کہ ہم

جلد نکاح کر رہے ہیں۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”جی بالکل، ان کو کہہ دیں کہ ہم بہت جلدی نکاح کر رہے ہیں۔“

اتنے میں کھانا آ گیا اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔ کھانے کے دوران بھی ہلکی پھلکی نوک جھونک جاری رہی۔

کھانے کے بعد میں نے پیسے دینے کے لیے پرس نکالا تو روزیہ نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”بھول گئے کیا؟ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار بل میں دوں گی اس لیے آج بل میں ہی دوں گی۔“

اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر میں نے بوڑھے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ ”ایز یوش میڈم۔“

کھانا کھانے کے بعد ہم گھر کی طرف چل دیے۔ اس کے گھر کے آگے گاڑی کھڑی کی۔ ”جی میڈم آپ کا گھر

آ گیا۔“

”آپ نہیں آئیں گے کیا؟“ اس نے بڑی لگاؤ سے پوچھا تو میرا دل بھی ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

”نہیں، میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔ رات خاصی ہو گئی ہے۔“ میں رسمی طور پر بولا حالانکہ دل کچھ ادا

کہہ رہا تھا۔

”اوکے..... ایڑی پوش سر.....“ اس نے مسکرا کر کہا تو میرا دل بجھ گیا۔ اس نے اترنے کے لیے دروازے

ہینڈل پر ہاتھ رکھا پھر پیچھے مڑ کر بولی۔

”آج میرے پاس رک جاؤ نا جان۔“ اس کی آنکھوں میں محبت کی قدیلیں روشن تھیں اور ہونٹ دم

جام دے رہے تھے۔ میرا پورا وجود سرشاری میں نہا گیا۔ میں تو پہلے سے ہی تیار بیٹھا تھا۔ فوراً گاڑی لاک کی اور ا

کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ بیرونی دروازے کی ایک چابی ہر وقت اس کے بیگ میں ہوتی تھی۔ اس نے دروا

کھولا۔ اندر داخل ہوئے تو مکمل خاموشی تھی۔ لگتا ہے دونوں سو گئیں۔ ہم دونوں روزیہ کے بیڈروم میں آئے تو میں

اسے بانہوں میں بھر لیا۔

”خاور.....“ اس نے آہستگی سے سرگوشی کی۔

”ہوں.....“ میں مغمور لہجے میں بولا۔

”امی کہتی ہیں کہ مرد اور عورت کی تنہائی میں تیسرا شیطان ہوتا ہے جو ان کو ورغلا تا ہے۔ تو کیا یہ شیطان ہے

ہمیں ورغلا رہا ہے؟“

”پتا نہیں جان! چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ کون سا وقت ہے فلسفہ جھاڑنے کا اور ویسے بھی ہم جلد ہی نکاح کر ر

ہیں۔ شیطان کا کام خود بخود تمام ہو جائے گا۔“



صوفیہ کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ اب وہ ہر وقت خاموش رہتی۔ کہاں ہر وقت اس کے گرجنے اور برسنے کی آواز

آتی رہتی تھیں اور کہاں اب اس نے جیسے چپ کا روزہ رکھ لیا تھا۔ ویسے اپنے فرائض پہلے سے زیادہ تندہی سے ادا کر

تھی۔ بچوں کو تیار کرنا، سکول بھیجنا، کھانا پکانا، گھر کی صفائی ستھرائی حتیٰ کہ اب امی کی خدمت بھی پہلے سے زیادہ کرنے

تھی۔ انہیں وقت پر کھانا دیتی اور رات کو سونے سے پہلے کتنی کتنی دیر تک ان کی ٹانگیں دباتی۔ امی بھی اب اس سے ہم

خوش تھیں۔ اسے دعائیں دیتی نہ تھکتی تھیں۔ میرا ہر کام بھی بغیر کہے کر دیتی۔ کتنے دنوں سے اس نے مجھ سے تلخ کلامی نہ

کی تھی۔ میری ہر بات سر جھکا کر سنتی اور فٹ سے ہر حکم بجالاتی۔ شاید وہ یہ سب مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کے

کر رہی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ میں جس راہ پر قدم بڑھا چکا ہوں وہاں سے واپسی ناممکن حد تک مشکل تھی۔

آج بھی اس نے مجھے ناشتہ کروایا اور خود کپڑے استری کرنے لگی۔ میں کپڑے بدل رہا تھا اور کن اکیوں۔

اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کاش صوفیہ بیگم تمہارا رویہ شروع سے ہی ایسا ہوتا تو آج یہ دن نہ میری زندگی میں

اور نہ تمہیں یہ دن دیکھنے پڑتے۔

”صوفیہ۔“ میں نے اسے پکارا۔

”ہی۔“ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔

”تو ہم ایسا ہیسا ہیسا تم نے؟“ میں نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گ

اس لمحہ مجھے اٹنی اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہاں پہلے؟“ وہ تھوک نکلنے ہوئے بولی۔

”تم ہاٹی ہو۔ میں کس فیصلے کی بات کر رہا ہوں۔“

وہ ہنسنے خاموش رہی، پھر بولی۔ ”آپ کو بتا دوں گی۔“

”اب؟ پہلے ہی کافی دن ہو گئے ہیں۔“

”بھلی ہی۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں چپوٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے انتقام

اور بھلائی کی ہمایاں نظر آئیں۔ وہ فوراً پلٹ کر پھر سے کپڑے استری کرنے لگی۔

میں کم سے باہر نکل آیا۔ آج فیصل آباد کی بنگ تھی۔ تمام دن رہ رہ کر صوفیہ کی آنکھوں کے وہ تاثرات میرے

مذہب میں آتے رہے۔ آخر یہ عورت کیا کرنا چاہ رہی ہے۔ کون سی کچھڑی اس کے دماغ میں پک رہی ہے، یعنی یہ بدلا ہوا

ایک آرام ہے۔ کہتے ہیں کہ عادتیں بدل جاتی ہیں، فطرت کبھی نہیں بدلتی اور اس کی فطرت میں اچھی طرح جانتا

ہے کہ مجھے ظالم اور خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے یہ نالٹ کر رہی تھی۔ وہ امی، بچوں اور میرے بھائیوں اور

بھائیوں کی ہمدردیاں بڑھانا چاہ رہی تھی اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکی تھی اور اس کا ثبوت مجھے شام کو مل بھی گیا

۱۲ بجے بھائی نے مجھے اوپر بلایا۔ میں گیا تو وہاں بٹھلے بھیا بھی بیٹھے تھے اور آچی کو بھی ان لوگوں نے بلایا ہوا تھا۔

تینوں بہن بھائیوں کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنے والے ہیں۔ میں سلام دعا کر کے بیٹھ گیا تو سب سے پہلے

امی نے بات پھیری۔ ”خاور مجھے تو یہ سمجھ نہیں آرہی کہ آخر تمہاری زندگی میں کس بات کی کمی ہے۔ سب کچھ تو اللہ نے دے

دیا۔“

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس کی بڑی مہربانی ہے۔“ میں نے سکون سے جواب دیا تو اب بڑے بھائی بولے۔

”تو پھر کیوں فضول کی ضد کر رہے ہو؟“

”کیسی ضد؟“ میں سمجھتے ہوئے بھی انجان بنا۔

”یہی فضول ضد دوسری شادی کرنے کی اور کون سی؟“ وہ ناگواری سے بولے۔

”بھائی میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور اب میرا یہ فیصلہ بدل نہیں سکتا۔“ میں نے قطعی لہجے میں

ہوا ب دیا تو بڑے بھائی تپ اٹھے۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس سے بات کرنا فضول ہے۔ خود سراور بدل لحاظ ہے۔ کسی کی نہیں سنے گا۔“ یہ کہہ کر

وہ ہاٹ بٹھنے ہوئے باہر نکل گئے۔ آپنی پھر بولیں۔

”خاور ہم سب تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہے ہیں۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ دو شادیوں کے بڑے

بھیسڑے ہوتے ہیں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا آپنی۔ آپ سب لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اسے صرف میرے سہارے کی

ضرورت ہے۔ اسے مجھ سے کچھ نہیں چاہیے۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے اس کے پاس۔“ یہ کہہ کر میں نیچے چلا آیا۔

نیچے آ کر میں نے صوفیہ سے کہا کہ صوفیہ کل مجھے تمہارا تحریری اجازت نامہ چاہیے۔ سمجھ گئی تم۔ وہ خاموش رہی اور

میں باہر نکل گیا۔ کافی دیر تک سڑکوں پر مڑ گشت کرتا رہا پھر رات گئے گھر آیا تو سب گھر والے سو چکے تھے۔ میں ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا۔ رات ایک بجے تک ٹی وی دیکھتا رہا اور سو کنگ کرتا رہا۔ یہ اونٹ اب کسی کروٹ بیٹھ جانا چاہیے۔ میں بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ ٹی وی بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆.....

دوسرے دن صبح نو بجے کی بنگ تھی۔ صوفیہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ ہو سکی۔ نہادھو کر تیار ہوا اور گھر سے نکل گیا۔ شام کو تھکا ہارا گھر لوٹا تو گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ امی اکیلی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

”امی باقی لوگ کہاں ہیں۔“ میں نے اطراف میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ امی نے حیران کر دینے والا جواب دیا۔

”صوفیہ بچوں کو لے کر اپنی ماں کے ہاں سرگودھا گئی ہے۔ کہہ کر گئی ہے کہ چند دن رہے گی۔ اس کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ تو کیا تمہیں بتا کر نہیں گئی۔“ امی کو یہ خیال ذرا دیر سے آیا۔

”نہیں تو۔ مجھے تو کسی بات کی خبر نہیں۔“

مجھے صوفیہ پر اس وقت بہت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے رات کو بتایا تھا کہ مجھے اس کا تحریری اجازت نامہ چاہیے اور وہ جا کر میکے بیٹھ گئی۔ دیکھتا ہوں بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ کتنے دن ٹال سکتی ہے مجھے۔ آنا تو گھر ہی ہے نا۔ میں غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

”ارے بیٹا، کھانا تو کھا لو۔ میں نے تمہاری پسند کے کرلیے گوشت بنائے ہیں۔“ امی بے چاری آدازیں دیتی رہ گئیں۔ باہر آ کر سوچنے لگا کہاں جاؤں۔ پھر سوچا آج روزینہ کے ہاں چلتا ہوں۔ پچھلے دو تین دن سے نہیں گیا۔ گاڑی میں بیٹھا اور اُن کے ہاں جا پہنچا۔

”ارے بیٹا! کہاں مصروف تھے؟ تین دن بعد شکل دکھا رہے ہو۔“ جاتے ہی آٹنی نے شکوہ کیا۔

”بس آٹنی، وقت ہی نہیں ملا ادھر آنے کا۔“ میں نے روزینہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، جو میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

”خاور بھائی، آج آپ نے آپ کا فورٹ سالن تیار کیا ہے۔“ ارینہ چپکتے ہوئے بولی۔

”وہ کیا بھلا۔“ میں انجان بنا۔

”کرلیے گوشت۔“ اس نے نعرہ لگایا۔

”بہت خوب۔ خوشی ہوئی سن کر کہ آپ کی آپنی نے اپیشل میرے لیے یہ ڈش بنائی ہے۔“ میں بدستور روزینہ کی

طرف دیکھ رہا تھا۔

”تو پھر آئیں کھانا کھاتے ہیں۔“ روزینہ نے کہا۔

میں نے نوالہ منہ میں ڈالا تو روزینہ نے پوچھا۔

”کیسے بنے ہیں؟“

”اچھے بنے ہیں۔“ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ یہی سالن میری ماں نے اتنے چاؤ سے میرے لیے بنایا تھا

اور میں ٹھکرا کر آ گیا۔ اب یہی سالن محبوبہ نے بنایا ہے تو میں شوق سے کھا رہا ہوں اور ساتھ تعریف بھی کر رہا ہوں۔
کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ ابھی اکٹھے بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتے رہے اور پھر میں ان سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔ طبیعت کی گرانی کافی حد تک کم ہو چکی تھی، بلکہ ختم ہو گئی تھی۔ میں نے گھر آ کر امی کے کمرے میں جھانکا وہ سو رہی تھیں۔ پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ موبائل نکالا اور روزینہ کے نمبر پر فراز کا یہ خوبصورت شعر ایس ایم ایس کیا۔

کچھ اس طرح سے ہم تیرے نزدیک آ چکے
خود کو تیرے وجود کا حصہ بنا چکے
اب تو ہمارے درد کی کوئی دوا کرو
ہم تو تمہیں اپنا مسیحا بنا چکے
چند منٹ بعد اس کا جوابی ایس ایم ایس اس شعر کی شکل میں آ گیا۔

اس دل میں پیار تھا کتنا
وہ جان لیتے تو کیا بات ہوتی
ہم نے مانگا تھا انہیں خدا سے
وہ بھی مانگ لیتے تو کیا بات ہوتی
اس کا جواب پڑھ کر میں مسکرانے لگا اور پھر فراز کا یہ شعر سینڈ کر دیا۔

پچھڑے ہوئے لوگوں پر ترس کھاؤ کسی دن
ایسا ہو کہ نہ یاد آؤ کسی دن
سادن کے بنا جیسے ہو جاتی ہے بارش
ایسے ہی میرے پاس چلے آؤ کسی دن
اس کی طرف سے یہ جواب آیا۔

وہ کرتے ہیں بات عشق کی
پر عشق کے درد کا انہیں احساس نہیں
عشق وہ چاند ہے جو دکھتا ہے سب کو
پر اسے پانا سب کے بس کی بات نہیں
میں نے اسے گڈ ٹائٹ لکھا اور موبائل فون بند کر دیا۔

.....☆.....

اگلے دو تین دن میں نے غصے میں صوفیہ کو فون نہیں کیا مگر جب اس کی طرف سے بھی کوئی خبر نہ ملی تو مجھے
تشویش ہونے لگی۔ بچوں کے بغیر خالی گھر کا نئے کو دوڑتا تھا۔ چوتھے دن میں نے صوفیہ کا نمبر ملایا کہ پتا تو کروں کہیں اس
کی امی کی حالت زیادہ سیریس تو نہیں۔

صوفیہ نے کال ریسیو کر کے ”ہیلو“ کہا تو میں پوچھنے لگا۔

”ہیلو صوفیہ، تمہاری امی کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہیں اب۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”ہوا کیا تھا انہیں؟“

”کچھ خاص نہیں، بخار تھا۔ اب ٹھیک ہیں۔“ لہجہ ہنوز برقرار تھا۔

”امی تو بتا رہی تھیں کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔“

”کہا ہے نہ کہ ٹھیک ہیں اب۔“ وہ بدتمیزی سے بولی۔

”یہ تم کیسے بات کر رہی ہو؟“ اب میں بھی ذرا سختی سے بولا۔ وہ چپ رہی تو میں پھر قدرے نرمی سے بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ گھر کب آ رہی ہو؟ کہو تو لینے آ جاؤں۔ بچوں کی سکول سے چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے آنے کی۔ بچے یہاں میرے پاس رہیں گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں غصے سے بولا۔

”مطلب تمہیں ایک دو دن میں سمجھ آ جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میرا دماغ غصے سے کھولنے لگا۔ تو آخر اپنی اوقات پر آ ہی گئی۔ بڑا شرافت کا ڈھونگ رچائے بیٹھی تھی۔ پہلے سوچا

امی کو ساری بات بتا دوں۔ پھر ارادہ ملتوی کر دیا یہ سوچ کر کہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔ صوفیہ کی دھمکی میں وقتی طور پر تو نہ سمجھ

سکا، مگر اس سے بات کرنے کے تیسرے دن پوسٹ میں امی کو خلع کا نوٹس دے گیا۔ شام کو میں گھر آیا تو امی نے وہ لفافہ

میرے سامنے لا رکھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ لفافے کے اندر کیا ہے۔ میں نے لفافہ کھول کر اندر دنی کاغذات

پڑھے تو میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں صوفیہ پر گر گیا تو امی گھبرا گئیں۔ ”ارے بیٹا، کیا ہے اس کے اندر؟ مجھے بھی تو کچھ

بتاؤ۔“

”امی، صوفیہ نے خلع کا نوٹس بھیجا ہے۔ وہ بچوں کی کھڑی اور خلع دونوں مانگ رہی ہے۔“

”کیا؟“ امی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ”کیا سچ کہہ رہے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو امی اونچی آواز میں رونے لگیں۔ ”اتنا بڑا فیصلہ اس نے کیسے کر لیا؟“

”امی وہ جانتی ہے کہ میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ میری کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی ہے مگر میں بھی

بچے اس سے چھین لوں گا اور اس کا طلاق کا شوق بھی ضرور پورا کروں گا۔“ میں باہر نکل گیا۔ امی آوازیں دیتی رہ گئیں۔

.....☆.....

اس مسئلے پر جوں جوں سوچتا گیا، ذہن الجھتا چلا گیا۔ روزینہ سے بھی مشورہ کیا اس نے پھر سے سختی سے منع کیا کہ

طلاق ہرگز نہیں دینی۔

آخر سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ سرگودھا جا کر دوبدوان لوگوں کے سامنے بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔ شائد

مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔ اس بات کا مجھے پورا یقین تھا کہ یہ نوٹس والا آئیڈیا اس کی شاطر ماں اور ساشی بھائیوں کا تھا ورنہ

اکیلی صوفیہ اس حد تک کبھی نہ جاسکتی تھی۔ تین چار دن بعد میں سرگودھا جا رہا تھا۔ حالانکہ سمجھوتے والی صورت حال نظر نہیں آ رہی تھی۔ کپروما نر کرنے والے وہ لوگ ہرگز نہ تھے۔

میں اپنی سسرال پہنچا تو بچے مجھ سے لپٹ گئے۔ وہ میرے بغیر بہت اُداس تھے۔ کبھی اتنی دیر مجھ سے دُور نہ رہے تھے۔ صوفیہ مجھے دیکھ کر کچن میں کھس گئی۔ اس نے مجھ سے سلام دعا تک نہ کی تھی۔ ساس بھی بڑی بے رخی سے پیش آئی۔ میری کسی بات کا سیدھے منہ جواب نہ دیا۔ سالے صاحبان آئے تو ان کا رویہ بھی سرد مہر ہی تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں بیٹھ کر تسلی سے بات کرنی چاہیے۔“ میں نے یہ کہا تو بڑا سالا بولا۔ ”تو چلے ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ پھر ہم صوفیہ سمیت ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

چند لمحوں بعد ساس صاحبہ نے بات شروع کی۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ تم دوسری شادی کر رہے ہو۔“

”جی ہاں، آپ نے درست سنا ہے۔“ میں نے سکون سے جواب دیا۔

”مگر کیوں؟ آخر ہماری بیٹی میں کیا کمی ہے؟“ وہ اونچی آواز میں بولیں۔

”دیکھئے بات کمی یا زیادتی کی نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“ اب کہ بڑا سالا بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میری بہن لاوارث ہے۔ اس کے آگے پیچھے

کوئی نہیں۔ تم جو مرضی کرتے پھر دو گے اور تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔“ وہ گرج کر بولا تو مجھے بھی غصہ آ گیا مگر میں غصہ پی گیا اور پھر قہر سے بولا۔

”دیکھئے میں کوئی پہلا آدمی نہیں جو دوسری شادی کر رہا ہوں اور دوسری شادی کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اگر

میں نے آپ کی بہن سے کوئی زیادتی کی تو آپ باز پرس کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ میں اپنا گھر اس کے نام کروا دیتا ہوں صرف اس کے تحفظ کی خاطر۔“

”یعنی تم اپنی اس ضد سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔“ اب کی بار چھوٹا بھائی پھنکارا۔

”ضد تو آپ کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ بہن کا گھر اجاڑنے کی کوشش نہ کریں۔ میں اسے ہر قسم کا تحفظ دوں گا۔

آپ کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہوں۔ یہ میرے بچوں کی ماں ہے میرے لیے قابلِ عزت ہے۔“

”بھائی ہماری تو ایک ہی شرط ہے۔ اگر تم نے دوسری شادی کرنی ہے تو اسے طلاق دے دو۔“ بڑے نے

مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے کہا۔

”کیسے بھائی ہیں آپ، بہن کے لیے طلاق مانگ رہے ہیں۔“ میں زچ ہو رہا تھا۔

”سوتن کی موجودگی میں گھل گھل کر مرنے کے بجائے طلاق لے کر علیحدہ رہے تو زیادہ بہتر ہے۔“ خوش دامن

ہاتھ نچا کر بولی۔

”آئی کیسی سوتن؟ وہ تو الگ گھر میں رہے گی۔ ہمارے گھر میں نہیں آنا اس نے۔ خدا کے لیے میری بات

سمجھیں۔ ہٹ دھرمی چھوڑیں۔ صوفیہ اور بچوں کو میرے ساتھ جانے دیں۔“

”صوفیہ سے پوچھ لو۔ اگر وہ جانے کے لیے تیار ہے تو ہم راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔“ بڑا بھائی بولا تو میں

نے صوفیہ سے کہا۔

”چلو صوفیہ اٹھو، اپنے گھر چلتے ہیں۔“

”میرا کوئی گھر نہیں نہ میں نے کسی گھر میں جانا ہے۔“ وہ تک کر بولی تو میں نے سر پکڑ لیا۔

جب کافی دیر تک میرے سمجھانے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے آپ اپنی بیٹی کو شوق سے اپنے پاس رکھیں۔ میرے بچوں کو میرے حوالے کریں۔ میں انہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ ان کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔“

”بچے میرے پاس رہیں گے۔“ صوفیہ چلانے لگی۔

”خاور تم بچوں کو نہیں لے جاسکتے۔“ ساس بھی بیٹی کی تکلیف سے بلبلا اٹھی۔

”دیکھتا ہوں مجھے میرے بچے لے جانے سے کون روکتا ہے۔“ میں ڈرائنگ روم سے باہر آ کر بچوں کو آوازیں

دینے لگا۔ بچے دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔

”چلو بچوں..... گھر چلیں۔“

”مگر پاپا..... ماما تو کہتی ہیں وہ نہیں جائیں گی۔“ بیٹی نے معصومیت سے کہا تو میرا دل کٹنے لگا۔

”بیٹا ماما بعد میں آجائیں گی۔ انہیں ابھی تھوڑے دن اور نانو کے پاس رکنا ہے۔“

دونوں بھائیوں نے ماں اور بہن کو پتا نہیں کیسے سمجھایا کہ اب وہ دونوں خاموش کھڑی تھیں۔ بھائی جانتے تھے کہ اگر بچے یہاں رہے تو بچوں کا خرچا اٹھانا پڑے گا۔ آج کل تو اپنے بچے پالنے مشکل ہیں بیگانے بچوں کو کون پالتا پھرے۔

”اوکے ماما، ہم پاپا کے ساتھ جارہے ہیں۔“ اب کی بار بڑا بیٹا بولا۔

”ماما! آپ بھی جلدی آنے کی کوشش کرنا۔“ بیٹی نے ماں کو تنبیہ کی تو صوفیہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”اوکے بیٹا، اپنے دونوں بھائیوں کا خیال رکھنا اور دادی کو زیادہ تنگ نہ کرنا۔“

میں بچوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھا تو دل بوجھل ہو رہا تھا۔ صوفیہ ان عورتوں میں سے تھی جو ٹوٹ تو سکتی ہیں مگر

جھک نہیں سکتیں۔

شام کو گھر آئے تو صوفیہ کو ساتھ نہ دیکھ کر امی بھی مجھ کر رہ گئیں۔ میں صبح سے بھوکا تھا۔ امی نے مہنڈی کا سالن بنا رکھا تھا۔ تھوڑی سی روٹی زہر مار کی اور لیٹ گیا۔ تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ آنے والی زندگی کے متعلق سوچ سوچ کر دماغ دکھنے لگا تھا۔ اب کیا کروں۔ صرف اپنی ذات کی خوشی کی خاطر بچوں سے ان کی ماں کو چھین لوں۔ اپنی بوڑھی ماں کو مشقت کی بھٹی میں جھونک دوں۔ وہ تو خود خدمت کروانے کی حالت میں ہیں۔ ان کے کمزور کندھوں پر بچوں کی بھاری ذمہ داری کیسے ڈال دوں۔ صرف اپنی خوشی کی خاطر، اپنی ذات کی خاطر، کیا میں اتنا خود غرض بن سکتا ہوں۔ اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔

.....☆.....

اگلی صبح امی کے ساتھ مل کر بچوں کو تیار کیا۔ انہیں سکول چھوڑ کر آیا۔ ناشتہ کیا اور ٹیکسی اسٹینڈ پر چلا گیا۔ وہاں ایک لوکل بنگل مل گئی۔ وہاں سے ایک بجے تک فارغ ہو گیا۔ بچوں کو سکول سے لیا، انہیں گھر چھوڑا۔ دوپہر کا کھانا امی تیار کر چکی

تھیں۔ بچوں کو اپنی نگرانی میں کھانا کھلایا، خود بھی دو چار نوالے لیے اور ستانے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ ہاتھ منہ دھویا اور انکل کریم سے ملنے چلا گیا۔ کافی دنوں سے ان کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ سوچا خیریت معلوم کروں۔ کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئے۔

انکل بڑے تپاک سے ملے۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چائے وغیرہ پلائی۔ بیمار ہونا تو دور کی بات انکل پہلے سے بھی زیادہ تروتازہ اور خوش و خرم دکھائی دے رہے تھے۔

”کافی دنوں سے آپ کی کوئی کال نہیں آئی۔ سوچا خیریت معلوم کرتا چلوں۔“

”اچھا کیا بیٹا چلے آئے۔ میرا بھی دل چاہ رہا تھا تمہیں ملنے کو۔ جہاں تک تمہیں بلانے کا سوال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل میرے دنوں بیٹے خیر سے آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کار خرید لی ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داریاں خود ہی نبھا رہے ہیں اور میں آج کل ہر کام سے فارغ ہوں۔ آزادی کے خوب مزے لوٹ رہا ہوں۔“ انکل نے قہقہہ لگایا تو میں بھی مسکرانے لگا۔

”تم سناؤ، کام کیسا جا رہا ہے؟ جس فیملی کے پاس تمہیں بھیجا تھا، کیسے لوگ ہیں؟“

انکل، روزینہ اور اس کی فیملی کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ ”جی انکل بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”ہاں بھئی بھابی بتا رہی تھیں کہ تم ان کی فیملی کا حصہ بن چکے ہو۔ تم میں کوئی نہ کوئی جادو تو ہے جو ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہو۔“ انکل پھر سے ہنسے۔

”بس انکل، ذرہ نوازی ہے ان کی۔“

میں نے چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور وہاں سے نکل آیا۔ اس میری منزل روزینہ کا گھر تھی۔ وہاں پہنچا تو روزینہ اپنی امی کو دوڑائی کھلا رہی تھی جبکہ ارینہ کچن میں گھسی کوئی چیز پکا رہی تھی۔ میں نے آنٹی سے دعا سلام کی تو ارینہ باہر نکل کر بولی۔

”خاور بھائی! آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ میں پکڑے تل رہی ہوں۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے لے کر آؤ۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔

”ابھی لائی۔“ وہ پھر سے کچن میں گھس گئی۔

رات کو ہمیں تنہائی میسر آئی تو روزینہ نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“

”ہاں، پریشان تو ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ کیا صوفیہ نے آنے سے انکار کر دیا۔“

”ہاں۔“

”تو کیا بچے یاد آ رہے ہیں؟“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بچوں کو تو میں ساتھ لے آیا ہوں۔“

”کیا؟ بچوں کو ان کی ماں سے دور کر دیا۔“

”میں نے دُور کر دیا..... یا وہ خود دُور ہونا چاہتی ہے۔“
 ”کچھ بھی ہو خاور، اسے منا کر لے آؤ۔ ماں کے بغیر بچے کیسے رہ سکتے ہیں۔“
 ”اسی بات کو لے کر میں پریشان ہوں۔“
 ”وہ کہتی کیا ہے.....“

”اس نے ایک ہی بات کی ضد پکڑ لی ہے کہ اگر میں دوسری شادی کروں گا تو وہ طلاق لے لے گی۔ میں نے بہت سمجھایا ہے مگر اس پر تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔“

”یعنی ہمارے بچھڑنے کا وقت آ گیا۔“ روزینہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔
 ”نہیں روز..... پلیز ایسا نہ کہو۔ ہم چوری چھپے نکاح کر لیتے ہیں۔“

”نہیں خاور، اسلام میں چوری چھپے نکاح کا کوئی تصور نہیں۔ میں نے تمام محلے داروں کو اور رشتہ داروں کو اس نکاح کے متعلق بتانا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی میرے کردار پر انگلی اٹھائے۔“
 ”بغیر نکاح کے جس طرح مل رہے ہیں، اسی طرح ملتے رہیں گے۔ پلیز مجھے خود سے دور نہ کرو۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔“

”سب کتابی باتیں ہیں۔ کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔“ آن وہ کوئی اور ہی روزینہ لگ رہی تھی۔ یہ میری روز ہرگز نہ تھی۔

”خاور صاحب آپ چلے جائیں یہاں سے۔ دوبارہ یہاں نکاح خواں کے ہمراہ تشریف لائیے گا۔“ یہ کہہ کر وہ اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں لٹا پٹا گھر آیا تو امی میرے پاس بیٹھ کر آنسو بہانے لگیں۔
 ”بیٹا! بچے جب سے گھر آئے ہیں ماں کو بہانے بہانے سے یاد کر رہے ہیں۔ چھوٹا تو کافی دیر تک روتا رہا ہے۔ اب جا کر بڑی مشکل سے چپ ہوا ہے۔“
 ”اب کہاں ہے؟“ میں تھکی ہوئی آواز میں بولا۔

”اب سو رہا ہے۔ مجھ سے بچوں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی اور نہ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم ہے کہ ان کی دیکھ بھال کر سکوں اور ویسے بھی ایک ماں بچوں کو جس طرح سنبھالتی ہے وہ کوئی اور نہیں سنبھال سکتا۔“
 ”امی! آپ کیا چاہتی ہیں؟“ میں شکستہ لہجے میں بولا۔

”بیٹا، میں تجھ سے التجا کرتی ہوں۔ دوسری شادی والی ضد چھوڑ دو اور صوفیہ کو جا کر لے آؤ۔ اپنا گھر برباد نہ کرو۔ بچے زل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر امی دھاڑیں مار کر روئے لگیں۔ میں تڑپ اٹھا۔ امی کو اپنے ساتھ لپٹا کر خود بھی رونے لگا۔
 ”امی خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔ آپ جسے میری ضد کہہ رہی ہیں آپ نہیں جانتیں، وہ میری زندگی ہے۔ اس کے بغیر میں جی نہ سکوں گا۔“

امی نے مجھ سے الگ ہو کر میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میری بات مان لو۔“

میں امی کے ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار چومنے لگا۔ ”امی میرے آگے ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہگار نہ کریں۔ آپ جیسا

چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔ میں آپ کی بات ضرور مانوں گا۔ آپ کا حق ہے مجھ پر۔“ یہ کہہ کر میں اونچی آواز میں رونے لگا۔
آہ میری محبت ہار گئی تھی اور یہ مجبوریاں جیت گئی تھیں۔ کافی دیر تک میں روتا رہا اور امی مجھے تسلیاں دیتی رہیں۔

☆.....

دوسرے دن امی اور بڑے بھیا جا کر صوفیہ کو لے آئے۔ میں اس کی شکل دیکھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر فح کی چمک تھی۔ بچے اور امی بہت خوش تھے۔ میرا دکھ کسی کو نظر نہ آ رہا تھا۔ نہ مجھے پیدا کرنے والی ماں کو اور نہ محبت کا دعویٰ کرنے والی محبوبہ کو۔ میں اکیلا ہی غم کی اس بھٹی میں جھلس رہا تھا۔

تین دن گزر گئے۔ میں سارا سارا دن محنوں بنا آوارہ گردی کرتا رہتا۔ نہ کھانے کی ہوش تھی نہ اوڑھنے پہننے کی خبر۔ روزینہ کو فون کرتا تو وہ کال کاٹ دیتی۔ آخر تک آکر اس نے فون ہی بند کر دیا۔ اب کیا کروں۔ دل مائی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ آخر ہمت کر کے رحم کی آس لگائے پھر در محبوب پر جا پہنچا۔ بیل دی تو ار مینہ نے دروازہ کھولا۔
”بھائی آپ کی گھر پر نہیں ہیں۔“ اس کی آواز، اس کے جھوٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”پیچھے ہٹو، مجھے اندر جانے دو۔“ وہ میرا جارحانہ انداز دیکھ کر ایک طرف ہو گئی۔ میں اندر گیا، دیکھا تو روزینہ لاؤنج میں بیٹھی رو رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ میں دیوانہ وار اس سے لپٹ گیا۔

”روز..... مجھے نہ چھوڑ دو..... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔“

مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی سسکیاں بھرنے لگی۔ ار مینہ اوپر چل گئی، پھر وہ مجھ سے الگ ہوئی۔ ”بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اس نے مجھے پکڑ کر صوفیہ پر بٹھایا۔ پھر پانی کا گلاس لاکر مجھے تھمایا۔

”پہلے پانی پی کر حواس قائم کریں اور پھر بات کریں۔“ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں ایک ہی سانس میں پورا گلاس چڑھا گیا۔ روزینہ سامنے بیٹھی چند منٹ تک مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

”خاور! آپ کو جو کہنا ہے آج کہہ دیں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد ہم زندگی میں دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”روز! خدا کے لیے، اتنی کٹھور نہ بنو۔ ملنے پر اتنی سخت پابندی نہ لگاؤ۔ بس کبھی کبھار تمہیں دیکھنے کے لیے آجایا

کروں گا۔“

”نہیں خاور، یہ کبھی کبھار پھر روز، روز میں بدل جائے گا۔ ہمارے پاس صرف دو راستے ہیں یا تو نکاح یا پھر مکمل طور پر ایک دوسرے سے قطع تعلقی۔ یہ درمیانہ راستہ چور راستہ ہے جو صرف برائی کی طرف جاتا ہے۔ میرا بیٹا کل کو جوان ہو گا۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ اسے ایک فاحشہ اور بدکردار عورت کا بیٹا کہیں۔“

”اگر مجھے ایسے ہی دھکنا تھا تو میرے اتنا قریب کیوں آئی تھی۔ کیوں مجھے اتنی محبت دی تھی۔“ میں پھر سے

سکٹنے لگا تھا۔

”وہ میری بھول تھی، بہک گئی تھی میں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری قسمت میں کسی مرد کی محبت نہیں۔ اگر اتنی ہی قسمت اچھی ہوتی تو پہلا کیوں چھوڑتا۔“ وہ پھر سے رونے لگی۔ تھوڑی دیر روتی رہی پھر آنسو پونچھ کر پوچھنے لگی۔ ”صوفیہ گھر

آگئی ہے نا!"

"ہاں، کل امی اور بھائی جا کر لے آئے ہیں۔ بچے اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"
"اچھی بات ہے، بچوں کو ماں کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ میں کسی عورت کی زندگی برباد کر کے اپنی زندگی آ نہیں کر سکتی۔" وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی، پھر بولی۔ "خاور! اگر آپ نے کچھ اور نہیں کہنا تو آپ جائے ہیں۔"

"کبھی کبھار آ سکتا ہوں نا!" میں پھر سے گڑ گڑا رہا تھا۔
"ہرگز نہیں۔ نہ آپ یہاں آئیں گے اور نہ فون پر مجھ سے رابطہ کریں گے۔ یہی سمجھیں کہ ہم کبھی ملے ہی نہیں۔ اس نام کی کوئی عورت آپ کی زندگی میں آئی ہی نہیں۔"
"کیا ایسا سمجھا جاسکتا ہے؟ کیا تم ایسا سمجھ سکتی ہو؟ بولو، چپ کیوں ہو؟"
"لوگ مر بھی تو جاتے ہیں۔ مرنے والوں کے لیے صبر آ جاتا ہے نا۔ تو ہمیں بھی آہستہ آہستہ صبر آ جائے گا۔" و منناک آواز میں بولی تو میں تڑپ اٹھا۔
"روز! تم اتنی سنگدل تو کبھی نہ تھی۔"
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ کھڑی ہو گئی۔

"خاور صاحب! اب آپ جا سکتے ہیں۔ خدا حافظ..... ہمیشہ کے لیے۔" یہ کہہ کر وہ اندر کمرے میں دوڑ گئی اور میں ہونق نظروں سے اس بند دروازے کو دیکھتا رہا جو اس نے اندر جا کر بند کر لیا تھا۔
چند منٹ بیٹھا دیکھتا رہا پھر اپنے وجود کا بوجھ بشکل اٹھائے ان کے گھر سے باہر آ گیا۔ باہر گہرے سرمئی بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سچ کہا ہے کسی نے، انسان کے اندر کا موسم خوشگوار ہو تو باہر جون کی تپتی دھوپ بھی بھلی دکھائی دیتی ہے اور اگر اندرونی ماحول دیران بیابان ہو تو بیرونی خوشگواریت بھی بد ہیئت اور ڈراؤنی لگتی ہے۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو ریم جھم شروع ہو گئی۔ مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان بھی میرے غم میں شریک آنسو بہا رہا ہے۔ میں کافی دیر گاڑی میں اسٹیرنگ پر سر ٹکائے بیٹھا رہا، پھر گاڑی اشارت کی۔ روزینہ کے گھر پر الوداعی نظر ڈالی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔



ناکامی عشق نے میری زندگی ہی بدل دی۔ روزینہ کیا زندگی سے نکلی، زندگی ایک سزا بن گئی۔ دن گزارے نہ گذرتے، راتیں کاٹے نہ کٹتیں۔ میری زندگی ساغر صدیقی کے اس شعر کی عملی تفسیر بن گئی۔

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی سزا پائی ہے یاد نہیں

مجھے گھر سے اور گھر والوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ غم جاناں بھلانے کے لیے شراب کا سہارا لے لیا۔ اسے تو نہ بھول سکا مگر خود شراب میں ڈوب گیا۔ دن رات کی نئے نوشی نے بیمار کر دیا۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ صوفیہ کسی بات پر چیخ کرتی تو اسے مارنا شروع کر دیتا۔ امی نے میرا غم ایسا سینے سے لگایا کہ قبر میں جاسوئیں۔ بچے بھی مجھ سے دور اور

ڈرے سہمے رہتے۔ اس کڑے وقت میں بھائیوں نے بہت ساتھ دیا۔ میرے گھر کی کفالت بھی کرتے رہے اور میرا اعلان معالجہ بھی کراتے رہے۔

کہتے ہیں ناگہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے۔ میرا زخم بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھرنا شروع ہو گیا۔ بچوں کی خاطر خود کو سنبھالنے لگا۔ آج اس بات کو دس برس کا طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ گھاؤ بھر چکا ہے۔ میں بظاہر نارمل زندگی کی طرف کب کالوٹ چکا ہوں، مگر آج بھی کبھی کبھار یہاں ٹیس اٹھتی ہے جو مجھے بے حال کر دیتی ہے۔

اس نے دل والی جگہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ آنکھیں بند کیے سیٹ سے سر نکالے آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے کانوں کو بھگور رہے تھے۔ میں اس کی آپ بیتی سنتے ہوئے گرد و پیش سے بالکل لا تعلق ہو گئی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں چونک کر ارگرد دیکھنے لگی۔ پارک بالکل سنسان ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی ذی روح نہ تھا۔ موبائل پر وقت دیکھا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے خاور کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں موندے اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے پکارا۔ ”خاور.....“

”ہوں.....“ اس نے آنکھیں کھولیں۔

”نام کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ ساڑھے آٹھ ہو گئے ہیں۔“ انھیں گھر چلیں۔ ”میں اٹھ کھڑی ہوئی۔“

وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ ”گھر..... ہوں..... جہاں کوئی اپنے دن اور رات گزارے، اگر اسے گھر کہتے ہیں تو پھر تو واقعی وہ گھر ہی ہے۔ چلیں چلتے ہیں۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہو گیا۔

”آپ کی کہانی نے مجھے دکھی کر دیا۔“ ہم گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔

”دنیا میں کتنا غم ہے، میرا غم کتنا کم ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا۔ وہ اپنی گلی کی طرف مڑ گیا اور میں اپنی گلی کی طرف۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے چابی لگائی۔

شکر ہے آج سنڈے ہے۔ بچے لیٹ ہی اٹھتے ہیں۔ میں پورچ میں داخل ہوئی تو جبار سامنے لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے آج اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟“

”وہ..... آج نسیم مل گئی تھی۔“ میں نے فوراً بات بنائی۔

”نسیم..... کون نسیم.....؟“

”ہمارے محلے میں ہی رہتی ہے۔ آپ کو اس کا نہیں پتا۔“ میں نے یہ کہہ کر فوراً اندر کی طرف قدم بڑھائے کہ کہیں اور کوئی سوال نہ کرے۔ اندر آ کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ خاور کی کہانی نے مجھے اُداس کر دیا تھا۔ کتنا دکھی تھا بے چارہ، پھر بھی ہنستا ہنستا رہتا تھا۔ کتنا گہرا انسان تھا۔ میں بچوں کو جگا کر ناشتے کی تیاری کرنے لگی۔ طبیعت بوجھل سی ہو گئی تھی۔



اگلی صبح وہ پارک میں ملا تو مجھے بہت اپنا، بہت خاص لگا۔ دل چاہ رہا تھا اس کا سارا دکھ سمیٹ کر اسے ہلکا پھلکا کر

دوں۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ بن جاتے ہیں۔ دل ان کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایک چکر مکمل کر کے ہم ستانے کے لیے بیٹھے تو میں نے بات شروع کی۔

”خاور ایک بات پوچھوں۔“

”جی پوچھئے۔“ وہ مسکرایا۔

”آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟“

”آپ کی کسی بات کا برا ماناؤں، امپوسبل۔ آپ مجھ سے ہر بات کر سکتی ہیں، بغیر اجازت لیے۔“

”کیا واقعی۔“ میں مسکرائی۔

”ہاں ہاں، واقعی کیا لکھ کر دوں۔“

”خاور آپ نے اس عورت سے اتنی محبت کیوں کی؟ کہتے ہیں کسی سے جتنی زیادہ محبت کر دو گے، بچھڑتے وقت

اتنی زیادہ تکلیف ہوگی۔“

خاور میرا اچھا سوال سن کر مسکرایا، پھر بولا۔

”شائد میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ دو چیزیں کرتے نہیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔ نمبر ایک محبت اینڈ نمبر دو

حسد۔ محبت ایک ایسا منہ زور جذبہ ہے جس کی شدت کے سامنے ہر جذبہ مدہم پڑ جاتا ہے۔ یہ ذات پات، رنگ و نسل کسی

چیز کو نہیں مانتا۔ یہ مرض کسی کو بھی، کسی بھی عمر میں لاحق ہو سکتا ہے۔“ پھر اس نے فراز کا یہ شعر پڑھا۔

محبت کو کوئی سمجھے تو کس طرح سمجھے فراز

یہ ظالم انتہا تک ابتدا معلوم ہوتی ہے

”بہت خوب۔“ میں نے دل سے داد دی۔ ”ایک عورت کے عشق نے آپ کو فلسفی بنادیا۔“

وہ پھر بولا۔

کتنے آنسو بہا دیئے ہیں اس چار دن کی محبت میں فراز

کاش سجدے میں بہاتے تو گناہ گار نہ رہتے

”کیا ابھی تک ناکامی عشق کے حصار سے باہر نہیں نکل پائے۔“ میں نے پوچھا تو وہ مسکرایا۔

الجھا رہی ہے مجھے یہی کشمکش مسلسل فراز

وہ آ بسا ہے مجھ میں یا میں اس میں کھو گیا ہوں

”کیا میری ہر بات کا جواب شعر سے ہی دیں گے۔ اچھا یہ بتائیں کہ وہ دوبارہ کہیں ملی کہ نہیں؟“

”ایک دفعہ دیکھا تھا اسے آج سے تین سال پہلے، ڈاکٹر کے کلینک میں۔ وہ شہر کا معروف آئی اسپیشلسٹ تھا۔

میں اس کے پاس اپنی نظر چیک کروانے کے لیے گیا تو وہ بھی وہاں مریضوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی

کلینک سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ اسے آوازیں دیں مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اچھا چھوڑیں یہ سب

میرے دکھڑے تو کبھی ختم نہ ہوں گے۔ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ شادی سے پہلے والی زندگی کے بارے میں،

اپنے بچپن کے بارے میں، اپنے مشاغل کے متعلق۔“

”میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ بتانے والا کچھ ہوگا تو بتاؤں گی نا! جس عمر میں لڑکیاں محبت کے بارے میں سوچتی ہیں، آنکھوں میں خواب بنتی ہیں، اس عمر کے آنے سے پہلے تو میری شادی ہو چکی تھی۔ ویسے بھی میری زندگی آپ کے لیے کھلی کتاب کی مانند ہے۔ آپ میرے سب کو، سب کو، اگلوں کو، پچھلوں کو، سب کو جانتے ہیں۔“

”چلیں، کوئی بات نہیں۔ اگر آپ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی۔“

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرے پاس بتانے لائق کچھ بھی نہیں۔ ہاں مشاغل کے متعلق میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ بچپن میں ڈرائنگ بہت اچھی بناتی تھی۔ شادی کے بعد بچے ذرا بڑے ہوئے، مصروفیت سے تھوڑی فراغت ملی تو لکھنے کا شوق پیدا ہوا جو آج تک جاری ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے موٹے افسانے لکھ لکھ کر ڈائجسٹوں میں بھیجتی رہی، جو کبھی شائع ہو جاتے اور کبھی نہ ہوتے۔ آج کل ناول لکھ رہی ہوں۔ ایک لکھ کر رکھا ہوا ہے دوسرا لکھ رہی ہوں۔ پتا نہیں ان کا کیا بنتا ہے۔“

”بنا کیا ہے، جو لکھ چکی ہیں اسے شائع کرنے کے لیے کسی پبلشر کو بھیجیں۔ کسی سے بات کی ہے کیا؟“

”ہاں، لاہور کے ایک پبلشر سے فون پر بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کا پہلا ناول ہے۔ اسے چھاپنے کے لیے آپ کو کچھ رقم ہمیں دینی ہوگی۔“

”کتنی رقم مانگ رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تیس ہزار کہہ رہا ہے۔“

”آپ ایسا کریں اپنے ناول کا مسودہ مجھے دیں۔ میں پڑھ کر رائے دے سکوں گا کہ وہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں۔ اگر مجھے پسند آگیا تو میرا ایک دوست پبلشر ہے وہ فری میں آپ کا ناول چھاپے گا۔“

”کیا واقعی؟“ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں، ہاں بالکل۔ بشرط اگر آپ اچھا لکھتی ہیں تو.....“

”میں بہت اچھا لکھتی ہوں۔ آپ کو بہت پسند آئے گا۔ اس بات کا مجھے پورا یقین ہے۔“

”اچھا جی..... خود پر اتنا یقین، دیکھتے ہیں۔ تو پھر کل واک کے لیے آئیں گی تو ناول کا مسودہ ساتھ لے آئیے گا۔“

”اوکے..... ضرور..... اب میں چلتی ہوں۔“

میں تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی اور وہ وہیں بیٹھا مجھے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆.....

رات کا کھانا کھا کر میں اور بچے لاؤنج میں بیٹھے گپیں مار رہے تھے۔ جبار ابھی آفس سے نہیں آیا تھا۔

میرے تینوں بچے میرے بہترین دوست بھی تھے۔ وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتے۔ اپنی اسٹڈی سے لے کر آنے والی نئی فلموں تک۔ آج بھی وہ اپنے اپنے فورٹ فلم اسٹار پر بحث کر رہے تھے۔ شاہ زیب کہہ رہا تھا کہ شاہ رخ خان زیادہ بڑا اسٹار ہے، جبکہ زویب اپنے سلمان خان کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سلمان خان جیسا خوبصورت اور ہینڈسوم ہیر کوئی دوسرا نہیں پوری دنیا میں۔ ”کچھ بھی ہو شاہ رخ جیسا کوئی دوسرا ایکٹر نہیں۔ ایکٹنگ تو اس پر

ختم ہے۔“ شاہ زیب اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”ہونہہ..... منہ دیکھا ہے اپنے شاہ رخ خان کا۔ چب کھڑا، ڈنٹ پڑے ہوئے ہیں اس کے چہرے پر۔ ایک دم بوڑھا لگتا ہے۔ جبکہ سلمان خان آج بھی جوان اور چارمنگ دکھتا ہے۔“ زوہیب نے اپنی دانست میں گہری چوٹ لگائی۔

شاہ زیب بلبلاتا تھا۔ ”امی اسے باز کر لیں۔ اس کی زبان بہت زیادہ چلنے لگی ہے۔“

”ارے ارے، تم تو ایسے تپ رہے ہو جیسے شاہ رخ خان تمہارے ماموں کا بیٹا ہے۔“ زوہیب نے شرارت سے کہا۔

”بھئی وہ آپ کا ماموں تو ہو سکتا ہے مگر ماموں کا بیٹا نہیں۔ عمر دیکھی ہے اس کی پچاس کا ہو رہا ہے یعنی آپ کی ماں سے بھی نو دس سال بڑا ہے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی تو شاہ زیب رو ہانسا ہو گیا۔

”امی اب آپ بھی شروع ہو گئیں۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

”اتنا تو شاہ رخ خان اور سلمان خان آپس میں بھی نہیں لڑتے ہوں گے جتنا آپ دونوں ان کو موضوع بنا کر لڑتے ہیں۔ اب یہ بچپنا چھوڑو ذخیرہ سے جوان ہو گئے ہو۔“ میں نے دونوں کو سمجھایا۔

”امی، تمہاری شادی کا سوچ رہی ہیں۔ تمہارے لیے لڑکی بھی دیکھ رہی ہیں۔“ زوہیب نے شوشہ چھوڑا تو شاہ زیب پریشان ہو گیا۔

”کیا واقعی امی؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”بالکل نہیں میری جان! مذاق کر رہا ہے یہ بد معاش۔ ابھی تو میرا بیٹا اپنی تعلیم مکمل کرے گا، پھر کوئی جاب کرے گا پھر کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی منگنی کریں گے۔ پھر جا کر شادی کی باری آئے گی۔“

”امی تب تک تو بے چارہ بوڑھا ہو جائے گا۔ آپ نے بہت لمبا چوڑا نقشہ کھینچ دیا۔“

”ابھی تو میرا بیٹا پورے بائیس کا بھی نہیں ہوا۔ بوڑھا کیسے ہو جائے گا۔ تم اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو۔“ میں نے زوہیب کو ڈانٹ دیا تو شاہ زیب زیر پر لب مسکرانے لگا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور جبار گھر میں داخل ہوا۔ ہم سب ہنستے ہوئے اچانک چپ ہو گئے۔ وہ سیدھا اپنے بیڈ روم میں کپڑے بدلنے کے لیے چلا گیا تو تینوں بچے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ جبار کپڑے بدل کر باہر آیا تو مجھے اکیلی کو بیٹھا دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”کدھر گئے؟.....“

”اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

”میرے آنے سے پہلے تمہیں گونج رہے تھے۔ میں گھر میں آیا تو سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ماں کے ساتھ گئیں ہاںکتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے سانپ سونگھ جاتا ہے ان کو۔“ وہ بکتا جھکتا بیٹھ گیا۔

”لاؤ کھانا لاؤ۔ کیا پکا یا ہے آج؟“

”آلو پھلیاں اور گڑوالے چاول بنائے ہیں۔“ میں پڑمرده لہجے میں بولی۔ وہ جب بھی میرے سامنے بچوں کو کونے دیتا تھا تو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔

میں اٹھ کر کچن میں جا کر اس کے لیے تازہ روٹیاں بنانے لگی اور وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ میں نے روٹیاں بنائیں تو وہ غائب تھا۔ اب پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ اس کے آنے تک تو روٹیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ اب کیا کروں۔ میں نے روٹیاں اٹھا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دیں کہ اگر ٹھنڈی ہو گئیں تو پھر سے چلانا شروع کر دے گا۔

وہ شاید غفار کے ہاں چلا گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد آیا تو میں نے کھانا اس کے آگے رکھ دیا۔

”روٹیاں کہاں ہیں؟“ اس نے کھر درے لہجے میں پوچھا۔

”ہاٹ پاٹ میں۔“ میں نے سکون سے جواب دیا۔

”یہ کب کی بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھی ہیں۔“ وہ ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر بولا۔

”ابھی ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے جب آپ نے آرڈر دیا تھا۔“

”تو جب تم نے دیکھا تھا کہ میں باہر جا رہا ہوں تو ہاتھ روک دیتی، جب میں آتا تب بناتی۔ تم جانتی ہونا کہ میں بالکل تازی روٹی کھاتا ہوں۔“

”میں نے ہاٹ پاٹ میں رکھی ہیں بالکل گرم ہیں۔“

”اور تم یہ بات بھی بخوبی جانتی ہو کہ میں ہاٹ پاٹ میں رکھی روٹیاں نہیں کھاتا۔ اس کے باوجود تم نے روٹیاں

ہاٹ پاٹ میں رکھ دیں۔“

”تو کیا کرتی؟ باہر رکھتی تو ٹھنڈی ہو جاتیں۔“ میری برداشت بھی لمحہ بالمحہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔

”میرے لیے دوبارہ روٹیاں بناؤ۔ میں یہ روٹیاں نہیں کھاؤں گا۔“ اس نے حکم دے دیا۔

”کیا؟ ان روٹیوں کا کیا کروں؟“ میں تپ اٹھی۔

”انہیں سوکھی روٹیوں میں پھینک دو۔“ اس نے چنگلی میں مسئلہ حل کر دیا۔

”یہ تو سراسر رزق کی بے ادبی ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”تمہارے جیسی فضول خرچ عورت کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ تمہیں جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔

آگے سے بحث مت کرو۔ ویسے بھی میں کماتا ہوں۔ گندم بھی میں ڈالتا ہوں۔ تمہارے میکے سے نہیں آتی جو تمہیں اتنی

تکلیف ہو رہی ہے۔“

میں کچن میں گئی۔ فریج سے آٹا نکالا اور پیڑے بنانے لگی۔ غصے سے میرا وجود لرز رہا تھا۔ آنکھوں سے بھل بھل

آنسو بہنے لگے۔ آج دل چاہ رہا تھا کہ اونچی آواز میں چیخ چیخ کر روؤں۔ یہ کس کم ظرف اور کینہ پرور انسان کو میرے اوپر

مسلط کر دیا گیا تھا، جس سے رہائی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ساری زندگی اس طرح گھٹ گھٹ کر تذلیل سہنی تھی۔ میں روتی گئی اور

روٹیاں بنانا کر اس کے آگے بٹختی گئی۔

وہ کھنور کھاتا گیا اس بات سے بے خبر کہ مجھ پر اس وقت کیا گزر رہی ہے اور میں اس وقت کتنی ذہنی اذیت

برداشت کر رہی ہوں۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں اس بندے کی عقل ٹھکانے لگا دوں۔ میں من ہی من میں بیچ و تاب کھا

رہی تھی جبکہ وہ اس وقت بہت پرسکون ہو کر کھانا کھا رہا تھا۔ وہ اذیت پسند تھا۔ مجھے ذہنی یا جسمانی کسی بھی قسم کی اذیت دے

کر وہ سکون حاصل کرتا تھا۔ میں جب بھی کبھی لیٹی ہوتی یا کسی پسندیدہ ٹی وی پروگرام سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی تو اسے

جھٹ سے کوئی کام یاد آ جاتا۔ اگر میں ٹال مٹول سے کام لیتی تو وہ آپ سے باہر ہو جاتا۔ وہ اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی فوری پاسداری چاہتا۔ یہ بات تو اس کی برداشت سے باہر تھی کہ وہ مجھے کوئی حکم دے اور میں فوراً اس کے حکم کی تعمیل نہ کروں یا وہ کوئی بات کرے اور میں نوٹس نہ لوں اور جب میں اپنا آرام و سکون چھوڑ کر اس کا بتایا ہوا کام کرتی تو اس کے چہرے پر آسودگی سی چھا جاتی۔ وہ ایسا انسان تھا جسے دوسروں کے احساسات اور جذبات کی کوئی پروا نہ تھی۔ اسے کھانا دے کر میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دل بوجھل ہو رہا تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔

میرے پیارے ابا جان آپ کیوں اتنی جلدی چلے گئے۔ آپ زندہ ہوتے تو شاید آج میری زندگی ایسی نہ ہوتی اور اگر ایسی ہی ہوتی تو آپ کے شفیق کندھے پر سر رکھ کر رو تو لیتی۔ آپ کو اپنے دکھڑے سنا کر من کا بوجھ تو ہلکا کر لیتی۔ کیوں آپ نے میری زندگی جہنم میں جھونک دی اور اگر جھونکی تھی تو خود زندہ رہتے۔

☆.....

میں نے ایک آسودہ حال اور خوش حال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ میرے ابا جان شہر کے بااثر اور معزز سیاسی شخصیت تھے۔ میرے دادا جان اپنے گاؤں کے نمبردار تھے۔ بلال بھائی مجھ سے پانچ سال بڑے تھے جبکہ مہوش مجھ سے تین سال چھوٹی تھی۔ میں اپنے ابو کی طرح سانولی رنگت کی مالک تھی جبکہ میرے دوسرے دونوں بہن بھائی امی پر گئے تھے، خوب گورے چٹے اور خوبصورت۔ امی میری نسبت ان دونوں سے زیادہ پیار کرتیں جس کی وجہ میں یہی سمجھتی کہ میں کالی ہوں، اس لیے امی مجھ سے کم پیار کرتی ہیں۔ جبکہ ابو مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے۔ میں بچپن ہی سے بہت حساس اور ذہین تھی۔ بلکہ میرے بعض اساتذہ کہتے تھے کہ میں غیر معمولی ذہانت کی مالک ہوں۔ میرا شروع سے ہی فنون لطیفہ کی طرف رجحان تھا۔ سات آٹھ برس کی عمر میں ایسی ایسی ڈرائنگ بناتی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ میرے ابو میری ڈرائنگ دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ میری بہت حوصلہ افزائی کرتے اور کہتے کہ یہ میری بیٹی اپنے باپ کا نام روشن کرے گی۔ بڑی ہو کر نامور آرٹسٹ بنے گی۔ آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرے گی۔

مجھے شروع ہی سے مطالعے کا بہت شوق تھا اور یہ شوق ابو کی جانب سے مجھے وراثت میں ملا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بنا ہوا شوکیس ابو کی ضخیم کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد ان کتابوں کی تھی جو تاریخ کے موضوع پر تھیں۔ ان میں سکندر اعظم سے لے کر مغل فرمانرواؤں تک ہر بادشاہ وقت کا زندگی نامہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ سیاست اور سیاسی شخصیات کے موضوع پر بھی بہت کتابیں موجود تھیں۔ مگر مجھے سیاست سے تو کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ تاریخ بڑے شوق سے پڑھتی۔ جس عمر میں لڑکیاں گڑیوں اور کھلونوں سے کھیلتی ہیں، میں اس عمر میں موٹی موٹی کتابیں چانا کرتی اور پھر جب ابو کے ساتھ بیٹھ کر ان حکمرانوں کے حالات زندگی اور ان کی کارکردگی پر روشنی ڈالتی جو کہ اب تاریخ کا حصہ بن چکے تھے، تو میرے ابو کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگتا اور گردن فخر سے اٹھ جاتی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتے اور میرا ہاتھ چوم لیتے۔ بارہ تیرہ سال کی بچی کے منہ سے ایسی عقل و دانش کی باتیں غیر یقینی سی بات تھی۔

مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ایک دن میں نے ابا جان کی تصویر سامنے رکھ کر سفید کاغذ پر لیڈ پنسل کے ساتھ ان کا اسکچ بنایا تھا۔ جب شام کو ابو آئے ان کو دکھایا تو وہ حیران رہ گئے۔ انہوں نے میری پیشانی چوم کر مجھے پچاس کا نوٹ بطور انعام دیا تھا۔ میرے لیے وہ پچاس کا نوٹ ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہ تھا، جو میرے باپ نے میری

حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بطور انعام دیا تھا۔ نصیباتی تعلیم میں بھی ہر سال ہر کلاس میں پوزیشن لیتی تھی۔ ہاں گھر کے دیگر کام کاج سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ امی ہر وقت ڈانٹتی رہتیں کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ امورِ خانہ داری میں بھی دلچسپی لیا کرو۔ مگر مجھے کھانا پکانا اور دیگر گھریلو کام بہت بور اور غیر دلچسپ لگتے۔ امی، ابو سے میری شکایت کرتیں تو وہ ہنس کر ٹال دیتے اور کہتے کہ کوئی فکر کی بات نہیں خود ہی سیکھ لے گی۔ عمر پڑی ہے سیکھنے کے لیے۔

”آپ کی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ یہ خود کو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگی ہے۔ عام لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے اس میں۔“ آج بھی امی، ابو کے سامنے شروع ہو گئی تھیں۔

”بھئی بیگم۔ اس بات سے تو ہم بھی مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری بیٹی عام ہرگز نہیں۔ بہت غیر معمولی ہے۔“ ابو مسکراتے ہوئے کہتے تو امی چراغ پا ہو جاتیں۔

”صرف آپ کے لیے غیر معمولی ہے، ورنہ عام لوگوں کے لیے تو عام سے بھی عام ہے۔ لڑکی اگر معمولی شکل و صورت کی مالک ہو اور ہاتھ میں کوئی سلیقہ نہ ہو تو کوئی پاس سے بھی نہیں گذرتا۔ باپ چاہے جتنا مرضی بڑا چودھری کیوں نہ ہو، سمجھے آپ۔“

”کاش تم بھی میری بیٹی کو سمجھ سکتیں زاہدہ بیگم۔ وہ کتنی ہونہار اور قابل ہے۔ تمہیں کیوں نظر نہیں آتا۔“

”معاف کرنا چودھری صاحب..... موٹی موٹی کتابیں پڑھنا اور تصویریں بنانے کو اگر آپ قابلیت کہتے ہیں تو میں ایسی قابلیت کو نہیں ماننی۔ اور اگر یہ قابلیت کسی لڑکی میں ہو تو وہ اس کی خوبی نہیں بہت بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ لڑکیوں نے اگلے گھر جا کر گرجہستی سنبھالنی ہوتی ہے۔ شوہر اور بچوں کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوتی ہیں۔ وہاں نہ تو شوہر نے تاریخ کے متعلق پوچھنا ہے اور نہ ساس نے اچھی تصویریں بنانے پر شاباش دینی ہے۔ وہاں تو سلیقہ مندی ہی کام آئے گی۔“

”اوئے زاہدہ بیگم، تم میری بیٹی پر ہر وقت ذہنی پریشر نہ ڈالا کرو۔ ابھی اس کے ہنسنے کھانے کے دن ہیں۔ نہ ڈرایا کر اسے اتنا۔“

”ماں ہوں۔ کل کو سسرال جائے گی تو طعنے تو مجھے ہی سننے پڑیں گے۔ آپ کا کیا جانا ہے۔ لوگ ماں کو ہی قصور وار سمجھتے ہیں۔“ امی ہاتھ نہچاتے ہوئے بولیں۔

”ماں ہو تو پھر..... ماں جیسی ماما بھی ہونی چاہیے تم میں۔ ہر وقت سوتیلوں جیسا سلوک نہ کیا کرو میری بچی کے ساتھ۔“

”ہاں ہاں، میں تو سوتیلی ہوں۔ بس آپ ہی سگے ہیں اس کے۔“

میں کمرے کی کھڑکی کے پاس لگی یہ ساری بحث و تکرار سن رہی تھی جو میرے لیے نئی بات نہ تھی۔ ہر دوسرے چوتھے دن یہ مکالمہ بازی امی، ابو کے درمیان ہوتی رہتی تھی۔ نئی بات تو آج یہ ہوئی تھی کہ ابو نے امی کو سوتیلی ماں کہا تھا اور یہ بات میرے کانوں کے لیے پگھلا ہوا سیسہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں سیدھی اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گر گئی۔ یہ جملے میری قوتِ سماعت پر ہتھوڑے بن کر برس رہے تھے۔

کیا امی میری سوتیلی ماں ہیں؟

کیا بلال بھائی اور مہوش میرے سوتیلے بہن بھائی ہیں؟

اسی لیے وہ گورے ہیں اور میں کالی۔

اسی لیے امی ان دونوں سے زیادہ پیار کرتی ہیں اور مجھے ہر وقت جھڑکیاں دیتی ہیں۔

تو پھر میری ماں کہاں ہے؟ وہ کون ہے؟ میں جوں جوں سوچتی گئی، دکھی ہوتی گئی۔ آنسو ساون بھادوں کی جھڑی بنے بہہ رہے تھے۔ بارہ سال کی حساس بچی کے لیے یہ انکشاف بڑا روح فرسا تھا کہ اس کی ماں، اس کی ماں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے سننے میں کوئی غلطی لگی ہو یا ابونے ایسے ہی محاورہ امی کو سوتیلی کہہ دیا ہو۔ کچھ بھی ہو مجھے سچ تلاش کرنا ہوگا۔ مجھے اس سوال کا جواب ہر حال میں ڈھونڈنا ہوگا کہ میں امی کی سگی بیٹی ہوں یا سوتیلی۔ یہ بات تو طے ہے کہ ابو میرے سگے ابو ہیں۔ ان کی محبت، ان کا والدانہ پن اس بات کو منہ بولتا ثبوت ہے کہ میں ان کی اولاد ہوں۔ اب کیا کروں؟ کس سے پوچھوں؟ کیا ابو سے؟

ہرگز نہیں ابو تو کبھی اس بات کا صحیح جواب نہیں دیں گے۔ وہ تو میرا دل رکھنے کے لیے جھوٹ کا ہی سہارا لیں گے۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ مثل ہونے لگا۔ خود سے سوال جواب کر کر کے نڈھال ہو گئی تو آنکھیں موند کر پڑ گئی۔ نیند کی آغوش میں جا کر سکون ملا تو شام تک سوتی رہی۔ امی کی کرخت آواز کانوں میں پڑی تو آنکھ کھلی۔

”اے لڑکی! یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔ اٹھ جاؤ اب شام ہو رہی ہے۔“ امی نے یہ کہتے ہوئے لائٹ جلا دی اور پھر کھڑکیوں سے پردے ہٹانے لگیں۔ میں امی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ امی مجھے چپ چاپ اپنی طرف گھورتا پا کر فکر مند ہو گئیں۔ میرے پاس بیٹھ کر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری!“ اب وہ قدرے نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔

میری آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔

”تمہیں تو بخار ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولیں۔ ”چلو لیٹی رہو۔ میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔ ساتھ ایک پینا ڈول کھا لو۔“ وہ اٹھ کر چلی گئیں تو میں پھر سے شش و پنج میں پڑ گئی۔ امی میری سگی امی ہیں، سوتیلی نہیں ہو سکتیں۔ مجھے تکلیف میں دیکھ کر کتنی فکر مند ہو گئی ہیں۔ دل کو تھوڑی تسلی ہوئی تو وہ سکون میں آنا چلا گیا۔

رات کو ابو آئے تو میرے پاس بیٹھے کتنی دیر تک میرا سر دباتے رہے، پھر وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ دوسرے دن میں بھلی چنگی ہو گئی اور تیسرے دن سے میں سکول جانے لگی۔ بظاہر میں نے خود کو دلیلیں دے دے کر مطمئن کر لیا تھا مگر میرے دل میں ایک پھانس سی چسب گئی تھی۔ ایک بے نام سے خلش مجھے بے چین کر دیتی تھی۔ کوئی بات ہے جو میں نہیں جانتی۔

رات کو سارے گھر والے اکٹھے بیٹھ کر ٹی وی ڈراما دیکھتے تو میں سوچوں میں ڈوبی ہوتی۔ میرا دھیان ٹی وی کی طرف بالکل نہ ہوتا۔ ابو نے کئی مرتبہ یہ بات نوٹ کی، مگر چپ ہو رہے۔ بس میری طرف دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتے۔

میں اب امی کی ہر بات، ہر حرکت نوٹ کرتی۔ مہوش کو بھی غور سے دیکھتی رہتی۔ وہ بالکل امی پر گئی تھی۔ رنگ و روپ کے علاوہ نین نقش بھی اور موٹی بھی امی کی طرح تھی۔ جبکہ میں بالکل دلیلی تھی، سانولی سلونی سی۔ ہم دونوں بہنوں میں کوئی بات بھی کامن نہ تھی۔ ہر بات میں ایک دوسرے کے برعکس تھیں۔ میں پڑھائی میں بہت لائق تھی جبکہ مہوش بہت نالائق اور کند ذہن تھی۔ ایک سبق کو کئی کئی دن یاد کرتی پھر بھی بمشکل ہی رٹا لگا پاتی۔

بلال بھائی کو بھی پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ مہوش کی طرح کندھن تو نہ تھے مگر پھر بھی ہر سال اتنے نمبر لیتے کہ بمشکل ہی پاس ہوتے۔

شاید ابو میری غیر معمولی ذہانت ہی کی وجہ سے مجھے اتنا چاہتے تھے۔ امی کو میری یہ خوبیاں اس لیے نہیں بھاتی تھیں کہ وہ خود بالکل چٹی اُن پڑھ تھیں۔ اتنی کہ اپنا نام تک نہیں لکھ سکتی تھیں۔ تعلیم ہی انسان کو سونپنے سمجھنے کا شعور دیتی ہے اور جس انسان نے سکول کا منہ ہی نہ دیکھا ہو وہ کیا سمجھے گا، آرٹ اور ہسٹری کو۔ اسے تو یہ چیزیں خرافات ہی لگیں گی نا! تھے تو ابو بھی انڈر میٹرک، مگر اپنے وسیع مطالعہ اور سیاست کی بدولت دنیا کے ہر موضوع پر بلا تکان گفتگو کر سکتے تھے۔ ان کی باتوں میں غضب کی فصاحت و بلاغت ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے تنہائی میں ابو سے پوچھا تھا۔

”ابو! آپ اتنے باذوق، اتنے باشعور اور دانش ور ہیں۔ امی کے ساتھ آپ نے کیسے زندگی گزار دی؟“

”بس بیٹا گذاردی۔ بزرگوں کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔“ ابو مسکرا کر بولے تو میں پھر بولی۔

”مگر ابو، جب کسی انسان کے ساتھ ذہنی معیار ہی نہ ملتا ہو، عادتیں نہ ملتی ہوں، پسند نا پسند مختلف ہوتو ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا خود پر ظلم نہیں ہے۔“

ابو میری باتیں سن کر مسکرا پڑے۔ مجھے خود سے لپٹا لیا۔

”میری ذہین اور حساس بچی۔ بیٹا دماغ پر اتنا زور مت ڈال کرو۔ تمہاری عمر ایسی باتیں سوچنے کی بالکل نہیں۔ تم صرف پڑھائی پر توجہ دیا کرو۔“

”ابو، مجھے ایک بات کی سمجھ بالکل نہیں آتی۔“

”وہ کیا میری جان؟“

”نانا ابو اور نانی نے امی کو سکول کیوں داخل نہیں کروایا تھا۔ تھوڑا پڑھ لیتیں تو ان کی سوچ بدل جاتی۔“

”میرے بچے..... نانا ابو کی ان دنوں اپنی برادری کے کچھ لوگوں سے بڑی زبردست قسم کی دشمنی چل رہی تھی اور اس دشمنی کے ڈر سے وہ بیٹیوں کو گھر سے نہیں نکالتے تھے۔“

”مگر ابو.....“ میں نے منہ کھولا تو ابو نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس اب اور سوال نہیں۔ کہا ہے ناکہ بچے ایسی باتیں نہیں سوچتے۔“

اور میں چپ ہو گئی تھی اور اب میں آج کل جس کشمکش سے گذر رہی تھی، ابو اور دوسرے گھروالے یکسر اس سے بے خبر تھے۔ وہ قطعی لاعلم تھے کہ میں اپنی ننھی سی جان پر کتنا کرب سہہ رہی تھی۔ آخر اس مسئلے کا حل میرے ذہن میں آ گیا۔ اس سوال کا جواب ایک ہی ہستی دے سکتی تھی اور وہ تھی میری نانی جان۔ میری پیاری نانی جان جو مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتی تھیں۔ یہاں پھر میرے ذہن میں یہ سوال سر اٹھانے لگا تھا کہ اگر امی سوتیلی ہوئیں تو پھر ان کی امی یعنی نانی کیوں مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے بن ماں کی بچی سمجھ کر، ترس کھا کر پیار کرتی ہوں۔ بہر حال کچھ بھی ہو میں اس سوال کا جواب نانی سے پوچھ کر رہوں گی۔ چتا تو چلے اصلیت کیا ہے۔ میں یہ فیصلہ کر کے پرسکون ہو گئی۔ اب صرف انتظار تھا تو نانی کے آنے کا۔ نانی ہر پندرہ بیس دن بعد ہمارے گھر آتی تھیں۔ ایک دو دن گزار کر واپس چلی جاتی تھیں۔ ان دو دنوں میں

نانی ہمارے خوب لاڈ اٹھاتیں، مزے مزے کے پکوان بنا کر کھلاتیں اور رات کو خوب مزے مزے کی کہانیاں سناتیں۔ دل یہی چاہتا کہ نانی ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس رہ جائیں، کبھی گھر واپس نہ جائیں۔ یہ حقیقت تھی کہ جو پیار مجھے ماں سے نہ ملا وہ نانی نے دیا۔

امی، نانی کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ نانی کے دو ہی بچے تھے۔ ایک ماموں جو امی سے سات سال بڑے تھے اور دوسری امی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے نواسے اور نواسیوں پر اندھا دھند پیار لٹاتیں۔ رات کو گرم لٹانوں میں گھس کر موگیگ پھلیاں اور چلغوزے کھاتے ہوئے نانی سے جنوں اور پریوں کی کہانیاں سننے کا اپنا ہی مزہ ہوتا۔ نانی بعض اوقات ہمارے ساتھ بالکل بچہ بن جاتیں۔ پھیلیاں بھجواتیں اور نہ بوجھنے پر ہمیں بڑی مزاحیہ سزائیں دیتیں۔ ابوبھی ان دنوں بڑے خوش نظر آتے۔ نانی اور نواسوں کی آپسی محبت دیکھ کر مسکراتے رہتے۔

اب مجھے نانی کی آمد کاشت سے انتظار تھا۔ آخر صبر نہ ہوا تو ایک دن امی سے پوچھ لیا۔
”امی! نانی کب آئیں گی؟“

”پتا نہیں، شاید جمعرات کو۔“ انہوں نے ٹکسا جواب دیا اور میں دن گننے لگی۔ جمعرات کو..... اور آج کون سا دن ہے، سوموار ہے۔ منگل، بدھ اور پھر جمعرات۔ یعنی صرف دو تین دن رہ گئے تھے نانی کے آنے میں۔ ان دنوں سکولوں میں جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی، اس لیے نانی جمعرات کو آتیں تھیں۔ تاکہ اگلے دن چھٹی ہونے کی وجہ سے ہمارا حرج نہ ہو۔ میں نے وہ دو دن بڑی بے صبری سے گزارے۔ آخر جمعرات آئی گئی اور ہم جمعرات کو ہاف ڈے ہونے کی وجہ سے جلدی سکول سے گھر آئے تو نانی آئی بیٹھی تھیں۔ ہم تینوں بھائی بہن نانی کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئے۔

”ارے ارے، تم تو ایسے مل رہے ہو جیسے برسوں سے بچھڑے تھے۔“ نانی ہنستے ہوئے ہمارا منہ چومنے لگیں۔

دن گذرا، رات ہوئی تو نانی سونے کے لیے میرے کمرے میں آ گئیں۔ وہ ہمیشہ میرے کمرے میں میرے بیڈ پر میرے ساتھ سوتیں تھیں۔ ورنہ عام دنوں میں مہوش میرے ساتھ سوتی تھی۔ ہم دونوں کا کمرہ ایک تھا، جبکہ بلال بھائی الگ کمرے میں سوتے تھے۔ جن دنوں نانی آتیں، ان دنوں مہوش اپنے لیے میٹرس بچھا لیتی۔

آج رات بھی ہم تینوں بہن بھائی نانی کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔

”نانو! آج کوئی اچھی سی کہانی سنائیں۔“ بلال بھائی بولے۔

”ارے بیٹا، اب تو تو جوان ہو گیا ہے۔ سترہ سال کا گروہن چکا ہے اور کہانی سننے کی ضد کر رہا ہے۔“ نانی نے بلال بھائی پر جملہ کسا تو وہ جھل سے ہو کر بولے۔

”کہاں نانی جان! ابھی تو میں بچہ ہوں۔ اٹھارہ سال کی عمر ہوتی ہے بلوغت کی۔“

”داڑھی مونچھ اُگ رہی ہے اور ابھی بچے ہو۔ خیر سے بڑے کب تک ہو جاؤ گے؟“ آج نانی، بلال بھائی کو

خوب تنگ کر رہیں تھیں۔

”نانی! اگر آپ نے کہانی نہیں سنانی تو میں جارہا ہوں۔“ بلال بھائی منہ پھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ارے ارے، تم تو غصہ کر گئے۔ بیٹھو سناؤ ہوں۔“ نانی نے بلال بھائی کو ہاتھ سے پکڑ کر پاس بٹھالیا۔

نانی نے کہانی سنانے کے لیے تمہید باندھی اور ہم سب نے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ وہ کہانی سناتی جا

رہی تھیں اور ہم منہ اور کان کھولے اس طرح کہانی میں گم ہو چکے تھے گویا کہانی کا حصہ ہی بن چکے تھے۔ وقتی طور پر میں وہ بات بھی بھول چکی تھی جو میں نانی سے پوچھنا چاہ رہی تھی اور جس کی وجہ سے اتنے دن سے نانی کا انتظار کر رہی تھی۔ کہانی ختم ہوئی تو ہم کہانی کے حصار سے باہر آئے۔ بلال بھائی بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہوش بھی سو چکی تھی۔ نانی نے لائٹ آف کر کے زیرو واٹ کا بلب جلایا اور سونے کے لیے میرے برابر لیٹ گئیں۔

”نانی جان!“ میں نے آہستگی سے پکارا۔

”جی میری جان۔“ نانی نے شہد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”نانی جان! آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔“ میں اٹکتے ہوئے بولی۔

”پوچھو..... میرے بچے.....“

”نانی جان.....“ میں چپ ہو گئی۔

”کیا بات ہے نور؟ پوچھو بیٹا کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔“

”نانی جان! کیا..... امی میری..... امی نہیں ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ نانی حیران ہوئیں۔

”میرا مطلب ہے کہ..... یہ میری سگی امی ہیں یا سوتیلی؟“

نانی چند لمحوں کے لیے بالکل چپ کر گئیں جیسے انہیں مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہ ہو۔ پھر وہ گلا کھنکھار کر

بولیں۔

”تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو نور؟“

”بس ایسے ہی، آپ میری بات کا جواب دیں نا!“ اور اس وقت نانی کی رگب ظرافت پھڑکی اور اس نے وہ

جواب دیا، جس نے آگے چل کر مجھے موت و حیات کے بیچ لاکھڑا کیا۔ نانی کو شرارت سوچھی۔ انہوں نے ایک منٹ کے

لیے بھی یہ نہ سوچا کہ ان کی باتیں میرے معصوم اور حساس ذہن پر کتنی بے رحمی سے اثر انداز ہوں گی۔

”نانی چپ کیوں ہیں؟ بتائیں نا!“ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نانی کی ٹال منول سے میرے ذہن میں

خداشات سر اٹھارے تھے۔

”تو پھر سنو میری بچی۔“ نانی نے غالباً اپنے ذہن میں پوری کہانی ترتیب دے ڈالی تھی۔ ”تمہارے ابو نے دو

شادیاں کی تھیں۔ ایک زاہدہ سے اور دوسری تمہاری ماں سے۔“

نانی کے یہ الفاظ میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھے، جس کی گونج سے میری روح لرزنے لگی۔ مگر نانی میری

حالت سے بے خبر بولتی چلی گئیں۔

”جب تم پیدا ہوئی تو تمہاری ماں چل بسی، یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی۔ پھر میں تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر

لے گئی۔ تمہیں پالا پوسا۔ جب تم تین سال کی ہوئی تو تمہارا باپ تمہیں واپس اس گھر میں لے آیا۔“

اب میں باقاعدہ رو رہی تھی۔ ہائے میری ماں مجھے پیدا کرتے ہی مر گئی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو مجھ سے کتنا پیار

کرتی۔ اتنا..... جتنا امی مہوش کو کرتی ہیں۔

”نانی جان! میری امی کی قبر کہاں ہے؟“ میری آواز جیسے گلے میں پھنس رہی تھی۔

”ہمارے آبائی قبرستان میں۔“ نانی نے فٹ سے جواب دیا۔

”نانی! میری امی کا نام کیا تھا؟“

”ہوں.....“ نانی سوچ میں پڑ گئی۔ ”اس کا نام تھا..... رضیہ۔“

”رضیہ.....“ میں نے زیر لب دہرایا۔

”نانی جان! میری امی کی کوئی تصویر نہیں ہے کیا۔ میں ان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ کیسی تھیں؟“

”بالکل تمہارے جیسی..... اور تصویر..... ہو سکتا ہے تمہارے ابو کے پاس ہو۔ پوچھ کر دیکھ لینا۔“

اس وقت میرے ننھے سے ذہن نے بالکل کام نہ کیا کہ میں شکل و صورت اور رنگ و روپ سے بالکل ابو پر گئی

تھی۔ ذہن میں اور بھی بہت سے سوالات سر اٹھا رہے تھے کہ اگر ابو نے زاہدہ سے شادی کر لی تھی اور ان کے بطن سے ایک خوبصورت بیٹا بھی موجود تھا تو پھر میری ماں سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ نہ وہ دوسری شادی کرتے اور نہ میں دنیا میں آکر سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی۔

نانی تو یہ من گھڑت قصہ سنا کر سو گئیں، مگر میں پوری رات انگاروں پر لوٹتی رہی۔ رورو کر اپنا تکیہ بھگو ڈالا۔ صبح

چھٹی کا دن تھا۔ مجھ سے اٹھا ہی نہ گیا۔ نانی جان کو بھی صبح سویرے ان کے گھر سے فون آ گیا کہ گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں، جلدی آ جائیں اور نانی اس ڈرامے کا ڈراپ سین کیے بغیر ہی چلی گئیں۔

لیکن مجھے سولی پر چڑھا گئیں۔ میں لمحہ بالمحہ، تھوڑا تھوڑا ہر روز، ہر پل مرنے لگی۔ کسی وقت بھی ذہن سے یہ بات نہ نکلتی کہ میں امی کی سوتیلی بیٹی ہوں۔ اب ان کی ہر بات پر میں آزرده ہو جاتی اور یہی سوچتی کہ سگی ماں ہوتی تو ایسا تھوڑا کہتی۔ کھانا پینا کم ہوتے ہوتے بالکل چھوٹ گیا۔ پہلے ہی دہلی پتی تھی اب تو سوکھ کر کاٹنا ہو گئی۔ ابو پوچھ پوچھ کر تھک گئے کہ بیٹا کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ۔ مگر میں نفی میں سر ہلا دیتی۔ کئی دفعہ جی میں آتا کہ ابو سے اپنی امی کے متعلق پوچھوں مگر یہ سوچ کر چپ ہو رہتی کہ ابو بھی خواہ مخواہ پریشان ہوں گے اور شاید شرمندہ بھی ہوں گے کہ میں ان کے اس راز سے واقف ہو گئی ہوں۔ مگر کوئی بھی راز ہمیشہ تو راز نہیں رہتا، ایک دن سب کے سامنے آ ہی جاتا ہے۔

اس دن سکول میں، میں ٹیچر کو سبق سنانے کے لیے کھڑی ہوئی تو چکر اکر زمین پر گر گئی۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ اسکول انتظامیہ نے میرے گھر اطلاع دی تو میرے گھر والے یعنی ابو اور امی دوڑے چلے آئے۔ فوراً اٹھا کر ہسپتال میں لے گئے۔ جہاں فوراً مجھے طبی امداد مہیا کی گئی اور گلوکوز کی ڈرپ چڑھا دی گئی۔ ڈاکٹر نے سب کو باہر بھیج کر اکیلے میں مجھ سے کچھ سوالات کیے اور پھر ابو سے کہا کہ چودھری صاحب آپ کی بیٹی کے ذہن پر کوئی دباؤ ہے۔

”دباؤ..... کیا دباؤ؟“ ابا جان حیران ہوئے۔

”یہ تو آپ اس سے پوچھیں گے، مگر اسے اعتماد میں لے کر۔“

”ضرور ڈاکٹر صاحب، میری بیٹی مجھ پر مکمل اعتماد کرتی ہے اور ہم باپ بیٹی میں بڑی گہری دوستی ہے۔ پتا نہیں

کون سی بات چھپا رہی ہے میری بچی مجھ سے۔“

اور پھر ابا جان میرے پاس آ بیٹھے۔ امی کو باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ ابا جان نے میرا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر دیا تو میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”نورین بیٹا! اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”اب ٹھیک ہوں ابو۔“ میں نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔

”نورین بیٹا! تم ہر بات مجھ سے کر لیتی ہو۔ تو اب ایسی کون سی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔“ ابا جان

انتہائی شفقت سے پوچھ رہے تھے۔

میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”کون سی بات ابو..... ایسی کوئی بات نہیں ہے جو آپ سے چھپاؤں گی۔“

”بیٹا! جو بھی تمہارے دل اور دماغ میں چل رہا ہے اور جس نے تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے مجھ سے کہہ دو۔“

میں تمہارا ابو ہوں۔ تم میری جان ہو۔ تم مجھ سے کوئی بات کیسے چھپا سکتی ہو۔ شاباش فوراً کہہ دو۔“

”ابو جان.....“ میرے لب کاپنے لگے۔

”ہاں ہاں کہو..... میرے بچے.....“ ابو مجھے پیار سے پکڑنے لگے۔

”ابو جان! میری امی کی قبر کہاں ہے؟ میں ان کی قبر پر جانا چاہتی ہوں۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو ابو

کے توجیسے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ ہونق بیٹھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”تمہاری امی کی قبر.....“ ابو کو تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو وہ بولے۔ ”بیٹا! تمہاری امی تو ابھی ابھی باہر گئی ہیں۔ وہ

زندہ ہیں تو پھر ان کی قبر.....“ ابو بات ادھوری چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔

”ابو! میں سب جان گئی ہوں۔ آپ مزید کچھ نہیں چھپا سکتے۔“

”کیا جان گئی ہو؟“

”یہی کہ آپ نے دوشادیاں کی تھیں۔ ایک اس امی سے اور دوسری میری امی سے، جو مجھے پیدا کر کے فوت ہو

گئی تھیں۔“ میں اب زوردار ہچکیاں لے رہی تھی۔

”اودہ میرے خدا!“ ابو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

”یہ سب تمہیں کس نے بتایا ہے؟“

”نانی جان نے.....“

”کیا..... نانی جان نے.....“ ابو کے سر پر گویا بم آگرا تھا۔ ”خالہ جان اتنی بڑی حماقت کیسے کر سکتی ہیں۔“ ابو

جان منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔ ان کا رنگ لال ہو کر تھمارا تھا۔ انہوں نے باہر جا کر امی کو بلایا۔

امی کمرے میں آئیں تو میری کہی باتیں ان کے گوش گزاریں۔ ابو غصے سے برس رہے تھے۔ امی بھی یہ سب سن

کر ہکا بکا رہ گئیں۔ میں دونوں کو باری باری دیکھ رہی تھی۔ میں سر ہانے سے ٹیک لگائے رو رہی تھی۔ امی میری طرف

آئیں۔ مجھے ساتھ لپٹا کر رونے لگیں۔ میرا سر منہ چوم کر روتی رہیں۔

”میری بچی تمہارے ذہن میں یہ خیال بھی کیسے آیا کہ میں تمہاری ماں نہیں۔“

”یہ سب کیا دھرا تمہاری ماں کا ہے۔“ ابو بری طرح برہم ہو رہے تھے۔ ”انہیں فون کر کے فوراً بلواؤ۔“ ابو نے

حکم دیا اور امی ہسپتال کے فون سے نانی کو فون کرنے چلی گئیں۔

☆.....

رات کو ہسپتال کے اس کمرے میں ایسے ایسے جذباتی مناظر دیکھنے کو ملے کہ بعد میں میری شادی پر رخصتی کے موقع پر بھی وہ مناظر دوبارہ نظر نہیں آئے۔

نانی، ماموں کے ساتھ آئیں۔ بیٹھی رو رہی تھیں۔ پہلے تو وہ مجھے گلے لگا کر روئیں پھر امی نے انہیں خوب جھاڑا تو وہ صفائیاں دیتے دیتے ہلکان ہو گئیں۔

”مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ نورین میری باتوں کو اس قدر سیریس لے لے گی۔ میں تو سمجھی تھی کہ مذاق میں پوچھ رہی ہے، اس لیے میں نے بھی مذاق میں ہی جواب دے دیا۔“

”نیری بچی کی چاہے جان چلی جاتی اور آپ کے لیے مذاق ہی ٹھہرتا۔“ ابو زہر خند لہجے میں بولے تو نانی تڑپ کر بولیں۔

”زمان! ایسا مت کہو۔ تم جانتے ہو کہ مجھے نورین بہت عزیز ہے، دوسرے دونوں بچوں سے زیادہ۔“ مہوش اور بلال بھی وہیں تھے۔ نانی پھر میرے پاس آ بیٹھیں۔

”میری بچی..... میں نے انجانے میں تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔“ نانی نے دونوں ہاتھ میرے آگے جوڑے تو میں اونچی آواز میں رونے لگی۔ نانی اور امی مجھے چپ کرانے لگیں۔ ابو بھی پریشان ہو گئے۔

”نور بیٹا! میں قبیلے کی طرف منہ کر کے اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ زاہدہ تمہاری سگی ماں ہے اور میں تمہاری سگی نانی۔ ارے پگلی یہ تو سوچو اگر تم میری سگی نواسی نہ ہوتی تو بھلا میں تمہیں اتنا پیار کیسے کرتی۔ بچپن میں تم میرے پاس ہی زیادہ رہتی تھی۔ میں تمہیں اپنے پاس سلاتی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دو دھ گرم کر کے فیڈر میں ڈال کر پلاتی تھی۔ کسی غیر کے بچے کے لیے میں یہ سب کیوں کرتی بھلا۔“

ایک ایک کر کے بدگمانی کے سارے بادل چھٹنے لگے۔ الٹا اب مجھے سب کے سامنے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ نانی پھر بولیں۔ ”تمہاری ماں تھوڑی غصے کی تیز ہے، مگر وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔“ نانی نے مجھے یقین دلایا تو میں نے امی کی طرف دیکھا جو اس وقت آنکھوں میں آنسو بھرے میری طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

”امی.....“ میں نے پکارا تو امی فوراً اٹھ کر میرے پاس آ گئیں۔

”جی میری جان!“ امی نے میری پیشانی چوم لی۔

”امی! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کو غلط سمجھی تھی۔“

”معافی تو میں تم سے مانگتی ہوں نورین۔ تمہیں سگھڑ بنانے کے چکر میں یہ تک بھول گئی کہ میرا اتنا سخت رویہ تمہارے حساس دل کو کیسے تکلیف دے رہا ہے۔“

”چلو سب لوگ رونا دھونا چھوڑیں۔ شکر کریں بروقت پتا چل گیا۔ ورنہ یہ لڑکی تو چپ چاپ اپنی جان پر جھیل رہی تھی۔“ اب ماموں بولے تو بلال بھائی نے بھی ہمت کی۔

”ابو جان پیسے دیں۔ میں سب کے لیے آکس کریم لے کر آتا ہوں۔ دیکھئے منٹوں میں سب کا موڈ ٹھیک ہو

جائے گا۔“ ابو نے بلال کو پیسے دیئے اور وہ سب کے لیے آکس کریم لے آیا اور پھر واقعی سب کا موڈ بحال ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے جہاں رونادھونا مچا ہوا تھا۔ اب وہاں تھقبے گونج رہے تھے۔

☆.....

اس واقعہ کے بعد امی کا رویہ حیرت انگیز حد تک بدل گیا۔ اب وہ مجھ سے نرمی سے بات کرتیں اور گھر کا کام نہ کرنے پر طعنے بھی نہیں دیتی تھیں۔ ویسے تو گھر یلو کام کاج کے لیے دو ملازمائیں آتی تھیں، مگر امی کی سوچ تھی کہ لڑکیوں کو کھانا پکانا ضرور آنا چاہیے اور تیرہ چودہ سال کی لڑکی کو کافی حد تک کوکنگ سیکھ جانی چاہیے۔ مگر اب وہ مجھے کسی بھی کام کے لیے نہ کہتیں۔ خود ہی کچن میں گھسی پکاتی رہتیں۔ کبھی میرا دل چاہتا تو ان کا ہاتھ بنا دیتی ورنہ کچی پکائی کھاتی۔

ابو نے امی سے سختی سے کہہ دیا تھا کہ خبردار نورین پر کسی وجہ سے کوئی بھی دباؤ ڈالا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ وقت اپنی سبک روی سے گذرنا چلا گیا۔ امی کے بدلے ہوئے رویے نے میری صحت پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔ میرا سوکھا مریل جسم بھرنا شروع ہو گیا۔ رنگت بھی اچلی اور صاف ہوتی چلی گئی۔ جوں جوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی گئی، پرکشش ہوتی چلی گئی۔ میٹرک کرتے کرتے میں سرو قد کے ساتھ سڈول اور متناسب جسم کی مالک بن چکی تھی۔ سانولی رنگت اب کھلتے ہوئے گندمی رنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گھنے لمبے سیاہ ریشمی بالوں نے میری شخصیت کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا تھا۔ چند سال پہلے دیکھنے والے اب مجھے دیکھ کر مبہوت ہو جاتے تھے۔ وہ اس کا پاپلٹ پر حیران رہ جاتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ آتی جوانی ہر کوئی دیکھتا ہے، مگر جاتے ہوئے کسی کو نظر نہیں آتی۔

میں اب سولہ برس کی بھرپور دوشیزہ بن چکی تھی، جبکہ مہوش تیرہ برس کی لڑکپن کی عمر سے گذر رہی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ فربہ اندام ہو گئی تھی۔ موٹاپے نے اس کو بے ڈول بنا دیا تھا۔ ان دنوں میں میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوئی تھی۔ نانی اماں مجھے لینے کے لیے آگئیں۔ ان کا اصرار تھا کہ نورین اب دو ماہ میرے پاس رہے گی۔ شاید وہ مجھے بھرپور توجہ اور محبت دے کر اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہ رہیں تھیں۔ حالانکہ میں بچپن سے ہی نانی کی جیتی اور لاڈلی تھی۔ دادی کی محبت سے تو ہم قطعی نا آشنا تھے کیونکہ وہ بہت پہلے وفات پا چکی تھیں۔ اس وقت مہوش ایک سال کی تھی۔ دادا جان ہفتے ڈیڑھ بعد ملنے کے لیے آ جاتے تھے۔ وہ چچا کے ہاں گاؤں میں اپنے آبائی گھر میں رہتے تھے۔ ابا جان بھی بمعہ فیملی کے وہیں رہتے تھے۔ ہم تینوں بہن بھائی کی پیدائش وہیں کی تھی۔ پھر ابا جان نے ہمارے بہتر مستقبل کی خاطر گاؤں چھوڑا اور شہر آ گئے۔ ہمیں بہترین انگلش میڈیم سکول میں داخل کروایا۔

ہمارا گاؤں شہر سے زیادہ دُور نہ تھا۔ گاڑی پر بشکل پندرہ بیس منٹ کا سفر تھا، اسی لیے ہم مہینے میں ایک دو چکر ضرور گاؤں کے لگا آتے۔ کبھی امی، ابوبھی ہمراہ جاتے تو کبھی ہم دونوں بہنیں بھائی کے ہمراہ بایک پر اور کبھی گاڑی پر چلی جاتیں۔

چچا کی فیملی میں اور ہم میں اتنا ہی فرق تھا جتنا شہری زندگی اور دیہاتی زندگی میں ہو سکتا ہے۔ چچا کی ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی، صائمہ۔ ڈری ڈری اور سہمی سہمی صائمہ میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ صنفِ مخالف اس کی طرف متوجہ ہوتی۔ گہری سانولی رنگت کے ساتھ معمولی نقوش نے اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ بہت کم گوشتی۔ ہم دونوں بہنوں کے ساتھ تو تھوڑا ہی مذاق کر لیتی، مگر بلال بھائی کے سامنے اس کی بولتی بند ہو جاتی۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی مگر ہم

دونوں بہنوں سے بہت دپ کر رہتی۔ ہماری ہر بات کی ہاں میں ہاں ملاتی۔ اگر ہم ہنسی مذاق کی کوئی بات کرتیں تو وہ ہماری ہنسی میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتی۔ اور اگر کسی دکھی ٹاپک پر اظہار خیال کرتیں تو وہ اداس ہونا ضروری خیال کرتی اور اگر کسی بات پر ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا ہو جاتا تو اس کی جان پر بن آتی۔ وہ چکی کے دوپاٹوں میں بری طرح پس جاتی۔ جب معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا یعنی وہ مغاہمت کروانے میں ناکام رہتی تو وہ بھاگی بھاگی جاتی اور دادا جی کو بلا لاتی۔ دادا جی کبھی پچکار کر اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے ہماری لڑائی ختم کرواتے۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد جب تک صلح نہ ہو جاتی وہ دورانہ صائمہ کے لیے بڑی کڑی آزمائش ثابت ہوتا۔ وہ بے چاری جس بہن کے ساتھ بولتی، دوسری اسے کڑے تیوروں سے گھورتی تو اس کا پتا پانی ہونے لگتا۔ پھر وہ دوسری کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی چالپوسی شروع کر دیتی۔ اپنی دانست میں وہ حساب برابر کرنے میں لگی رہتی اور اس حساب کتاب کے چکر میں وہ ہلکان ہو جاتی۔ پھر کوئی بڑا بوڑھا ہم دونوں بہنوں کی صلح صفائی کرواتا جس کی سب سے زیادہ خوشی صائمہ کو ہی ہوتی اور اس کی جان ایک دم سے ہلکی ہو جاتی۔ چچی جان کو ہم دونوں بہنوں کی جی حضوری کرتی صائمہ سے بہت چڑھنے لگتی۔ وہ چاہتیں کہ ان کی اکلوتی بیٹی ہمارے سامنے اکثر کر رہے۔ ہمارے سامنے خود کو کمتر نہ جانے۔ حالانکہ چچی بڑی تیز مزاج خاتون تھیں، یہی وجہ تھی کہ امی اور چچی کی زیادہ ہمتی نہ تھی۔ جب تک اکٹھی ایک گھر میں رہیں، لڑتی ہی رہیں۔ جب دور ہو گئیں، لڑائی جھگڑے تو بند ہو گئے۔ کبھی کبھار ملتیں تو بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملتیں، مگر پھر بھی باتوں باتوں میں طنز کے نشتر چلانا نہ بھولتیں۔

بھلا چچی کو یہ بات کیونکر گوارہ ہوتی کہ ان کی جھٹانی کی بچیاں ان کی بچی سے کسی طور پر برتر ہوں اور ان کی بیٹی ہاتھ باندھے ان کے آگے پیچھے پھرتی رہے۔ مگر فطرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کچھ چیزیں انسان کو فطری طور پر وراثت میں ملتی ہیں۔ صائمہ فطری طور پر کمزور اور ڈرپوک لڑکی تھی اور یہ عادت اسے اپنے باپ یعنی چچی کی طرف سے ملی تھی۔ چچا جان بھی ایک سیدھے سادے کھیتوں میں بل چلانے والے کسان تھے۔ گھر میں سیاہ و سفید ہر چیز کی مالک چچی جان تھیں۔ چچا جان نے کبھی ان سے کسی چیز کا حساب نہیں لیا تھا۔ وہ بس گھر میں آتے، کھانا کھاتے اور کھیتوں کی جانب نکل جاتے۔ گھر میں ہوتے بھی تو چپ چاپ حقہ گڑ گڑاتے رہتے۔ چچی جان کی زوردار اور دبنگ شخصیت کے سامنے صائمہ سٹ کر رہ گئی۔ اپنے باپ کی طرح چچی کے ہر فیصلے پر چپ چاپ سر جھکا دیتی۔

ہاں البتہ دادا جان کے سامنے چچی کا سکھ نہ چلتا۔ دادا جان اگر کسی بات پر گرجتے برستے تو چچی جان کان لپیٹ کر خاموشی میں ہی عافیت جانتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم تینوں بہن بھائی جب بھی بچپن کے ہاں رہنے کے لیے آتے تو چچی جان، دادا جان کے ڈر سے اچھا برتاؤ کرتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ہم تینوں تیز تر اور امنہ پھٹ ہیں۔ ان کی کوئی بھی ریشہ دوانی ہمارے سامنے چلنے والی نہ تھی۔ ہم نہ صرف زمینوں بلکہ اس آبائی بڑے سے حویلی نما گھر کے آدھے حصے کے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارے دادا جان ہمارے سروں پر سلامت تھے۔ اس لیے پورے طمع طراق سے آتے اور ٹھسے سے رہتے تھے۔ اپنے گاؤں تو ہم جاتے رہتے تھے۔ البتہ نانی کے گاؤں کبھی کبھار ہی جانا ہوتا تھا۔ موسم گرما اور سرما کی چھٹیوں میں یا پھر کوئی خوشی یا غمی کے سلسلے میں۔

اب جبکہ میں میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوئی تو نانی مجھے لینے کے لیے چلی آئیں۔ امی نے تو کوئی

اعتراض نہ کیا مگر ابو سے پوچھنا بھی ضروری تھا۔ شام کو ابوائے تو وہ بھی تھوڑی سی پس و پیش کے بعد مان گئے۔
میں نے اپنی ضروری چیزیں سمیٹیں اور بلال بھائی ہمیں گاڑی پر نانی کے گاؤں چھوڑ گئے۔ بلال بھائی اس وقت اکیس سال کے خوبصورت اور توانا مرد بن چکے تھے۔ اپنی قابل رشک صحبت اور رنگ و روپ کی وجہ سے اور بھاری بھر کم مونچھوں کی وجہ سے اپنی عمر سے بڑے دکھائی دیتے تھے۔

میں بہت عرصہ بعد نانی کے یہاں رہنے کے لیے آئی تھی اور ان دو مہینوں میں مجھے ماموں کی فیملی کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا اور تب ہی پہلی مرتبہ میں جبار کی عادات و اطوار دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ان دنوں وہ میرے لیے جبار بھائی تھے۔ وہ مجھ سے گیارہ برس بڑے تھے۔ کچھ تو عمروں کا اتنا زیادہ فرق اور اس پر جبار کی خشک مزاجی اور آدم بے زاری نے اس فرق کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوتا تو میں ایک دم چپ ہو جاتی۔ وہ بغیر سلام دعا کیے سیدھا اپنے کمرے میں جا گھستا۔ کسی کو بلانا کسی سے بات کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔

ان دنوں وہ ستائیس سال کا بھاری بھر کم نوجوان تھا۔ عمر کے لحاظ سے نوجوان مگر دیکھنے میں پینتیس چالیس سال کا پکی عمر کا مرد۔ سر کے بال بے حد گھنے اور مونٹے مگر بالکل سفید۔ چہرے پر کرخنگی جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی اور اس کرخنگی اور سفید بالوں نے اسے عمر سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

ان دنوں وہ واہڈا میں بطور افسر بھرتی ہو چکے تھے۔ شروع سے وقت کے بہت پابند تھے۔ ٹھیک وقت پر گھر سے نکلتے اور دفتر آف ہوتے ہی سیدھے ناک کی سیدھ میں گھر آتے۔ گھر سے نکلتے وقت اپنا کمرہ لاک کرنا کبھی نہ بھولتے اور اس کی چابی ہمیشہ اپنے پاس رکھتے۔ صرف چھٹی کے دن اپنی نگرانی میں ملازمہ سے کمرے کی صفائی کرواتے اور خود کو کمرے میں بند کر لیتے۔ کسی کو اجازت نہ تھی ان کے کمرے میں داخل ہونے کی یا ان کی کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی۔

ان کے برعکس غفار بھائی بہت شگفتہ مزاج اور بذلہ سخ تھے، بالکل ماموں کی طرح۔ وہ بات بے بات قہقہے لگاتے اور ہمیشہ خوش رہتے۔ وہ جبار بھائی سے سات سال چھوٹے تھے اور مجھ سے چار سال بڑے، اس لئے میں دونوں کی بہت عزت کرتی تھی اور بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

اس دن بھی شام کا وقت تھا۔ نانی جان میرے لیے گھنے بالوں میں سرسوں کا تیل لگا رہیں تھیں۔ نانی کا گھر بھی ایسا ہی تھا جیسا عموں گاؤں کے خوشحال لوگوں کا ہوتا ہے۔ بڑا سادہ لان اور اس کے اطراف میں بہت سارے کمرے۔ انہی کمروں میں ایک کمرہ باورچی خانہ تھا، جس میں سے اس وقت بڑی اشتہا انگیز مہک آرہی تھی۔ ممانی جان قیمہ بھرے کر پیلے بنا رہیں تھیں اور ان کے تیلنے کی خوشبو بڑے سے صحن میں چکرا رہی تھی۔ نانی جان چار پانی پر بیٹھی تھیں اور میں ان کے قدموں میں زمین پر لکڑی کی چوکی پر بیٹھی سر میں تیل لگا رہی تھی۔ جبکہ دوسری چار پانی پر غفار بیٹھا دادی سے نوک جھونک کر رہا تھا۔

”دادی جان کیا یہ سچ ہے کہ ہمارے دادا جان بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ دنیا سلام کرتی تھی ان کو۔“
”ہاں ہاں، بڑی گل والے تھے تمہارے دادا جان۔ بڑی بڑی پنچائیتیں آتی تھیں ان کے پاس اپنا فیصلہ کروانے کے لیے۔“ نانی جان کی گردن میں تناؤ پیدا ہونے لگا اور غفار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔
”کہتے ہیں انگریزوں سے بھی بڑی اچھی علیک سلیک رکھتے تھے۔“

”ہاں تو اور کیا..... کئی دفعہ انگریز صاحب بہادر ہماری اس بیٹھک میں بیٹھ کر چائے لسی پی چکے ہیں۔“

”اچھا اچھا، یعنی پاکستان بننے سے پہلے آپ کی شادی ہو چکی تھی۔“ غفار آہستہ آہستہ نانی کے گرد اپنا جال تنگ کر رہا تھا اور میں جانتی تھی اس گفتگو کا اینڈ کیسے اور کہاں ہونا ہے، اس لئے میں بھی زیر لب مسکرا رہی تھی۔

”لے تو اور کیا..... نہ صرف میری شادی ہو چکی تھی بلکہ تمہارا باپ یعنی عبدالستار پورے پانچ سال کا تھا۔“

”ہوں..... ابا جان اس وقت پانچ سال کے تھے تو پھوپھو کتنے سال کی تھیں؟“

”زابدہ پاکستان بننے کے دو سال بعد پیدا ہوئی تھی۔“ یعنی وہ میری امی کے متعلق بتا رہی تھیں۔

”ہوں.....“ غفار نے سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”دادی جان اب آپ کی کتنی عمر ہوگی؟“

”میری عمر اس وقت.....“ نانی سوچتے ہوئے بولیں۔ ”چالیس پینتالیس تو ضرور ہوگی۔“ نانی نے یہ کہہ کر گویا دھماکہ کر دیا۔ میرے ہاتھ سے تیل والی کنوڑی گرتے گرتے بچی۔

”مگر دادی جان پینتالیس چھیالیس سال تو پاکستان کو بنے ہوئے ہو گئے، تو آپ پینتالیس کی کیسے ہو گئیں؟“

غفار بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکے بیٹھا تھا۔

”اچھا..... تو پھر پچاس یا ساٹھ کی تو ضرور ہوگی۔“ نانی جان گڑبڑاتے ہوئے بولیں۔

”پچاس یا ساٹھ ایک بات کریں۔“ غفار، نانی جان کی گڑبڑاٹ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”چلو ساٹھ ہی لگالو۔“ نانی ہار مانتے ہوئے بولیں۔

”ہوں..... اگر آپ کی موجودہ عمر ساٹھ سال ہو تو ساٹھ میں سے پینتالیس نکالیں تو باقی بچے پندرہ..... اس کا مطلب ہے قیام پاکستان کے وقت آپ پندرہ سال کی تھیں۔“ غفار بھولپن سے بولا تو نانی بات کی تہہ تک پہنچے بغیر جھٹ سے بولیں۔

”اگر پندرہ بنتی ہے تو پندرہ ہی کی ہوں گی۔“ نانی اب جان چھڑا رہی تھیں۔

”دادی جان! یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔“ وہ وکیلوں کی طرح بحث کر رہا تھا۔

”وہ کیا؟“ نانی جان تیوری چڑھا کر بولیں۔

”ابھی ابھی آپ نے کہا ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ابا جان کی عمر پانچ سال تھی۔“

”ہاں کہا ہے تو پھر.....“ نانی جان اب فل غصے میں آ چکی تھیں۔

”تو پھر آپ پندرہ کی تھیں اور وہ پانچ کے تو پھر اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ آپ نے دس سال کی عمر میں انہیں جنم دیا اور اگر دس سال کی عمر میں ماں بن چکی تھیں تو پھر شادی نو سال کی عمر میں ہوئی ہوگی۔ اور اگر شادی نو سال کی عمر میں ہوئی تھی تو دادا جان اپنے دور کے بہت بڑے ظالم انسان تھے، نو سال کی کسمن بچی پر اتنا ظلم..... چہ چہ..... بے چاری دادی جان.....“

”بدتمیز..... بے ادب..... بے شرم ابھی بتاتی ہوں تمہیں۔“ نانی جان نے اپنی چپل اٹھائی اور غفار کو دے ماری۔ غفار نے کمال پھرتی سے سر جھکا کر خود کو دادی کے وار سے بچایا اور پھر وہاں سے بھاگے میں ہی عافیت جانی۔ جب تک نانی نے دوسری چپل اٹھائی وہ وہاں سے نودو گیارہ ہو چکا تھا۔

”ناہجار..... مکینہ..... ہر وقت میری عمر کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اس کم بخت کو پتا نہیں میری عمر سے کیا لینا دینا ہے۔“

دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ خوب کھلکھلا کر ہنسوں مگر نانی کا خراب موڈ دیکھ کر ضبط کر گئی۔
 ”اپنی ماں کی تو کبھی عمر نہیں پوچھی۔ مجھ سے پانچ سات سال ہی چھوٹی ہوگی۔“ نانی اب بلند آواز سے بولیں تاکہ بچن میں گھسی اس کی ماں بھی سن لے۔

اب میرے لیے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں اُٹھ کر اندر کمرے میں چلی آئی۔ اندر آ کر خوب جی بھر کر ہنسی۔ اس وقت مجھے کوئی دیکھ لیتا تو یقیناً میری ذہنی حالت پر شک کرتا۔ غفار ہمیشہ نانی کو کسی نہ کسی بات پر چھیڑتا رہتا اور جب وہ زچ ہو کر جوتا اٹھاتیں تو ہنستا ہوا باہر کی طرف دوڑ لگا دیتا۔ نانی کو، یعنی اپنی دادی کو تنگ کر کے اسے پتا نہیں کیا ہاتھ آتا تھا۔ جہاں تک میں جانتی تھی سوائے جوتوں اور گالیوں کے کچھ نہ ملتا تھا۔

نانی اکثر بزرگوں کی طرح عمر بتاتے وقت گڑبڑ کرتی تھیں۔ بغیر سوچے سمجھے کچھ بھی بتا دیتی تھیں۔ چاہے بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔ پرانے لوگ، پرانے واقعات تو بڑی اچھی طرح یاد رکھتے ہیں، مگر نئی باتیں ذہن سے نکل جاتی ہیں۔ جن میں ان کی عمر بھی شامل ہوتی ہے۔ غفار کو نانی جان کی اس کمزوری کا پتا تھا اس لیے وہ بڑی ہوشیاری سے کوئی پرانا قصہ چھیڑ دیتا۔ نانی پورے جوش و خروش سے سنا لگتیں۔ وہ بڑی چالاکی سے نانی کو ماہ و سال کی بھول بھلیوں میں ڈال دیتا اور پھر نانی بے چاری اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتیں۔

تھوڑی دیر بعد میں باہر آئی تو نانی کا موڈ بحال ہو چکا تھا اور وہ مرغیوں کو دانہ ڈال رہیں تھیں۔ میں بھی نانی سے دانہ لے کر مرغیوں کو ڈالنے لگی۔

”نانی جان!“

”جی نانی کی جان۔“ نانی اتنی اپنائیت سے بولیں تو میں سمجھ گئی کہ موڈ خوشگوار ہے۔

”غفار بھائی تو آپ کو جھوٹ موٹ تنگ کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ آپ سے بہت پیار کرتے

ہیں۔“

”جانتی ہوں، گھوڑا میرا دل بہلانے کے لیے یہ ڈرامے کرتا ہے۔“ نانی مسکرائیں۔

میں ان کی فہم و فراست کی قائل ہو گئی۔

”نانی ایک بات سچ بتائیں۔“

”ہاں پوچھو۔“

”اپنی عمر بتاتے وقت آپ بھی ڈراما کرتی ہیں یا سچ محاسب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے؟“

”اے لڑکی..... ہوش کے ناخن لے۔ میں کیوں ڈراما کرنے لگی۔ اب سال ہی اتنی جلدی گزر جاتے ہیں کہ عمر

کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ ویسے بھی عمر کا حساب رکھ کر کرنا بھی کیا ہے۔ جتنی اللہ نے لکھ دی ہے نہ اس سے ایک دن زیادہ ہو

سکتی ہے اور نہ ایک دن کم۔“

نانی کتنی سادگی سے کتنی گہری بات کہہ گئیں تھیں۔

”نانی آج میں آپ کو آپ کی صحیح عمر بتاتی ہوں۔ یہ ذہن میں رکھیے گا۔ کوئی بھی پوچھے تو یہی بتائیے گا۔“
”چلو بتاؤ۔“

”دیکھئے قیام پاکستان کے وقت آپ کی شادی ہو چکی تھی اور ماموں جان پانچ سال کے تھے۔ اتنا تو آپ کو یاد ہے اب یہ بتائیے کہ جب آپ کی شادی ہوئی تھی تب آپ کی عمر کتنی تھی؟“
”پکا تو یاد نہیں۔“ نانی سوچ میں پڑ گئیں۔
”چلو اندازے سے بتادیں۔“

”اس زمانے میں کم عمری میں ہی شادیاں ہو جاتی تھیں۔“
”پھر بھی پندرہ سولہ سال تو آپ کی عمر ہوگی نا!“ میں نے تصدیق چاہی۔
”ہاں، اتنی تو ہوگی۔“ نانی آسانی سے مان گئیں۔

”چلیں یہ مان لیا کہ شادی کے وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی۔ ایک سال بعد ماموں پیدا ہوئے ہوں گے اور تب آپ سترہ کی ہو گئیں۔ پھر ماموں پانچ سال کے ہوئے تو پاکستان بن گیا اور آپ اس وقت بائیس سال کی ہو چکیں تھیں۔ اب پاکستان کو قائم ہوئے پینتالیس سال ہو چکے ہیں، اس حساب سے آپ کی عمر ہو گئی ہے سڑسٹھ سال۔ سمجھیں آپ۔“

”ہاں ہاں، سمجھ گئی۔“ نانی نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”جب کوئی آپ کی عمر کے متعلق پوچھے گا تو آپ نے کتنی بتانی ہے؟“ میں بھی اتنی آسانی سے کہاں چھوڑنے والی تھی۔

نانی سوچ میں پڑ گئیں اور پھر اٹکتے ہوئے بولیں۔ ”سڑسڑ سال۔“
میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ”سڑسڑ نہیں، سڑسٹھ سال۔“
”ہاں ہاں جو بھی ہے، سمجھ گئی ہوں۔ یہ پکڑو دانہ میری نماز کا وقت ہو گیا ہے۔“ نانی دانے والا پیالہ مجھے پکڑا کر وضو کرنے چلی گئیں اور میں وہیں کھڑی مسکراتی رہی۔



شام کو بڑے سے صحن میں چار پائیاں بچھادی جاتی تھیں اور ان پر بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا جاتا تھا۔ ممانی پیڑھی پر بیٹھ کر سب کے لیے کھانا نکال رہیں تھیں اور میں پکڑ کر سب کے آگے رکھ رہی تھی۔

پھر میں بھی اپنی چنگیر پکڑے نانی کی چار پائی پر ان کے پاس آ بیٹھی۔ تنوری روٹیوں کے ساتھ قیمہ بھرے کر لیے اور ساتھ کچے دودھ کی لسی نے لطف دو بالا کر دیا۔ ممانی کے ہاتھ میں بہت لذت تھی۔ وہ تقریباً ہر سال بڑا مزیدار بناتی تھیں، جبکہ دوپہر کو اور شام کو تنور پر روٹیاں لگانے کے لیے ملازمہ آ جاتی تھی۔ آٹا گوندھ کر روٹیاں بنانا اس کی ذمہ داری تھی جبکہ برتن وغیرہ بھی وہی دھوتی تھی۔ صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لیے الگ سے ملازمہ آتی تھی۔

ممانی جان معمولی پڑھی لکھی ایک روایتی سی دیہاتی خاتون تھیں۔ ان کی اپنی تو کوئی بیٹی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں بہنوں کو بہت چاہتی تھیں۔ غفار اور ماموں بھی بڑے انہماک سے کھانا کھا رہے تھے۔

”لے بھی بشری..... آج تُو نے کریلوں میں جان ڈال دی ہے۔“ ماموں نے کھلے دل سے تعریف کی۔
 ”ابا جان! جان کہاں ڈالی ہے، قیمہ ڈالا ہے۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا۔“ غفار نے فٹ سے لقمہ دیا تو ماموں بے اختیار ہنسنے لگے۔

”تُو بڑا شرارتی ہو گیا ہے۔ ہر بات کو پکڑ لیتا ہے۔“
 ”صرف شرارتی نہیں، بلکہ خاصا بدتمیز بھی ہو گیا ہے۔ کسی دن میرے ہاتھ سے پٹ جائے گا۔ دونوں میاں بیوی سن لو۔ یہ نہ ہو بعد میں شکوے کرتے پھر دو..... ہاں....“ نانی نے موقع غنیمت جان کر شکایت لگا دی۔
 ”کیوں اوئے، دادی کے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہے تم نے؟“
 ”کچھ نہیں ابا جان، دادی ویسے ہی غصہ کر جاتی ہیں۔“ وہ معصومیت سے بولا۔
 ”ویسے ہی غصہ کر جاتی ہوں۔ میں کیا پاگل ہوں۔“ نانی نے گھورا۔
 ”دیکھئے اب اپنے منہ سے یہ خود کو کیا کہہ رہی ہیں۔“
 ”دیکھ پتر، بڑے بزرگوں کو زیادہ جھگ نہیں کرتے۔“ ماموں نے لقمہ توڑتے ہوئے نصیحت کی۔
 ”بڑے بزرگ..... ابھی تو دادی صرف پینتالیس پچاس کی ہوئی ہیں، بزرگ کیسے ہو گئیں۔ اچھی خاصی جوان ہیں۔“

”دیکھ لیا ستار تم نے..... پھر سے شروع ہو گیا۔“ نانی کا پارہ ہائی ہونے لگا۔
 ”غفار! چپ چاپ کھانا کھاؤ۔ خبردار اب کوئی بات کی تو۔“ ماموں نے غفار کو تنبیہ کی اور خود اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ممانی بھی منہ دوسری طرف کیے مسکرا رہی تھیں۔
 ابھی یہ کھٹی میٹھی نوک جھونک کھانے کے ساتھ ساتھ جاری تھی کہ اوپر سے جبار آ گیا۔ حسبِ عادت اس نے سلام دعا کیے بغیر انٹری کی اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔
 ”بیٹا پہلے کھانا کھا لو، ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ ممانی نے پیچھے سے آواز دی مگر اس نے جواب دینا پسند نہ کیا اور کمرے میں گھس گیا۔

”ہونہہ..... بڑا بلانے پر بھی نہیں بولتا اور چھوٹا جان چھڑانے پر بھی نہیں چھوڑتا۔“ نانی تنک کر بولیں۔
 ”واہ واہ..... دادی جان آپ نے تو شعر کہہ دیا۔ خدا کی قسم کیا زبردست قافیہ ملا یا ہے۔“ غفار نے دادی تو ماموں اسے گھورنے لگے۔

”میں تو کہتی ہوں میرے منہ اس وقت نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔“ نانی نے وارننگ دی۔

”کس کے حق میں؟“ وہ پھر بولا، مگر نانی کے سر سے یہ بات گذر گئی۔

”ستار میاں! ویسے یہ بات تم پر بالکل سچ بیٹھتی ہے۔“

”وہ کیا اماں؟“ ماموں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”دو جتے..... دونوں نکلتے.....“

ماموں یہ سن کر خفت زدہ ہو گئے اور غفار پھر سے بلند آواز میں بولا۔

”ارے واہ دادی! آپ نے پھر سے قافیہ ملا دیا۔“
”یہ کم بخت قافیہ کون ہے؟“ نانی تیوری چڑھا کر بولیں۔

”یہ مافیہ کا بڑا بھائی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اور یہ مافیہ کون ہے؟“ نانی الجھ کر بولیں۔

”یہ قافیہ کی چھوٹی بہن ہے۔“ غفار فل شرارت کے موڈ میں تھا۔

”خضماں نوکھانا..... تمہارے ساتھ کون سر پھوڑے۔“ نانی نے یہ کہہ کر گویا شکست تسلیم کر لی۔ میں کھانا کھا کر برتن سینٹے لگی تو ممانی نے کہا۔

”نورین بیٹی! جاز را جبار کو بلالہ۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا تو کیا مزہ آئے گا۔“

میں جی اچھا کہہ کر اس کے کمرے کی طرف چل دی۔ دروازے کے آگے جا کر رک گئی۔ میں جب سے آئی تھی جبار سے آمناسا منام ہی ہوا تھا۔ جب اس نے پہلے دن مجھے دیکھا تھا تو قدرے ٹھنک گیا تھا۔ پھر میری طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”تم نورین ہو؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو بڑی حیرانگی سے بولا۔ ”تم کتنا بدل گئی ہو۔“

اور میں نے شرما کر نظریں جھکا لیں تھیں۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی بات ہوئی ہو، یا نہیں۔ اور آج میں اس کے کمرے کے دروازے کے آگے کھڑی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے دروازہ ہلکے سے ناک کیا۔

”کون؟“ اندر سے اس کی کرخت آواز آئی۔

”جبار بھائی میں.....“ میرا گلا خشک ہونے لگا۔

”آ جاؤ۔“ اُف کس قدر تحکمانہ لہجہ تھا جیسے پرانے وقتوں میں کوئی بادشاہ اپنی لونڈی کو اندر آنے کی اجازت دے رہا ہو۔

میں جھجکتے ہوئے اندر آ گئی اور اس دن پہلی مرتبہ میں نے جبار بھائی کا کمرہ اندر سے دیکھا۔ ایک بڑا سا پرانے وقتوں کا بیڈ، ایک پڑھنے والی میز اور اس پر رکھی ہوئی کتابیں، دوسری دیوار کے ساتھ کپڑوں والی الماری اور اس کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل۔ دیواروں پر جابجا قدرتی مناظر والی تصویریں، ایک دیوار پر علامہ اقبال اور قائد اعظم کی بڑے سائز کی تصویریں۔

”کہو..... کس لیے آئی ہو؟“ اس کی کرخت آواز کانوں سے ٹکرائی تو میں بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

یقیناً میں جتنی دیر تک کمرے کا جائزہ لیتی رہی تھی وہ میرا جائزہ لیتا رہا تھا اور جب وہ بولا تو میں ہونق نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ..... مم..... ممانی کہہ رہی ہیں کہ آ کر..... کھانا کھالیں۔“ میں ہکلائی ہوئی بولی۔

”کھالوں گا۔ تم جاسکتی ہو۔“ وہ نخوت سے بولا۔

میں فوراً باہر آ گئی۔ احساسِ ذلت سے کپنیاں سلگ رہی تھیں۔ اتنا تو ہیں آمیز لہجہ مجھ سے برداشت نہ ہو پارہا

تھا۔ مجھ سے آج تک کسی نے اس لہجے میں بات نہ کی تھی۔ میں نے ممانی کو کہہ دیا کہ وہ آرہے ہیں اور خود بوجھل قدموں سے بیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر آگئی۔ وسیع و عریض چھت پر ٹہلنے لگی اور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ملازمہ میری اور نانی کی چار پائیاں بچھا گئی تھی۔

میں اور نانی چھت پر سوتے تھے۔ جبکہ باقی افراد خانہ صحن میں پنگھا لگا کر سوتے تھے۔ جب میں ٹہل ٹہل کر تھک گئی تو اپنے بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد نانی بھی عشاء کی نماز پڑھ کر چھت پر آگئیں۔ نانی بھاری بھر کم جسم اور سرخ و سفید رنگت والی ایک بارعب خاتون تھیں۔ غصہ در ہونے کے باوجود بہت زندہ دل، بذلہ رخ اور ہنس مکھ تھیں۔ بچوں کے ساتھ بچہ اور بڑوں کے ساتھ بڑا بن جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں بڑی عقل مند اور زمانہ شناس تھیں۔

نانی اپنی چار پائی پر لیٹ گئیں تو میں بھی لیٹ گئی۔

”نانی جان!“ میں اب کافی حد تک ریلیکس ہو چکی تھی۔

”جی نانی کی جان۔“

”یہ جبار بھائی خود کو کیا سمجھتے ہیں۔“ میں دل کے پھپھو لے پھوڑنے لگی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ نانی مسکرائیں۔

جواب میں نے ساری بات ان کے گوش گزار دی، تو وہ ہنس پڑیں اور بولیں۔

”یہ بچپن ہی سے ایسا ہے خشکی کا مارا ہوا۔“

”مگر نانی بندے کو اتنی تو تمیز ہونی چاہیے کہ کسی لڑکی سے کیسے بات کی جاتی ہے اور لڑکی مہمان بھی ہو تو.....“

”ہاں، کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔“ نانی میری بات سے خوب لطف اندوز ہوئیں۔

”مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کس بات کا غرور ہے، بڑھا کہیں کا۔“ میرا غصہ کسی صورت کم نہ ہو رہا تھا۔

نانی نے قہقہہ لگایا۔ ”چندا! زیادہ غصہ نہ کرو۔ وہ ہر کسی کے ساتھ ایسے ہی بولتا ہے۔ اور غرور تو تم جانتی ہو اسے

کس بات کا ہے۔ خیر سے اپنے خاندان کا پہلا لڑکا ہے جو بی۔ اے پاس ہے۔“

”اور جس طرح اس نے بی۔ اے کیا ہے، وہ بھی سب جانتے ہیں۔“ میں نے جملہ کسا۔ ”تین سال میٹرک

میں، دو سال ایف اے میں اور چار سال بی اے میں لگائے ہیں اور تب جا کر گریجویٹ ہوئے ہیں۔ رو دھو کر بی اے کیا ہے اور وہ بھی آرٹس میں۔“ میں جل کر بولی تو نانی پھر سے ہنسنے لگیں۔

”چلو کر تو لیا ہے جیسے بھی کیا ہے۔ اپنے باقی خاندان میں نہ خیال ہو یا ددھیال، نظر دوڑاؤ گی تو کوئی بی اے پاس

لڑکا نہ ملے گا۔ لڑکا کیا، شاید لڑکی بھی نہ ملے۔“

”دیکھئے گا نانی جان، میں اپنے خاندان کا ریکارڈ توڑ دوں گی۔ اتنا پڑھوں گی، اتنا پڑھوں گی کہ دنیا حیران رہ

جائے گی۔“ میں جوش سے بولی۔

”اللہ میری بیٹی کو کامیاب کرے۔“ نانی نے صدق دل سے دعا دی۔

”نانی جان! ایک بات تو بتائیں۔“

”ہاں ہاں، پوچھو۔“

”جبار بھائی بوڑھے ہو رہے ہیں۔ ستائیس اٹھائیس کے ہو رہے ہیں۔ ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی اب تک۔ اب تو برسِ روزگار بھی ہیں۔“

”اس کی ماں نے پچھلے پانچ سال سے بات پکی کی ہوئی ہے اپنی بھانجی کے لیے، مگر وہ لوگ کبھی ہاں کرتے ہیں کبھی ناں۔“

”کیا مطلب؟“ میں حیران ہوئی۔

”مطلب یہ کہ اس لڑکی سے بڑی اس کی دو بہنیں ابھی تک بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کا رشتہ کہیں ہوگا تو اس کی باری آئے گی نا۔“

”تو بڑی لڑکیوں میں سے کسی کے ساتھ جبار بھائی کی مگنی کر دیں نا۔“ میں نے چٹکی میں حل تلاش کر لیا۔

”ان کے لیے جبار نہیں مانتا۔ اسے بھی یہ تیسری والی ہی پسند ہے۔ ماں نے بچپن سے ہی ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ شبانہ میری بہو بنے گی اور اب برخوردار شبانہ سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔“

”اوہ..... یہ تو بڑی انٹر سٹنگ سٹوری ہے۔“ میں سارا غصہ بھول کر اٹھ بیٹھی۔

”نانی جان! بڑی دولڑکیوں کی شادی ہونے تک تو جبار بھائی بالکل بوڑھے ہو جائیں گے۔“ یہ کہہ کر میں ہنسنے لگی۔ ”ویسے ماموں جان کیا کہتے ہیں؟“

”سچ پوچھو تو وہ اس رشتے کے خلاف ہے۔ اسے زہرہ کے میکے والے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔“

”ویسے نانی جان! آپ کو زہرہ ممانی میں کیا نظر آیا تھا۔ ماموں اتنے ہینڈسم اور خوبصورت ہیں اور زہرہ ممانی بالکل معمولی شکل و صورت کی مالک ہیں۔ وہ کسی طرح بھی ماموں کے ساتھ نہیں چھتیں۔ جبار بھائی بھی بالکل اپنی امی پر گئے ہیں۔ کاش طبیعت بھی ان پر چلی جاتی۔“

”یہ خیر سے تمہارے نانا جان کی پسند ہے۔ دیرینہ دوست کی بیٹی تھی۔ شروع سے آنا جانا تھا۔ ایک دن ہاں کر کے رشتہ پکا کر آئے۔ مجھ سے پوچھنا بھی گوارہ نہ کیا اور لڑکی کی واحد خوبی یہ بتائی کہ بہت کامی ہے۔“

”کامی؟“ میں سوچ میں پڑ گئی۔

”کامی کا مطلب یہ کہ ہر وقت گھر کے کام کاج میں جتنی رہتی ہے۔ بندہ پوچھے کہ بہو کا صرف کامی ہونا کافی ہوتا ہے۔ کام کاج تو نوکر بھی کر لیتے ہیں۔“

”نانی! ویسے آپ کے دونوں بچے آپ کی طرح خوش شکل اور خوبصورت تھے، مگر نہ تو آپ بہو خوبصورت لائیں اور نہ ہی داماد ہینڈسم ڈھونڈا۔“ میں نے اپنے ابو کو بھی نہ بخشا۔

”بس بیٹا! جہاں لیکھ مقدر ملے ہوں، وہاں مل جاتے ہیں۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ قسمت کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔“ نانی نے فلسفہ بگھارا۔

”نانی، میرے ابو بے شک سانولی رنگت کے مالک ہیں، مگر وہ باوقار اور پرکشش پرسنالٹی کے مالک ہیں۔“

”یہ ایک مجھے اپنے ابو دنیا کے وجہ بہترین مرد نظر آنے لگے۔“

”ہاں ہاں، تمہارے ابو واقعی بہت لاجواب ہیں اب خوش۔“

”اس میں کوئی شک نہیں نانی، میرے ابو جیسا کوئی نہیں۔ وہ سب سے الگ، سب سے زیادہ پیار کرنے والے ہیں۔“ میں اترائی۔

”ہر بیٹی کو اپنا باپ دنیا کا سب سے پیارا باپ لگتا ہے۔ چلو اب سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ صبح فجر نائم اٹھنا ہوتا ہے۔“ نانی نے یہ کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

میں بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میرے ذہن میں ایک ہی سوال چکرار ہا تھا کہ کیا جبار بھائی جیسا خشک مزاج اور آدم بے زار شخص بھی کسی لڑکی سے محبت کر سکتا ہے۔ یہ بات میرے لیے بڑی حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھی۔

☆.....

مجھے ماموں کے ہاں آئے ہوئے مہینہ ہونے کو آرہا تھا۔ میں مئی کے بالکل شروع میں آئی تھی اور اب مئی تقریباً ختم ہونے کو تھا۔ گرمی کی شدت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اب میرا دل یہاں سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔ مجھے امی، ابو اور بہن بھائی کی یاد ستانے لگی تھی۔ خصوصاً ابو اور ان کی شفقت بہت زیادہ یاد آتی تھی۔ حالانکہ ہر دوسرے تیسرے دن فون پر سب سے باری باری بات ہوتی۔ مہوش اور بلال بھائی یہاں آنے کے لیے چل رہے تھے۔ وہ اپنے اپنے تعلیمی اداروں سے تعطیلات ہونے کا انتظار کر رہے تھے، جو یکم جون کو ہونے کی اطلاع تھی۔ میں نے ایک دن فون پر مہوش سے واپس آنے کا ذکر کیا تو مہوش نے منع کر دیا۔

”ابھی وہیں رہو۔ ہم بھی پرسوں امی، ابو کے ساتھ آرہے ہیں۔“ وہ بڑے جوش سے بولی۔

”مگر اب میرا یہاں دل نہیں لگ رہا۔ جی چاہتا ہے فوراً گھر آ جاؤں۔“

”جب ہم دونوں بھی آ جائیں گے تو دل بھی لگ جائے گا۔ مل کر خوب مزا کریں گے۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے

بولی۔

”چلو ٹھیک ہے، پھر جلدی سے آ جاؤ۔“ میں بھی آنے والے دنوں کا تصور کر کے خوش ہو گئی۔

”کہا تو ہے، پرسوں آرہے ہیں۔“ اس نے پھر سے یاد دلایا اور فون بند کر دیا۔

میں ریسیور رکھ کر سوچنے لگی، اب کیا کروں۔ یہ دو تین دن کیسے گذاروں۔ نانی گھنٹے ڈیڑھ سے اپنی کسی سہیلی کے ہاں اس کی عیادت کرنے گئی تھیں۔ ممانی جان آج اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بازار گئی تھیں، جو گاؤں سے خاصی مسافت پر تھا۔

غفار اور ماموں کھیتوں پر گئے تھے۔ غفار ایف اے کرنے کے بعد اب ماموں کا کھیتوں میں ہاتھ بٹاتا تھا یا پھر دادی کو تنگ کرتا تھا۔ ویسے غفار کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ ہر روز شہر سے اس کے دوست اسے ملنے کے لیے آتے اور وہ بھی ہر روز ایک چکر شہر کا ضرور لگا آتا اور آتے وقت اس کے ہمراہ انواع و اقسام کی کھانے پینے کی چیزیں ہوتیں۔ پتا نہیں وہ یہ سب میری خاطر داری کے لیے کرتا تھا یا پھر ویسے ہی اس کی روٹین تھی۔

بہر حال میں اب اس دیہاتی زندگی سے اوب چکی تھی۔ مجھے اب اپنا پڑا سانس اور آرام دہ گھر یاد آتا۔ اس کے خوبصورت ڈیگور، ایئر کنڈیشنر کمرے یاد آتے۔ اپنی خوبصورت معلومات بھری کتابیں یاد آتیں اور اپنے پینٹنگ کلاور برش یاد آتے۔

بچپن سے یہی سنتے آئے ہیں کہ دیہاتی زندگی زیادہ صحت مندانہ ہوتی ہے۔ دیہاتی آب و ہوا زیادہ صحت بخش اور آلودگی سے مبرا ہوتی ہے۔ دیہات میں خوراک زیادہ خالص اور ملاوٹ سے پاک ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں اپنی جگہ درست سہی مگر شہری زندگی، دیہاتی زندگی سے کہیں زیادہ پُر آسائش اور سہل ہوتی ہے۔

گاؤں کی بڑی بڑی چودھرانیاں بھی سارا سارا دن چولہے کے آگے بیٹھیں، ایلوں کی آگ کو پھونک پھونک کر بڑے بڑے دیکچے اور بیس بیس روٹیاں پکاتی ہیں۔ اتنا کھانا گھر کے افراد نہیں کھاتے جتنا کھانا ملازماؤں اور مزارعوں کے لیے پکتا ہے۔ چودھرانیاں بے چاریاں آگ کو پھونکیں مار مار کر دھویں سے آنکھیں اندھی کر لیتی ہیں۔ خالص خوراک کھانے کے باوجود وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

چودھری اپنا دل بھلانے کا سامان باہر ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کنیوں نے تو اپنی سے آدھی عمر کی لڑکیوں کو فلیٹ خرید کر دیئے ہوتے ہیں، جہاں وہ بڑھاپے کو جوانی کی گرم آغوش میں سکون پہنچاتے اور گھر چلے آتے ہیں۔ شاید انہی لوگوں کے لیے یہ مثال بنی ہے کہ رند کے رندر ہے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی۔ اب ایک ہی عورت کے ساتھ زندگی گزارنا، موٹاپے اور بڑھاپے کو بھگتنا، یہ تو زیادتی کی بات ہے نا۔

ان نوجوان دانشواؤں کے ساتھ ہفتے میں دو تین مرتبہ، دو تین گھنٹے گزارنا کون سا غیر انسانی فعل ہے۔ یہ تو ہر ذی حیثیت اور کھاتے پیتے مرد کا بنیادی حق ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ لڑکیاں ان بوڑھوں کی غیر موجودگی میں اپنی عمر کے نوجوانوں سے میل ملاقات رکھتی ہیں، اس لیے ذہنی اور جسمانی آسودگی حاصل کرنا، ان کا بھی بنیادی حق ہے۔ صرف دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔

میں بور ہو رہی رہی تھی کہ نانی آگئیں۔ میں نے شکر ادا کیا کہ کچھ رونق تو ہوئی ورنہ اکیلی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچے چلی جا رہی تھی۔ نانی آکر بیٹھی ہی تھیں کہ ممانی بھی ڈھیروں شاپرز پکڑے ہانپتی کانپتی اندر داخل ہوئیں۔ باہر غضب کی گرمی تھی۔ ممانی پسینے سے تر بتر ہو رہی تھیں۔

”نورین بیٹا! ذرا پنکھا تیز کر دو۔“ ممانی بیڈ پر گررتے ہوئے بولیں۔

”ممانی جان! میں آپ کے لیے ابھی شربت بنا کر لائی۔“ میں نے پنکھے کے سپینڈ تیز کی اور شربت بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ میں شربت کا جگ مع دو گلاس ٹرے میں رکھ کر واپس آئی تو ممانی شاپرز میں سے سوٹ پیس نکال نکال کر نانی کو دکھا رہی تھیں۔

مجھے دیکھ کر چبکیں۔ ”یہ دیکھو نورین، یہ دو سوٹ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔“ انہوں نے دو سوٹ لان کے خوبصورت پرنٹ کے میری طرف بڑھائے۔

میں نے شربت کا گلاس ممانی کو تھماتے ہوئے وہ سوٹ پکڑ لیے۔

”بہت خوبصورت ہیں۔“ میں بیٹھ کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”یہ دو سوٹ امی جان کے ہیں۔“ انہوں نے قدرے ہلکے رنگوں کے دو سوٹ میری طرف کیے۔ نانی جان کو وہ امی جان کہتی تھیں۔

”بہت پیارے ہیں۔ نانی جان کی عمر کے حساب سے پرنٹ بھی خوبصورت ہیں۔“ میں نے تعریف کرتے

ہوئے نانی جان کی طرف دیکھا تو وہ منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ اوہ میں نے نانی کو شربت نہیں دیا، شاید اسی لیے ان کا موڈ خراب ہے۔ میں نے فٹ سے گلاس بھر اور نانی کو پیش کیا۔ نانی نے گلاس پکڑا اور غٹ غٹ پی گئیں مگر موڈ ہنوز برقرار تھا۔ میں نے نانی کے سوٹ نانی کی گود میں رکھے۔ ”نانی دیکھئے تو کتنے پیارے ہیں آپ کے سوٹ۔“

”خاک پیارے ہیں۔“ نانی یکدم پھٹ پڑیں۔ ”رنگ دیکھا ہے ان کا۔ ایک کارنگ تو بالکل گوبر جیسا ہے اور دوسرے کا مٹی جیسا۔“

”نانی اتنے پیارے کھر ہیں۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ میں نے ترحم آمیز نظروں سے ممانی جان کی طرف دیکھا۔ بے چاری کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ مگر وہ بالکل پرسکون بیٹھیں تھیں بلکہ ان کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی، جیسے یہ سب ان کے لیے معمول کی بات ہو۔

”امی! آپ میرے سوٹ دیکھ لیں۔ اگر آپ کو یہ پسند آجائیں تو یہ رکھ لیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے لیے خریدے دونوں سوٹ نانی کی گود میں رکھ دیئے۔

نانی انہیں کھول کھول کر دیکھنے لگیں۔ ”ہاں یہ اچھے ہیں، مگر یہ تم اپنے لیے لائی ہو۔ میں کیسے لے سکتی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں امی جان، اگر آپ کو یہ پسند ہیں تو یہ رکھ لیں۔ میں وہ سلوا لوں گی۔“

”چل تو اتنا زور دے رہی ہے تو یہی رکھ لیتی ہوں۔ جب درزن کے پاس جاؤ گی تو یہ میرے لیے سلنے کے لیے دے دینا۔“ نانی نے ممانی کے دونوں سوٹوں پر بڑے آرام سے قبضہ کر لیا اور خود اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلیں گئیں۔

نانی کے جانے کے بعد میں ممانی کے پاس بیٹھ گئی۔ مجھے اس وقت ان پر بوا ترس آ رہا تھا۔ بے چاری اپنے لیے کتنے چاؤ سے سوٹ لائی ہوں گی اور نانی نے غنڈہ گردی کرتے ہوئے قبضہ جمالیا۔

”ممانی جان! یہ تو بہت برا ہوا۔“ میں نے ممانی جان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”وہ کیسے؟“ وہ مسکرائیں۔

”نانی جان نے آپ کے سوٹ لے لیے۔“

”یہ تو معمول کی بات ہے۔ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ وہ ہمیشہ وہی چیز لیتی ہیں جو میں اپنے لیے لاتی ہوں۔ میری ان کے لیے کوئی بھی خریدی ہوئی چیز، ان کو کبھی بھی پسند نہیں آئی۔“ انہوں نے بڑے آرام سے جواب دیا اور چیزیں سمیٹ سمیٹ کر شا پرز میں ڈالنے لگیں۔

”مگر نانی ایسا کیوں کرتی ہیں؟“ میں الجھ کر بولی۔

”ہوگی کوئی وجہ..... کوئی نفسیاتی مسئلہ..... بہر حال مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے رجحان کیسے ہوئے سوٹ میں سلوا لیتی ہوں اللہ اللہ خیر صلا۔“

”مگر ممانی ان کی عمر میں اور آپ کی عمر میں اتنا فرق ہے۔ اسی حساب سے کپڑوں کے پرنٹ اور رنگوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔“

”کوئی فرق نہیں ہوتا۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولیں۔ ”میں جانتی ہوں کہ امی جان تیز اور شوخ رنگ پسند کرتی

ہیں۔ اس لیے میں ان کے لیے شوخ رنگ منتخب کرتی ہوں مگر گھر آ کر اپنے لیے خریدے ہوئے کپڑے ان کے آگے رکھ دیتی ہوں۔ وہ حسب عادت اور حسب توقع انہیں رجحان کر دیتی ہیں اور پھر جو کپڑے میں نے ان کے لیے خریدے ہوتے ہیں وہ میرے سمجھ کر پسند کر لیتی ہیں۔ اور یوں ان کے کپڑے ان تک پہنچ جاتے ہیں۔“ ممانی یہ کہہ کر ہنسنے لگیں۔ ان کی چال سمجھ کر میں بھی ہنسنے لگی۔

”ممانی جان! آپ کی عقل کی تو داد دینی پڑے گی۔ بھی مان گئے آپ کو۔“
 ”وقت اور حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں اور ویسے بھی بقول امی جان کے پانچ، سات سال ہی تو چھوٹی ہوں ان سے۔“ یہ کہہ کر ممانی نے پھر زوردار قہقہہ لگایا اور میں بھی بے اختیار ہنسنے لگی۔



اگلے دن میں پیڑھے پر بیٹھی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ نانی جان اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں جبکہ ممانی درزن کے ہاں گئیں تھیں، نئے سوٹ سلوانے کے لیے۔ غفار اپنے کمرے میں میوزک سے دل بہلا رہا تھا اور جبار بھائی دفتر جا چکے تھے۔ میں مرغیوں کو دانہ کھاتے ہوئے بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ گھر کے باہر موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی۔ میں سوچنے لگی کہ اس وقت کون آ گیا۔ میں گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

پہلے ایک لمبی تزنگی اور سوکھی مرل لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے اسی نقشے کا لڑکا تھا۔ وہ یقیناً اس کا بھائی تھا۔ میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔
 ”السلام علیکم!“ لڑکی لہراتے ہوئے بولی۔

”وعلیکم السلام۔“ میں کھڑی ہو گئی۔ ”آپ کی تعریف؟“

”حیرت ہے، آپ مجھے نہیں جانتیں۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”نہیں جانتی، تو آپ بتا دیں۔“ مجھے اس کا اس طرح بات کرنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

”میں شبانہ ہوں۔“ وہ چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔ ”خالہ کہاں ہیں؟“

شبانہ..... مجھے یہ نام جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں جھماکہ ہوا..... جبار بھائی کی مگتیر شبانہ۔

”آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں۔ آئیے نا!“ میں انہیں ممانی کے کمرے میں لے آئی۔

”آپ بیٹھیں، ممانی کام سے ذرا باہر گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔“ انہیں بٹھا کر میں نے غفار کے کمرے پر

دستک دی اور اندر چلی گئی۔

”غفار بھائی!“ میں نے غفار کو پکارا جو آنکھیں موندے میوزک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں

کھول دیں۔ ”کیا بات ہے؟“

”وہ..... آپ کے مہمان آئے ہیں۔“ میں بڑی پر جوش ہو رہی تھی۔

”میرے مہمان۔“ وہ حیران ہوا۔ ”کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟“

”آپ کی کزن شبانہ اور اس کا بھائی۔“

”اچھا وہ..... بگلا اور بگلی۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”غفار بھائی! عزت سے بات کریں۔ وہ آپ کی بھابی بننے والی ہے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔
 ”ہونہہ بھابی..... مجھے تو نہیں لگتا۔“

غفار میرے ساتھ اُن کے پاس آیا۔ ان سے بڑے تپاک سے ملا۔ حال احوال، خیر خیریت دریافت کی۔ میں سوچ رہی تھی کہ غفار باہر جائے گا کچھ کھانے پینے کے لیے لائے گا، مگر وہ تو بے فکر ہو کر مہمانوں کے پاس بیٹھ چکا تھا۔
 ”نورین! مہمانوں کو کوئی ٹھنڈا ونڈہ پلایا ہے کہ نہیں؟“

”نہیں غفار بھائی، آپ جلدی سے کولڈ ڈرنکس وغیرہ لے آئیں۔“
 ”کولڈ ڈرنکس کی کیا ضرورت ہے..... شربت ہے ناگھر میں فنافٹ بنا لاؤ۔“
 ”شربت.....“ میں جھپکتے ہوئے بولی۔ ”صرف شربت.....“

”ہاں ہاں، لے آؤ۔ یہ کوئی غیر تھوڑی ہی ہیں۔ کیوں بھی شیری۔“ اس نے شیری کی سوکھی ران پر زور سے ہاتھ مارا تو شیری بے چارہ گرتے گرتے بچا۔
 ”جی بالکل غفار بھائی۔ ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں۔“ وہ بے چارہ طوعاً کرہاً بولا۔
 شبانہ بھی شربت کا سن کر منہ بسور رہی تھی۔

میں اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ شربت کا جگ تیار کیا۔ ساتھ دو گلاس ٹرے میں رکھے اور واپس کمرے میں آئی، تو غفار کسی بات پر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور وہ دونوں بہن بھائی مجبوراً اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ میں نے شربت گلاسوں میں ڈال کر ان کے حوالے کیا۔ غفار کے اس سلوک کی وجہ سے میں ان کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ غفار اس بات سے لاپرواہان اشاپ بولتا جا رہا تھا اور وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہے تھے۔

میں نے شبانہ کا غور سے جائزہ لیا تو وہ مجھے کسی بھی اینگل سے پرکشش دکھائی نہ دی۔ ساڑھے پانچ فٹ قد کے ساتھ انتہائی دبلا جسم، جونسوانیت سے بالکل عاری تھا۔ نہ سینے کا ابھارا اور نہ کمر میں کوئی خم، ایک دم سٹریٹ اور فلیٹ۔ پتلی لمبی گردن پر دبلا پتلا چہرہ اور چہرے پر بہت اونچی اور لمبی ناک، جو چہرے کی مناسبت سے زیادہ اونچی دکھائی دیتی تھی۔ ناک میں جھوٹی ہوئی چھوٹی سی تھیلی نے بھی شبانہ کو کوئی چارم نہ بخشا تھا۔ شبانہ کا اتنی باریک بینی سے جائزہ لیا تو مجھے تا سَف ہونے لگا۔ بے چارے جبار بھائی کو آخراں لڑکی میں کیا نظر آ گیا کہ وہ کسی صورت اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔

بہر حال پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ جولڑکی مجھے معمولی دکھائی دے رہی تھی، ہو سکتا ہے وہ جبار بھائی کو غیر معمولی نظر آتی ہو۔ ان کے لیے وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو۔ بڑے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ کسی نے مجھوں سے کہا تھا کہ تمہاری لیلیٰ تو کالی ہے اور مجھوں نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے پاس لیلیٰ کو دیکھنے والی نظر ہی نہیں۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ کسی چہرے کو معمولی نہ سمجھو۔ ہر چہرہ کسی نہ کسی کا محبوب ہوتا ہے۔ میں خیالوں سے اس وقت چوکی جب ممانی اندر داخل ہوئیں اور بھانجے اور بھانجی کو گرم جوشی سے ملنے لگیں اور ساتھ ہی غفار کرتاڑا کہ مہمانوں کے لیے کوئی چیز کیوں نہیں لایا۔ پھر ممانی نے غفار کو شہر جا کر ڈھیر ساری چیزیں لانے کا آرڈر دیا۔ جن میں دیہی بھلے، فروٹ چاٹ، مٹن، چکن اور دوسری ضروری چیزیں شامل تھیں۔

”ای! آج گرمی بہت زیادہ ہے۔“ غفار آنا کافی کرنے لگا تو ممانی بولیں۔

”بائیک پر نہ جاؤ، گاڑی لے جاؤ۔ گاڑی میں ایئر کنڈیشنر ہے۔ تمہیں گرمی بالکل نہیں لگے گی۔ جلدی جاؤ۔“ غفار نے دیکھا کہ یہ معاملہ بالکل نہیں ٹلنے والا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”شیری یار آ جاؤ میرے ساتھ، دونوں چلتے ہیں۔“ شیری بے چارہ فوراً چلتے کے لیے تیار ہو گیا۔ غفار کے سامنے وہ انکار کرنے کی جرأت کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ دونوں باہر نکل گئے تو میں بھی خالہ بھانجی کو تنہائی فراہم کرنے کے لیے کمرے سے باہر آ گئی۔

نانی کے کمرے میں آ گئی، جو اس وقت میرا بھی کمرہ تھا۔ نانی اب جاگ رہیں تھیں۔ میں نانی کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا کوئی آیا ہے؟“ نانی پوچھ رہیں تھیں۔

”ہاں شبانہ اور اس کا بھائی آیا ہے۔“

”شبانہ..... کون شبانہ؟“

”جبار بھائی کی منگیت۔“

”اچھا..... وہ..... چھچھوند رکھیں کی۔“

”نانی! وہ جبار بھائی کی منگیت ہے۔ ایسا تو مت کہیں۔ آپ کی ہونے والی بہو ہے۔“ مجھے نانی کا اس طرح اس کا نام ڈالنا اچھا نہ لگا۔

”ہونہہ..... بہو..... دودن یہاں رکے گی تو تم بھی دیکھ لینا اس کے رنگ ڈھنگ۔ اس کی کوئی عادت بھی تمہیں بہو بنانے والی نظر آئی تب کہنا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب گھر والوں کو وہ قبول ہے تو آپ کیوں اعتراض کرتی ہیں۔“ میں نے نانی کو سمجھایا۔

”گھر والوں کو.....“ نانی حیران ہو کر بولیں۔ ”کون سے گھر والے، صرف جبار کو اور اس کی ماں کو۔ باقی کسی کو نہیں۔“ نانی ہاتھ نہچاتے ہوئے بولیں۔

مجھے نانی کا یہ انداز دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ ”مگر نانی کیا خرابی ہے اس میں؟ اچھی بھلی تو ہے۔“

”اچھی بھلی۔ لگتا ہے تم نے غور سے نہیں دیکھا اس چھمک چھلو کو۔“

”دیکھا ہے نانی۔ مجھے تو ٹھیک ہی لگی ہے لڑکی۔“ میں نے بڑی بوڑھیوں کی طرح جواب دیا تو نانی ہنسنے لگیں۔

”جیسے تم لڑکی کہہ رہی ہو، تم سے چار پانچ سال بڑی ہے۔“

”نانی، جب جبار بھائی خوش ہیں تو آپ سب کو کیا اعتراض ہے۔ زندگی تو انہوں نے گذارنی ہے نا اور پھر جبار بھائی کون سے منے ہیں۔ اچھی خاصی عمر ہے ان کی۔“

”ہاں بھئی، وہ تو بہت خوش ہے اور اس کی خوشی بھی تم شام کو ملاحظہ کر لینا۔“

اور پھر واقعی شام کو جبار بھائی گھر آئے تو کئی حیرت انگیز مناظر دیکھنے کو ملے۔ اس شام جبار بھائی گھر آئے تو صحن میں بیٹھے مہمانوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ ہر روز کی طرح منہ پھلائے کمرے میں جانے کے بجائے مسکراتے ہوئے ہم لوگوں کی طرف بڑھے اور بڑی لگاؤ سے سلام کیا۔ اُن کی مخاطب یقیناً شبانہ ہی تھی۔

شبانہ نے بھی جباتے ہوئے ”وعلیکم السلام“ کہا۔
 میں تو یہ کاپلاٹ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ آج میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ جبار بھائی کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور
 مسکراتے ہوئے وہ بڑے مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ وہ سوکھے مرل شیریں سے بھی بغل گیر ہو رہے تھے۔ میں نے نانی کی
 طرف دیکھا تو وہ بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔
 ”امی! آج کیا پایا ہے۔ بڑے زوروں کی بھوک لگ رہے ہے۔“ وہ خوشدلی سے بولے تو ممانی بھی مسکرا کر
 بتانے لگیں۔

”مشن تورمہ اور چکن پلاؤ، ساتھ تندوری روٹیاں۔“
 ”واہ بھئی، آج تو زبردست کھانا پکایا گیا ہے۔ میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔ آپ کھانا نکال لیں۔ میں آج
 سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا۔“ جبار بھائی کہہ کر اٹھ گئے اور میں، نانی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر سر ہلانے
 لگی۔ پھر میں شبانہ کے پاس آ بیٹھی۔
 ”آپی شبانہ! آپ کیا کرتی ہیں؟“ میں نے اس کا انٹرویو لینا چاہا۔
 ”کیا مطلب؟“ اس نے ناک بھوں چڑھائی۔
 ”مطلب.....“ میں گڑبڑا گئی۔ ”مطلب یہ کہ سارا دن گھر میں کیا کرتی ہیں؟“
 ”عجیب سوال ہے۔ لڑکیاں گھر میں رہ کر کیا کرتی ہیں۔ گھر کے کام کاج ہی کرتی ہیں نا! تو وہ میں بھی کرتی
 ہوں۔“ وہ بھونڈے سے انداز میں بولی۔

”گھر کے کام کاج کے علاوہ کیا کرتی ہیں؟“ میں بھی کہاں ہار ماننے والی تھی۔
 ”گھر کے کام کاج کے علاوہ.....“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”ہاں یاد آیا، گھریلو کاموں کے علاوہ میں کڑھائی اور سلائی
 کرتی ہوں۔“ وہ فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے بولی۔
 ”اوہ..... اچھا.....“ میں مایوسی سے بولی۔
 ”تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟“ میں پھر سے شروع ہو گئی۔
 ”میٹرک کیا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”آگے کیوں نہیں پڑھا؟“

”مرضی میری، بس دل نہیں چاہا۔“ اس کے تیور بدلنے لگے۔
 ”آگے تو تب پڑھتی تاجب میٹرک میں پاس ہوتیں۔“ شیریں نے لقمہ دیا تو شبانہ نے گھور کر اُسے دیکھا۔
 ”شیریں! تم اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو۔“
 ”بابی! تم سیدھی طرح انڈر میٹرک کہہ دیا کرو نا!“

اتنے میں جبار بھائی فریش ہو کر آگئے اور ہم خاموش ہو گئے۔ ماموں اور غفار بھی کھیتوں سے آگئے تھے۔ ممانی
 ڈشوں میں کھانا نکالنے لگیں اور میں اور شبانہ سرو کرنے لگیں۔ کھانا حسبِ توقع بہت لذیذ تھا اور تو آج جبار نے بھی
 کھانے کی تعریف کر ڈالی۔

”آج کوئی انہونی ہو کر رہے گی۔“ غفار کی رگِ ظرافت پھڑکنے لگی، وہ بولا۔
 ”وہ کیوں؟“ نانی نے پوچھا۔

”آج جبار بھائی نے کھانے کی تعریف کر دی ہے جو کہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔“

”اس سے بڑی انہونی اور کیا ہوگی کہ جبار بھائی نے کھانے کی تعریف کی ہے۔“ میں بولی تو سب لوگ اونچی آواز میں ہنسنے لگے۔ جبار نے غصے سے گھور کر مجھے دیکھا تو میں انجان بنی کسی اور طرف دیکھنے لگی۔
 ”شیری آپ لوگ میرے کمرے میں آجائیں، وہاں لڈو کھیلیں گے۔“ جبار اُٹھتے ہوئے بظاہر شیری سے مخاطب ہوا مگر درپردہ وہ شبانہ کو انوائیٹ کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے جبار بھائی آپ چلیں، ہم آتے ہیں۔“ شیری سعادت مندی سے بولا تو جبار اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کھانا کھانے کے بعد غفار بولا۔ ”ہاں تو شیری چلیں۔“

”کہاں؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”جبار بھائی کے کمرے میں اور کہاں۔ تم نے سنا نہیں وہ ہم سب کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ لڈو کھیلنے کی آفر کر رہے تھے۔“

”ہاں ہاں، چلیں۔“ شیری بھی کھڑا ہو گیا۔

”لیڈیز اُٹھ بھی جائیں کہ آپ کو اُٹھانے کے لیے کرین منگوانی پڑے گی۔“ غفار چپکا تو ہم دونوں بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

سچ تو یہ تھا کہ مجھے جبار کے کمرے میں جا کر اس کے ساتھ لڈو کھیلنے کا کوئی شوق نہ تھا۔

”غفار بھائی آپ لوگ جائیں مجھے نیند آرہی ہے۔“ میں نے بہانہ بنایا۔

”اتنی جلدی تمہیں نیند کیسے آسکتی ہے اور کھانا کھاتے ہی کون احمق سوتا ہے۔ بیوقوف لڑکی سوچو ذرا، جبار بھائی

نے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی ہے جسے تم ٹھکرا رہی ہو۔ ایسا سنہرا موقع زندگی میں بار بار نہیں آتا۔“

ہمیں آپس میں بحث و تکرار کرتا دیکھ کر وہ دونوں بہن بھائی منہ بسور رہے تھے۔ آخر شبانہ بولی۔

”آپ آجایئے گا، ہم جا رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ جبار کے کمرے کی طرف چل دیئے تو غفار جل بھن کر بولا۔

”اسے دیکھو ذرا، کتنی جلدی ہے بھائی کے کمرے میں گھسنے کی۔“

”غفار بھائی آپ کیوں کباب میں ہڈی بن رہے ہیں۔ جبار بھائی نے صرف مہمانوں کو آنے کی آفر کی تھی۔“

”تو کیا تم مہمان نہیں۔“ غفار ترنت بولا تو میں لا جواب ہو گئی۔

”مہمان تو ہوں مگر ان کی فیورٹ مہمان نہیں۔“ میں اداس ہو کر بولی تو غفار نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”چلو

میرے ساتھ میں بھی دیکھتا ہوں، ہمیں چھوڑ کر کیسے ان خستہ حال لوگوں سے چہلیں کرتے ہیں۔“

”اچھا، ٹھیک ہے۔ ہاتھ تو چھوڑیں، میں چل رہی ہوں نا۔“ میں اس کے ساتھ گھٹتے ہوئے بولی تو اس نے میرا

ہاتھ چھوڑ دیا۔

ہم دونوں جبار کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ تینوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر خاموش ہو گئے بلکہ جبار کے چہرے پر ناگواری سی چھا گئی۔

”جبار بھائی! آپ لڈو کھیلنے کے لیے کہہ رہے تھے، کہاں ہے لڈو؟“ غفار نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا، تو جبار بادل نخواستہ بولا۔

”ہاں کہہ تو رہا تھا مگر لڈو مل نہیں رہی۔“

”مل نہیں رہی..... کیا مطلب..... بھائی آپ کے پاس تو بہت بڑی اور اچھی والی لڈو ہے۔ کہاں جاسکتی

ہے۔“

”پتا نہیں یار! شاید کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔“

”ابھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔“ غفار نے اٹھ کر اس کے بیڈ کی درازیں کھولنی شروع کر دیں۔

”یہ رہی لڈو۔“ غفار نے نعرہ لگایا اور ایک دراز سے لڈو برآمد کر لی۔

”اچھا..... مل گئی..... لے آؤ۔“ جبار جبراً مسکرایا۔

غفار نے لڈو بیڈ پر پھیلا کر اس پر گولیاں سجا دیں۔

”مگر ہم کھیلیں گے کیسے؟“ جبار نے پھر سے نقطہ اٹھایا۔

”کیا مطلب؟“ غفار بولا۔

”بھئی لڈو تو چار لوگ کھیل سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ جبکہ ہم تو پانچ ہیں۔“

”آپ لوگ کھیلیں۔ میں چلی جاتی ہوں۔“ میں بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھو تم۔“ غفار نے حکم دیا اور میں بیٹھ گئی۔ ”ہم چار یعنی دو لیڈر اور دو جینٹلس کھیلیں گے۔ کھیل کو دیکھنے والا

کوئی تماشائی بھی تو ہونا چاہیے اور وہ تماشائی ہوگا شیر۔ کیوں شیر؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں نا!“

”نہیں نہیں، غفار بھائی بھلا مجھے کوئی اعتراض کیوں ہوگا۔“ وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”شباباش..... گڈ بوائے.....“

ہم چاروں لڈو کے اطراف میں بیڈ پر بیٹھ گئے۔ جبار کے ایک طرف شبانہ اور دوسری طرف غفار بیٹھ گیا، جبکہ میں بالکل سامنے تھی۔ شیر صوفے پر بیٹھا میوزک سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کھیل شروع ہوا تو جبار کی اس کھیل میں مکمل مہارت اور دسترس سامنے آنے لگی۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر اپنی کوئی چلتا۔ آدھ پونے گھنٹے میں ہی وہ ہم تینوں کو بری طرح شکست دے کر جیت چکا تھا۔ کھیلتے ہوئے ایک بات ہم دونوں نے نوٹ کی۔ وہ یہ کہ جبار بھائی بات بے بات، بہانے بہانے سے شبانہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتے۔ جب وہ کوئی ایسی حرکت کرتے تو غفار میری طرف دیکھتا اور میں نظریں جھکا لیتی۔

کھیل ختم ہوا تو میں نے شکر ادا کیا۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔ نانی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”ہاں ہاں، تم جاؤ۔ میں ابھی مزید بیٹھوں گا۔ اب ایک بازی شیر کی ساتھ بھی ہو جائے۔ کیوں شیر؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ شیری نے تو گویا کوئی اور جملہ سیکھا ہی نہ تھا یا پھر ان دونوں بھائیوں کی جی حضوری ضرورت سے زیادہ کرتا تھا۔

میں چھت پر گئی تو نانی جان سوچیں تھیں۔ میں بھی اپنی چار پائی پر خاموشی سے لیٹ گئی۔



اگلے دن جمعہ تھا۔ جبار بھائی کو دفتر سے چھٹی تھی۔ ان دنوں سرکاری چھٹی جمعے کو ہوتی تھی۔ میں چھت سے اتری تو معزز مہمان صحن میں پنجھی چار پائیوں پر ابھی تک سو رہے تھے۔

ماموں منہ اندھیرے کھیتوں کی طرف نکل جاتے تھے جبکہ ممانی اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھیں۔ نانی جان صحن میں رکھے پیڑے پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ متحرک تھے اور انگلیاں لگا تار دانے پر دانہ گرا رہی تھیں۔ مگر ان کی نظریں اس وقت بے سدھ پڑے شیری پر جمی تھیں۔ وہ ناگواریت سے شیری کو دیکھ رہی تھیں۔ گاؤں دیہاتوں میں ویسے بھی دیر سے اٹھنا سخت ناپسند کیا جاتا ہے۔ بچے ہوں یا بڑے بوڑھے سب فجرِ ثائم اُٹھ جاتے ہیں۔ نو دس بجے تک تو دیہاتی عورتیں اپنے گھر کا سارا کام نمٹا کر دوپہر کے سونے کی تیاری کر رہی ہوتی ہیں۔ شہروں میں جبکہ اس وقت تک صبح کا آغاز بھی بمشکل ہوتا ہے۔

شیری اور شبانہ دونوں ہر بات سے بے خبر سکون سے سو رہے تھے۔ شبانہ نے تو اپنا چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا جبکہ شیري ننگے منہ، چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کو سوتے میں منہ کھلا رکھنے کی عادت تھی شاید اور اس وقت بھی اس کے ادھ کھلے منہ سے مکھیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

میری نظر شیري پر پڑی تو مجھے ابائی آتے آتے رہ گئی۔ یا اللہ کس قدر درہشت ناک منظر ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ دارفانی سے کوچ کر چکا ہے۔ کیونکہ زندہ انسان تو اپنی ناک پر کبھی تک نہیں بیٹھنے دیتا کجایہ کہ کھیاں اس کے منہ سے حلق تک سیر کر رہی ہیں تھیں اور اُسے کوئی ہوش نہ تھا۔

میں فکر مندی سے اس کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی کہ غفار باہر سے آگیا۔ وہ صبح کی سیر کا عادی تھا۔ اس کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ اس نے مجھے شیري کے پاس کھڑے دیکھا تو وہ بھی پاس آگیا۔ شیري کی عبرت ناک حالت دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اسے شرارت سوچھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی مسواک آہستگی سے اس کے کھلے ہوئے منہ میں ڈال دی۔ مسواک کو اس نے تھوڑا ہلایا تو سویا ہوا شیري بڑے زور و شور سے مسواک کو چبانے لگا۔

اس کو مسواک چباتا دیکھ کر ہم زور زور سے ہنسنے لگے۔ نانی بھی یہ تماشا دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ ہنسی کی آواز سن کر شیري اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پریشان نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ ہنوتی بنا پوچھ رہا تھا۔ ”میرے منہ میں کیا ڈالا گیا ہے؟“

یہ شور اباسن کر شبانہ بھی جاگ گئی۔

”ہم نے کیا ڈالنا ہے تمہارے منہ میں۔ یہ گستاخ کھیاں تمہارے منہ کو اپنی رہائش گاہ بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔

کچھ نے تو شاید اندرائے بھی دے دیئے۔“

یہ سن کر شیري بے چارہ تھوکنے لگا اور ہم ہنسنے چلے گئے۔ شبانہ چپ چاپ منہ پھلائے دیکھتی رہی۔ جبار بھائی کو

ادھر آتا دیکھ کر ہم ادھر ادھر ہو گئے۔ شبانہ پہلے ہی مجھے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی اس واقعہ کے بعد اور بدظن ہو گئی۔ سارا دن مجھ سے کھنچی کھنچی رہی۔ ایک بات پر میں بہت حیران تھی کہ وہ سب کے سامنے بلا جھجک جبار بھائی کو مخاطب کر لیتی اور باتیں بھی کرتی رہتی۔ اس کے علاوہ بلا جھجک ان کے کمرے میں چلی جاتی۔ بعض اوقات وہ دونوں کمرے میں بالکل اکیلے گھنٹوں گزارتے، حالانکہ ہمارے خاندان میں منگنی کے بعد لڑکا، لڑکی ایک دوسرے کے سامنے آنے سے کتراتے تھے۔ باتیں کرنا تو دور کی بات تھی۔ اپنے خیالات کا اظہار میں نے نانی کے سامنے کیا تو وہ تنک کر بولیں تھیں۔

”یہ ساری بہنیں ایسی ہی چھپھوری اور آزاد خیال ہیں۔ اسی لیے تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔“

آج بھی وہ جبار بھائی کے ساتھ ان کے کمرے میں گھسی بیٹھی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ جبار بھائی گھر پر ہی تھے۔ میں جان بوجھ کر ان کے کمرے کے آگے سے گزری۔ اندر سے میوزک کی آواز آرہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ مجھے تجسس ہو رہا تھا کہ وہ دونوں اکیلے اندر کیا کر رہے ہوں گے۔ یقیناً لڈو کھیل کر رہے ہوں گے یا پھر باتیں کر رہے ہوں گے یا پھر..... یا پھر..... اس سے آگے میں سوچتے سوچتے رک گئی۔ خود کو ڈانٹنے لگی کہ میں کیا اوٹ پٹانگ سوچ رہی ہوں۔ جبار بھائی جیسا آدمی رومانس کر ہی نہیں سکتا۔ مگر شبانہ سے تو کر سکتا ہے۔ وہ ان کی محبت ہے، مگیتیر ہے۔ میرا دل چاہا کہ دروازے کو دھکیل کر دیکھوں کہ وہ لاک ہے یا محض بھڑا ہوا ہے۔ مگر چاہتے ہوئے بھی میں اپنی یہ خواہش پوری نہ کر سکی۔ اسی وقت کچن سے پکوڑے تلنے کی اشتہا انگیز خوشبو آئی تو میں کچن کی طرف کھنچی چلی آئی۔ دیکھا تو ممانی پکوڑے تل رہی ہیں۔

”آخا پکوڑے.....“ میں چبکی۔ ”آئی لو پکوڑے۔“ میں نے ایک پکوڑا اٹھا کر چکھا۔

”بہت مزیدار۔“ میں نے ممانی کو داد دی۔

”اچھا اچھا، یہ تعریفوں کے پل بعد میں باندھنا۔ پہلے یہ پکوڑے اور کچپ جبار اور شبانہ کو دے آؤ۔“ ممانی نے تھوڑے پکوڑے پلیٹ میں ڈالے اور فریج سے کچپ کا پاؤچ نکال کر مجھے پکڑایا۔

تو کیا میں یہ پکوڑے دینے جبار بھائی کے کمرے میں جاؤں۔ مجھے اپنا پہلا تلخ تجربہ یاد آ گیا۔ جب میں ان کے کمرے میں انہیں بلانے گئی تھی اور انہوں نے بلا وجہ مجھے جھاڑ پلا دی تھی۔

”نہیں نہیں ممانی، میں پکوڑے دیکھتی ہوں آپ جا کر دے آئیں۔“ میں نے ان کے ہاتھ سے پکوڑے تلنے

والی چھلنی پکڑنی چاہی۔

”نورین! کیوں ضد کر رہی ہو۔ جیسا میں کہتی ہوں ویسا ہی کرو۔ بلکہ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھنا، گپ شپ لگانا، یہ تو تھوڑے پکوڑے اور ڈال لو۔ تم بھی وہیں بیٹھ کر کھانا۔“ ممانی نے تھوڑے پکوڑے اور پلیٹ میں ڈال دیئے۔ اب میرے پاس انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے ٹرے اٹھالی کہ اچھا ہے، اسی بہانے کمرے کے اندر کا منظر دیکھ سکوں گی۔ دروازہ لاک ہے یا ان لاک۔ اس بات کا بھی پتا چل جائے گا۔

میں جبار بھائی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے زرب لب مسکرا رہی تھی۔ دروازے کے پاس جا کر میں رک گئی۔ ہلکے ہاتھ سے دستک دی مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ محمد رفیع کے گانوں کی آواز باہر تک آرہی تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ میری دستک اندر نہ جاسکی۔ میں نے دروازے کو ہلکا سا دبایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میں جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اندر کا

منظر دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ جبار بھائی اور شبانہ صوفے پر ایک دوسرے کے ساتھ چپکے بیٹھے تھے۔ جبار بھائی نے ایک بازو شبانہ کی کمر پر لپیٹ رکھا تھا۔ جبکہ شبانہ اپنا سر ان کے کندھے پر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کا دوسرا بازو جبار کے دوسرے کندھے پر ٹکا ہوا تھا۔ جبار بھائی نے اپنا سر اس کے سر پر ٹکا رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ محبت بھرے گانے سن کر وہ اس قدر ہوش وہ چکے تھے کہ انہیں میری آمد کا بھی پتا نہ چلا۔

یہ پتویشن میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں ہونق بنی کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ پکڑوں والی ٹرے میرے ہاتھ میں لرز رہی تھی۔ پہلے سوچا کہ گلا کھٹکھا کر انہیں متوجہ کروں۔ پھر سوچا کہ خواہ مخواہ بے چارے شرمندہ ہوں گے چپکے سے واپس چلی جاتی ہوں۔ میں واپس جانے کے لیے مڑنا ہی چاہتی تھی کہ جبار نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سامنے کھڑی دیکھ کر اس نے شبانہ کو ٹھوکا دیا۔ شبانہ ہوش میں آئی تو بجلی کی سی سرعت سے وہ صوفے کے دوسرے کنارے پر چلی گئی۔ وہ نادم سی نظر میں جھکائے بیٹھی تھی۔ جبار بھائی پہلے تو کچھ گھبرائے مگر بعد میں اُن کی گھبراہٹ شدید غصے میں بدل گئی۔ ”تمہیں اتنی تمیز نہیں کہ کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دروازہ ناک کرتے ہیں۔“ وہ غصے سے چنگاڑا تو میری ٹانگیں کا پٹنے لگیں۔ احساسِ ذلت سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”وہ..... میں..... نے.....“ میں کانپتی ہوئی آواز میں بولی مگر الفاظ نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ”گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔“ وہ پھر سے دھاڑا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہی جملہ اس نے زبان بدل کر کہا تو میں نے پکڑوں والی ٹرے میز پر پٹختی اور دوڑتی ہوئی باہر آ گئی۔ سیدھی نانی کے کمرے میں جا کر دم لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ نانی اس وقت سو رہی تھیں۔ میں آہستگی سے جا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ احساس تو ہیں سے میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ میرے پاس کوئی بھری ہوئی پستول ہو اور میں جبار بھائی کو شوٹ کر دوں اور ساتھ میں اس بل بوتی کو بھی۔ مجھے آج تک ایسی حقارت اور غصے سے کبھی کسی نے مخاطب نہیں کیا تھا اور اس وقت مجھے پہلی مرتبہ جبار سے نفرت کا احساس ہوا، شدید نفرت کا احساس۔ میں نے دل ہی دل میں اسے جی بھر گالیاں دیں۔ جانے کب تک میں روتی رہی اور جلتی کڑھتی رہی۔ جب نڈھال ہو گئی تو آنکھ لگ گئی۔

جب سو کر اٹھی تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر چھت پر جھولتے پٹکھے کو گھورتی رہی۔ جو نانی کے کمرے میں لگا تھا اور نانی کی عمر کا ہی لگ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چلنے سے زیادہ ہلکے کھارہا تھا۔ میں اٹھ کر باہر آ گئی۔ نانی برآمدے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں۔ وسیع و عریض صحن میں چار پائیاں بچھ چکی تھیں۔ صحن کے ایک کونے میں بنی تندوری میں آگ دہک رہی تھی۔ آگ کی سرخ اور نیلی لپٹیں تندوری کے منہ سے باہر زبان نکال رہی تھیں۔ ملازمہ پاس کھڑی سوکھی ہوئی ٹھنڈیاں تندوری میں ڈالتی جا رہی تھی۔ جس سے آگ مزید دہک رہی تھی۔ تندوری سے تھوڑا ہٹ کر مٹی کے چولہے پر ممانی بیٹھی ہنڈیا بھون رہی تھیں۔

صحن میں پچھی چار پائیوں پر غفار اور شیریں بیٹھے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر کھڑی اطراف کا جائزہ لیتی رہی، جب جبار اور شبانہ کہیں نظر نہ آئے تو میں باہر آ گئی۔ صحن میں ایک طرف واش روم تھا جو سب کے استعمال میں تھا۔ میں غفار کے پاس سے گزر کر واش روم کی طرف گئی تو وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

واش روم سے فارغ ہو کر منہ ہاتھ دھو کر پھر پاس سے گزرنے لگی تو اس نے آواز دے لی۔
”نورین! بات سنو۔“

”جی غفار بھائی۔“ میں اپنے دوپٹے سے منہ پونچھتی ہوئی پاس آکھڑی ہوئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے اپنے سامنے والی چار پائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں چھپ چاپ بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھتے ہی شیریں اٹھ کر چھت پر چلا گیا۔ شیریں کے جانے کے بعد اس نے

پوچھا۔

”کیا کوئی بات ہوئی ہے۔“

میں نے آنکھیں اٹھائیں تو وہ گہری نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

میری مسلسل خاموشی پر وہ پھر بولا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”مجھے..... کچھ بھی تو نہیں۔“ میں نظریں جھکائے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”اچھا..... کچھ نہیں ہوا تو چہرے پر بارہ کیوں نہ رہے ہیں اور آنکھیں کیوں سوچ رہی ہیں۔“

”کچھ نہیں، سو کر انھی ہوں شاید اس لیے۔“

”میری طرف دیکھو۔“ وہ تھکمانہ لہجے میں بولا تو میں نظریں اٹھائے اُسے دیکھنے لگی۔

نظریں جھکانے سے جن آنسوؤں کو میں چھپائے بیٹھی تھی، نظریں اٹھانے سے وہ بھل بھل بننے لگے۔ مجھے روتا

دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

”ارے ارے..... کچھ بتاؤ بھی تو آخر ہوا کیا ہے؟“

اب میں باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نانی بھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو دوڑی چلی آئیں۔ ممانی نے دور

سے شاید صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا، وہ بھی ہانڈی چولہا چھوڑ کر دوڑی چلی آئیں۔ سبھی پوچھ پوچھ کر تھک گئے مگر میں

رونے کی وجہ بتانے کے بجائے روئے جا رہی تھی۔

دل چاہا کہ جبار بھائی نے جو ہنک آمیز سلوک میرے ساتھ کیا ہے، وہ سب کو بتا دوں۔ مگر پھر یہ سوچ کر ارادہ

بدل دیا کہ ممانی بے چاری شرمندہ ہوں گی۔ ان کا دل دکھے گا۔ اس کٹھور اور پتھر دل انسان کی غلطی کے لیے یہ مہربان اور

شفیق لوگ مجھ سے مافیائے مانگیں گے اور اگر میری امی یا ابوبک یہ بات پہنچی تو تعلقات میں بھی کشیدگی پیدا ہو سکتی

ہے۔ اس بے حس شخص کو تو شاید کوئی فرق نہ پڑے مگر باقی لوگوں پر خاصا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں سوچ کر میں نے اپنا

ارادہ ملتوی کر دیا۔

”تو تم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہمیں اپنے دل کی بات نہیں بتاؤ گی۔“ غفار نے پوچھا۔

”بات اتنی چھوٹی ہے کہ آپ لوگ سنیں گے تو میرا مذاق اڑائیں گے۔“ میں آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”نہیں اڑاتے مذاق۔ بھلا ہم کیوں اپنی گڑیا کا مذاق اڑائیں گے۔“ ممانی بڑی اپنائیت سے بولیں تو میرا پھر

سے دل بھرا آیا۔

”بات یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر والے بہت یاد آرہے ہیں۔ میں گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔“
 ”کیا؟“ غفار حیرت سے اُچھل پڑا۔ ”تم اتنی سی بات کے لیے اتنی شدت سے رو رہی ہو۔“ وہ بے یقینی سے
 میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ میرا مذاق اڑایا جائے گا۔“ میں شکایت بھرے لہجے میں بولی تو ممانی نے غفار کو گھور کر
 دیکھا۔

”تو گڑیا اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ کل تمہارے گھر والے آرہے ہیں خوب جی بھر کر مل لینا۔ بس آج
 کی رات ہی تو ہے۔“ ممانی بڑے ڈار سے بولیں۔

”مگر امی، اس طرح تو بچے بھی نہیں روتے جس طرح یہ محترمہ بلک رہیں تھیں۔“

”میری چندا بھی تو بچی ہی ہے۔“ نانی نے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

اسی اثناء میں جبار اور شبانہ میز ہیوں سے اترتے دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے ان کا دم چھلا بھی اُچھلتا ہوا آ رہا
 تھا۔ ان کو دیکھ کر میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ لوگ آکر ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے
 اور کن اکھیوں سے میری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔

”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ جبار نے پوچھ ہی لیا۔

”نہیں کچھ خاص نہیں۔ نورین بیٹی اپنے گھر والوں سے اداس ہو گئی ہے۔ کبھی اتنی دیر دور نہیں رہی نا اس لیے۔“

ممانی ہنستے ہوئے بولیں تو جبار کے چہرے پر اطمینان لوٹ آیا۔

”ہاں تو اگر یہ جانا چاہ رہی ہے تو چھوڑ آئیں۔“

”کل تمہاری پھوپھو اور پھوپھا جمع اپنے باقی بچوں کے آرہے ہیں۔ دودن قیام کریں گے اور پھر نورین کو بھی

ساتھ لے جائیں گے۔“

”اوہ اچھا۔“ جبار سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے دوبارہ ان کی طرف دیکھنے سے گریز ہی کیا۔ مجھے ان کی شکل سے بھی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی
 دیر بعد کھانا تیار ہو گیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران غفار نے خوب چٹکے چھوڑے جنہیں سن کر میں بھی وقتی
 طور پر سب بھول بھال کر ہنسنے لگی۔ ماموں جان، امی وغیرہ کی آمد کا سن کر بہت خوش ہوئے۔

”غفار! کل تمہاری پھوپھو آ رہی ہیں۔ ان کی مہمان داری میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ کل شہر جا کر تمام

ضروری چیزیں لے آنا۔“

”جی اباجی، لے آؤں گا۔“ غفار خوشدلی سے بولا۔

”بلکہ ایسا کرو ساری چیزوں کی لسٹ بنا لو تا کہ کوئی چیز رہ نہ جائے۔“

”اوکے..... اباجی۔“ وہ پھر سعادت مندی سے بولا۔

میں اور نانی رات کو اپنی چارپائیوں پر جا کر لیٹیں تو چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نانی بولیں۔

”نورین! کیا مجھے بھی سچ نہیں بتاؤ گی؟“

”کیا مطلب نانی جان۔“ میں حیران ہوئی۔

”مطلب یہ کہ اپنے رونے کی وجہ۔“

”وجہ بتاؤ دی تھی۔“ میں نے جان چھڑانی چاہی۔

”وہ وجہ تو ان لوگوں کے لیے تھی اور وہ شاید مطمئن بھی ہو گئے ہوں گے۔ مگر میں کیسے ہو سکتی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں نانی۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔“ میں نے ٹالنا چاہا مگر نانی کہاں ٹلنے والی تھیں۔

”نورین! تم مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی اور چھپانے کی کوشش بھی نہ کیا کرو۔ کیونکہ میرے سامنے تمہاری یہ

کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

نانی کے سامنے فرار کے تمام راستے بند پا کر میں نے سارا واقعہ نانی کے گوش گزار دیا۔ جسے سنتے سنتے نانی کا پارہ

ہائی ہوتا چلا گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”اس ناخوار کی اتنی جرأت کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کرے۔ میں ابھی جا کر

اس کے باپ سے بات کرتی ہوں۔ جس نے اس کا داغ خراب کر رکھا ہے۔“

نانی اٹھنے کے لیے پرتول رہی تھیں کہ میں نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”نانی! اس بات کو بھول جائیں۔“

”ایسے ہی بھول جاؤں۔ ابھی اس کی طبیعت صاف کرتی ہوں۔ خود کو سمجھتا کیا ہے۔ نہ منہ نہ متھا، جن پہاڑوں

لتھا۔“

”نانی میں ایک مہینہ یہاں رہی ہوں اور یہ وقت میں نے بڑا خوبصورت گزارہ ہے۔ اب جاتے ہوئے میں

کوئی بد مزگی نہیں چاہتی۔“

”مگر چند!.....“

”نانی..... آپ کو میری قسم..... اس بات کو یہیں چھوڑ دیں۔ جبار بھائی اچھے نہیں، باقی سارے گھر والے تو

اچھے ہیں نا۔ پھر ان کا دل کیوں دکھایا جائے۔ کل امی وغیرہ سب لوگ آرہے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے کیوں ماحول کو

کشیہ کر لیا جائے۔ وہ کتنے چاؤ سے دودن رہنے کے لیے آرہے ہیں۔“

میری باتیں نانی کی سمجھ میں آ گئیں۔ انہوں نے نیچے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا پھر میرے ہاتھوں کو اپنے

ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

”میری بچی اتنی کم عمری میں کتنی سمجھدار ہو گئی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے آج ہوا ہے۔ جس گھر میں میری بچی جائے

گی اس گھر کو جنت بنا دے گی۔“

”نانی..... آپ بھی نا!“ میں شرمانے لگی۔

ہم دونوں نانی، نواسی پھر سے اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔

”نورین فلک ناز!“ نانی نے پیار سے مجھے پکارا۔

”جی نانی، کیا بات ہے۔ آج بڑا پیار آرہا ہے مجھ پر۔“ میں ہنسی، کیونکہ نانی مجھے میرے مکمل نام سے کبھی کبھار

ہی بلاتی تھیں۔

”اگر تو ہمارے گھر کی بہن جانے تو کیا حرج ہے۔“ نانی بڑی دور کی کوڑی لائیں۔

”کیا مطلب؟“ میں چونکی۔

”اگر ہم غفار کے لیے تمہارا ہاتھ مانگیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہونا چاہیے۔“ نانی نے بڑے یقین سے کہا

تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔

”آپ یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”اعتراض کرنے کے لیے کوئی وجہ بھی تو ہو۔“

”بے شک غفار بھائی بہت اچھے ہیں، مگر میں فی الحال شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میں نے جو خواب

آنکھوں میں سجا رکھے ہیں، ان کو پورا کروں گی پھر شادی کے متعلق سوچوں گی۔“ میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

”کیا خواب دیکھ رکھے ہیں بنو، ذرا میں بھی تو سنوں۔“

”نانی، میں فائن آرٹس میں ماسٹر کروں گی۔ مصوری کی دنیا میں نام پیدا کروں گی۔ ہر بڑے شہر میں میرے فن

پاروں کی ایگزیشن ہوگی۔ لوگ میرے فن کی دل کھول کر تعریف کریں گے۔“ میں جوش میں بولتی چلی گئی، اس بات سے

بے خبر کہ نانی بے چاری کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ میں خاموش ہوئی تو نانی استعجاب سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

”مگر تو کہتی تھی کہ میرا ایک ہی خواب ہے ڈھیر سارا پڑھنے کا۔ سولہ جماعتیں پاس کرنے کا۔“ نانی حیرانی سے

بولیں تو میں بھی حیران ہوئی۔

”تو نانی..... ابھی ابھی..... میں کیا کہہ رہی تھی۔“

”مجھے تو تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آئی سوائے ایک بات کے۔“

”اور وہ کیا بات ہے؟“ میں نے کریدا۔

”یہی کہ میں ماسٹر کروں گی۔ لو بھلا بتاؤ ذرا۔ ماسٹر کرنے کا فائدہ۔ ماسٹر کی تنخواہ کتنی ہوتی ہے، جانتی ہو۔ ماسٹر

کی قلیل آمدنی میں گزارہ کر لو گی۔“ نانی اب تاسف سے سر ہلا رہی تھیں۔ نانی کو جس واحد بات کی جس طرح سمجھ آئی تھی۔

یہ جان کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”ارے نانی! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ وہ والا ماسٹر نہیں، یہ کوئی اور ماسٹر ہے۔“

”تو میں نے کب کسی کا نام لیا ہے۔“ نانی اکھڑ گئیں۔

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”نانی، ماسٹر کا مطلب ہے ایم۔ اے، یعنی سولہ جماعتیں۔“

”سولہ جماعتوں کو ماسٹر کہتے ہیں۔“ نانی ششدر رہ گئیں۔ ”نئے نئے رواج نکل پڑے ہیں۔ ہم تو یہی دیکھتے

سننے آئے ہیں کہ سکول میں پڑھانے والا ماسٹر کہلاتا ہے۔ آج پہلی مرتبہ تمہارے منہ سے سن رہی ہوں کہ سولہ جماعتیں

پاس کرنے والے کو کہتے ہیں کہ اس نے ماسٹر کر لیا ہے۔ نئے دور کی نئی باتیں۔“

میں نانی کی بات سن کر خاموش رہی تو نانی پھر سے گویا ہوئیں۔ ”تم جتنا دل چاہے پڑھ لو۔ ہمیں کون سی جلدی

ہے شادی کرنے کی۔“

”نانی پلیز، اس بات کو ختم کریں۔ مجھے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنی۔“ یہ کہہ کر میں نے کروٹ بدل

لی۔ نانی بھی میرا رویہ دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

.....☆.....

صبح میں اٹھ کر نیچے آئی تو شبانہ اور شیریں واپس جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ وہ ممانی سے الوداعی کلمات کہتے ہوئے گلے مل رہے تھے۔ میں پاس سے گزری تو شبانہ نے اچھتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور بولی۔

”اچھا خالہ جان! اب ہمیں اجازت دیں۔“

”اب تم لوگ جانے پر رضہ ہو تو اللہ حافظ۔ میں تو کہہ رہی تھی دو دن اور رُک جاتے۔“

”نہیں خالہ، بس اتنا ہی کافی ہے۔“

”اچھا..... آپا کو میرا سلام کہنا۔ میں کسی دن چکر لگاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے، کہہ دوں گی۔“

واش روم تک جاتے جاتے میں اتنی ہی باتیں سن پائی تھی۔ باہر نکلی تو وہ لوگ جا چکے تھے۔

”کیا مہمان چلے گئے؟“ میں نے ممانی سے پوچھا جو اس وقت آنا گوندھ رہی تھیں۔

”ہاں چلے گئے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”ناشتہ کیے بغیر چلے گئے۔“

”ہاں، کہہ رہے تھے دھوپ چڑھ گئی تو گرمی کی تمازت میں اضافہ ہو جائے گا۔ تھوڑا تھوڑا ہی زبردستی کھلایا ہے

میں نے۔“

شکر ہے جان چھوٹی۔ میں نے دل میں شکر ادا کیا۔ میں نانی کے کمرے میں آگئی۔ نانی حسبِ معمول تسبیح کر

رہیں تھیں۔ ناشتے کے بعد میں نے اپنے گھرفون کیا، جو مہوش نے اٹھایا۔

”کب تک آؤ گے؟“ میں نے بے تابانی سے پوچھا۔

”بس نکل رہے ہیں۔ اتا دلی کیوں ہو رہی ہو۔“

”بس اب جلدی سے آ جاؤ تم لوگ۔“

”میں نے کہا نا کہ نکل رہے ہیں۔ گوجرانوالہ سے کاموکی کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ اور

اس کے بعد نانی کا گاؤں مزید پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر ہے۔ یعنی ہم تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر تمہارے پاس ہوں

گئے۔ کسی اور سے بات کرنی ہے کہ بند کر دوں؟“

”نہیں، بس بند کر دو۔ ویسے بھی ایک گھنٹے تک تو مل ہی رہے ہیں۔“ میں نے یہ کہہ کر ریسپورڈ کر بیڈل پر رکھ دیا

پھر سوچنے لگی۔ یہ ایک گھنٹہ کیسے گذاروں۔ نہا کر کپڑے تبدیل کرتی ہوں۔ کچھ وقت بھی کٹ جائے گا اور فریش بھی دکھائی

دوں گی۔ میں نے ممانی کے دیئے ہوئے جوڑوں میں سے ہلکے پیلے رنگ کا سوٹ نکالا، جس پر سرخ پھول بنے ہوئے تھے

اور ساتھ سرخ کلر کا دوپٹہ تھا۔

میں ہاتھ میں کپڑے اور ناؤں اٹھائے باہر آئی۔ کچن کے آگے سے گزرنے لگی تو غفار پر نظر پڑی جو شہر سے لایا

گیا سودا سلف کچن کی شیلف پر رکھ رہا تھا، جبکہ ممانی پاس کھڑی شاہر زکھول کھول کر چیک کر رہی تھیں۔ غفار کا سرخ و سفید

چہرہ اس وقت گرمی کی شدت سے لال بھوکا ہو رہا تھا۔ آسمانی کلر کے کاٹن کے شلوار سوٹ میں وہ بہت ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔

ویسے نانی کا خیال اتنا بھی برا نہیں۔ میں کپڑے واش روم میں ٹانگتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پھر میں نے مسکراتے ہوئے سر جھکا اور شاد رکھول کر نیچے کھڑی ہو گئی۔ نہا کر نانی کے کمرے میں آئی تو وہاں غفار، نانی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی طرف پیٹھ موڑ کر تو لیے سے ہال خشک کرنے لگی۔

پھر تویہ چار پائی پر بچھا کر ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو کر بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ میں نے آئینے میں اپنے پیچھے بیٹھے غفار کو دیکھا جو اب بھی میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جب آئینے میں ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو میں جھینپ گئی۔ میں نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔ سر پر دوپٹہ اوڑھا۔

”نانی میں ممائی کے پاس جا رہی ہوں۔“ میں نے غفار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اب بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ہاں ہاں جاؤ۔“ نانی نے کہا اور میں فٹ سے باہر آ گئی۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالا اور ممائی کے کمرے کی طرف چل دی۔ ممائی کمرے میں نہ تھیں۔ ممائی کہاں چلی گئیں۔ میں کمرے میں کھڑی سوچ رہی تھی۔ آتے ہوئے کچن میں نظر دوڑائی تھی وہاں بھی نہ تھیں۔ کہاں جاسکتی ہیں۔ یقیناً نہانے گئی ہیں۔ میں بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ ہی گئی۔ میں واپس جانے کے لیے مڑی تو دروازے کے بیچ غفار کو کھڑا دیکھ کر رُک گئی۔

”نہا کراتنی ٹھنڈی ہو گئی ہو کہ گرمی کا احساس تک نہیں ہو رہا۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں پنکھا چلائے بغیر کھڑی ہوں۔ غفار نے پنکھے کا سوئچ آن کر دیا۔ ”وہ..... وہ غفار بھائی میں جانے کا سوچ رہی تھی اس لیے پنکھا چلانا ضروری نہ سمجھا۔“ میں نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ نجمانے کیوں آج مجھے غفار بھائی سے شرم محسوس ہو رہی تھی۔

”چلو آؤ تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ میں فٹ سے پیچھے ہو گئی۔

”نہیں، میں اب جاؤں گی۔“ میں گھبرا گئی۔

”کہاں جاؤ گی؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”نانی..... کے..... پاس۔“

”ابھی ابھی تو وہاں سے آئی ہو۔“

”ہاں..... مگر..... میں تو ممائی کے پاس آئی تھی۔“

”مجھے لگتا ہے امی شاید نہانے کے لیے گئی ہیں۔“

”اوکے..... میں چلتی ہوں۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو وہ لپک کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”پلیز غفار بھائی، راستہ چھوڑیں۔“

”غفار کے ساتھ بھائی کا دم چھلا لگانا ضروری ہے کیا۔ صرف غفار کہا کرو۔“ وہ بڑی لگاوٹ سے کہہ رہا تھا۔

”صرف غفار..... کیسے کہہ سکتی ہوں۔ آپ مجھ سے اتنے سال بڑے ہیں۔“
 ”جب میں بڑا ہونے کے باوجود تمہیں اجازت دے رہا ہوں تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے، کہہ دیا کروں گی۔“ میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔
 ”بتاؤ کیا کہہ کر بلاؤ گی؟“ غفار کسی بچے کی طرح ضد پراڑ گیا۔
 ”غفار.....“ میں جھکتے ہوئے بولی۔
 ”ویری گڈ۔“ وہ خوش ہوا۔

”اب میں جاؤں۔“ میں نے مظلومیت سے پوچھا۔
 وہ تھوڑی دیر گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر شاید میری بے بسی پر ترس آ گیا۔ ہنس کر ایک طرف ہو گیا۔ ”ہاں جاؤ۔“

میں نے قدم باہر کی طرف بڑھائے تو وہ پھر بولا۔ ”سنو۔“
 میں جاتے جاتے رک گئی۔ وہ میرے بالکل پاس آ گیا۔ اتنا پاس کہ اس کی سانسیں میری سانسوں سے ٹکرانے لگیں۔ پھر اس نے اپنا سر جھکا کر میرے کان کے پاس اپنے ہونٹ لا کر سرگوشی کی۔
 ”نورین! تم بہت خوبصورت ہو۔ آئی لو یو.....“

اس کی یہ مدھر سرگوشی میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ میں تقریباً بھاگتی ہوئی نانی کے کمرے میں آئی۔ خدا کا شکر ہے کہ نانی اس وقت آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔ مگر وہ سوئی ہوئی نہیں بلکہ جاگ رہی تھیں۔ قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نانی کے پاس بیٹھ گئی۔
 ”ارے نور! کیا ہوا تمہیں؟“ نانی پریشانی سے بولیں۔

”کیا ہوا ہے۔“ میں بے اختیار اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرنے لگی۔
 ”تمہارا رنگ ایک دم لال ہو رہا ہے۔ کہیں بخار وغیرہ تو نہیں ہو گیا۔“ نانی نے میرا بازو چیک کیا۔
 ”نہیں نانی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”اچھا یہ اپنے لیے گھسنے کا لے بال سمیٹ کر باندھو۔ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔“
 مجھے نانی کے پاس سے اٹھنے کا معقول بہانہ مل گیا۔ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس وقت واقعی میرے رخساروں پر گلاب کھلے ہوئے تھے۔ مجھے پھر غفار کی حرکت یاد آئی تو سوچنے لگی۔ یہ آج غفار بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی اور نہ ان نظروں سے کبھی دیکھا تھا۔ میں نے بال باندھ لے اور پھر سے نانی کے پاس آ بیٹھی۔

.....☆.....

بارہ بجے تک ابو وغیرہ آ گئے۔ میں ان لوگوں کی آمد سے کھل اٹھی۔ ابو سے کافی دیر تک لپٹی روتی رہی۔ سبھی میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ امی اور مہوش بھی والہانہ انداز میں ملیں۔ بلال بھائی نے بھی پیار سے سر پر ہلکی سی چپت ماری اور ساتھ لگایا۔

”اے لڑکی! باپ کے سامنے رو کے تم ثابت کیا کرنا چاہ رہی ہو۔“ نانی نے مصنوعی خشکی سے بولا۔
 ”یہی کہ ہم بڑے ظالم ہیں اور اس سے انتہائی براسلوک کرتے رہے ہیں۔“ غفار نے فٹ سے جملہ اچک لیا۔
 غفار کی بات سن کر سبھی ہنسنے لگے اور میں سر اسیمہ ہو گئی۔
 ”میں تو..... بس یونہی.....“ میں ہکلاتی رہ گئی۔

امی، نانی کے کمرے میں نانی کے پاس بیٹھ گئیں۔ ابو، ماموں کے ساتھ ان کے کمرے میں چلے گئے۔ بلال بھائی، غفار کے ساتھ اس کے کمرے میں، جبکہ میں اور مہوش کچن میں ممانی کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ممانی نے بہت اہتمام کر رکھا تھا۔ کھیر صبح سویرے ہی بنا کر فرنچ میں رکھ دی تھی۔ مہوش سلا دینا لگی جبکہ میں قیے والے چاولوں میں جھج چلانے لگی۔ دوسرے چولہے پر ممانی مننن قورمہ پکا رہی تھیں۔ اس وقت تک ان کے گاؤں میں سوئی گیس نہیں پہنچی تھی۔ صبح اور دوپہر کو وہ کچن میں کھانا پکاتیں، جس کے لیے سلنڈر استعمال کیا جاتا۔ البتہ رات کا کھانا باہر مکن میں کھلی فضا میں پکایا جاتا۔ روٹیاں پکانے کی ڈیوٹی گھر کی ملازمہ کے ذمے تھی جو دونوں وقت تندوری دہکا کر روٹیاں پکاتی۔
 دوپہر کا کھانا پورے دو بجے تیار ہو گیا۔ سب نے مل کر کھایا تو کھانے کا لطف دو بالا ہو گیا۔ کھانا حسب توقع بہت لذیذ تھا۔ سب نے دل کھول کر تعریف کی۔ کھانا کھانے کے بعد افراد خانہ پھر سے ٹولیوں کی شکل میں بٹ گئے۔

گھر کی تمام خواتین نے نانی کے کمرے میں ڈیرہ ڈال لیا۔ قریبی اور دور دراز کے سبھی رشتہ داروں کو موضوع گفتگو بنایا گیا۔ کیموں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے اور کیموں کے بچے ادھیڑے گئے۔ ویسے بھی جہاں چار عورتیں اکٹھی ہوں اور غیبت اور چغلی سے بچی رہیں۔ یہ ناممکن سی بات ہے۔

امی کی اپنی بھادج سے خوب بنتی تھی۔ اس لیے جب دونوں اکٹھی ہوتیں، جی بھر کر باتیں کرتیں۔ دونوں میں اتنا پیار دیکھ کر نانی بھی پھولی نہ ساتیں۔

دوپہر ڈھلی۔ دھوپ کی تمازت میں تھوڑی کمی آئی تو غفار اور بلال دونوں ہمارے کمرے میں آ گئے۔
 ”پھوپھو جان! آئیں کہیں باہر گھومنے چلتے ہیں۔“ غفار نے امی سے کہا۔
 ”باہر..... باہر کہاں؟“

”لو جی، پوچھ ایسے رہی ہیں جیسے آپ کو پتا ہی نہیں کہ باہر کہاں جانا ہے۔ ہر طرف جدھر نظر دوڑائیں ہمارے زمینیں ہیں۔ گھوم پھر کر آتے ہیں۔ مویشیوں کے باڑے کے پاس میں نے اپنے لیے ڈیرہ بنوایا ہے، وہ دکھاتا ہوں آپ کو اور وہاں پاس ہی ٹیوب ویل ہے۔ آپ سب خوب انجوائے کریں گے۔“ بات کرتے ہوئے غفار کے چہرے پر فخر پیدا ہوتا چلا گیا، جو مجھے برا نہیں بلکہ اچھا لگا۔

بے شک حسب نسب اور دولت و ثروت کو وجہ افتخار نہیں سمجھنا چاہیے۔ مگر اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونا باعث سعادت تو یقیناً ہے۔ ایک انسان کا کسی اعلیٰ نسب خاندان میں پیدا ہونا اس کے لیے ایک نعمت ہے۔
 ”کیوں بھی لڑکیوں، کیا کہتی ہو؟“ امی نے ہم سے رائے پوچھی تو مہوش فٹ سے بولی۔

”نیکلی اور پوچھ پوچھ..... چلتے ہیں۔“

”اور تم نورین.....“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ مجھے تو غفار بھائی نے ایک دن بھی ایسی آفر نہیں کی۔ سارا سارا دن گھر میں پڑی بور

ہوتی رہی ہوں۔“

”دیکھو نورین، تم واقعی بہت بڑی احسان فراموش ہو۔ تمہیں دو تین دفعہ شہر لے کر گیا ہوں۔ دادی اس بات کی

گواہ ہیں۔ کیونکہ امی اور دادی ہمارے ساتھ جاتی رہی ہیں۔“

”ہاں تو میں نے کب کہا ہے کہ نہیں لے کر گئے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ایسی آفر کبھی نہیں کی۔ فارم ہاؤس پر لے

جانے کی۔“ میں نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

”اچھا اچھا، یہ لڑنا بند کرو اور اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔“

”ایسا کریں آپ لوگ چلے جائیں، میں گھر میں رکتی ہوں۔ رات کا کھانا تیار کرنا ہے۔“ ممانی نے کہا۔

”بالکل نہیں، آپ ہمارے ساتھ جائیں گی۔“ امی نے فیصلہ سنا دیا۔ ”ابھی ابھی تو اتنا ٹھونسا ہے۔ کیا اتنی جلدی

بھوک لگ جائے گی اور اگر لگ بھی گئی تو دو پہر کا بچا کچھا کھالیں گے۔ آپ اٹھ کر تیار ہو جائیں۔“

”غفار بھائی! پیدل جانا ہے کہ گاڑیوں میں۔“ مہوش نے غفار سے پوچھا۔

”جیسا آپ حکم کریں، مائی لعل سسٹر۔ ویسے مزا تو پیدل جانے میں ہے، لیکن آپ کو چلنے میں یقیناً دشواری ہو

گی۔ آپ کی ٹانگیں آپ کے بھاری بھر کم وجود کو گھسیٹنے سے انکار کر دیں گی، اس لیے گاڑیاں ہی ٹھیک رہیں گی۔“

غفار کی بات سن کر سب ہنسنے لگے تو مہوش نے غصے سے منہ پھلایا۔

”امی! غفار بھائی آپ کے سامنے مجھے کیا کہہ رہے ہیں۔“

”غفار بیٹا! کیوں تنگ کر رہے ہو میری بیٹی کو۔“

”او کے پھوپھو، فنانٹ سب لوگ باہر آ جائیں۔ میں اور بلال گاڑی گیٹ کے آگے لا کر کھڑی کرتے ہیں اور

ہاں ابو اور پھوپھو چاچی کو بھی ان کے کمرے سے نکالیں۔“ یہ کہہ کر وہ دونوں باہر چلے گئے اور میں، ابو اور ماموں کو یہ پیغام

دینے ان کے کمرے میں چلی گئی۔

ہم سب لوگ تیار ہو کر گیٹ سے باہر نکلے تو جبار دفتر سے آ گیا۔ وہ امی سے بڑے پر تپاک طریقے سے ملا۔ امی

نے بھی سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں دعائیں دیں۔ ویسے بھی امی اپنے بھتیجیوں سے بہت پیار کرتی تھیں اور وہ دونوں بھائی بھی

امی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہ آنے دیتے تھے۔ اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ ماموں، امی

کو بہت چاہتے تھے۔ اپنی اکلوتی چھوٹی بہن کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ پورے سال کی گندم اور پورے سال کے چاول وہ

ہمارے گھر بھیجتے تھے۔ جس کی کبھی انہوں نے قیمت وصول نہ کی۔ عید بقرعید پر ڈھیروں تحائف اس کے علاوہ تھے۔

ہمارے خاندان میں بیٹیوں کو وراثت میں حصہ دینے کا کوئی رواج نہ تھا۔ اسی لیے بیٹیوں اور بہنوں کو اسی طرح بہانے

بہانے سے نوازا جاتا تھا۔

”آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں کیا؟“ جبار نے سب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہم سب زمینوں پر جا رہے ہیں۔“ امی نے جواب دیا۔ ”تم بھی چلو ہمارے ساتھ۔“ امی نے اصرار کیا

تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

”نہیں پھوپھو، آپ لوگ جائیں میں تو تھکا ہوا آیا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کروں گا۔ ابو اور پھوپھا جان کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں گھر میں ہی ہیں۔ انہوں نے بھی تمہاری طرح انکار کر دیا ہے کہ اب اس عمر میں صرف خبریں اور حالات حاضرہ کے پروگرام ہی بھاتے ہیں۔“

”جبار! کھانا کچن میں رکھا ہے، کھا لینا۔“ ممانی نے کہا تو وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے امی، میں کھا لوں گا۔“
ہم گاڑیوں میں بیٹھے اور پانچ منٹ میں ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہ تقریباً دو کینال جگہ پر چار دیواری کی گئی تھی۔ چار دیواری پر خاردار تار لگائے تھے۔ جن میں بقول غفار کے رات کو بجلی دوڑادی جاتی تھی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ہماری گاڑیاں سیدھی اندر جا کر رکیں۔ ہم نے باہر نکل کر جائزہ لیا۔ دو بڑے کمرے تھے جن کے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدہ دو تین میٹر ہیاں اونچا تھا۔ برآمدے سے آگے تھوڑا کچا فرش تھا۔ اس کے بعد باقی کافی جگہ کو سرسبز لان بنا دیا گیا تھا۔ جہاں بید کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم سب انہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ہمیں دیکھ کر ایک ملازم بھاگا بھاگا آیا اور ایک طرف مؤدب کھڑا ہو گیا۔

”تو یہ ہے تمہارا ڈیرہ۔ خاصی خوبصورت جگہ ہے۔“ امی نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”غفار ایسا کرو یہ فروٹ فریق میں لگا دو۔ تھوڑی دیر بعد کھائیں گے۔“ ممانی نے بڑے بڑے شاپر غفار کی طرف بڑھائے، جن میں آم اور آلو بخارے اور خوبانیاں تھیں۔ غفار نے ملازم کو اشارہ کیا تو وہ شاپر پکڑ کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔

”گلتا ہے تم نے ضرورت کی تمام چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔“ امی نے پوچھا۔

”جی پھوپھو، ایک کمرہ اپنے لیے فرشتہ کر دیا ہے۔ میرے شہر سے آنے والے دوست یا کوئی بھی ملنے جلنے والا آئے تو یہیں ٹھہرتا ہے۔ جبکہ دوسرے کمرے میں میرے خاص ملازم سوتے ہیں۔ انھیں انٹھ کر دیکھیں۔ آپ لوگ تو یوں بیٹھ گئے ہیں جیسے پیدل آئے ہوں۔“ غفار نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

میری دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم نے دونوں کمروں کا معائنہ کیا۔ غفار کا زیر استعمال کمرہ بہت خوبصورت فرنیچر اور قالین وغیرہ سے آراستہ تھا۔ اس کے ایک کونے میں بنی الماری میں اسلحہ وغیرہ رکھا تھا، جسے بلال بھائی بڑے شوق سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

اباجان خود اسلحہ رکھنے کے بڑے شوقین تھے۔ ہر جدید رائل ان کے پاس تھی اور ان کا باقاعدہ لائسنس بھی ان کے پاس تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اسلحہ ہر زمیندار کی شان ہوتا ہے اور بقول ان کے ہر مرد کو اسلحہ چلانا آنا چاہیے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ بھی کوئی مرد ہے جو اسلحہ نہ چلا سکے اور بوقت ضرورت اپنی اور اپنے خاندان کی حفاظت نہ کر سکے۔

اس احاطے سے باہر نکلے تو ساتھ ہی موسیوں کا باڑہ تھا، جہاں اس وقت لگ بھگ پچاس بھینسیں اور دس گائیں بندھی تھیں۔ ملازم بھینسوں کا دودھ دھور رہے تھے۔ باڑے کے ساتھ ہی ٹیوب ویل تھا جو اس وقت چل رہا تھا۔ ٹیوب ویل کا ٹھنڈا اور شفاف پانی دیکھ کر ہم دونوں بہنیں مچلنے لگیں۔

”امی، آئیں اس حوض میں نہاتے ہیں۔“

نیوب ویل کا حوض کافی بڑا اور زیادہ گہرا نہ تھا۔

”رہنے دو، کپڑے گیلے ہو جائیں گے۔“ امی نے نال دیا۔

”نانی آئیں نائیوب ویل کے ٹھنڈے پانی میں نہائیں۔“ میں نے نانی سے کہا، جو حسبِ توقع فوراً مان گئیں۔

”زاہدہ، کیوں بچپن کو منع کر رہی ہو نہانے سے۔“

”امی جان! کپڑے بھیگ جائیں گے۔ اگر انہوں نے نہانا تھا تو گھر سے پرانے کپڑے ساتھ لے کر آتیں۔“

”کچھ نہیں ہوتا کپڑوں کو۔ بھیگ گئے تو سوکھ جائیں گے۔ گرمیوں کا موسم ہے، فٹ سے خشک ہو جائیں گے۔“

نانی کے سامنے امی کی ایک نہ چلی تو انہوں نے ہار مان لی۔ نانی نے بلال بھائی اور غفار بھائی کو کہا کہ لڑکوں تم

ذرا دُور چلے جاؤ۔ خواتین کا نہانے کا موڈ ہو رہا ہے۔

دونوں لڑکے احاطے کی چار دیواری کے اندر چلے گئے تو نانی نے حوض کی منڈیر پر چڑھ کر نعرہ مستانہ لگایا اور

گھڑاپ سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ نانی کا بھاری بھر کم وجود پانی میں گرا تو پانی اچھل کر کناروں سے باہر گرا۔ ہم سب کا

ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ نانی نے پانی میں اچھلتے ہوئے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا تو ہم دونوں بہنیں بھی کود گئیں۔

ٹھنڈے پانی نے ایک دفعہ تو کپکپی طاری کر دی۔ مگر اگلے ہی لمحے نہانے میں لطف آنے لگا۔ ہم نانی کے ساتھ وسیع و

عریض حوض میں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی تیرنے لگیں۔ امی اور ممانی کنارے پر کھڑی ہم کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔

میں نے باہر نکل کر امی اور ممانی کو بھی زبردستی کھینچ لیا۔ اب ہم پانچوں خواتین پانی میں ایک دوسرے کے ہاتھ

پکڑ کر گول دائرے کی شکل میں ہلکے ہلکے جب لگا رہی تھیں۔ کافی دیر پانی میں نہانے سے اب ہمیں ہلکی ہلکی سردی اور

تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بالآخر نانی بول پڑیں۔

”اری لڑکیو، بس بھی کرو۔ کیوں مجھ بڑھیا کو بیمار کرنے پر تلی ہو۔“

”کیا ہوا نانی؟ اتنا مزہ تو آ رہا ہے۔“ مہوش کا ابھی جی نہیں بھرا تھا۔

”میرے لیے تو اتنا مزہ ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ مزہ لیا تو ڈاکٹر کے پاس حاضری دینی پڑے گی۔“ نانی یہ کہہ

کر پانی سے باہر آ گئیں۔

”چلو چلو، اب ہم بھی باہر نکلتے ہیں۔ کافی دیر نہالیا۔“ امی نے ہمیں حکم دیا اور خود باہر نکلیں۔ امی نکلیں تو ہم تینوں

بھی پانی سے باہر آ گئیں۔ سب کے کپڑے بھیگ کر جسموں سے چپک گئے تھے۔ کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ہم نے

ہاتھوں سے جس حد تک کپڑے نمونڈ سکتیں تھیں اتنے نمونڈے۔ اپنے اپنے بال نمونڈے اور دوپٹے اوڑھ کر اپنے سر اپا کو

چھپایا۔ دوپٹے ہمارے خشک تھے۔ پانی میں اترنے سے پہلے ہم سب نے دوپٹے اتار کر ایک سائیڈ پر رکھ دیئے تھے۔

ڈیرے میں جا کر ہم لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بلال اور غفار اندر کمرے میں اے سی آن کیے ٹی

وی دیکھ رہے تھے۔ ملازم ہمیں دیکھ کر پھر سے ہمارے پاس آ کر قدرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”کرمو.... تم فروٹ سے لے آؤ۔“ ممانی نے اسے آرزو دیا تو وہ فوراً فروٹ سے فروٹ لے آیا۔

ٹھنڈے ٹھنڈے فروٹ نے گیلے گیلے کپڑوں کے ساتھ خوب لطف دیا۔ ہماری آمد کا سن کر مرد حضرات بھی باہر

ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ نہانے سے بھوک خوب چک اٹھی تھی۔ دوپہر کا کھانا پیا کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ خوش گپیاں

لگاتے ہوئے فروٹ منٹوں میں ختم ہو گیا۔

”اب چلنا چاہیے۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی ہیں۔ میری نماز کا وقت نہ نکل جائے۔“ نانی نے کہا تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔



پانی میں اچھل کود نے نانی کو بتا دیا کہ وہ اب بوڑھی ہو چکی ہیں۔ پہلے والا دم خم باقی نہیں رہا۔ مغرب کی نماز بھی نانی نے بمشکل ادا کی اور اس کے بعد ہائے ہائے مچادی۔ نانی کا تمام جسم اکڑ کر درد کر رہا تھا۔

”اماں! اب آپ کی عمر ہے اچھل کود کرنے کی۔ بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی ہیں۔“ ماموں، نانی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے جو اس وقت صحن میں کچھی چار پائی پر لیٹی ہائے ہائے کر رہی تھیں۔ باقی تمام افراد بھی وسیع صحن میں کچھی چار پائیوں پر بیٹھے خوش گپیاں لگا رہے تھے۔ میں نانی کے پاس بیٹھی نانی کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

”اوئے غفار!“ ماموں نے غفار کو پکارا۔

”جی ابا جان۔“

”اپنی دادی کو گاؤں کے ڈاکٹر کے پاس لے جا اور درد کا انجکشن لگوا لا۔“

”اچھا ابا جی، اٹھیں دادی۔“

”اٹھا جائے گا تو اٹھوں گی نا۔“ نانی نے نفاہت بھری آواز میں جواب دیا۔

”دادی! ٹیوب دیل پر نہاتے وقت تو آپ یگ لڑکی بنی چھلانگیں لگا رہی تھیں اور اب بوڑھیوں کی طرح کراہ رہی ہیں۔ اب بھی خود کو جوان سمجھتے ہوئے ہمت کریں۔“

”میری پوزیشن دیکھ کر بھی چوٹیں لگانے سے باز نہ آنا۔“ نانی نے غصے سے غفار کو گھورا تو اس نے نانی کو سہارا دے کر اٹھنے میں مدد دی۔

”دادی مگر آپ کہیں تو بازوؤں میں اٹھا کر آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔“

”رہنے دے، بڑا آیا میرا ہمدرد۔ اتنی جان ہے میری ٹانگوں میں کہ دو گلیاں چھوڑ کر ڈاکٹر کی دکان پر جاسکوں۔“

نانی اٹھتے ہوئے بولیں۔

”دادی! ڈاکٹر کی دکان نہیں کلینک ہوتا ہے۔“

”ہاں ہاں، وہی۔“

غفار، نانی کو سہارا دے کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور ہم سب لوگ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ جب تک ہم کھانے سے فارغ ہوئے غفار اور نانی واپس بھی آ گئے۔ نانی آ کر چار پائی پر بیٹھیں تو ہمارے سوال جواب شروع ہو گئے۔

”نانی، ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بھی ڈاکٹر نے تو کچھ بتایا ہے یا نہیں، دادی نے ڈاکٹر کو کچھ ایسا سبق سکھایا ہے کہ بے چارے ڈاکٹر کے دماغ

کا دی ہو گیا۔“

”وہ کیسے؟“ بلال بھائی نے اشتیاق سے پوچھا۔
 ”بتا دوں دادی۔“ غفار نے معصومیت سے نانی سے اجازت طلب کی تو نانی شعلہ باز نظروں سے گھورتی ہوئی بولیں۔

”بک دے جو بکنا چاہتا ہے۔ اب تو خاموش تھوڑا ہی رہے گا۔“
 ”بہت شکریہ دادی جان! آپ کی اجازت پا کر بات شروع کرتا ہوں۔“
 ”تو بات یہ ہوئی دوستو کہ ڈاکٹر نے دادی سے پوچھا کہ اماں جی آپ نے ایسا کون سا مشقت والا کام کیا تھا جس کی وجہ سے آپ کا عمر رسیدہ وجود دہائیاں دے رہا ہے؟
 تو دادی نے جواب دیا۔ بیٹا مشقت والا تو کوئی کام نہیں کیا سوائے نہانے کے۔
 نہانے سے اتنی تھکاوٹ۔ ڈاکٹر بڑا حیران ہوا۔
 ڈاکٹر صاحب، دادی ہاتھ روم میں تھوڑا نہائی تھیں، یہ تو ٹیوب ویل پر نہائی تھیں اور وہ بھی ٹیوب ویل کی منڈیر پر چڑھ کر پورے جوش سے پانی میں پھلانگیں مارتے ہوئے۔
 ڈاکٹر کی حیرانگی دو چند ہو گئی۔

اماں جی اس عمر میں بھی اتنا جوش اور زندہ دلی، بہت خوب۔ ڈاکٹر یہ کہہ کر مسکرانے لگا اور دادی غصے سے مجھے گھورنے لگیں۔ اب میرا تو یہ فرض بنتا تھا نا کہ ڈاکٹر کی کنفیوژن دور کرتا۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اور دکیل سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!“
 بالکل..... ہم سب یک زبان ہو کر بولے تو نانی لیٹ گئیں اور چہرے پر چادر ڈال لی۔ جوان کے خراب موڈ کی دلیل تھا۔

”تو کیا اتنی سی بات پر ڈاکٹر کے دماغ کا دلیہ ہو گیا۔“ مہوش نے معصومیت سے پوچھا۔
 ”اس سے آگے بھی تو سنو۔ ابھی بات ختم کہاں ہوئی ہے۔ پھر ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے دادی سے ان کی عمر پوچھی۔ بس پھر کیا تھا۔ دادی سوچ میں پڑ گئیں۔

اماں جی میں نے کون سا ایسا مشکل سوال پوچھ لیا۔ عمر ہی تو پوچھی ہے۔
 ہاں وہی تو یاد کر رہی ہوں۔ دادی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔
 یاد کر رہی ہیں، کیا مطلب؟

بھئی میری نواسی نے مجھے میری عمر بتائی تو تھی۔ اب یاد نہیں آرہی۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد دادی جوش سے بولیں۔ ہاں یاد آگئی۔ میری عمر ہے ستر سال۔

ستر سال..... ڈاکٹر بڑا حیران ہوا۔

ستر سال نہیں، سٹ سٹ سال۔ دادی نے توضیح کی۔

سٹ سٹ سال..... معاف کیجئے گا اماں جی میں سمجھ نہیں سکا۔ ڈاکٹر بے چارے کی حالت دیکھنے والی تھی۔
 اگر تم سمجھ نہیں سکتے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ دادی ہمت سے اکھڑ گئیں۔

چلیں اماں جی، اندازے سے بتادیں۔ وہ بے چارہ گڑ گڑایا۔
چل پھر کچھ بھی لکھ لے۔ دادی نے حکم دیا۔
کچھ بھی..... کچھ بھی کتنی؟
یہی کوئی چالیس پینتالیس لکھ لے اور کتنی لکھنی ہے۔
ڈاکٹر کے ہاتھ سے قلم گر گیا۔

اماں جی پینتالیس سال تو میری عمر ہے۔ اس نے احتجاج کیا اور نیچے جھک کر پینسل اٹھائی۔
لے بھائی ڈاکٹر، اگر تیری عمر پینتالیس سال ہے تو تو مجھے کس حساب سے اتنی دیر سے اماں جی کہہ رہا ہے۔
دادی نے جارحانہ انداز اختیار کیا تو ڈاکٹر کی بولتی بند ہو گئی۔ وہ بے چارہ ہکلا نے لگا۔
اماں..... جی..... جی

نہ کیا اماں جی، اماں جی لگا رکھا ہے۔ میری عمر کا ہو کر مجھے اماں جی کہہ رہا ہے۔ کوئی خدا کا خوف ہے تجھے کہ
نہیں۔ یہ تو میرے بال وقت سے پہلے سفید ہو گئے اور میں اپنی عمر سے بڑی دکھنے لگی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میرے ہم
عمر مجھے اماں، اماں کہنے لگیں۔

غلطی ہو گئی اماں جی، معاف کر دیں۔ ڈاکٹر روہانسا ہو رہا تھا اور میرے لیے ہنسی کو روکے رکھنا بہت مشکل ہو رہا
تھا۔ اس وقت بے چارے ڈاکٹر پر مجھے بڑا ترس آرہا تھا۔
ڈاکٹر نے فوراً نسخہ لکھا، دوائی بنائی اور پھر دوائی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے ضروری ہدایات دینے لگا۔ بعد
میں ڈاکٹر نے پوچھا۔

آپ ان کے بیٹے ہیں؟

نہیں، میں ان کا بیٹا نہیں پوتا ہوں۔ میں نے بڑے سکون سے جواب دیا تو ڈاکٹر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس
نے بڑے شکایتی انداز میں دادی کی طرف دیکھا مگر دادی کی ڈھٹائی تو قابلِ تعریف تھی۔ وہ بجائے شرمندہ ہونے کے اکڑ
کر بولیں کہ آئندہ اپنی عمر کو مد نظر رکھ کر کسی خاتون کو مخاطب کرنا۔ سمجھے.....

جی سمجھ گیا۔ اس نے پسپائی میں ہی اپنی عافیت جانی اور میں دادی کو گھر لاتے ہوئے راستہ بھر ہنستا ہی آیا ہوں۔
اپنی بات ختم کر کے غفار پھر بے تحاشا ہنسنے لگا، مگر اب اس کی ہنسی میں ہم سب کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔ نانی نے کروٹ
بدل کر ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا اور ہم ڈرتے ہوئے چپ ہو گئے۔

☆.....

اگلے دن نانی کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ وہ سارا دن ہمارے ساتھ چپکیتی رہیں۔

رات کے کھانے کے بعد کھلی چھت پر چار پائیوں پر خوب محفل جمی۔ امی، ابو، ماموں اور ممانی تو نیچے صحن میں
ڈیرہ جمائے بیٹھے رہے، جبکہ ہماری چنڈال چوکرزی بیچ اپنے پورے ممبران کے چھت پر چلی گئی اور ہماری ٹیم کا سب سے
اہم رکن یعنی نانی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم سبھی گول دائرے میں بیٹھے شور مچا رہے تھے۔ ڈیسا نہ نہیں ہو پارہا تھا کہ کیا کھلیا
جائے۔ جبار اس وقت بھی اپنے کمرے میں گھسا میوزک سن رہا تھا۔

”کیوں نا آج ہنسنے ہنسانے والا کھیل کھیلا جائے۔“ بلال بھائی بولے۔

”چلیں ٹھیک ہے۔“ سب اس کھیل پر متفق ہو گئے۔ اس کھیل میں کسی ایک فریق نے مضحکہ خیز شکلیں بنا کر باقی

لوگوں کو ہنسانا ہوتا ہے۔ اگر دوسرے نہ ہنسیں تو وہ فریق ناکام اور اگر وہ دوسروں کو ہنسانے میں کامیاب ہو جائے تو وزر۔

سب سے پہلی باری بلال بھائی کے حصے میں آئی۔ انہوں نے بہت کوشش کی ہنسانے کی مگر سب نے اپنے منہ سختی

سے بھیج رکھے تھے۔ ان کی فضول حرکات پر کوئی بھی نہ ہنسا۔ اس کے بعد میری باری آئی مگر میں بھی سوائے خود ہنسنے کے اور کسی

کو نہ ہنسا سکی۔ میرے بعد غفار کی باری آئی۔ اس نے بندروں جیسی حرکات اور شکلیں بنانی شروع کر دیں، جس پر سب کا ہنس

ہنس کر برا حال ہو گیا۔ غفار نے سب کو بہت انٹرٹین کیا۔ اس کے بعد نانی کی باری تھی۔ ہنسی کا طوفان تھا تو سب پر شوق

نظروں سے نانی کو دیکھنے لگے۔ نانی کے چہرے پر اس وقت گہری سنجیدگی طاری تھی۔ ہم سب پر تجسس نظروں سے نانی کو دیکھ

رہے تھے کہ وہ ہنسانے کے لیے بھلا کیا کریں گی۔

چند منٹوں کی گہری خاموشی کے بعد نانی نے سامنے والے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے منہ کھولا اور بلند آواز

سے جنوں اور بھوتوں کی طرح قہقہے لگانے لگیں۔ نانی کے سامنے والے دانت گر چکے تھے۔ دونوں کناروں پر دو بڑے

بڑے نوکیلے دانت رہ گئے تھے۔ ان لمبے اور نوکیلے دانتوں کو دکھاتے ہوئے جب نانی نے مکروہ آواز میں قہقہہ بلند کیا تو ہم

سب مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ نانی اس وقت بہت مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔ غفار تو ہنستے ہوئے چار پائی سے نیچے

گر گیا۔ میری بھی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

”نانی بس کریں، خدا کے لیے بس کریں۔ کتنا ہنسائیں گی۔“ نانی نے ہماری پر زور فرمائش پر اپنا منہ بند کر لیا اور

فاتحانہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگیں۔

”آج کی وز میں ہوں۔“ نانی نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔

”ہرگز نہیں۔“ غفار نے اعتراض کیا۔ ”وز میں ہوں۔ دادی نے چینگ کی ہے۔“

”وہ کیا ہوتی ہے؟“ نانی سمجھ نہ سکیں۔

”نانی چینگ کا مطلب ہوتا ہے، بے ایمانی۔“ بلال بھائی نے وضاحت کی تو نانی کی تیوریوں پر پل پڑ گئے۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کم بخت مجھے بے ایمان کہہ رہا ہے۔ ٹھہر جا ذرا میں اس کو سبق سکھاؤں ذرا۔“ نانی

جوتا اٹھانے کے لیے جھکیں تو غفار نے شور مچایا۔ ”دادی ایک منٹ میری بات تو سنیں۔“

”ہاں سناؤ۔“ نانی جوتا ہاتھ میں پکڑے پکڑے بولیں۔

”دادی آپ نے ہمیں ہنسانے کے لیے غلط طریقہ چنا ہے۔“

”مطلب۔“ نانی تنک کر بولیں۔

”مطلب یہ کہ آپ نے ہمیں جوتا ہنسایا ہے اس میں آپ کا کوئی کمال نہیں۔“

”تو پھر کس کا کمال ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔“

”آپ کے ان لمبے لمبے ڈر کیولا جیسے دانتوں کا۔“

”اب یہ کون ہے؟“

”کون..... کون ہے؟“

”یہ جس کی تُو نے مثال دی ہے، ڈرا کولا۔“

”ڈرا..... کولا..... یہ..... یہ انگریزی فلموں کا بڑا مشہور اور خوبصورت ہیرو ہے۔“ غفار کی وضاحت سے ہم

سب ہنسنے لگے۔

ہمیں ہنستا دیکھ کر نانی شک میں پڑ گئیں۔ ”اس ہیرو کی کوئی فلم مجھے بھی دکھاؤ۔ ذرا میں بھی دیکھوں کتنا

خوبصورت ہے۔“

”کیوں نہیں نانی جان، اگر آپ ڈریکولا کی فلم دیکھنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو ابھی دکھا دیتا ہوں۔“ بلال بھائی

نے فوراً پیشکش کی۔

”ابھی کہاں سے دکھائے گا یار! کل میں شہر سے لا کر دای کو دکھا دوں گا۔“ غفار بوکھلاتے ہوئے بولا۔

”اوئے یار! تجھے یاد نہیں، ابھی رات کو ہی تو ڈریکولا کی فلم دیکھ کر سوئے تھے۔ ابھی فلم وہیں وی سی آر کے پاس

پڑی ہوئی ہے۔ چلیں انھیں نانی سب نیچے چل کر فلم دیکھتے ہیں۔ ویسے بھی ابھی کون سی رات گزر گئی ہے۔ کل صبح تو ہم نے

چلے جانا ہے۔ آج خوب انجوائے کریں گے۔“ بلال بھائی کے ساتھ ہی ہم سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ غفار، بلال بھائی

کو ایسے گھور رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔ وہ بھی مرے مرے قدموں سے ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگا۔

جب ہم صحن سے گذر کر ممانی کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو وہاں بیٹھے لوگ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔

”بھئی اب کہاں کا ارادہ ہے؟“ ابو حیرت سے بولے۔

”ابو! اب ہم فلم دیکھیں گے اور وہ بھی ڈریکولا کی۔“ بلال بولا۔

”فلم اور وہ بھی ڈریکولا کی.....“ ابو بہت حیران ہوئے۔

”جی ابو، نانی جان کو بہت شوق ہے ڈریکولا دیکھنے کا۔ سوچا انہیں ذرا دکھا ہی دوں۔“

”اماں! ہوش کے ناخن لو، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ اب کے ماموں بولے۔

”کیا ہو گیا ہے مجھے۔“ نانی ہاتھ نچا کر بولیں۔ ”اپنے پوتوں اور نواسوں کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنا جرم ہے کیا۔“

”اماں! ڈریکولا کی فلم دیکھنے کی کیا ضرورت آپڑی آپ کو؟“

”میری مرضی، میں جو چاہے دیکھوں تمہیں اس سے کیا۔“ ہمارا قافلہ آگے بڑھ گیا تو میرے کانوں میں پیچھے

سے ماموں کی آواز پڑی۔

”گلتا ہے اماں کا ذہنی توازن درست نہیں رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچوں جیسی حرکات کرنے

لگی ہیں۔“

”بھائی جان! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اماں کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ بس بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی

ہیں۔“ امی نے جواب دیا۔

”اور بچہ بھی سب سے چھوٹا۔“ ماموں جل کر بولے تو ابو نے قہقہہ لگایا۔

میں ان کی باتیں سن کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

ماموں کے کمرے میں ٹی وی ٹرائی کے اندر وی سی آر رکھا تھا۔ اس زمانے میں وی سی آر پر فلم دیکھی جاتی تھی جو ایک بڑی کیسٹ کی شکل میں ہوتی تھی۔ ہم سب یعنی میں، نانی اور مہوش بیڈ پر براہمان ہو گئے۔ جبکہ بلال بھائی فلم لگانے میں مصروف ہو گئے۔ غفار کرسی پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

جب فلم اسٹارٹ ہوئی تو بلال بھائی بھی ہم لوگوں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ کمرے کی لائٹ بجھا کر اندھرا کر دیا گیا۔ جب فلم کے ابتدائی مناظر شروع ہوئے تو غفار اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ذرا واش روم سے ہو کر آیا۔“ وہ چلا گیا تو ہم سب پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فلم کا خوب دھیر دھیر دھیر چلتا پھر تا نظر آ رہا تھا۔

”یہ ڈرا کولا ہے؟“ نانی نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”نہیں نانی، یہ ڈریکولا نہیں ہے۔ جب آئے گا آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔“

پھر کچھ دیر بعد ڈریکولا کو دکھایا گیا جو ایک حسین و جمیل لڑکی کے گلے میں دانت گاڑھے اس کا خون پی رہا تھا۔ یہ کراہت انگیز منظر دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”ارے بیٹا، اس کو بند کر دو۔ میرا دل تو پہلے ہی بڑا کمزور ہے۔“ نانی نے کلیجہ تھامتے ہوئے کمزوری آواز نکالی۔

”نانی، اچھی طرح دیکھ لو۔ یہی تو ڈریکولا ہے۔“ بلال بھائی جوش سے بولے تو نانی کے سر پر گویا پہاڑ آ پڑا۔

”کیا..... یہ ڈرا کولا ہے۔“

”ہاں..... جی.....“

”کیا میری شکل ایسی ہے؟“ نانی کی حالت اس وقت بڑی قابلِ رحم تھی۔

”شکل نہیں نانی، دانت۔“

”کیا تم بھی.....“ نانی نے بلال بھائی کی طرف دیکھا تو وہ ڈر گئے۔ ”نانی یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ غفار نے کہا تھا۔“

بلال بھائی نے اٹھ کر ٹی وی بند کیا اور ہم دونوں بہنوں نے بھی نانی کو تسلی بخشی دی کہ غفار نے یہ سب یقیناً مذاق میں کہا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد نانی نے خود کو سنبھال لیا اور کمرے میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

”نانی، کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی ایسی چیز جس سے میں اس کی مرمت کر سکوں۔“ اور آخر وہ چیز نانی نے ڈھونڈ ہی نکالی۔ یہ ایک گز بھر لمبا مضبوط ڈنڈا تھا جو نانی نے ماموں کے بیڈ کے نیچے سے برآمد کیا تھا۔

”نانی اس سے زیادہ چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔“ ڈنڈا دیکھ کر بلال بھائی بھی فکر مند ہو گئے۔

”آج میں اس کا دماغ درست کر دوں گی۔ اس نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے۔ ناخوار کہیں کا۔“ نانی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ پھر جب نانی ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے باہر نکلیں تو سب حیران ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

”کہاں ہے تمہارا لاڈلا؟“ نانی نے ماموں کو مخاطب کیا۔

”کون..... غفار.....“ ماموں بڑی جلدی سمجھ گئے۔

”ہاں ہاں، وہی مکینہ۔ آج میں اس کو چھوڑوں گی نہیں۔“

”آج کیا کر دیا ہے اس نے؟“ ماموں پریشان ہو گئے۔

”آج تو وہ بد تمیزی کی ساری حدیں پھلانگ گیا۔“

”ہوا کیا ہے؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔“

”اس نے آج مجھے ڈرا کولا کہا تھا۔“

”ڈرا کولا....“ ماموں شش و پنج میں پڑ گئے۔ پھر بلال نے آگے بڑھ کر ساری روئید اسنادی۔ سن کر کبھی ہنسنے لگے۔ مگر دبی آواز میں نانی کے ڈر کی وجہ سے۔

”نانی، آپ یہاں سکون سے بیٹھیں۔ میں مجرم کو ڈھونڈ کر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔“ بلال بھائی نے نانی

کو بازو سے پکڑ کر چار پائی پر بٹھادیا۔ نانی نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا پاس رکھ لیا۔

اب بلال بھائی نے سارے کمرے بمع واش روم چیک کیے۔ اتنی دیر تک امی، ابو اور ماموں نے نانی کو خاصی

حد تک ٹھنڈا کر دیا تھا۔ بالآخر بلال بھائی غفار کو چھت سے پکڑ کر نیچے لائے۔ غفار نے نانی کے سامنے آتے ہی ہاتھ جوڑ کر

نانی سے معافی مانگ لی۔ نانی نے بھی تھوڑی لعن طعن کر کے معاف کر دیا۔ اس سے اگلی صبح ہم نے ناشتہ کر کے رخت سفر

باندھ لیا۔ نانی نے میرا ہاتھ جو کم کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ماموں اور ممانی نے بھی بڑے والہانہ انداز میں ہمیں خصوصاً مجھے

رخصت کیا۔ غفار نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں الوداع کہا اور اس ایک مہینے کی یادیں میری یادداشت کی ڈائری میں

ہمیشہ کے لیے رقم ہو گئیں۔



گھر آنے کے بعد زندگی پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آئی۔ میٹرک کا رزلٹ حسب توقع بہت شاندار آیا تھا۔ میں نے

فرسٹ ڈویژن میں امتیازی نمبر لے کر کامیابی حاصل کی تھی۔ ابو میری کامیابی پر پھولے نہ مارا ہے تھے۔

شہر کے پہلے ترین کالج میں میرا ایڈمیشن کرایا گیا۔ میں نے اپنے شوق کے پیش نظر فائن آرٹس رکھی۔ مہوش بھی

اب آٹھویں کلاس میں پہنچ گئی تھی جبکہ بلال بھائی بھی روپیٹ کر بی اے کلیئر کر چکے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھنے سے

صاف انکار کر دیا تھا۔ اب وہ ابو کے ساتھ کاروبار دیکھتے تھے۔

بلال بھائی بی اے کرنے کے باوجود وہی روایتی چودھری تھے۔ کلف زدہ شلووار قمیص کے ساتھ بڑی بڑی

موغھیں پال رکھی تھیں، جنہیں وہ وقتاً فوقتاً دو دیتے رہتے تھے۔ بلکہ وہ ابو سے بھی زیادہ دقیقہ نوسی اور روایت پسند تھے۔

لڑکیوں کی آزادی اور تعلیم دونوں انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ میرے آگے بڑھنے اور کالج جانے پر بھی انہوں نے بہت

واویلا مچایا تھا۔ ان کی سوچ کے مطابق لڑکی کے لیے اتنی تعلیم کافی ہوتی ہے، مگر ابو کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ کیونکہ ابو

میری کوئی خواہش رد کر ہی نہیں سکتے تھے۔

ستمبر کے وسط میں میری پڑھائی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ ابو نے میرے لیے نئی گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کر

دیا۔ مہوش بھی اب میرے ساتھ گاڑی میں سکول جاتی اور واپسی میں ہمارے ساتھ ہی آتی۔ اس سے پہلے ہم لوگ رکشہ پر

سکول جاتی تھیں۔ رکشہ بھی پرائیویٹ تھا صرف ہمیں لے کر جاتا اور واپس لاتا تھا۔

کالج لائف میرے لیے بالکل ایک نئی چیز تھی۔ تھا تو وہ گرلز کالج، مگر لڑکیوں کا بے باک انداز میں باتیں کرنا، ایک دوسرے پر آوازے کسنا، کھلے ڈالے انداز میں لڑکوں کو لے کر یا پھر فلمی سپر اسٹارز پر کمٹس کرنا، مجھے بہت اٹریکٹ کرتا۔ جب میری فرینڈز اپنے کزنز کے حوالے سے دلچسپ واقعات خوب چٹخارے لے کر بیان کرتیں تو مجھے بیساختہ غفار یاد آ جاتا۔ اس کی بے باکیاں اور شوخیاں یاد آ جاتیں۔ مگر میں نے یہ یادیں کبھی کسی سے شیئر نہیں کیں۔ ہمیشہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھیں۔ پتا نہیں نانی نے ماموں اور ممانی سے میرے اور غفار کے رشتے کے متعلق بات کی ہے یا نہیں۔ یہ خیال اکثر مجھے ستاتا تو پھر میں خود کو خود ہی سرزنش کرتی کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ مجھے بہت سارا پڑھ کر کچھ بننا ہے۔ اپنے ابو کا نام روشن کرنا ہے۔ ایک دن میں آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کروں گی۔ لوگ میرا نام لے کر کہیں گے کہ یہ نورین فلک ناز ہے، چودھری زمان کی بیٹی۔ لوگوں کی زبان سے میری تعریفیں سن کر ابو کا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔ پھر کہیں جا کر میں شادی کے بارے میں سوچوں گی۔ اگر غفار اتنا انتظار کر سکتا ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں اور اگر اسے جلدی ہے تو کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لے۔ میرے پاس ابھی بالکل بھی دقت نہیں ہے شادی جیسے جھنجھٹ کو پالنے کا۔ میں من ہی من میں اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی اور پھر اپنی دیوانگی پر خود ہی ہنس دیتی۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ نانی ہر مہینے دو مہینے بعد آتیں، دودن رہتیں اور چلی جاتیں۔ ان کی زبانی ماموں کے گھریلو حالات پتا چلتے رہتے۔ ان کی زبانی یہ پتا چلا کہ جبار بھائی کی منگنی پکی ہو گئی ہے۔ ماموں اور ممانی جا کر ڈائمنڈ کی رنگ شبنم کو پہنا آئے ہیں اور ٹھیک چھ ماہ بعد شادی بھی طے پا گئی ہے۔

”بے چارے جبار بھائی کی بھی بالآخر سنی گئی۔“ میں نے نانی سے کہا تو نانی مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”ہاں جبار کی شادی کے فوراً بعد غفار کی منگنی کر دیں گے۔“

”اچھا جی۔“ میں مصنوعی حیرت سے بولی۔ ”اچھی بات ہے، کیا لڑکی دیکھ لی ہے؟“

”ہاں، دیکھ لی ہے بلکہ کب کی دیکھ لی ہے۔“ نانی میری طرف دیکھ کر شرارت سے بولیں۔

”نانی! میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ پلیز آپ کوئی اور لڑکی دیکھ لیں۔“

”نورین! تم اپنی نانی کی اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔“ نانی افسردگی سے بولیں۔

”اتنی سی خواہش..... نانی جسے آپ اتنی سی خواہش کہہ رہی ہیں، وہ میرے لئے پوری زندگی کا سوال ہے۔“

”تو تمہاری زندگی کو کون سا خطرہ لاحق ہو جانا ہے غفار سے شادی کر کے۔“ نانی تنک کر بولیں تو میری ہنسی

چھوٹ گئی۔

”میری پیاری نانی جان! ابھی خاصا وقت پڑا ہے۔ اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تو جبار بھائی کی

شادی کی خوشی انجوائے کرنے دیں۔ ہمارے فرسٹ کزنز میں سے سب سے پہلے کزن کی شادی آرہی ہے۔ خوب ہنگامہ

کریں گے۔“ میں جوش سے بولی تو نانی بھی سپنوں میں کھو گئیں۔

”ہاں ہاں، تمہیں تو میں پندرہ، بیس دن پہلے ہی لے جاؤں گی۔ ہر روز شام کو ڈھولک رکھیں گے۔ ٹپے گا میں

گے۔ گداڑا لیں گے۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ میں مارے خوشی کے نانی سے لپٹ گئی۔ ایسی ہی تھی میری نانی..... جو نانی کم اور سہیلی

زیادہ تھی۔



آنے والے دن ہمارے لیے بہت تبدیلی اور ہنگامہ لے کر آئے۔ ابو اور امی نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے بلال بھائی کے لیے چچا غفور کی بیٹی صائمہ کا ہاتھ مانگنے کا فیصلہ کر لیا۔ امی نے جب ہم دونوں بہنوں کو اپنا اور ابو کا فیصلہ سنایا تو ہم دونوں دنگ رہ گئیں۔

بے شک صائمہ ہماری کزن اور سہیلی ہونے کے ناطے ہمیں بہت عزیز تھی، مگر وہ کسی بھی طور بلال بھائی کے قابل نہ تھی۔ خوب گورے چٹے اور دہنگ پر سٹائی کے مالک بلال بھائی کے سامنے سانولی سلونی اور دھان پان سی صائمہ بالکل بے جوتھی۔ وہ تو ویسے بھی بلال بھائی کے سامنے بالکل بھج جاتی تھی۔

”امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ بلال بھائی اور صائمہ کا بھلا کیا جوڑ؟“ میں نے احتجاج کیا۔

”تمہارے ابو کا اٹل فیصلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اتنی زرعی اراضی لوگوں کے گھر ہرگز نہ جانے دیں گے۔“

”بڑا دکھ پہنچا ہے مجھے ابو کی سوچ جان کر۔ چند ایک زرعی اراضی کی خاطر بلال بھائی کو قربان کر دیں گے، اپنے اکلوتے بیٹے کو۔“ میں رو ہانسی ہو رہی تھی، مگر امی اور مہوش کو کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

”امی یہ نہ صرف بلال بھائی کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ صائمہ کے ساتھ بھی ظلم ہے۔ وہ بلال بھائی کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ بے چاری تو شاید ساری زندگی بلال بھائی کے سامنے اونچی آواز میں بول بھی نہ سکے۔“

”تو اچھی بات ہے نا! ساری عمر دب کر رہے گی۔“ امی نے بڑی آسانی سے کہہ دیا۔

”آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ میں شام کو ابو سے خود بات کر دوں گی۔“

”ہاں ہاں، کر لینا۔ گھر کی بڑی بوڑھی تم ہی تو ہو۔ اب شادی بیاہ کے فیصلے تم ہی تو کرو گی۔“

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ رات کا کھانا کھا کر ابو ڈرائنگ روم میں چلے گئے، جو ان کا اسٹڈی روم بھی تھا۔ وہ سونے سے پہلے ایک گھنٹہ مطالعہ کرتے تھے پھر بیڈ روم میں آتے تھے۔ میں دس پندرہ منٹ بعد ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ وہ اس وقت ایزی چیئر پر بیٹھے کسی تاریخی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجھے اپنے پاس کھڑا دیکھ کر میری طرف استفہامی نظروں سے دیکھنے لگے۔

”ابا جان! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہوں..... بیٹھو.....“ انہوں نے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

”ہاں تو کہیے نو رچشم۔“ ابو بڑے خوشگوار موڈ میں نظر آرہے تھے۔

”ابو..... میں نے..... امی سے سنا ہے کہ آپ بلال بھائی کی مٹگنی کرنے جارہے ہیں۔“

”ہاں بیٹا جان، آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں، مجھے مٹگنی پر تو کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ صائمہ کے ساتھ بلال بھائی کی مٹگنی پر ضرور اعتراض ہے۔“

”وہ کیوں بھلا؟“ ابو یکدم سنجیدہ ہو گئے۔

”ابو! آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک بے جوڑ شادی ہے۔ نہ صرف دیکھنے میں بلکہ ذہنی طور پر بھی دونوں ایک دوسرے سے بالکل ہٹ کر ہیں۔“

”جہاں تک دیکھنے کی بات ہے۔ میں ظاہری شکل و صورت کو زیادہ اہمیت دینے کا قائل نہیں۔ انسان کی سیرت اچھی ہو تو صورت خود بخود اچھی لگنے لگتی ہے اور جہاں تک بات ذہنی ہم آہنگی کی ہے تو صائمہ ایک نخل مزاج اور بردبار قسم کی لڑکی ہے۔ ہر قسم کے حالات سے سمجھوتہ کر لے گی۔“ ابو نے بڑی آسانی سے جواب دے دیا۔

”مگر ابو، کیا یہ صائمہ کے ساتھ زیادتی نہیں کہ اسے سمجھوتے کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔“

”نورین! کیا یہ تمہاری عادت بن گئی ہے کہ ہر بات پر وکیلوں کی طرح بحث کرنے لگتی ہو۔“ ابو نے ذرا سخت لہجے میں جواب دیا تو میں بھی تھکے سے اکھڑ گئی۔

”آپ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ جائیداد کے لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ آپ کو صائمہ نہیں اس کی اراضی نظر آرہی ہے۔“

”نورین..... چپ ہو جاؤ..... اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ ابو دھاڑے تو میں چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی۔ مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ابو مجھ سے کبھی اس لہجے میں بھی بات کر سکتے ہیں۔

میں اٹھی اور دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر کے بے تحاشا روٹی۔ دوسرے دن غصے سے کالج بھی نہیں گئی۔ سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہی۔ امی نے دو تین مرتبہ کھانے کے لیے پوچھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ بالآخر ابوبتک میری ناراضگی کی اطلاع پہنچ گئی۔ وہ مجھے منانے کے لیے میرے کمرے میں آئے۔

میں بال کھڑائے، گھٹنوں میں منہ دیئے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ابو میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ ابو کی اپنائیت دیکھ کر میری آنکھوں سے پھر سے آنسو بہنے لگے۔

”اتنا غصہ..... باپ رے.....“ ابو نے چکارا۔ ”میری بیٹی اتنی غصیلی ہے اس بات سے تو میں بھی بے خبر تھا۔ چلو اٹھو اب ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو۔ تمہاری امی بتا رہی تھیں کہ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

میں چپ چاپ سر جھکائے روتی چلی گئی۔

”بیٹا! اب اٹھ بھی جاؤ۔ کیا اپنے ابو کا کہنا نہیں مانو گی۔ آئی ایم سوری جان۔ بس غصہ آ گیا تھا۔“

”ابو! مجھے ایک بات کا جواب دیں گے۔“ میں نے ہیگلی آواز میں پوچھا۔

”ہاں ہاں، پوچھو بیٹا۔“

”کل کو آپ مجھے بھی مصلحتوں کی بھیٹ پڑھا دیں گے۔ میری خوشی جانے بغیر صرف مادی فوائد کو ترجیح دیں

گے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو نورین؟ مجھے تمہاری خوشی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوگی۔ تم حد سے زیادہ حساس ہو۔ ہر

بات دل پر لگ لیتی ہو۔ چلو اٹھو کھانا کھاؤ۔“

”ابو! آپ نے بلال بھائی سے ان کی رائے معلوم کی ہے۔“

”ہاں کی ہے۔“ ابو نے قطعی لہجے میں جواب دیا تو میں حیران رہ گئی۔

”چلو اب اٹھ بھی جاؤ، پھر سے بحث و تکرار شروع کر دی ہے۔“
میں اٹھتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ بلال بھائی کیسے مان گئے۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا اور دوپہر کا کھانا کھایا اور
پھر سے کمرے میں پناہ گزین ہو گئی۔ شام تک اسی موضوع پر سوچتی رہی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بلال بھائی آخر کیوں
مان گئے۔ وہ تو مرد تھے با اختیار تھے، آسانی سے انکار کر سکتے تھے۔ یقیناً جائیداد کے لالچ میں مان گئے ہوں گے۔ سچ ہے
دولت میں بڑی کشش ہوتی ہے۔



اگلے دن امی، ابو نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے عملی قدم اٹھالیا۔ یعنی وہ دونوں باقاعدہ صائمہ کا رشتہ
پوچھنے کے لیے چچا کے گاؤں بلکہ ہمارے آبائی گاؤں چلے گئے۔ امی، ابو ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں گئے تھے۔ ان کی
والہی یقیناً رات گئے ہوتی۔ ہمارے ہاں یہی رواج تھا۔ صرف گھر کے ایک دو افراد رشتہ پوچھنے کے لیے جاتے۔ ہاں ہو
جاتی تو بعد میں اگر کوئی چاہتا تو دھوم دھڑکے سے منگنی کی جاتی اور اگر کوئی نہ چاہتا تو اسی ہاں پر اکٹفا کیا جاتا۔ بنیادی چیز تو
زبان سے نکلے ہوئے الفاظ گردانے جاتے اور ہمارے خاندان میں منگنی کو آدھا نکاح سمجھا جاتا تھا۔ منگنی توڑنے کا کوئی
تصور موجود نہ تھا۔

آج ہم تینوں بہن بھائی نے رات کا کھانا کھایا اور پھر ٹی وی دیکھنے لگے۔

”بلال بھائی.....“ میں نے بلال بھائی کو مخاطب کیا۔

”ہونہ.....“ وہ ریہٹ سے چینل بدلتے ہوئے بولے۔

”امی، ابو آپ کی منگنی کرنے گئے ہیں۔ آپ کو اس بات کا پتا ہے نا!“

”ہاں، پتا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔

”آپ کو..... اس رشتے..... پر کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو.....“

ان کو پرسکون دیکھ کر میں بھی خاموش ہو گئی۔ مزید کوئی بات کہنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔

آخر نو ساڑھے نو بجے تک ابو اور امی بھی آ گئے۔ ان کے چہروں سے خوشی ہو رہی تھی۔ حسب توقع چچا چچی نے

بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی تھی۔ بلکہ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھے کہ انہیں بلال جیسا خوب رواماد ملا تھا۔ ڈرائیور نے ایک
مٹھائی کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی جو اس نے لاکر سینئرل ٹیبل پر رکھ دی۔ ڈرائیور ایک عمر رسیدہ شخص تھا جسے ہم بچے بشیر چچا کہتے
تھے۔ اس کا ہم سے کوئی پردہ نہ تھا۔ اسے گھر کے اندر آنے جانے کی کھلی اجازت تھی۔

”امی آپ مٹھائی لے کر گئے تھے۔“ میں نے مٹھائی کی ٹوکری کی طرف دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”ہم کیا پاگل تھے کے بغیر ہاں ہوئے ہی مٹھائی لے کر پہنچ جاتے۔“ امی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”یہ مٹھائی تو ہاں ہونے کے بعد بشیر کو شہر بھیج کر منگوائی تھی۔“ ابو نے خوشی خوشی بتایا۔

”پورا ایک من مٹھائی منگوائی تھی اور وہ بھی دیسی گھی والی مشہور دکان کی۔“ امی نے فخر سے بتایا۔

”تھیل پر کیا رکھا تھا۔“ بلال بھائی نے مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے پوچھا۔

”پورا ایک لاکھ۔“ امی جوش سے بولیں۔

”چچا، چچی خوش تھے نا۔“ بلال نے پھر پوچھا۔

”ہاں ہاں، بہت خوش تھے۔ ان دونوں کے تو پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔“

”اور دادا جان.....“ مہوش نے پوچھا۔

”دادا جان سے بڑھ کر بھلا اور کون خوش ہوگا۔ ان کے دونوں بیٹے اس رشتے کے ذریعے آپس میں اٹیچ ہو گئے

ہیں۔ ابا جان تو ویسے بھی ہماری پارٹی میں تھے۔ ہم نے پہلے انہیں ساتھ ملایا اور پھر بات شروع کی تھی۔“ ابو نے تفصیل بتائی۔

”مہوش جاؤ، کوئی پلیٹ لاؤ۔ تھوڑی مٹھائی نکالو اور سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔“ امی نے مہوش کو حکم دیا تو وہ فٹ

سے پکن سے پلیٹ لے آئی۔ پھر اس نے مٹھائی والی پلیٹ سب کے آگے کی۔ سب نے منہ میٹھا کیا اور میں گلاب جامن اٹھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یقیناً کسی نے صائمہ سے اس کی رائے جاننے کی زحمت نہیں کی ہوگی۔ بے چاری صائمہ۔

☆.....

تھوڑے عرصہ بعد میں بھی اس ٹرانس سے باہر آ گئی۔ سب کچھ نارل بالکل پہلے جیسا ہو گیا۔ بہر حال اس واقعے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ابواتے روشن خیال اور براڈ مائنڈڈ نہیں ہیں، جتنا ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے اندر بھی ایک ہٹ دھرم اور روایت پسند چودھری چھپا بیٹھا ہے۔ وہ دنیا کے سامنے روشن خیال ہونے کا صرف ڈراما کرتے ہیں۔ میں نے اپنے من مندر میں ابو کی جو صورت بحیثیت ایک دیوتا کے سجا رکھی تھی، اس صورت میں دراڑیں سی پڑ گئی تھیں۔ دو تین ماہ بعد رمضان شروع ہو گیا۔ رمضان کا پہلا عشرہ گزرا تو عید الفطر کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ صائمہ کی منگنی کے بعد یہ اس کی پہلی عید تھی۔ اس لیے امی اور میں ہر دوسرے تیسرے دن بازار کے چکر لگانے لگیں۔ صائمہ کے لیے پانچ قیمتی کا مدار جوڑے، تین جوتے اور ایک سونے کا بھاری بھر کم نیکلس سیٹ خریدا گیا۔ دوسرے چھوٹے موٹے لوازمات اس کے علاوہ تھے۔

دوسرے عشرے کے اینڈ پر ہم سب بمع ساز و سامان کے گاؤں پہنچ گئے۔ اپنے آنے کی اطلاع ہم پہلے ہی فون پر دے چکے تھے۔ افطاری ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہی ہم پہنچے تھے۔ بلال بھائی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ صائمہ بچاری کی تو بلال بھائی کو دیکھ کر سنی گم ہو گئی۔ دوڑ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ ”لو بھلا گھر کے بچے ہیں، اب کیا ایک دوسرے سے پردہ کریں گے۔“ امی ہنستے ہوئے بولیں۔

”نہیں نہیں، پردہ کیوں کریں گے۔ یہ تو ہے ہی ایسی۔ میں ابھی اس کو باہر لاتی ہوں۔“ چاچی نے شہد گھلے لہجے میں جواب دیا۔ وہ ہم پر صدفے واری جا رہی تھیں۔ جو تھوڑی بہت عداوت ان کے دل میں تھی، وہ ان ہی رشتے داری سے ختم ہو گئی تھی۔

”رہنے دے صابرہ، کیوں زور زبردستی کرتی ہو۔ خود ہی باہر آ جائے گی۔ بچی ہے سنھلنے کے لیے وقت چاہیے۔“

ابا جان نے چاچی کو روک دیا تو وہ پھر سے بیٹھ گئیں۔

”نورین اور مہوش تم دونوں اندر بہن کے پاس چلی جاؤ۔“ ابا جان نے ہمیں حکم دیا تو ہم فوراً سے بھی پیشتر

صائمہ کے پاس پہنچ گئیں۔

صائمہ نے ہمیں دیکھتے ہی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔

”ارے ارے، کیا ہم سے بھی منہ چھپاؤ گی؟ بلال بھائی تو باہر بیٹھے ہیں۔ ہم دونوں اکیلی ہیں۔“ مہوش بڑی شوخ ہو رہی تھی۔

”صائمہ! یہ کیا پچپنا ہے۔ ہاتھ ہٹاؤ۔“ میں نے ذرا سختی سے کہا تو اس نے ہاتھ نیچے کر کے گود میں رکھ لیے۔

”اور اس طرح نظریں جھکائے کیوں بیٹھی ہو۔ ہماری طرف دیکھو۔ ہم سے باتیں کرو۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے کرتی تھیں۔ ہم تمہاری مندی نہیں، چچا زاد بہنیں ہیں، سمجھیں تم۔“ میں نے ایک ٹچر کی طرح لیکچر دے ڈالا۔ وہ بھی سعادت مند شاگرد کی طرح اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”کیوں بھئی، ہم مندی کیوں نہیں ہیں۔ یہ ہمارے بھائی کی ہونے والی بیوی ہے۔ اس لحاظ سے ہم اس کی مندی ہی ہوئی نا، کیوں بھابی جان!“ مہوش نے کندھے سے ٹھوکا مارا تو صائمہ پھر سے سمنے لگی۔

”مہوش! کیوں اسے پزل کر رہی ہو۔“ میں نے مہوش کو ڈانٹا۔

”پزل کر رہی ہوں، ہرگز نہیں۔ میں تو اپنی بھابی سے پھیٹر چھاڑ کر رہی ہوں اور یہ میرا حق ہے اور یہ حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ سمجھی تم..... بڑی آبی بی اماں۔“

”صائمہ! تم اس منگنی سے خوش ہونا۔“ میں نے پھر صائمہ سے پوچھا تو اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

”اس منگنی سے سب خوش ہیں سوائے تمہارے۔“ مہوش نے سیدھی مجھ پر چوٹ کی۔

”تم اپنا منہ بند رکھو۔“ میں بھی غصے میں آ گئی۔

”بائی داوے تمہیں اس منگنی پر اعتراض کیا ہے۔ ہر کسی کے پیچھے لٹھ لے کر پڑی ہو۔ اگر چچا کی بیٹی بھابی بن رہی ہے تو اتنا برا کیوں لگ رہا ہے۔“

مہوش کی باتیں سن کر میں سلگ اٹھی۔ ”بکو اس بند کرو۔ ورنہ.....“

”ورنہ کیا..... مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گی۔“ مہوش پھر کر بولی۔

اس سے پہلے کہ میں واقعی اس پر ہاتھ اٹھا دیتی، امی اندر آ گئیں۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے۔ تم لوگوں کا پچپنا آخر کب ختم ہوگا۔ تم دونوں بہنوں کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔ یہ تو شکر

کرو کہ تمہارے ابا اور بلال باہر نہیں ہیں، ورنہ ابھی تم دونوں کو سبق مل جاتا۔ جانتی ہونا کہ بلال غصے کا کتنا تیز ہے۔“

”امی یہ صائمہ کو لائی سیدھی پٹیاں پڑھا رہی تھی۔“ مہوش نے اتنا سنگین الزام مجھ پر لگایا تو میں بھی بھڑک اٹھی۔

”کیسی پٹیاں؟ میں تو بس منگنی میں اس کی رضامندی پوچھ رہی تھی۔“

”تم سے کس نے کہا ہے رضامندی پوچھنے کے لیے۔ یہ! ذہن میں رکھو کہ منگنی ہو چکی ہے۔ منگنی ہونے کے

بعد رضامندی پوچھنے کا مطلب..... اور تم کیا گھر کی بڑی بوڑھی ہو جو سب سے ان کی مرضی پوچھ رہی ہو۔“ امی کی توپ کا دہانہ میری طرف ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے بھی چپ میں عافیت جانی۔

ہمارے اس سارے جھگڑے میں کسی کا دھیان صائمہ کی طرف نہیں گیا، جو اس وقت کھڑی تھر تھر کانپ رہی

تھی۔ اس کا وجود اتنا ہی بے وقعت تھا کہ اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ امی نے پچکار کر صائمہ کو تسلی دی اور اسے پکڑ کر نرمی سے بٹھا دیا۔

”دیکھو تم دونوں بہنوں کی وجہ سے یہ بے چاری کتنا ڈر گئی ہے۔ اس کے پاس بیٹھو۔ اس کا دل بہلاؤ۔ خبردار اگر اب تم دونوں میں سے کسی کی آواز باہر آئی تو۔“ امی ہمیں وارننگ دیتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ امی کے جانے کے بعد چند منٹ خاموشی چھائی رہی پھر صائمہ نے لب کھولے۔ ”پلیز آپ دونوں اپنا موڈ ٹھیک کر لیں۔“

پھر مجھے صائمہ پر ترس آ گیا۔ میں جانتی تھی کہ ہم دونوں بہنوں کی لڑائی سے اسے سخت ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

”اچھا صائمہ، یہ بتاؤ آج کھانے میں کیا کیا بنایا ہے؟“

صائمہ خوشی خوشی کھانے کی تفصیل بتانے لگی۔ کھانے کا سن کر مہوش کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ وہ بھی باتوں میں حصہ لینے لگی۔ ویسے بھی ہماری لڑائی کا دورانیہ بہت کم ہوتا تھا۔ اگلے لمبے ہی ہم تینوں کسی بات پر توجہ لگا رہی تھیں۔ آپس کی رنجش ہوا ہو گئی تھی۔

”صائمہ! تم بلال بھائی کو دیکھ کر ڈر کیوں جاتی ہو؟“ میں نے صائمہ سے پوچھا تو وہ چپ ہو گئی۔

”صائمہ! تم دیکھو اگر تم اسی طرح سے ان سے ڈرتی رہی، جھپکتی رہی تو تمام عمر ان سے دب کر رہو گی۔ داسی بن کر خد متیں ہی کرتی رہو گی۔“

”تو پھر کیا کروں۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”پورے اعتماد کے ساتھ ان کے سامنے جایا کرو۔ خود پر مکمل یقین رکھتے ہوئے بات کیا کرو۔“

”یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو گا۔“ وہ سرانکار میں پھیرنے لگی۔

”کیوں نہیں ہو گا۔ تم ایک جیتی جاگتی انسان ہو۔ باعقل اور باشعور ہو۔ کسی بھی طور ان سے کمتر نہیں ہو۔“ میں

باقاعدہ دلیلیں دے دے کر اُسے قائل کر رہی تھی۔

”میں ہر لحاظ سے ان سے کمتر ہوں۔ یہ بات میں بھی جانتی ہوں اور آپ بھی۔“

”جب تک تمہارے دماغ سے یہ کمتری کا احساس نہیں نکلے گا۔ تم میں کبھی اعتماد نہیں پیدا ہو گا اور جب تک اعتماد

پیدا نہیں ہو گا تم کبھی مکمل عورت اور ایک آئیڈیل ماں نہیں بن سکتی۔“

”تم لگی رہو، کبھی نہ کبھی تمہاری باتیں شاید اس کے دماغ پر اثر کرنے لگیں اور یہ ایک مکمل عورت بن ہی

جائے۔“ مہوش نے طنز کا تیر چلایا تو میں اس کو گھورنے لگی۔

”چلو آؤ، باہر چلتے ہیں۔ دیکھتے ہیں امی اور چاچی کیا کر رہی ہیں۔ ان کی ہیلپ کرتے ہیں۔ روزہ افطار ہونے

میں صرف پونا گھنٹا رہ گیا ہے۔“ مہوش یہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

”چلو ہم بھی چلتے ہیں۔“ میں نے صائمہ کا ہاتھ پکڑا۔

”میں بھی.....“ وہ ہکلائی۔

”ہاں ہاں، تم بھی۔“ میں نے بازو سے پکڑ کر اسے کھینچا۔

”نورین! پلیز تم جاؤ۔ میں بھلا کیسے جاسکتی ہوں۔ باہر وہ بھی ہوں گے۔“

”کون؟ بلال بھائی..... وہ کوئی جن یا بھوت نہیں ہیں۔ ہماری طرح انسان ہی ہیں۔ چلو اٹھو۔“ میں نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ”اور ہاں، اُن کے سامنے پریشان بالکل نہیں ہونا اور نہ گھبراہٹ کا اظہار کرنا۔ ہر کام مکمل اعتماد اور یقین سے کرنا۔“

”اور اگر وہ میری طرف دیکھیں تو.....“

”دیکھنے دو..... تمہارا کیا جاتا ہے۔ بھی کسی کے دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں لگا سکتا نا اور ویسے مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے۔“

میں اسے کھینچتے ہوئے باہر لائی تو امی اور چاچی چارپائی پر بیٹھی سر جوڑے مستقبل کی کوئی پلاننگ کر رہی تھیں۔ شاید بلال اور صائمہ کی شادی کے متعلق۔

”چاچی! کیا کھانا تیار ہو گیا۔“ میں نے چاچی سے پوچھا۔

”ہاں، تقریباً سب کچھ تیار ہے۔ بس روٹیاں بنانی رہ گئی ہیں۔ وہ بھی یہ لڑکیاں جلدی ہی بنالیں گی۔ میں نے ہی منع کیا تھا کہ ابھی ٹھہر جاؤ، کافی وقت پڑا ہے۔“

”یہ دونوں لڑکیاں گاؤں کی ہی ہیں نا!“ میں نے پکن میں کھانا پکاتی لڑکیوں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان میں سے ایک لڑکی بہت خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت کہ میں پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ دوسری البتہ عام شکل و صورت کی مالک تھی۔

”دونوں گاؤں کی ہی ہیں۔ ایک تو صائمہ کی بڑی اچھی سہیلی اور ہماری رشتہ دار ہے۔ کنول ذرا باہر آؤ۔“ وہی خوبصورت اور دراز قد لڑکی لچکتی ہوئی باہر آئی۔ گرمی کی حدت سے اس کا سرخ و سفید چہرہ دہک رہا تھا۔

”کنول یہ تمہارے زمان چاچا کی بیٹیاں ہیں۔“

کنول نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کی طرح بڑی دلاؤ پر تھی۔

”کنول کا باپ تمہارے ابا کا سگا پھوپھو زاد بھائی تھا۔ کنول ایک سال کی تھی جب اس کی ماں بیٹھے سے مر گئی تھی۔ اس سے بڑا اس کا بھائی ہے۔ شیرا، کنول سے تین سال بڑا ہے۔ ان کی دادی نے یعنی تمہارے ابا کی پھوپھو نے انہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے۔“

”ابا کی پھوپھو تو میں نے دیکھی ہوئی ہیں۔ کئی مرتبہ ہمارے گھر بھی آچکی ہیں۔ کیا نام ہے اُن کا۔“ میں دماغ پر زور دینے لگی۔

”زینب۔“ امی نے فٹ سے جواب دیا۔

”اماں زینب، ہم سب پیار سے انہیں اماں زینب کہتے ہیں۔“ چاچی نے جواب دیا۔

”تو یہ اماں زینب کی پوتی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر کنول۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے گرم جوش سے کہا تو وہ مسکرائے لگی۔

”مجھے بھی آپ لوگوں سے مل کر بہت اچھا لگا۔“

”تم کیا کرتی ہو کنول؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”گھر کے کام کاج اور دادی کی دیکھ بھال کے علاوہ کچھ خاص نہیں۔“

”کیا پڑھتی نہیں ہو؟“

”آٹھویں تک پڑھی ہوں۔ اس کے بعد بھائی نے سکول جانے سے منع کر دیا۔“

”افوہ..... یہ ساری دنیا کے بھائی کیا ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔“

اتنے میں افطاری کا نام ہو گیا۔ بلال بھائی، ابوجان، چچا جان اور دادا جان سبھی مرد حضرات تشریف لے آئے۔ زمین پر ڈرائنگ روم میں دسترخوان بچھایا گیا تھا۔ ہم لڑکیاں بمع صائمہ اور کنول کے کھانے کا سامان لالا کر دسترخوان پر رکھ رہی تھیں۔ صائمہ میری ہدایات پر عمل کر کے خوب جی کڑا کر کے بلال بھائی کے سامنے آ جا رہی تھی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ بلال بھائی نے ایک مرتبہ صائمہ پر سرسری نظر ڈالی، اس کے بعد دوبارہ اس کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔ حالانکہ بے چاری آج خاصا اہتمام کر کے تیار ہوئی تھی۔

البتہ کنول، بلال بھائی کی نظروں کا محور و مرکز بنی رہی۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری اور پرکشش کہ کوئی بھی اسے دیکھتا تو دوبارہ ضرور دیکھتا۔ مگر بلال بھائی اسے کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مرد کی ان نظروں کو عورت فوراً پہچان جاتی ہے۔ عورت کی یہ حس فطری طور پر بہت تیز ہوتی ہے۔ کنول بھی بلال بھائی کی نظروں کی زبان سمجھ گئی تھی شاید۔ مگر اس کی خود اعتمادی اور اعتماد میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ بہت جرأت مند اور با اعتماد لڑکی تھی اور مجھے ایسی ہی عورتیں یا لڑکیاں پسند تھیں۔

روزہ افطار کرنے کے بعد مرد حضرات اور سینئر خواتین یعنی چاچی اور امی صحن میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ جبکہ ہم چاروں لڑکیاں چھت پر چڑھ گئیں۔ موسم خوب سہانا ہو رہا تھا۔ اکتوبر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم چاروں چار پائیوں پر بیٹھ گئیں۔

”ہاں تو کنول تم اتنی بے باک اور نڈر لڑکی ہو۔ صائمہ تمہاری دوست ہے تو پھر وہ کیوں اتنی شرمیلی اور ڈرپوک ہے۔“

”یہ تو ایک دم چھوٹی موٹی کی طرح ہے۔ کسی نے چھوا نہیں کہ سمٹ گئی۔“ کنول ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں نے اسے برا سمجھایا ہے کہ ایسی لڑکیاں آج کل کے دور میں نہیں چل سکتیں۔ مرد بھی ایسی لڑکیوں سے جلدی بے زار ہو جاتے ہیں اور پھر تمہارا بھائی تو ہے بھی خاصا تیز طرار۔ یہ اس کے ساتھ کیسے چل سکے گی۔ خدا خیر ہی کرے۔“

”تم سمجھاتی رہو گی تو یقیناً اس پر اثر ہوگا۔ چاہے دیر سے ہی ہو۔“ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”ویسے حیرت والی بات تو یہ ہے کہ منگنی کرنے سے پہلے اس سے کسی نے بھی اس کی رائے نہیں پوچھی۔“ کنول

نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”گویا یہ کوئی جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو بلکہ کوئی بے جان چیز ہو۔“

”یعنی تم اپنی شادی اپنی مرضی سے کرو گی۔“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”جی بالکل۔“ وہ پر یقین لہجے میں بولی۔ ”میں شادی وہاں کروں گی جہاں میری مرضی ہوگی۔“

”سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی تم شادی شاہد سے کرو گی۔“ صائمہ نے شرارت سے کہا تو وہ صائمہ کو گھورنے لگی

جیسے چپ رہنے کی تاکید کر رہی ہو۔

”یہ شاہ کون ہے؟“ میں نے بھی کان کھڑے کیے۔

”ہے..... ایک..... لڑکا.....“ کنول شرماتے ہوئے بولی۔

”ہاں، نام لڑکوں والا ہے تو یقیناً وہ لڑکا ہی ہوگا مگر تم سے اس لڑکے کا کیا تعلق ہے؟“

وہ نظریں جھکائے مسکرائے جارہی تھی۔

”کیا تم اس لڑکے کو پسند کرتی ہو؟“ میں نے پھر پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟“ میں نے پے در پے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”وہ ہمارے گاؤں کا نہیں ہے۔ ہماری ہمسائی ہے خالہ زرینہ، اس کا بھانجا ہے۔ ان سے ملنے کبھی کبھار آتا رہتا

ہے۔“

”ہمارے گاؤں کا نہیں یعنی مہمان بن کر آتا جاتا ہے۔ کیا ہماری برادری کا ہے؟“

”نہیں، یہی تو مسئلہ ہے وہ ہماری برادری کے نہیں ہیں۔ وہ لوہار ہوتے ہیں۔“

”اری اوپا گل..... یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ ہمارے بڑے بزرگ تمہیں غیر برادری میں بیاہ دینے پر راضی ہو

جائیں گے۔“ میں پریشان ہو گئی۔

”دادی تو شاید مان جائیں۔ بھائی کسی صورت نہیں مانے گا۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”کوئی بھی نہیں مانے گا۔ کیا تم اپنے خاندان اور برادری کو نہیں جانتی۔ ہمارے ہاں غیر برادری میں شادی

کرنے کا رواج بالکل بھی نہیں اور لڑکیوں کے لیے تو یہ قانون اٹل ہے۔ لڑکوں کے معاملے میں تھوڑی نرمی ہو سکتی ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”فوراً اس لڑکے سے تعلق ختم کرو اور اس کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔“ میں نے تنبیہ کی۔

”کیسے نکال دوں۔ میں اسے نہیں بھلا سکتی اور نہ اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور کر سکتی ہوں۔“

”آگ سے کھیل رہی ہو۔ ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔“

”ایک ہستی ایسی ہے جو ہماری شادی کر سکتی ہے۔ ان کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا، نہ بھائی اور نہ دادی۔“

”وہ کون ہے؟“ مجھے تجسس ہونے لگا۔

”تمہارے ابو، یعنی پچھا زمان۔ وہ ہماری برادری کے لیڈر ہیں۔ ان کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا۔ سب ان کی

بہت عزت کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ ابو اس معاملے میں تمہاری حمایت کریں گے۔“ میں مایوسی سے بولی۔

”اگر تم چاچا سے بات کرو تو شاید وہ مان جائیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں اور تمہاری ہر

بات مانتے ہیں۔“ وہ لجاجت سے بولی۔

”پہلے میں بھی یہی سمجھتی تھی مگر ایسا نہیں ہے۔“ میں دکھ سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیرانگی سے بولی۔

”چھوڑو یہ باتیں۔ اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ یہ بتاؤ وہ لڑکا دیکھنے میں کیسا ہے اور کرتا کیا ہے؟“

”بہت خوبصورت ہے۔“ اب کی بار صائمہ بولی۔

”تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟“ میں نے صائمہ کو گھورا۔

”وہ اپنی خالہ کی چھت پر چڑھا ہوا تھا۔ ہمارے گھر سے چار گھر چھوڑ کر کنول کا گھر ہے اور کنول کے گھر کے ساتھ والا گھر خالہ زینہ کا ہے۔ میں چھت پر کپڑے ڈالنے گئی تھی۔ کنول اور وہ لڑکا اپنی اپنی چھت پر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔“

”ہوں..... اور کرتا کیا ہے؟“

”ٹیلی فون کے محکمے میں آپریٹر ہے۔ بی اے پاس ہے۔“ اب کنول نے جواب دیا۔

”ہوں..... تو لڑکا تعلیم یافتہ ہے۔ گڈ لکنگ ہے۔ برسرِ روزگار ہے اور پینڈ سم بھی ہے۔ صرف ایک ہی خرابی ہے

کہ غیر برادری کا ہے۔“ میں سوچتے ہوئے بولی۔

”اتنی خوبیوں کے سامنے یہ ایک خرابی چل نہ جائے گی۔“ وہ پرامید ہو کر بولی۔

”مشکل ہے۔ جو ایک کمی ہے وہ ہر خوبی پر بھاری ہے۔“

”یارت تم تو مجھے ڈرائے چلی جا رہی ہو۔“ کنول خفت سے بولی تو میں ہنس پڑی۔ ”میں تمہارے حق میں دعا کروں

گی۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔

”مجھے صرف تمہاری دعا نہیں بلکہ مکمل ساتھ چاہیے۔ اپنے ابو سے بات کرو۔ کروگی نا!“

”اچھا ٹھیک ہے، کروں گی۔“

”وعدہ.....“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”وعدہ.....“ میں نے بھی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”کانی وقت ہو گیا ہے بھائی لیئے نہیں آیا۔“ کنول فکر مند سے بولی۔

”آجائے گا۔ تم کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔ پڑ گیا ہو گا کہیں چرس کا سونا لگا کر۔“ صائمہ بولی تو میں حیران ہوئی۔

”کیا تمہارا بھائی نشہ کرتا ہے؟“

”ہاں چرس پیتا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کام دھندا نہیں کرتا کیا؟“

”کبھی کر لیا، کبھی نہ کیا۔“ وہ ادا سی سے بولی۔

”تو تم لوگ گزر بسر کیسے کرتے ہو؟“

”تم نہیں جانتی کیا؟“ وہ حیرانگی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”کیا؟ میں یکسر لاعلم ہوں۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”چاچا زماں یعنی تمہارے ابو نے ہمارا ماہانہ خرچہ لگا رکھا ہے۔ وہ ہمیں ایک معقول رقم ماہانہ خرچ کے طور پر بھیجتے

ہیں۔ جس سے ہمارا دادی پوتی کا با آسانی گزارہ ہو جاتا ہے۔“

یہ بات سن کر مجھے اپنے ابو پر بہت پیار آیا اور فخر بھی محسوس ہوا۔ میں خواہ مخواہ اپنے ابو سے اتنی بدگمان ہو رہی تھی۔ میرے ابو تو بہت اچھے، بہت خدا ترس ہیں۔ ہر غریب رشتہ دار کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

”تو تمہارا بھائی کیا نام ہے اس کا شیرا..... وہ نشہ کرنے کے لیے پیسے کہاں سے لیتا ہے۔ کیا تم لوگوں سے؟“

”ہرگز نہیں، دادی اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ وہ ایک پیسا بھی اسے جیب خرچ کے نام پر نہیں دیتیں۔ صرف دو وقت کا کھانا دیتی ہیں۔ وہ اپنا نشہ پانی خود ہی پورا کرتا ہے۔ اتنا کام کر لیتا ہے کہ نشہ خرید سکے۔“

اتنے میں نیچے سے امی نے آواز دی کہ لڑکیوں گھر جانے کا کوئی ارادہ ہے کہ نہیں۔ دس بج رہے ہیں اب چلنے کی تیاری کرو۔ امی کی آواز سن کر ہم سبھی نیچے اتر آئیں۔ صحن میں سبھی چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔ دادا جی کے پاس ایک ملگجاسا نو جوان بیٹھا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خمار بھرا تھا۔ اگر اس کا حلیہ ٹھیک ٹھاک ہوتا تو وہ ایک خوش شکل نو جوان تھا۔ اس کی شکل کی کنول سے مشابہت نے ہمیں بتا دیا کہ وہ کنول کا بھائی ہے۔

”چلو اب ہم بھی چلیں۔“ وہ نو جوان کنول کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”شیرے دو منٹ ٹھہرو۔“ چاچی نے شیرے کو روک دیا اور فٹ سے کچن سے تین پلاسٹک کے چھوٹے ڈبوں میں کھانا بھر لائیں۔ ”یہ اپنی دادی کو دینا اور خود بھی کھا لینا۔“

”ٹھیک ہے چاچی۔“ شیرا نے ڈبے پکڑے اور دونوں بہن بھائی مین دروازے کی طرف چل دیئے۔ اُن کے جانے کے بعد ہم بھی اپنے میزبانوں سے ملنے لگے۔ دادا نے کھڑے ہو کر ہم دونوں بہنوں کو ساتھ لپٹا کر خوب پیار کیا۔

”دادا جان! کیا آپ صرف صائمہ کے دادا ہیں؟“ مہوش نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہے مر جائیے۔ میں تو تم سب بچوں کا دادا ہوں۔“

”تو پھر آپ ہمارے گھر میں آکر کیوں نہیں رہتے۔ صرف چاچا کے گھر میں ہی رہتے ہیں۔“

”آتا تو ہوں تمہارے گھر۔“

”ہوں..... کبھی کبھار اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔“

”اچھا بھئی، اب کی بار آیا تو ایک دو دن رہوں گا۔“

”وعدہ.....“ مہوش نے ہاتھ آگے کیا تو دادا نے مہوش سے ہاتھ ملا کر پکا وعدہ کیا۔ اس بات پر سارے لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ گھر پہنچنے پہنچتے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سارے ایسے بے سدھ سوئے کہ سحری کے وقت بمشکل ہی آنکھ کھل سکی۔

.....☆.....

اس سے اگلے دن ماموں، ممانی، نانی اور غفار ہمیں عید دی دینے کے لیے آگئے۔

ان کو دیکھ کر ہم سب سرشاری میں نہا گئے۔ معزز مہمانوں کی خوب خاطر مدارت کی گئی اور جب ہمیں پتا چلا کہ وہ ایک رات قیام کر کے دوسرے دن واپس جائیں گے تو ہماری خوشی ڈبل ہو گئی۔ ورنہ عام طور پر ماموں وغیرہ جب بھی آتے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی آتے تھے۔ ہاں البتہ نانی کبھی کبھار دو چار دن رک جاتی تھیں۔

رات کا کھانا کھا کر ہم لوگوں نے گھومنے پھرنے کا پروگرام ترتیب دے لیا۔ دونوں فیملیاں دونوں گاڑیوں میں سوار ہو گئیں۔ سینئر سٹیزن ایک گاڑی میں، جبکہ بیک ٹولہ دوسری گاڑی میں سوار ہو گئے۔

گوجرانوالہ شہر کے مشہور اور قابل دید مقامات کی سیر کی گئی اور پھر چین کی آئس کریم کھا کر گھر واپس آ گئے۔

رات کو حسب سابق دو جھلیں جمیں۔ ایک ہماری یعنی بیک جزیرہ کی، جس کی روح رواں نانی جان تھیں۔ دوسری اولڈ سٹیزن یعنی امی، ممانی، ابو اور ماموں کی۔ انہوں نے لڈو کی گیم نکالی اور ہم نے پہلے تاش کی بازی لگائی اور پھر نانی جان سے پرانے دور کے قصے سنے گئے۔ جب انگریزوں کا دور تھا، پاکستان کا نام و نشان نہ تھا اور انگریز اپنا ہر قدم اٹھانے سے پہلے نانا جان سے صلاح مشورہ لینا ضروری خیال کرتے تھے۔ بقول نانی کے انگریزوں کی ہر گتھی نانا جان سلجھاتے تھے۔

”مگر دادی جان، میں نے تو سنا ہے کہ انگریز بڑی شاطر اور عقلمند قوم ہے۔ ان کو آخر دادا جان کے مشوروں کی ضرورت کیونکر پڑتی ہوگی۔“

”وہ جتنے مرضی عقلمند ہوں۔ تمہارے دادا سے زیادہ عقلمند نہیں تھے۔ ہمارے علاقے کے تھانے کا انچارج ایک انگریز تھا۔ اس کے تھانے کی حدود میں چار پانچ گاؤں تھے۔ کسی گاؤں میں کوئی واردات ہو جاتی تو وہ انگریز ایس ایچ او تمہارے دادا کی خدمت حاصل کرتا اور تمہارے دادا بڑے سے بڑا مسئلہ چنگی بجا کر حل کر دیتے۔“ نانی واقعات سناتی جا رہی تھیں اور ان کی گردن فخر سے اکڑتی جا رہی تھی۔

”مگر دادی، ہمارے دادا کو لوگ اچھے الفاظ میں تو یاد نہیں کرتے ہوں گے۔“ غفار سنجیدگی سے بولا۔

”وہ کیوں؟“ نانی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”سیدھی سی بات ہے دادی۔ اس زمانے میں انگریزوں کا جو دوست ہوتا تھا، اسے عذار سمجھا جاتا تھا اور جو انگریزوں کے خلاف آواز اٹھاتا تھا اسے حریت پسند کا خطاب ملتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس وقت جن لوگوں نے انگریز راج کے خلاف بغاوت کی۔ آج ان کے نام تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے جگمگا رہے ہیں۔“

”کیا مل گیا ان کو آزادی کی لڑائی لڑ کے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو آج پاکستان دیکھ کر شرمندہ ہی ہوتے۔“

نانی جوش سے بولیں تو ہم سب کی بولتی بند ہو گئی۔ ماحول پر یکا یک سنجیدگی طاری ہو گئی۔

”دادی! ایسا تو نہ کہیں۔ ان جیالوں کی وجہ سے ج ہم ایک آزاد اور خود مختار ملک میں سانس لے رہے ہیں۔“

غفار نے کمزوری آواز میں اپنا دفاع کیا۔

”کیسا آزاد اور خود مختار ملک۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم امریکہ کے ٹٹو اور غلام ہیں۔ امریکہ کی مرضی کے بغیر یہاں کوئی حکمران حکومت نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی اس کے خلاف جانے کی جرأت کرتا ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے یا اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔ اور کیا دیا ہے اس آزاد اور خود مختار ملک نے۔ جہاں انسان کو کتے کی موت مار دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک غریب کے لیے انصاف ملنا ناممکن ہے۔ بغیر پیسوں کے نہ پولیس اس کی سنتی ہے اور نہ عدالتوں میں اس کی شنوائی ہوتی ہے۔ اس کے لیے انصاف حاصل کرنا مظالم سہنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ بنا دیا گیا ہے۔ ہر جگہ میں سفارش اور رشوت کے بغیر کوئی کام ہو نا ناممکن ہے۔“

ارے میں تو کہتی ہوں انگریز کا دور اس دور سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ ان کے دور میں ہر غریب، امیر کو انصاف کی

فراہمی یکساں تھی۔ کوئی بھی سرکاری ملازم اپنے فرائض سے روگردانی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ رشوت لینا یا کسی بااثر فرد کا پشت پناہی کرنا سخت جرم تھا اور اس کی کڑی سزا ملتی تھی۔ اگر کوئی کمزور عورت اکیلی تھانے جا کر کسی کے خلاف رپورٹ درج کراتی تو فوراً اس کی شنوائی ہوتی تھی۔ اس کی شکایت پر سخت ایکشن لیا جاتا تھا۔ اگر کوئی ماتحت کوتاہی کرتا تو اس کا افسر اس کی سرزنش کرتا تھا۔“

نانی کا لیکچر سن کر ہم سب کی سنی گم ہو گئی۔ زبانیں گنگ ہو گئیں۔ آخر کافی دیر بعد بلال بھائی بولے۔
 ”ارے نانی، آپ تو اتنی بڑی دانشور ہیں۔ ہمیں تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ ایسی باتیں بھی کر سکتی ہیں۔“
 ”کرنے کو تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ بس خود ہی شرافت کے دائرے میں رہتی ہوں۔“ نانی بڑی ادا سے بولیں۔
 تو ہم سب ہنسنے لگے۔

”ونڈرفل دادی.....“ غفار نے تالیاں بجانے شروع کیں تو ہم سب نے بھی تالیاں بجا کر نانی کو خراج تحسین پیش کیا۔

”میں پانی پی کر ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر میں ڈرائنگ روم سے باہر آ گئی۔ کیونکہ ہم نے ڈرائنگ روم میں ہی ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ میں کچن میں گئی۔ فریج کھولا اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر پانی گلاس میں انڈیلنے لگی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ میں پلٹی تو غفار کو کھڑے پایا۔

”آپ.....“ میں گھبرا گئی۔

”مجھے دیکھ کر تم ڈر کیوں جاتی ہو؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں تو..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔

”کیوں؟“

”جلدی کرو، کوئی آجائے گا۔“

یہ سوچ کر میں نے فٹ سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا کہ کہیں واقعی کوئی آنے جائے۔ اس نے اپنی جیب سے ایک نازک سی سونے کی انگوٹھی نکالی، جس کے ٹاپ پر ایک ننھا منا بہرا جگمگا رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے وہ انگوٹھی میری انگلی میں پہنادی۔ پھر اس نے انگوٹھی والا ہاتھ پکڑا اور اس کو اپنے لبوں سے لگا کر چوم لیا۔ میں جوششدر کھڑی یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی، اس کی اس حرکت سے جھینپ گئی اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اپنے لب میرے کان کے قریب لا کر سرگوشی میں بولا۔

”میری طرف سے عید کا تحفہ۔“

یہ کہہ کر وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور واپس ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

میں بت بنی کتنی دیر بے حس و حرکت وہاں کھڑی رہی۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد میں ہوش کی دنیا میں واپس آئی تو سب سے پہلے وہ انگوٹھی انگلی سے اُتاری۔ اپنے کمرے میں گئی۔ اسے اپنی الماری کے لاک والے دروازے میں رکھ کر دروازہ لاک کر دی۔ چند گہرے سانس لے کر دل کی دھڑکن کو اعتدال پر لائی اور پھر

ہانی پنے بغیر ہی واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔ محفل خوب گرم تھی۔ نانی کے کسی قصے پر خوب تہمتے اہل رہے تھے۔
 ”اتنی دیر لگا دی۔“ مہوش مجھے دیکھ کر چلائی۔ ”نانی نے اتنا مزے دار قصہ سنایا ہے۔“

”اچھا۔“ میں مسکرائی تو نظریں غغار سے جانکرائیں۔ وہ بھی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں میرے چہرے سے پھسلتی ہوئی میرے ہاتھوں پر آریں۔ میرے خالی ہاتھ دیکھ کر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے استفسار کرنے لگا۔ میں اسے نظر انداز کرتی ہوئی نیچے قالین پر سب کے پاس بیٹھ گئی۔ رات ایک بجے سب کو سونے کا لیال آیا تو یہ محفل برخاست ہوئی۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد مہمان روانہ ہو گئے۔

☆.....

رمضان کا مہینہ گزرا تو عید آئی۔ یہ عید بھی ہر عید کی طرح بورہی گذری۔ سارا دن کھانے پکاتے اور کھاتے ہی گذرا۔ رات کو سب نے پروگرام بنایا کہ کل گاؤں جایا جائے اور ٹروکا سارا دن گاؤں میں گزرا جائے۔ ویسے بھی تقریباً ہم ہر عید کے بعد دوسرا دن گاؤں میں ہی گزارتے تھے۔

دوسرے دن پہننے والے ڈریس سب نے تیار کر رکھے تھے۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ فجر کے وقت چاچا فلور کا فون آگیا۔ انہوں نے ابو کو روتے ہوئے بتایا کہ دادا جان وفات پا گئے ہیں۔ حسب معمول جب دادا جان نماز فجر ادا کرنے کے لیے نہ اٹھے تو انہیں تشویش لاحق ہوئی۔ وہ دادا جان کے کمرے میں انہیں اٹھانے کے لیے گئے تو وہ کب کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ وہ سوتے سوتے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ وہ شاید سائینٹ ہارٹ اٹیک کے شکار ہوئے تھے۔

ہم دونوں بہنیں میٹھی نیند سو رہی تھیں جب امی نے روتے ہوئے ہمیں بیدار کیا۔ امی کو روتا دیکھ کر ہم بوکھلا کر اٹھ بیٹھیں۔ پھر جب ہم نے اپنے پیارے دادا جان کی موت کی خبر سنی تو ہم بھی رونے لگیں۔

”امی! دادا جان نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمارے گھر میں ہمارے پاس رہنے آئیں گے۔“ مہوش روتے ہوئے پکار رہی تھی۔ امی نے مہوش کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”امی، دادا جان نے اپنا وعدہ توڑ دیا۔“

”مہوش چپ ہو جاؤ بیٹی۔ یہ اللہ کی مرضی ہے۔ اس کی مرضی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔“

آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہم لوگ گاؤں پہنچ گئے۔ دادا جان کی میت صحن کے درمیان چار پائی پر رکھی گئی تھی۔ نیچے دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ گاؤں کے کافی لوگ اور ہمارے رشتہ دار اکٹھے ہو رہے تھے۔ چاچی چار پائی کے ساتھ لگی بین کر رہی تھیں۔ جب ہم لوگ پہنچے تو چاچا، ابو سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگے۔ جبکہ امی، چاچی سے لپٹ کر رونے لگیں۔ ہم دونوں بہنیں بھی صائمہ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ وہاں کنول اور اس کی دادا ای اماں زینب بھی موجود تھیں۔

دادا کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سوتے پڑے ہیں۔ ابھی اٹھ کر بیٹھ جائیں گے۔

مجھے چند دن پہلے کی باتیں یاد آنے لگیں، جب ہم رمضان میں صائمہ کو عید دیئے آئے تھے۔ دادا کیسے ہنس کر ہم سے باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں ساتھ لپٹا کر پیار کرتے رہے تھے۔ سچ ہے زندگی کی بے ثباتی پر کسی کو شک نہیں۔

دادا کے جنازے کا وقت عصر کے فوراً بعد رکھا گیا۔ ہمارے زیادہ تر رشتہ دار اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ کچھ دور تھے مگر وہ بھی زیادہ دور نہ تھے۔

ماموں کی ساری فیملی بھی فوراً آن پہنچی تھی۔ آج تو جبار بھائی بھی دفتر سے چھٹی لے کر آ گئے تھے۔ دادا کی تدفین کے بعد سب سو گوار بیٹھے تھے۔ نانی اور ممانی ہماری دلجوئی میں لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اصرار کر کے ہمیں کھانا کھلایا۔ شام تک زیادہ مہمان رخصت ہو گئے۔ صرف قریبی قریبی چند رشتہ دار رہ گئے۔ جن میں نانی اور ماموں بھی شامل تھے۔ ان کے باقی افراد یعنی ممانی، جبار اور غفار شام کو چلے گئے تھے۔ دوسرے دن رسم قل کے بعد ماموں بھی چلے گئے۔ نانی آٹھ دس دن ہمارے پاس ہی رہیں۔ گیارہویں کا ختم دلا کر ہم بھی اپنے گھر آ گئے اور نانی بھی اپنے گاؤں چلی گئیں اور اس طرح دادا جان اچانک خاموشی سے ہماری زندگی سے چلے گئے۔ ہاں جاتے جاتے ابو اور چاچا کو ایک نئے اٹوٹ بندھن میں باندھ گئے۔

.....☆.....

کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ ہم بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دادا کی موت کا غم بھولنے لگے اور پھر زندگی کی گہما گہمی میں مصروف ہو گئے۔ ہماری اب بھی یہی روٹین تھی کہ مہینے میں ایک دو مرتبہ گاؤں ضرور جاتے۔ اس دوران میں ایک دفعہ کنول کے ہاں بھی گئی صائمہ کے ساتھ۔ کنول کا چھوٹا سا گھر بہت صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ اس کی ماں کے جینز کے سامان سے ان کا گھر بھرا پڑا تھا۔

”تمہارے ابو کو کیا ہوا تھا؟ کتنی دیر ہو گئی انہیں فوت ہوئے؟“

”ان کو ٹی بی تھی۔ چار سال ہو گئے ہیں انہیں چھوڑ کر گئے ہوئے۔“ کنول افسردگی سے بولی۔ میں اور صائمہ بھی افسردہ ہو گئیں۔

”کنول! تمہارے پاس اپنی امی کی کوئی تصویر ہے۔ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہے۔“ وہ اندر گئی اور کچھ تصویریں لے آئی۔

”تمہاری دادی اس وقت کہاں ہیں؟“

”وہ کسی کے ہاں عیادت کے لیے گئی ہیں۔“

میں تصویریں دیکھنے لگی۔ اس کی امی واقعی بہت پیاری تھی۔ کنول ہو بہو اپنی ماں کی ڈپلیکٹ تھی۔ کچھ تصویروں میں اس کے ابا بھی امی کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ کچھ تصویروں میں وہ، کنول اور شیرا کے ساتھ نظر آ رہی تھیں۔ کنول نے ہمیں چائے پلائی اور ساتھ بسکٹ بھی کھلائے۔ چائے پینے کے بعد اوھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں تو میں نے پوچھ لیا۔

”اور سناؤ کنول، اس لڑکے کا خیال دماغ سے نکلا کہ نہیں۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو نورین! ہمارا تعلق کوئی مذاق نہیں۔ ہم محبت کرتے ہیں ایک دوسرے سے۔“ وہ بخنجدی

سے بولی تو میں بھی شرمندہ ہو گئی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا کنول۔“

تم بتاؤ تم نے میرے ساتھ ایک وعدہ کیا تھا۔ کیا پورا کیا۔“ وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تو میں بغلیں جھانکنے لگی۔

”وہ اصل میں ابھی وقت ہی نہیں ملا۔“

”کیا..... وقت ہی نہیں ملا۔ تین مہینے ہو گئے ہیں اس بات کو اور تم کہتی ہو تمہیں وقت ہی نہیں ملا۔“ وہ حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔

”تم جانتی تو ہو اس بات کے فوراً بعد دادا جان کی ڈیٹھ ہو گئی تھی۔ اب ان حالات میں ابو سے کیسے یہ بات کر سکتی تھی۔“

”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ مگر نورین پلیزیہ بات جلدی کر لو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

”کیوں، کیا ہوا؟“ اسے پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گئی۔

”میری دادی میرا رشتہ طے کر رہی ہیں۔ لڑکے والے آ کر مجھے پسند کر گئے ہیں۔“

”کون ہیں وہ؟“

”ہمارے ہی گاؤں کے ہیں۔“ اب وہ باقاعدہ رونے لگی۔ میں اسے اپنے ساتھ لگا کر تسلیاں دینے لگی۔

”نورین! میں شاہد کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں اس کے بغیر زندہ

نہیں رہ سکتی۔“ وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

”تم نے اپنی دادی سے بات نہیں کی۔“ میں نے پوچھا۔

”کی تھی۔ دادی نے سختی سے منع کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر شیرا کو اس بات کا پتا چلا تو وہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر

کے کتوں کے آگے ڈال دے گا۔ نورین محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے نا۔“ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ”تو پھر کیوں زاماندو

پیار کرنے والوں کے بیچ دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“

”کنول اب چپ کر جاؤ۔ میں گھر جاتے ہی ابو سے بات کروں گی۔“

میری بات سن کر وہ تھوڑی مطمئن ہو گئی مگر میں مطمئن نہیں تھی۔ میں بخوبی جانتی تھی کہ برسوں پرانی روایات کو

میرا باپ کبھی توڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا اور میرا اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ جب میں نے گھر واپس آ کر اسی رات ابو

سے تنہائی میں بات کی اور وہ تنہائی ہمیں ڈرائنگ روم میں ہی میسر آ سکتی تھی۔ یہ بات ایسی تھی کہ مجھے اپنے جسم کی پوری

توانائی اکٹھی کرنی پڑی اور تب کہیں جا کر یہ بات میرے کانپتے لبوں سے بمشکل نکل سکی۔ میں نے بات کچھ اس طریقے

سے شروع کی۔

”ابو میں نے ایک بات کہنی ہے آپ سے؟“

”ہاں کہو۔“ ابو نے کتاب بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

”وہ..... کنول..... ہے نا..... اس کی دادی اس کی مگنی کر رہی ہیں۔“ میں اکتتے ہوئے بولی۔

”کنول..... کون کنول؟“ ابو حیران ہوئے۔

”کنول..... اماں زینب کی پوتی۔“ میں زور دیتے ہوئے بولی۔

”اچھا اچھا، پھوپھی زینب کی پوتی کا نام کنول ہے۔ اچھا تو کیا ہوا ہے کنول کو؟“ ابو دلچسپی لیتے ہوئے بولے۔

”ابو، کنول کی مگنی کرنے جا رہی ہیں اماں زینب۔“

”تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔“ ابو مسکرانے لگے۔
 ”پریشانی والی بات یہ ہے کہ کنول..... کسی..... اور کو..... پسند کرتی ہے اور وہ..... اس..... سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“
 ”کون ہے وہ؟“ اب ابو سنجیدہ ہو گئے۔

”وہ اس کی ہمسائی..... خالہ صغریٰ..... کا بھانجا ہے۔“
 ”اس کی ہمسائی..... اس کے ہمسائے تو غالباً لوہار ہیں۔“
 ”ہاں ہاں..... وہی۔“ میں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔
 ”تو کیا وہ ایک لوہار لڑکے کو پسند کرتی ہے۔“ ابو کی پریشانی پر بل پڑ چکے تھے۔
 ”جی ابو۔“ میں سہم گئی۔

”اس کا دماغ تو خراب ہو ہی چکا ہے۔ لگتا ہے تمہارا بھی ہو گیا ہے جیسی تم اس کی سفارش لے کر میرے پاس آئی ہو۔ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اس کی شادی ایک لوہار سے کروادوں گا۔“ اب ابو باقاعدہ گرج رہے تھے۔
 ”مگر ابو..... وہ اس کے بغیر مر جائے گی۔“ میں روہانسی ہو گئی۔
 ”مرنے دو۔ ایسی بیٹیوں کو مر جانا چاہیے جو اپنے خاندان کی بدنامی کا باعث بن جائیں۔“ ابو سفاکی سے بولے۔

”ابو، اگر..... آپ چاہیں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں لجاجت سے بولی۔
 ”ایسا کچھ نہیں ہو سکتا جو تم سوچ رہی ہو۔ اس کی دادی جہاں اس کی شادی کرے گی وہیں ہوگی۔ یہ بات اسے بھی سمجھا دینا۔ ہماری برادری میں خاندان سے باہر بیٹیاں بیاہنے کا رواج بالکل نہیں اور جو لڑکی اس قانون کے خلاف بغاوت کرتی ہے اس کی سزا صرف موت ہے۔ یہ بھی بتا دینا اسے۔“ ابو کی بات سن کر میں سر تا پا لرز اٹھی۔
 ”اگر کوئی اور بات نہیں کہنی تو تم جاسکتی ہو۔“ ابونے یہ کہہ کر اپنی توجہ کتاب کی جانب مرکوز کر لی۔
 میں اٹھی تو میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں بمشکل اپنے کمرے میں پہنچی اور بیڈ پر گر گئی۔ مہوش بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ میری حالت دیکھ کر حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا ہوا ہے تمہیں؟“
 ”کچھ نہیں۔“ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

کیا ہوگا کنول کی پریم کہانی کا۔ اگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آئی تو کیا اسے اپنی جان گنوا بیٹے گی۔ ابو دیکھنے میں کتنے شفیق اور روشن خیال نظر آتے ہیں مگر اندر سے بالکل دقیانوسی سوچ کے مالک ہیں۔ مجھے کنول پر کبھی ترس آنے لگتا اور کبھی غصہ۔

بھلا اسے کیا پڑی تھی ایک پردیسی بابو سے اکھیاں ملانے کی۔ محبت کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لیتی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر محبت کب سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے۔ یہ مرض تو خود بخود لاحق ہو جاتا ہے۔ اگلے لمحے ہی مجھے ترس آنے لگا۔ جب وہ میرے منہ سے انکار سنے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ اسے تو بڑا یقین تھا کہ ابو میری بات ضرور مانیں گے۔ سخت ذہنی انتشار کے باوجود دیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے ہی لیا اور ویسے بھی مثال بنی ہے کہ نیند تو سولی پر

بھی آ جاتی ہے۔ اگلے دن کالج میں بھی میرا دل نہ لگا۔ ہر ٹیکچر سر پر سے ہی گذرنا رہا۔ رہ رہ کر دل میں ایک ہی خیال آتا کہ اب کنول کا کیا بنے گا۔ اسی ادھیڑ بن میں ایک ہفتہ گذر گیا۔ میری بے چینی تو کسی طور بھی کم نہ ہو رہی تھی۔ آخر ویک اینڈ پر میں نے امی سے کہا کہ میں گاؤں جانا چاہتی ہوں۔

”کیوں، خیریت ہے نا؟“ امی نے بغور میری طرف دیکھا۔

”جی، بس صائمہ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔“

”صرف صائمہ کو یا کنول کو بھی۔“ امی نے طنز کیا۔

”ہاں، ہاں کنول کو بھی۔ میں دونوں سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”ابھی بلال فارغ نہیں ہے۔ اگلے ویک اینڈ پر چلی جانا۔“

”میں نے آج اور ابھی جانا ہے۔“ میں اٹل لہجے میں بولی۔

”مگر کس کے ساتھ؟“ امی ناگواری سے بولیں۔

”ڈرائیور کے ساتھ۔ آخر وہ کس لیے رکھا ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے اپنے ابو سے اجازت لے لو پھر چلی جانا۔“

”ابو گھر پر نہیں ہیں۔ جب آئیں تو انہیں بتا دیجئے گا۔“ یہ کہہ کر میں سرنٹ کو اسٹریٹ میں بشیر بابا کے پاس پہنچ گئی۔

جو اس وقت بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

”بشیر بابا مجھے گاؤں چھوڑ آئیں۔“

وہ فوراً مودب کھڑے ہو گئے۔

”جی بیٹا، ابھی جانا ہے کیا؟“

”جی ابھی جانا ہے۔“ یہ کہہ کر میں اندر چلی آئی۔ اپنا ایک سوٹ بیگ میں ڈالا اور امی کو بتایا کہ میں جا رہی ہوں۔ امی حیران پریشان کھڑی دیکھتی رہیں اور میں باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بشیر بابا نے گاڑی باہر نکالی اور گاڑی کا رخ

گاؤں کی طرف کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد ہم گاؤں پہنچ گئے۔

چاچا، چاچی حسب توقع بڑے تپاک سے ملے۔ ہمیں کولڈ ڈرنکس پلائیں۔ بشیر بابا نے کولڈ ڈرنکس ختم کی تو میں

نے انہیں واپس بھیج دیا یہ کہہ کر کہ کل اسی وقت مجھے آکر لے جائیں۔ وہ ٹھیک ہے بیٹی کہہ کر واپس چلے گئے۔

”چاچی، صائمہ کہاں ہے۔“ میں نے چاچی سے صائمہ کے متعلق پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہے۔“ چاچی نے جواب دیا۔

میں صائمہ کے کمرے میں گئی تو وہ بیڈ پر لیٹی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر رسالہ پیچھے ہٹایا۔

مجھے دیکھا تو اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”اکیلی ہو۔ دوسرے کہاں ہیں۔“ وہ میرے پیچھے دیکھنے لگی۔

”آج میں اکیلی ہی آئی ہوں۔“

”کیا واقعی، مہوش بھی نہیں آئی۔“ وہ بڑی حیران ہوئی۔

”نہیں، کہا تو ہے میں آج بالکل اکیلی آئی ہوں۔“ میں بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔
 وہ بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔ ”کس کے ساتھ آئی ہو؟“
 ”بیشر بابا کے ساتھ۔“

”اودہ اچھا.....“ وہ شاید بلال بھائی کا نام سننا چاہ رہی تھی۔ میرا جواب سن کر مایوسی سے بولی۔ ”باقی سارے گھر والے ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟“

”ہاں، ہمارے گھر والے تو سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تم سناؤ۔“
 ”ہم سب بھی ٹھیک ہیں۔ دیکھ لو تمہارے سامنے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔
 ”اور کنول کا کیا حال ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”اس بے چاری کا برا حال ہے۔“ صائمہ ادا سی سے بولی۔
 ”کیوں کیا ہوا ہے اسے؟“

”اس کی پرسوں منگنی ہو گئی ہے۔ انہی لوگوں کے ہاں جو اسے دیکھنے آئے تھے۔ رورو کر ہلکان ہو رہی ہے۔“
 ”اودہ نو.....“ میں بھی بجھ گئی۔

”تم نے بات کی تھی تایا جان سے۔“ صائمہ نے پوچھا۔
 ”ہاں کی تھی، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“
 ”کیا تایا جان نہیں مانے؟“

”ماننا تو دور کی بات ہے۔ انہوں نے سخت ڈانٹ بھی پلائی ہے اور کہا ہے کہ اس لڑکی کو جا کر سمجھاؤں کہ محبت کا بھوت دماغ سے اتار چھینکے ورنہ اس کے حق میں بہت برا ہوگا۔“
 ”تو پھر اب کیا ہوگا؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔ ”کیا کنول کو تمہاری باتیں سمجھ میں آجائیں گی۔ کیا وہ اتنی آسانی سے سمجھوتے پر آمادہ ہو جائے گی؟“

”سمجھوتہ تو اسے کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے اس کے پاس۔“ میں دکھ سے بولی۔
 ”چلو کنول کے پاس چلتے ہیں۔ گھر میں ہی ہوگی نا!“ میں نے کہا۔
 ”اس بے چاری نے کہاں جانا ہے۔ گھر میں پڑی رہتی ہے اور اپنی ناکام محبت کا سوگ مناتی رہتی ہے۔“
 ہم دونوں کمرے سے نکلیں تو چاچی نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہی ہو دونوں؟“
 ”کنول کے ہاں۔“ صائمہ نے جواب دیا۔

”ابھی ابھی تو آئی ہو۔ تھوڑی دیر آرام کرو۔ کنول کے ہاں تو کل بھی جاسکتی ہو۔“
 ”چاچی میں کون سا لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں۔ دس پندرہ منٹ کی مسافت ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے
 چاچی کو جواب دیا۔

اگلے لمحے ہم کنول کے گھر میں داخل ہو رہیں تھیں۔ اماں زینب صحن میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ بڑی شفقت سے ملیں۔ ہم نے کنول کا پوچھا تو انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے چہرے پر بھی افسردگی پھلک رہی

تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئیں تو کنول پلنگ پر لیٹی رو رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے نیچے رو رو کر ہلکے پڑ چکے تھے۔ چہرے کا رنگ بھی پیلا زرد ہو رہا تھا۔ ہم اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”یہ تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے کنول۔“ میں تاسف سے بولی۔ وہ اور زور و شور سے رونے لگی۔

”ارے ارے.....“ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”رونا تو بند کر دنا۔“

”اب یہ رونا میری موت پر ہی ختم ہوگا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”خدا نہ کرے کنول، کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں تمہارے دشمن۔“ میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

”میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ جلدی زمان چاچا سے بات کرو۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ دیکھ لو، ہوگئی نادیر۔“

”کنول! شادی وہیں ہوتی ہے، جہاں قسمت ہوتی ہے۔ تمہاری قسمت یہی تھی۔ خود کو سمجھا لو۔“

”ہرگز نہیں، میری شادی شاہد کے ساتھ ہوگی۔ اگر اس کے ساتھ نہ ہو سکی تو یہاں بھی نہیں ہوگی۔ میں مہندی

والی رات زہر کھالوں گی۔“

کنول کی باتیں سن کر میں کانپ اٹھی۔ ”کنول! ایسی فضول باتیں مت کرو۔“ میں سخت لہجے میں بولی۔

”یہ آپ کو اس وقت پتا چلے گا جب یہ فضول باتیں سچ ثابت ہوں گی۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”اچھا، ابھی سے خود کو ہلکان مت کرو۔ ابھی صرف تمہاری منگنی ہوئی ہے شادی ابھی دور ہے۔“

”مجھے جھوٹی تسلیاں مت دو۔ منگنی ہوئی ہے جو نکاح سے زیادہ کچی ہے۔ کوئی چاہے بھی تو توڑ نہیں سکتا۔“

”دیکھو کنول، تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔ سمجھداری سے کام لو۔ کوئی بھی ایسا قدم مت اٹھانا جس سے تمہاری جان کو

خطرہ لاحق ہو جائے۔“

وہ چپ رہی تو میں پھر بولی۔ ”سمجھ رہی ہونا میری بات۔“

”جان تو اب جانی ہی ہے چاہے جیسے بھی جائے۔“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنسی تو میں خوفزدہ ہو گئی۔ یہ جنونی لڑکی پتا نہیں

کون سا قدم اٹھائے گی۔ محبت انسان سے اس کی عقل چھین لیتی ہے۔

”کنول! میں نے ابو سے بات کی تھی۔“

”اب کیا فائدہ۔ بہر حال کیا کہا تھا انہوں نے؟“ وہ مسکرائی۔

”انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“ میں نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”پتا تھا ایسا ہی جواب ملے گا۔ میں پاگل نہ جانے کیوں اتنی آس اور اُمید لگائے بیٹھی تھی۔ چلو جو ہونا تھا وہ تو ہو

گیا اور جو ہونا ہے وہ آنے والا وقت بتائے گا۔ تم زمان چاچا سے یہ ضرور پوچھنا کہ وہ اتنا پڑھے لکھے ہیں۔ دنیا بھر کی

کتابیں پڑھتے ہیں۔ کیا ہمارا مذہب ہمیں پسند کی شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ کیا جیون ساتھی منتخب کرتے وقت یہ کافی نہیں

ہوتا کہ وہ اچھے اوصاف کا مالک ہو اور مسلمان ہو۔ کیا ہمارے نبیؐ نے یہ نہیں کہا تھا کہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر کوئی

فوقیت حاصل نہیں سوائے پرہیزگاری کے۔ تو پھر کیوں جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر جھوٹے قوانین بنا رکھے ہیں۔ کیوں خدا

اور رسولؐ کے احکامات کو سامنے رکھ کر فیصلے نہیں کیے جاتے۔“

کنول بولتے بولتے ہلکان ہو گئی تو چپ ہو کر ہانپنے لگی۔

میں اور صائمہ اس کی باتیں سن کر رنجیدہ ہو گئیں۔ اس کی باتوں میں سچائی سے میں تو کیا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا مگر اس سسٹم کے خلاف آواز کون اٹھاتا۔ آواز اٹھانے والے کو باغی کا خطاب مل جاتا تھا اور اگر یہ بغاوت لڑکیاں کریں تو انہیں صرف ایک ہی سزا ملتی تھی اور وہ سزا تھی ”موت“۔

میں اسے ڈھارس دیتی رہی اور صبر کرنے کی تلقین کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں واپس آ گئیں۔ کنول کی حالت دیکھ کر دل بوجھل ہو گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر میں اور صائمہ رات گئے تک اسی کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ دوسرے دن کنول ہمارے پاس آ گئی۔ آج اس نے اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی مگر کل والے موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ مجھے بھی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی طبیعت سمجھوتے کی جانب مائل ہو رہی ہے۔ میں نے بھی اس موضوع پر دوبارہ کریدنا مناسب خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر کنول چلی گئی اور پچھلے پہر مجھے بشیر بابا لینے کے لیے آ گئے۔

میں صائمہ اور چاچی سے رخصت لے کر گاڑی میں بیٹھی تو بشیر بابا سے پوچھا۔
 ”بابا..... گھر میں خیریت ہے نا!“

”ہاں ہاں بیٹی، گھر میں بالکل خیریت ہے۔“

میں دل میں ابو کی ناراضگی کے متعلق سوچ رہی تھی اور اب تھوڑا ڈر بھی رہی تھی کہ شاید وہ میرے اکیلی گاؤں آنے پر خفا ہوں۔ ابو کے متعلق ناراضگی کا ڈر بالکل بے بنیاد نکلا۔ انہوں نے مجھ سے گاؤں والوں کی خیر خیریت دریافت کی، مجھے پیار کیا اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ البتہ بلال بھائی جب شام کو فیکٹری سے لوٹے تو انہوں نے خاصے کان کھینچے۔

”تمہیں ایسی کون سی امیر جنسی آن پڑی تھی کہ تم اکیلی منہ اٹھائے گاؤں چلی گئی؟“

”بشیر بابا کے ساتھ گئی تھی، اکیلی کب تھی۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”زبان بند کرو۔“ وہ گر بے۔ ”یہ تمہاری پہلی اور آخری غلطی ہے۔ آئندہ ایسی حماقت کبھی مت کرنا۔“ وہ

وارننگ دیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں آنکھوں میں آنسو بھرے وہیں بیٹھی رہی۔

مجھے گاؤں سے آئے ہوئے ابھی بمشکل ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ ایک روح فرسا خبر سننے کو ملی۔ یہ خبر چاچا اور چاچی کے ذریعے ہم تک پہنچی۔ وہ ہمیں ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں کالج سے آئی۔ چاچا، چاچی کو دیکھا تو خوش ہو گئی۔ ان سے صائمہ کی خیریت دریافت کی، پھر مجھے کنول کا خیال آیا۔

”چاچی، کنول کیسی تھی؟“

”اس کلمو ہی کا تو کچھ مت پوچھو۔ اس بے غیرت نے تو اپنے گھر والوں کو جیتے جی مار دیا۔“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

”ہونا کیا تھا۔ بھاگ گئی اپنے یار کے ساتھ۔ وادی بچاری چار پائی پر پڑ گئی ہے۔ بھائی پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا

پھر رہا ہے اس آوارہ کو۔ ہاتھ لگ گئی تو کٹڑے کر ڈالے گا۔“

میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ کنول نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھالیا۔ کیا اسے خوف محسوس نہیں ہوا۔ کیا محبت انسان کو اتنا نڈر اور بہادر بنا دیتی ہے کہ محبوب سے ملنے کے لیے وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں بھی ڈال دیتا ہے۔ میں کالج یونیفارم بدلنے کے بہانے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں کپڑے بدلنے کے بجائے دھم سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اب کیا ہوگا؟ کیا کنول کا بھائی اسے ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اللہ کرے شیرا کو کنول کبھی نڈل سکے۔ وہ اپنے محبوب کے ساتھ کہیں دور چلی گئی ہو۔ اتنی دور جہاں کوئی اسے پا نہ سکے۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتی ہوئی بے دلی سے کپڑے بدلنے لگی۔

شام کو چاچا اور چاچی چلے گئے۔ میں اور مہوش بھی اپنے کمرے میں آ گئیں۔

”کنول نے اتنا سنگین قدم اٹھا کر اپنی موت کا سامان خود ہی پیدا کر لیا۔“ مہوش بھی بڑے دکھ سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں، بہت برا کیا اس نے۔ حالانکہ میں نے بہت سمجھایا تھا۔“

”جب عشق کی پٹی آنکھوں پر بندھ جائے تو پھر کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔“ مہوش بولی۔ ”دیکھ لینا تم اس کے بھائی نے اسے ڈھونڈ ہی نکالا ہے۔ اسے مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

”مہوش ایسا نہ کہو۔“ میں تڑپ کر بولی۔ ”دعا کرو وہ بھی شیرا کے ہاتھ نہ آئے۔ جہاں بھی رہے خوش رہے۔“

”میں کیوں دعا کروں اس کے لیے۔“ مہوش تنک کر بولی۔ ”اور تم کیوں اتنی ہلکان ہو رہی ہو اس کی خاطر۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ برے کام کا برا نتیجہ۔“

مہوش کی باتیں سن کر میں خاموش ہو گئی اور اس بات کی قائل بھی ہو گئی کہ مہوش واقعی سخت دل کی مالک ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں بہنوں میں اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ ہوئی۔ ہم دونوں اپنی اپنی سائیڈ پر سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

میرے ذہن میں اس وقت کنول کی کہی ہوئی یہ بات چکرارہی تھی کہ جان تو اب جانی ہی ہے چاہے جیسے بھی جائے۔

☆.....

دوسرے دن رات کو ہم سب گھر والے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ ابو نے بلال بھائی سے پوچھا۔

”اس لڑکی کا کچھ پتا چلا کہ نہیں؟“

”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔ جلدی ہی پتا لگ جائے گا اس کا۔ کہاں تک بھاگیں گے۔ میں نے ہر شہر میں اپنے منبر پھیلارکھے ہیں۔“ بلال بھائی نے مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے جواب دیا تو میں نے کان کھڑے کیے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کنول کے متعلق ہی بات کر رہے ہیں۔

”میں نے بھی شیرا کو کہہ دیا ہے کہ جلد سے جلد اس آوارہ کو ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتار دے۔ اس کے بعد اسے علاقہ غیر کی طرف بھیج دیں گے۔ جہاں سال ڈیڑھ سال گزار کر آئے گا تو یہاں معاملہ ختم پڑ چکا ہوگا۔“ ابو کی یہ بات سن کر بہر اول کاٹھنے لگا۔

اوہ میرے خدائے ایک جیتی جاگتی لڑکی کو کیسے بے دردی سے مارنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ جس کا جرم یہ ہے کہ اس نے محبت کی اور پھر اپنی پسند کی شادی کر لی۔

میں اٹھ کر کمرے میں آگئی اور پھر سے زور و شور سے دعائیں مانگنے لگی کہ کنول اور اس کا شوہر کبھی ان ظالموں کے ہتھے نہ چڑھیں۔



ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے دل کو لگا ہوا دھڑکا بھی کم ہونے لگا۔ مجھے لگا جیسے میری دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ کنول اپنے قاتلوں کی دسترس سے دور نکل گئی ہے۔ جب کنول کو فرار ہوئے دو ماہ سے زائد ہو گئے تو میں بھی مطمئن ہو گئی۔ پھر اچانک ایک اور دردناک خبر ملی۔ وہ خبر تھی کہ دھماکہ، جس نے ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکا دی۔ وہ خبر تھی شبانہ کی موت کی اطلاع۔

جبار بھائی کی مگنیت شبانہ۔

شبانہ مر گئی، مگر کیسے؟ ہر ایک کی زبان پر یہی سوال تھا۔ اس دن جمعہ تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ سب بے فکری کی نیند سو رہے تھے کہ صبح چھ بجے ٹیلی فون چنگاڑنے لگا۔ ٹیلی فون لاؤنج میں رکھا ہوا تھا۔ تیسری چوتھی بیل پر امی اپنے کمرے سے آنکھیں ملتی ہوئی باہر آئیں۔ انہوں نے ریسورٹ اٹھایا تو ان کی آواز ہمارے کمرے میں بھی ہلکی ہلکی آرہی تھی۔ کیونکہ ہمارے کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔

اچانک امی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”کیا..... کب..... کیسے؟“

ایک ہی سانس میں وہ کئی سوال پوچھ رہی تھیں۔ میں ان کی آواز سن کر پوری طرح جاگ چکی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی بری خبر ہے۔ میں اٹھ کر باہر آگئی۔ امی سر پکڑے صوفے پر بیٹھی تھیں۔

”کیا ہوا امی؟“ میں نے پریشان بیٹھی امی کے چہرے پر نظر ڈالی۔

”شبانہ مر گئی ہے۔“ امی مری مری آواز میں بولیں۔

”شبانہ..... جبار بھائی کی مگنیت.....“ میں بے یقینی سے بولی۔

”ہاں، وہی۔“

”اُسے کیا ہوا؟“

”یہ تو وہاں چل کر ہی پتا چلے گا۔ اپنے ابو کو اور مہوش کو جگاؤ۔ میں بلال کو جگاتی ہوں۔“

”فون پر اطلاع کس نے دی ہے؟“

”تمہاری نانی نے فون کر کے بتایا ہے۔“

سات سو سات بجے تک ہم شبانہ کے گاؤں پہنچ گئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ شبانہ کو عرصہ دراز سے ٹی بی کا مرض لاحق تھا۔ اس کے والدین در پردہ اس کا علاج کرواتے رہے۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ وہ اتنی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ مگر وہ بے چاری دھان پان سی لڑکی اس خطرناک بیماری سے مقابلہ نہ کر پائی اور جان کی بازی ہار گئی۔ وہیں ہم نے جبار بھائی کو دیکھا۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی جواری اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی جوئے میں بار جائے۔ آزرہ اور نکست خوردہ سے جبار بھائی پر مجھے اس وقت واقعی بڑا ترس آیا۔ ان کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا تھا۔ رات کو سب واپس

آئے تو سبھی پڑمرده اور مضحک دکھائی دے رہے تھے۔ آپس میں کوئی بات چیت کیے بغیر سب اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔ زندگی اپنی بے ثباتی کا یقین قدم قدم پر دلاتی ہے۔



کتاب زندگی سے تھوڑے اوراق اور پلٹے۔ میں فرسٹ ایئر اچھے نمبروں سے پاس کر کے سیکنڈ ایئر میں آگئی تھی اور پھر سیکنڈ ایئر کے سالانہ امتحانات دے کر آج کل فارغ گھر میں بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ یہ ڈیڑھ سال بخیر وعافیت گزر گیا تھا۔

اس عرصہ میں نانی متواتر جبکہ غفار کبھی کبھار آتا رہا تھا۔ ان دونوں کی زبانی پتا چلا کہ جبار بھائی نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ ممانی اور ماموں ان کے انکار کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ جبار بھائی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تمام عمر شادی نہیں کریں گے۔

ایک لڑکی کی محبت میں ساری زندگی کی خوشیاں تیاگ دینا میرے لیے تو بڑے تعجب کی بات تھی۔ ان جیسا خشک مزاج آدمی اتنی سنجیدگی سے کسی کو چاہ سکتا ہے۔ واقعی بڑا حیران کن تھا۔

ایک دن غفار آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ دوستوں کے ساتھ تین ماہ کے لیے ورلڈ ٹور پر جا رہا ہے اس لیے ہم سب سے ملنے آیا ہے۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب وہ ہم سب لوگوں کے درمیان بیٹھا اپنی دلچسپ باتوں سے ہمیں ہنسنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”کب تک آ جاؤ گے؟“ امی نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تین ساڑھے تین ماہ تو لگ جائیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”چلو بیٹا، خیریت سے جاؤ اور خیریت سے لوٹ آنا۔“ امی نے دعا دی۔

”امی کی بات کا مطلب تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔“ بلال بھائی شرارت سے بولے۔

”پھوپھو نے مجھے دعا دی ہے۔ اس میں سمجھنے نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے۔“

”امی کا مطلب یہ ہے کہ خیریت سے جانا اور خیریت سے آنا یعنی جیسے جا رہے ہو ویسے ہی واپس آنا۔ ساتھ کوئی

ولایتی میم نہ اٹھالانا۔“ بلال بھائی کی بات پر قہقہہ اُمنڈ پڑا۔

”مجھے ولایتی میم کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں اپنے لیے آل ریڈی ایک دیسی میم پسند کر چکا ہوں۔“ غفار

نے آنکھوں میں شرارت بھر کر میری طرف دیکھا تو میں جھینپ گئی۔

”کیا واقعی؟“ سب کی حیرت بھری آواز بلند ہوئی۔

”جی بالکل۔“ وہ اتر آیا۔

”کون ہے وہ غفار بھائی، ہمیں بتائیں نا۔“ مہوش نے ضد کی۔

”اس ٹور سے واپس آ کر بتاؤں گا۔“

”پراس۔“ مہوش چپکی۔

”پکا پراس۔“

”میں تو کہتی ہوں تم جلدی سے منگنی کرلو۔“ امی نے مشورہ دیا۔ ”یہ ناہوتہارے آنے تک وہ کسی اور کی ہو جائے۔“

”وہ کسی اور کی کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس بات کا مجھے ہنڈرڈ پرسنٹ یقین ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اور اگر ہو گئی تو؟“ مہوش نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”اگر ہو گئی تو.....“ غفار سوچ میں پڑ گیا۔ ”ہوں..... تو میں اسے اور اس کے شوہر کو قتل کر دوں گا۔“ اس کی اس بات پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

”قتل و عارت گری سے بہتر ہے کہ اس کے حقوق ملکیت اپنے نام کرا کر جاؤ۔“ امی ہنستے ہوئے بولیں۔

”اب تو وقت نہیں ورنہ آپ کے مشورے پر ضرور عمل کرتا۔ پرسوں میری فلائٹ ہے۔ سفر سے واپسی پر سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔“ اس کی نظریں میری طرف اٹھیں تو میں اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی نگاہوں کی تپش مجھے پکھلا رہی تھی۔

”اچھا پھوپھو، اب اجازت دیں۔“ اس کی آواز اندر تک آرہی تھی۔ ”ابھی مجھے کچھ ضروری شاپنگ بھی کرنی ہے۔“

”اچھا بیٹا۔“ امی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”خدا تمہاری حفاظت کرے۔“

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی غیر موجودگی میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ ہر جذبہ، ہر رشتہ۔

☆.....

اور پھر غفار چلا گیا۔ بلال بھائی اسے ایئر پورٹ چھوڑنے گئے۔ غفار کو گئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ اس کے خیریت سے پہنچ جانے کا فون آچکا تھا۔ آج میں سو کر اٹھی تو طبیعت پر کسٹمندی سی طاری تھی۔ مہوش سکول جا چکی تھی جبکہ بلال بھائی اور ابو بھی فیکٹری کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے لیے ناشتہ بنایا۔ ناشتہ کرنے کے بعد چائے تیار کی، مگ میں ڈالی اور مگ پکڑے چھت پر چڑھ آئی۔ آسمان سفید سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ساتھ ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں چھت پر پڑی پلاسٹک کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔

چائے ختم ہونے تک میں فیصلہ کر چکی تھی کہ آج موسم خوشگوار ہونے کی وجہ سے چھت پر پینٹنگ بنائی جائے۔ میں خالی مگ ہاتھ میں لیے نیچے آئی اور ملازمہ کو آوازیں دینے لگی۔

”رجو..... رجو بات سنو ذرا۔“

رجو برتن دھوتے ہوئے ہاتھ روک کر کچن سے باہر آ گئی۔

”جی چھوٹی بی بی۔“ وہ ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

”رجو میں نے کچھ سامان چھت پر لے کر جانا ہے۔ ذرا میری مدد تو کرو۔“

میں نے کیوس اور اسٹینڈ اسے پکڑایا اور خود رنگ اور برش پکڑ لیے۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ امی نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بھنوائیں چڑھائیں۔
 ”امی چھت پر جا کر پینٹنگ کرنے کا ارادہ ہے۔ کافی دنوں سے یہ تصویر شروع کی ہوئی ہے آج مکمل کر کے ہی نیچے اتروں گی۔“

”چھت پر کیوں، نیچے کیا مسئلہ ہے؟“ امی نے اعتراض کیا۔
 ”امی آج چھت پر بڑی پیاری ہوا چل رہی ہے۔ آج میں کھلی فضا میں کام کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے، جلدی نیچے آ جانا۔ تمہیں پتا ہے نابالاکولڑکیوں کا چھتوں پر چڑھنا سخت ناپسند ہے۔“
 ”امی.....“ میں نے احتجاج کیا۔ ”کیوں ہر بات پر بلال بھائی کی دھمکی دیے لگتی ہیں۔“
 میں دھم دھم کرتی اوپر چڑھ گئی۔ رجو کے ہاتھ سے چیزیں لے کر سیٹ کیں اور تصویر پر کام کرنے لگی۔ میرا دوپٹہ ہوا سے اڑ رہا تھا اور مجھے بار بار سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ ویسے بھی مجھے پینٹنگ بناتے ہوئے ہر چیز کی مداخلت گراں گذرتی تھی۔
 چاہے وہ میرا دوپٹہ ہی کیوں نہ ہو۔

میں نے ارد گرد نظریں دوڑائیں۔ سب گھروں کی چھتیں خالی تھیں۔ یہاں تقریباً ہر گھر ڈبل اسٹوری تھا۔ دوسری منزل کی چھت پر چڑھنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اس لیے لوگ کم کم ہی چھتوں پر دکھائی دیتے تھے۔ ہماری چھت کے ساتھ آئی خالہ کی چھت تھی۔ دونوں چھتوں کے درمیان تین ساڑھے تین فٹ کی منڈی تھی۔ آئی خالہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا بڑا تھا جو بیرون ملک اسٹڈی کے لیے گیا ہوا تھا۔ اور بیٹیاں تقریباً میری اور مہوش کی ہم عمر ہی تھیں۔ دونوں لڑکیوں سے اکثر میل ملاقات ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی چھت پر چڑھ جاتی تھیں اور ایک دو دفعہ وہ اپنی امی کے ساتھ ہمارے گھر بھی تشریف لاجچکی تھیں۔ اسی طرح ہم بھی امی کے ساتھ ان کے گھر جا چکی تھیں۔ ان کو اس گھر میں آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ان کا بھائی ہم نے نہیں دیکھا تھا۔
 میں نے تمام چھتوں کا جائزہ لیا۔ جب تسلی ہو گئی کہ میرے علاوہ کوئی اور ذی روح موجود نہیں تو میں نے دوپٹہ اتار کر کرسی پر رکھ دیا۔ بازو اوپر چڑھالیے اور پورے انتہاک سے تصویر بنانے لگی۔

دوپٹے سے جان چھوٹی تو بال اُڑا کر پریشان کرنے لگے۔ حالانکہ بالوں کو کچھ میں قید کر رکھا تھا۔ مگر پھر بھی چند ٹیس ماتھے پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی تنگ کر رہی تھیں۔ میں نے ان شرارتی لٹوں کی بالکل بھی پروا نہ کی اور پوری توجہ تصویر پر مرکوز رکھی۔ میرے ہاتھ بڑی تیزی اور مہارت سے چل رہے تھے۔

آخر دو ڈھائی گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد وہ تصویر مکمل ہو گئی۔ میں اب اسے فائل بچ دے رہی تھی۔ جب پینٹنگ کمپلیٹ ہو گئی تو میں چند قدم پیچھے ہٹ کر اس کا تنقیدی جائزہ لینے لگی۔ وہ ایک لینڈ اسکیپ تھا۔ جس میں طلوع آفتاب کا منظر دکھایا گیا تھا۔

”واؤ.....“ میں نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکیز کر کہا۔ ”زبردست۔“

”واقعی زبردست۔“ ایک مردانہ آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں چونک کر ادھر دیکھنے لگی۔ آئی خالہ کی چھت پر منڈیر کے بالکل پاس ایک خوش شکل نوجوان بڑی دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے باکی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں چند لمحے تو بالکل ساکت ہونق بنی اسے دیکھتی رہی پھر فوراً مجھے احساس ہوا کہ میرے

اندھوں پر دوشہ نہیں ہے۔ میں نے جھٹ سے پاس پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور اسے سینے پر اچھی طرح پھیلا لیا۔ مجھے خود پر اور اس لڑکے پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ خود پر اس لیے کہ چند فٹ کی دوری پر کوئی غیر مرد مجھے بے باک نظروں سے گھورتا رہا اور مجھے اس کی خبر نہ ہو سکی۔ میں غصے میں تنہا تھی، دنیٰ اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

”اے مسٹر! یہ کیا بد تمیزی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ معصومیت سے بولا۔ ”کیسی بد تمیزی؟“

”کسی لڑکی کو چوری چھپے گھورنا..... بد تمیزی نہیں تو اور کیا ہے۔“

”چوری چھپے کہاں۔ میں تو آپ کے سامنے کھڑا آپ کو دیکھتا رہا۔ اب آپ ہی اتنی بڑی تھیں تو اس میں میرا کیا

تصور۔“

اس کی بات سے میں لا جواب ہو گئی اور پاؤں پختی ہوئی واپس آ کر اپنی تصویر کیئوس سے اتارنے لگی۔ اس نے درمیان والی چھوٹی دیوار پھلانگی اور میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

میں بوکھلا گئی۔ ”آپ یہاں کیوں آ گئے؟ پلیز واپس اپنی چھت پر چلے جائیں۔ کوئی آ جائے گا۔“ میرے ہارے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

”ریلیکس۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کر نرمی سے دبایا۔

”میں صرف یہ تصویر دیکھنے آیا تھا۔ بہت خوبصورت کام کرتی ہیں آپ۔“ وہ اب تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”شکریہ..... اب آپ چلے جائیں..... پلیز.....“ میں رو ہانسی ہو کر بولی۔

”اٹس اوکے..... میں جا رہا ہوں، کل ملیں گے..... بائے۔“

وہ دیوار پھلانگ کر نیچے چلا گیا اور میں بھی تصویر پکڑے نیچے اتر آئی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں نے تصویر لاؤنچ میں رکھی اور کچن میں جا کر ٹھنڈے پانی کا گلاس پی کر اپنے حواس بحال کیے۔ یہ لڑکا تو مجھے مردانے پر تلا ہوا تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو..... اس سے آگے سوچنے کی ہمت نہ ہوئی۔

”رجو.....“ میں نے رجو کو آواز دی۔

”جی بی بی۔“

”چھت پر جا کر میرا باقی سامان لے آؤ۔“

”جی اچھا، بی بی جی۔“

میں لاؤنچ میں صوفے پر بیٹھ گئی اور اس لڑکے کے بارے میں سوچنے لگی۔

یہ آنٹی خالدہ کا کوئی مہمان ہے یا پھر ان کا بیٹا باہر سے آیا ہوا ہے۔ بہر حال جو بھی ہے، ہے خاصا پرکشش اور

جاذب نظر۔

مجھے اس سے کیا۔ جو بھی ہے جیسا بھی ہے جائے بھاڑ میں۔ میں نے فوراً سر جھکا۔

رات کو سوتے وقت پھر وہ نوجوان میرے تصور میں آ گیا۔ اس کا دیکھنا..... اس کا مسکرانا..... اس کا بات کرنا سب کتنا سحر انگیز تھا۔

یہ میں کیا سوچ رہی ہوں، لاحول ولاقوۃ۔ میں نے اپنی سوچوں پر بندھ باندھا اور پھر غفار کے متعلق سوچنے لگی۔ غفار اشاروں کنایوں میں یہ بات بتا چکا تھا کہ وہ آتے ہی میرا ہاتھ مانگ لے گا۔

کیا میں غفار کو پسند کرنے لگی ہوں؟ کیا مجھے غفار سے محبت ہے؟ یہ دو سوال میں نے اپنے دل سے پوچھے ایک کا جواب ہاں میں تھا جبکہ دوسرے سوال کا جواب ”پتا نہیں“ تھا۔ بلکہ شاید نفی میں تھا کیونکہ میں نے غفار کے لیے کبھی اپنے دل میں وہ جذبہ محسوس نہیں کیا جسے محبت کہتے ہیں۔

وہ ایک اچھا انسان تھا اور بحیثیت شوہر قبول کیا جاسکتا تھا، مگر میں نے کبھی اُسے محبوب کے روپ میں نہیں دیکھا تھا۔

.....☆.....

دوسرے دن آنٹی خالدہ کی چھوٹی بیٹی ٹرے اٹھائے آئی۔ ٹرے میں بریانی تھی۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے بریانی کی دیگ پکوا کر پورے محلے میں چاول بانٹے ہیں۔

”کس خوشی میں؟“ میں نے پوچھا۔

”بھیا آئے ہیں اسی خوشی میں۔“ وہ بھی فوراً بولی۔

اچھا تو وہ اس کا بھائی تھا۔ میں سوچنے لگی۔

”کیا تعلیم مکمل ہو گئی ان کی؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”ہاں بالکل۔ اب وہ یہاں نوکری کریں گے اور ہمارے ساتھ رہیں گے۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”اچھا یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ امی نے خالی ٹرے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنی امی کو میری طرف سے

مبارک باد دینا۔“

”جی آنٹی، دے دوں گی۔“

”نورین آپ! آپ ہمارے گھر آئیں نا کسی دن۔ میں آپ کو اپنے بھیا سے ملواؤں گی۔“

”ہاں ہاں، ضرور آؤں گی کسی دن۔“ میں دل میں ہنسی کہ میں ان سے تو مل چکی ہوں۔ وہ چلی گئی تو امی بھی اپنے

کمرے میں چلی گئیں۔ میرا دل چاہا کہ چھت کا ایک چکر لگا کر آؤں۔

ہرگز نہیں۔ میں نے خود کو ڈانٹا اور اپنے کمرے میں آ کر ڈائجسٹ پڑھنے لگی۔ شام کو مہوش نے کہا کہ آؤ آج

چھت پر چلیں تو میں انکار نہ کر سکی۔ میں تو پہلے ہی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی اوپر جانے کا۔ ہم دونوں چھت پر گئیں تو آنٹی خالدہ کی

چھت پر وہ تینوں بہن بھائی بھی چڑھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں کرسیوں پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا

چہرہ کھل اٹھا۔ وہ مسکرایا تو میں جھینپ گئی۔

”اوہ تو یہ ہے ان کا بھائی۔“ مہوش دلچسپی سے بولی۔ وہ منڈیر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

”ہیلو..... شمرہ، نمرہ کیسی ہو دونوں؟“

”اے دن..... مہوش یہ ہمارے بھیا ہیں، فیصل بھیا۔“
 ”ہائے فیصل بھائی! کیسے ہیں؟“ مہوش نے بے تکلفی سے کہا تو میں حیران رہ گئی۔
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ سنا لیں۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔ ”یہ جو محترمہ آپ کے پیچھے کھڑی ہیں۔ ان کا تعارف بھی کروادو۔ خاصی آدم بے زار معلوم ہوتی ہیں۔“
 ”اوہ نو..... یہ میری بڑی بہن نورین ہے۔ نورین ادھر آؤ نا!“ مہوش نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے برابر لاکھڑا کیا۔

”السلام علیکم!“ میں نے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ مسکرایا۔

”تم لوگ ہماری چھت پر آ جاؤ نائل کرتاش کھیلتے ہیں۔“ اس نے آفری۔

”بالکل نہیں، بلال بھائی غصہ کریں گے۔“ میں جلدی سے بولی۔

”یہ بلال بھائی کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ بڑے دبنگ اور رعب والے ہیں۔“ مہوش نے فخر سے کہا۔

”لٹانا ہی پڑے گا آپ کے بلال بھائی سے۔“ فیصل نے کہا تو مہوش نے فٹ سے جواب دیا۔

”جب ملیں گے تو آپ خود مان جائیں گے کہ بلال بھائی واقعی بڑے بارعب ہیں۔“

چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہم نیچے آ گئیں۔ بلال بھائی اور ابو فیکٹری سے آ چکے تھے اور اب لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بلال بھائی نے پوچھا۔

”کہاں تھیں تم دونوں؟“

”ہم چھت پر گئی تھیں۔“ مہوش نے جواب دیا۔

”چھت پر کیا کرنے گئی تھیں؟“ بلال بھائی تیوری پڑھا کر بولے۔

”ویسے ہی بلال بھائی، شمرہ اور نمرہ بھی چھت پر تھیں۔ انہی سے گپ شب لگا رہی تھیں۔“

شمرہ اور نمرہ کا ذکر سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کہ کہیں فیصل کا نام بھی نہ لے دے۔ مگر شکر ہے کہ مہوش کو اتنی سمجھ ضرور تھی کہ اس نے فیصل کا ذکر گول کر دیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ چھت پر ذرا کم ہی جایا کرو۔“ بلال بھائی نے حکم دیا اور خود ابو سے مصروف گفتگو ہو گئے۔

میں اور مہوش کچن میں گھس گئیں جہاں امی کھانا پکا رہی تھیں۔ ہم دونوں ان کی ہیلپ کرنے لگیں۔

☆.....

دو تین دن میں جان بوجھ کر چھت پر نہ گئی۔ چوتھے دن مغرب سے تھوڑی دیر پہلے میں چھت پر گئی تو وہ موجود نہ تھا۔ میں نے سکون کی گہری سانس لی اور چھت پر چہل قدمی کرنے لگی۔

چند منٹ بعد وہ درمیانی دیوار کے پاس کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہائے۔“ اس نے ہاتھ ہلایا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ پھر بولا۔ ”کیسی ہیں؟“
 ”آئی ایم فائن۔“ میں نے روکھے پن سے جواب دیا، پھر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ ”ایک بات
 پوچھوں۔“

”جی پوچھئے۔“ وہ لگاؤ سے بولا۔
 ”آپ کو کوئی کام نہیں سوائے چھت پر کھڑے ہو کر لوگوں کو گھورنے کے۔“ میں نے چوٹ لگائی تو وہ ڈھٹائی
 سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”چھت پر کھڑے ہو کر اگر خوبصورت لوگوں کو دیکھا جائے تو اس سے خوبصورت اور کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔“
 میں جزبہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ مجھ سے اتنی بے زار کیوں ہیں؟“ وہ مظلومیت سے بولا۔
 ”میں آپ سے کیوں بے زار ہونے لگی۔ میرا آپ سے تعلق ہی کیا ہے؟“ میں لا پرواہی سے بولی۔
 ”تو پھر آج سے دوستی کچی۔“ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”اے مسٹر! یہ مغرب نہیں..... مشرق ہے۔ یہاں لڑکیوں اور لڑکوں میں دوستیاں نہیں ہوا کرتیں۔“ میں تنک کر
 بولی۔

”یار..... میں صرف دوست بننے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ مجبہ بننے کے لیے تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔“ وہ شرارت
 سے بولا تو میرے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔

”کس قدر بے باک اور منہ پھٹ انسان ہیں آپ۔ میں آئندہ آپ سے ہرگز بات نہیں کروں گی۔“ میں غصے
 سے واپس پلٹی تو وہ آوازیں دینے لگا۔

”ارے مے سنئے تو..... آئی ایم سوری..... پلیز بات سنیں۔“

میں دندناتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ ہوں..... چھچھورا کہیں کا۔ لڑکیوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ اس کے بعد
 میں ایک ہفتہ چھت پر نہ گئی۔ ساتویں دن گئی تو وہ چار پائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں چہل قدمی کرنے لگی تو اس نے اخبار
 ہٹا کر میری طرف دیکھا۔

کم بخت کو پتا نہیں میری خوشبو آ جاتی ہے۔ فوراً میری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ میں منہ میں بڑبڑاتی چہل قدمی
 کرتی رہی۔ پھر وہ دیوار کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میری نظر اس پر پڑی تو وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کان پکڑ کر
 معافی مانگنے لگا۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بھی مسکرائے لگا۔ میں اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔
 ”ایسی باتیں کرتے ہی کیوں ہیں جن پر بعد میں شرمندگی ہو۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔

”میری نظر میں تو میں نے کوئی غیر اخلاقی بات نہیں کی۔ آپ کے قوانین ہی زیادہ سخت ہیں۔“ وہ احتجاج
 کرتے ہوئے بولا۔

”جو مرضی سمجھ لیں۔ آپ مجھ سے کوئی بھی غیر اخلاقی بات نہیں کر سکتے۔“ میں حتیٰ لچھ میں بولی۔

”اوکے بابا..... اگین سوری.....“

”اٹس اوکے.....“

”اچھا یہ بتائیں کیا کرتی ہیں؟ کیا پڑھتی ہیں؟ کون سی کلاس میں ہیں وغیرہ وغیرہ۔“
میں اس کے سوالوں کے مختصر جواب دینے لگی۔

”ہوں..... تو آپ فائن آرٹس میں ماسٹر کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“ میری باتیں سن کر وہ بولا۔
”ہاں، انشاء اللہ۔“ میں جوش سے بولی۔

”ویسے مجھے نہیں لگتا کہ آپ اپنی منزل پالیں گی۔“

”کیوں؟ آپ کو کیوں نہیں لگتا۔“

”میرا اندازہ ہے۔ حتمی طور پر تو میں آپ کا ہاتھ دیکھ کر ہی بتا سکوں گا۔“

”کیا..... آپ ہاتھ دیکھ سکتے ہیں۔ آپ پامسٹری جانتے ہیں۔“ میں حیرت سے بولی۔

”جی ہاں، لندن میں ہی ایک صاحب سے یہ فن سیکھا تھا۔“

”تو آپ میرا ہاتھ دیکھ کر بتائیں نا! میری قسمت کیسی ہے۔ آنے والے وقت میں کیا کیا ہوگا۔“ میں جوش سے

بولی۔

”ہاں ہاتھ تو میں آپ کا دیکھ سکتا ہوں مگر اس کے لیے آپ کو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا ہوگا۔“ وہ ذومعنی انداز

میں بولا تو میں جھینپ گئی۔

”اوہ، مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔“ میں نے اپنا کانپٹا ہوا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو ہنس کر بولا۔ ”آپ لرز کیوں رہی ہیں؟“

”نہیں..... نہیں تو.....“ میں نے لرزش پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ وہ غور سے میرے ہاتھوں

کی لکیریں دیکھنے لگا۔

”آپ کی مٹگنی ہو چکی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کسی سے محبت کرتی ہیں؟“ اس نے نظریں اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

”پتا نہیں۔“ میں نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل جواب دیا۔

”یہ کیسا جواب ہے؟“ وہ حیران ہوا۔

”آپ جلدی سے یہ بتائیں کہ میں آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کروں گی کہ نہیں؟“ میں نے بے چینی سے

پوچھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں۔ آپ کو جیون ساتھی بھی آپ کی پسند کا نہیں

ملے گا اور ناموری کی بھی کوئی لکیر آپ کی ہتھیلی پر نہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا تو اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”ایک منٹ..... ابھی کچھ اور بھی دیکھنا باقی ہے۔“ وہ میرے ہاتھ کو ٹیڑھا میڑھا کر کے دیکھنے لگا۔

”نورین.....“ بلال بھائی کی چٹکھاڑتی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں بوکھلا کر پلٹی۔ بلال بھائی میرے پیچھے کھڑے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”بلا..... بلال..... بھائی.....“ الفاظ میرے گلے میں پھنس گئے۔

بلال بھائی نے ایک زوردار طمانچہ میرے گال پر مارا، جس کی شدت سے میں نیچے گر گئی۔ پھر انہوں نے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ سیزھیوں سے گھسیٹتے ہوئے مجھے نیچے امی کے سامنے لا پٹا۔ تکلیف اور ذلت کی شدت سے میرے آنسو بہہ رہے تھے۔

”اس کو سنبھال کر رکھیں۔ کتنی مرتبہ میں نے آپ کو کہا تھا کہ یہ دونوں چھت پر نہ جائیں۔“ بلال بھائی اب امی پر گرج رہے تھے۔

”ہوا کیا ہے آخر پتا تو چلے۔“ امی بھی پریشان ہو گئیں۔ مہوش بھی کرے سے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہمسایوں کے لڑکے سے پیار کی پیٹنگیں بڑھا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے۔“

اُف بلال بھائی کی باتیں تھیں کہ پکھلا ہوا سیسہ۔ جس نے میری قوتِ سماعت کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ امی بڑے تاسف سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں امی کی نظروں کی تاب نہ کر رہی ہوئی۔

”امی ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں بے قصور ہوں۔“

”مجھے جھوٹا کہہ رہی ہے۔ حرافہ کہیں کی۔“ بلال بھائی مجھے تھپڑوں سے مارنے لگے۔ امی مجھے بچانے کے لیے میرے آگے ڈھال بن گئیں۔ مہوش بھی رونے لگی۔ بلال بھائی پاؤں پٹختے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ امی مجھے ساتھ لیے میرے کمرے میں آئیں۔ مجھے بیڈ پر بٹھایا، خود بھی میرے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔

”امی، پلیز چپ کر جائیں۔ بلال بھائی بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ میرا اس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں۔“

”کتنی دفعہ تم دونوں بہنوں سے کہا تھا کہ چھت پر مت جایا کرو۔ تمہارا بھائی بہت تنگ ذہن اور سوچ کا مالک ہے۔“

”ابو آئیں گے تو میں بلال بھائی کی خوب شکایتیں لگاؤں گی۔ ان کی جرأت کیسے ہوئی ہے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی۔“ میری عزت نفس بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ کبھی کسی نے مجھے پھول تک نہ مارا تھا کجا یہ کہ بلال بھائی نے اتنی بے دردی سے مجھے تھپڑ مارے تھے کہ میرا چہرہ جل رہا تھا۔ گالوں پر ان کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔

”یہ دعا مانگو کہ تمہارے ابو تمہاری بات کا یقین کر لیں۔“ امی فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔

”کیا مطلب امی! ابو بھلا میری باتوں کا یقین کیوں نہیں کریں گے۔“

”بیٹی، ان معاملات میں عورت کی پوزیشن بڑی کمزور ہوتی ہے۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی کہے یقین نہیں کیا

جاتا۔“

”میرے ابو ایسے نہیں ہیں۔ وہ میری ہر بات پر یقین کرتے ہیں۔ ان باتوں پر بھی کریں گے۔“ میں آنسو

پوچھتے ہوئے پورے دثوق سے بولی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ امی زیر لب بولیں۔

پھر رات ہوئی۔ رات کا کھانا سب نے ٹیبل پر بیٹھ کر خاموشی سے کھایا۔ رورو کر میری آنکھیں سوچ چکی تھیں۔ چہرہ پتھروں کی وجہ سے متورم ہو گیا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ کھانے میں صرف اس لیے شامل ہوئی تھی کہ ابو میری طرف دیکھیں گے تو تڑپ اٹھیں گے۔ مجھ سے میری بد حالی کی وجہ پوچھیں گے اور میں رورو کر بلال بھائی کے مظالم بیان کروں گی۔ پھر ابو جی بھر کر انہیں ڈانیں گے۔ مجھے گلے لگا کر تسلی دیں گے۔

مگر یہاں تو بالکل الثامہ معاملہ تھا۔ ابو نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا تک نہیں۔ خاموشی سے سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ بلال بھائی بھی خاموش تھے۔ بہر حال ایک بات تو عیاں تھی کہ کوئی بھی فرد کھانا رغبت سے نہیں کھا رہا تھا۔ سب برائے نام ہی زہر مار کر رہے تھے۔ میں نے ایک دو لقمہ لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔ چند لمحوں تک بیٹھی سب کا جائزہ لیتی رہی اور پھر غصے سے پیچ و تاب کھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گر گئی۔ مجھے روتے ہوئے آدھا گھنٹہ گذر گیا، جب امی مجھے بلانے آئیں۔

”تمہارے ابو تمہیں بارہا کہتے ہیں۔“ امی تھکی تھکی آواز میں بولیں۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”آپ نے ابو سے ساری بات کی ہے نا! ابو کو یقین ہو گیا نا کہ میں بے قصور ہوں۔ بلال بھائی بہتان لگا رہے ہیں مجھ پر۔“ میں پھر سے پر امید ہو گئی۔

”جو بھی کہنا ہے اپنے ابو کے سامنے جا کر کہو۔“ امی سپاٹ لہجے میں بولیں۔

”ہاں تو کہہ دوں گی۔ میں بلال بھائی کے سامنے ہر بات کروں گی۔ میں ڈرتی نہیں ہوں ان سے۔“ میں نے پاؤں چپل میں گھسیڑے۔ دوپٹہ درست کیا اور امی کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ ڈرائنگ روم میں اس وقت ابو اکیلے بیٹھے تھے اور کسی سوچ میں گم تھے۔ بلال بھائی اس وقت یا تو اپنے کمرے میں تھے یا پھر گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

میں ادرا می خاموشی سے ان کے سامنے جا بیٹھیں۔ ابو نے نظریں اٹھائیں اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں ان کی آنکھوں کا خالی پن دیکھ کر لرز گئی۔ وہ آنکھیں جن میں ہر وقت میرے لیے محبت اور شفقت اُمنڈتی رہتی تھی، اس وقت بالکل سرد اور بے تاثر تھیں۔

”نورین!“ ابو نے مجھے پکارا تو ان کی آواز بھی سپاٹ اور بے تاثر تھی۔

”جی ابو۔“ میں کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں تم سے چند باتیں کروں گا۔ جو تم نے غور سے سنی ہیں۔ ان باتوں پر نہ تو تم نے کوئی اعتراض کرنا ہے اور نہ ہی احتجاج۔“ ابو حتی لہجے میں بولے۔

میں خاموش رہی مگر میرا دل انجانے اندیشوں سے دہل رہا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ انہونی ہونے والی ہے۔

ابو نے گلا کھنکھارایا، جیسے بات شروع کرنے کے لیے الفاظ سوچ رہے ہوں۔ پھر چند لمحوں بعد بات شروع کی۔

اتنی دیر تک میری جان جیسے سولی پر لگی رہی۔

”تمہارا الف۔ اے کارزلٹ کب تک آجائے گا۔“ ابو نے پوچھا۔

”تقریباً ایک ماہ تک آجائے گا۔“ میری آواز جیسے اندھے کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

”ہوں.....“ ابوسوج میں پڑ گئے۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہاری شادی کر دی جائے۔“ ابورک رک کر

گہری سنجیدگی سے بولے۔

”کیا؟“ میرے سر پر گویا ساتوں آسمان گر پڑے۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ ابو۔ آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا خواب دیکھ رکھے ہیں۔“ میں چلائی۔

”آواز نیچی کر کے بات کرو۔“ ابو غرائے۔ ”جتنا پڑھنا تھا اتنا پڑھ لیا ہے۔ مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ تین

ماہ کے اندر اندر تمہاری شادی ہو جائے گی۔ زائدہ اس کی شادی کی تیاری کرو۔“ ابو نے امی کو حکم دیا۔

میں نے رونا شروع کر دیا۔ مجھے اس صورت حال کی توقع بالکل بھی نہیں تھی۔

”ابو میں جانتی ہوں بلال بھائی نے آپ کے کانوں میں زہرا نڈیلا ہے۔ مگر ابو جو کچھ انہوں نے آپ کو بتایا ہے

وہ سچ نہیں ہے۔ بعض اوقات آنکھوں دیکھی حقیقت بھی سچ نہیں ہوتی۔“ میں زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اور ہاں، اس کا گھر سے باہر اکیلے لکھنا اور چھت پر چڑھنا بند۔“ ابوکھور بنے مزید احکامات صادر کیے جا رہے

تھے۔

میں اٹھ کر ابو کے قدموں پر گر گئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ابو کے پاؤں پکڑ کر ان پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔ ”ابو

پلیز ایسا نہ کریں۔ مجھے پڑھنے دیں۔ آپ نے تو خود مجھے اتنے اونچے اونچے خواب دکھائے تھے۔ اب کیسے ان خوابوں کو

چکنا چور کر سکتے ہیں۔“

ابو نے تو میرے سر پر ہاتھ رکھا اور نہ مجھے چپ کروانے کی کوشش کی۔ بلکہ امی کو کرحمت آواز میں حکم دیا کہ

زائدہ اسے باہر لے جاؤ۔

امی نے بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور مجھے کھینچتی ہوئی باہر لے آئیں۔ میں امی کے ساتھ گھسٹتے ہوئے بھی اُمید

بھری نظروں سے ابو کی طرف دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ ابھی اٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیں

گے۔ میرے آنسو پونچھیں گے۔ میری پیشانی چومیں گے اور کہیں گے۔ لگی میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں بھلا اپنی پیاری بیٹی

نورین فلک ناز کے ساتھ ایسا گھٹیا سلوک کر سکتا ہوں۔ مگر یہ سب میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ ابونگاہیں جھکائے آرام سے

بیٹھے رہے۔ انہوں نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر گر گئی۔ میری حالت مُردوں سے بھی بدتر تھی۔ میرا دماغ بری طرح چکرارہا تھا۔

مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہنے والے میرے باپ کو مجھ پر رتی برابر بھی یقین نہ تھا۔ اس نے میرا جرم پوچھنا نہ مفاہی مانگی۔

سیدھی سزا سنائی۔ سزا سنانے سے پہلے جج بھی مجرم کو صفائی کا حق دیتا ہے مگر میرے باپ نے تو مجھے کوئی بھی حق نہ دیا۔

میں روتی رہی اور تکیہ بھگوتی رہی۔ امی بار بار میرے پاس آئیں، مجھے تسلیاں دیتیں۔ مگر اُن کے کھوکھلے الفاظ

میرے زخموں کا مرہم نہ بن سکے۔ وہ رات میرے لیے صرف آنسوؤں کی سوغات لے کر آئی۔ پوری رات میں جاگتی رہی

اور روتی رہی۔ اپنی پارسائی کیسے ثابت کروں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مہوش بھی مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتی رہی، بالآخر وہ تھک ہار کر سو گئی۔ مگر میں نے پوری رات کانٹوں پر گزار دی۔ صبح ہونے تک میں تیز بخار کی حدت سے جل رہی تھی۔ مہوش جاگی تو میری حالت دیکھ کر امی کو بلا لائی۔ امی میری حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر ماتھے پر رکھنے لگیں۔

مہوش میرے لیے چائے کا مگ اور ساتھ پینا ڈول گولیاں لے آئی۔ امی نے زبردستی اٹھا کر مجھے چائے پلائی اور گولیاں کھلائیں۔ دوپہر تک میری طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ مجھے ابھی تک ابو سے توقعات تھیں کہ انہوں نے یہ سب مجھے ڈرانے دھمکانے کے لیے کہا ہے۔ عملی طور پر وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ انہی اُمیدوں کے سہارے دو تین دن گذر گئے۔ اس دوران نہ ابو مجھے ملے اور نہ بلال بھائی میرے سامنے آئے۔

میں بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہی۔ چوتھے دن ابو اور بلال بھائی لاؤنچ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ شاید ابھی ابھی فیکٹری سے آئے تھے۔ امی اور مہوش کچن میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ میں اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی جو لاؤنچ میں کھلتا تھا۔ ابو اور بلال بھائی صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان دونوں کی پشت میری طرف تھی۔ ان دونوں کی گفتگو سننے کے لیے میں تھوڑا آگے آ گئی۔ مجھے شک تھا کہ وہ میرے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ اسی تجسس نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ میں دبے پاؤں ان سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔

”اباجان! آخر اس لڑکی کا پتا چل ہی گیا۔“ بلال بھائی جوش سے بولے۔

”کس لڑکی کا؟“ ابو نے پوچھا۔

”وہی لڑکی..... شیرا کی بہن..... جو گھر سے بھاگ گئی تھی۔“

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بلال بھائی یقیناً کنول کا ذکر کر رہے تھے۔ کنول کو گھر سے فرار ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اب تو میں کنول کی جانب سے بے فکر ہو گئی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ کنول ان لوگوں کی دسترس سے بہت دور چلی گئی ہے۔ وہ اپنی دنیا میں خوش اور گمن ہوگی۔ اب تک تو شاید اس کا کوئی بچہ بھی ہو چکا ہوگا۔ میں ہر روز تصور کی آنکھ سے دیکھتی کہ کنول اپنے بچے کو چھو لے میں ڈال کر جھولا جھلا رہی ہے اور اس کا بچہ قلقاریاں مار کر ہنس رہا ہے۔ کنول کا بچہ بھی کنول کی طرح بے حد خوبصورت ہے۔

بلال بھائی کی بات نے مجھے بے چین کر دیا۔

”تو پھر..... شیرا کو بتا دیا ہے کیا؟“ اب ابو بھی بڑی دلچسپی سے پوچھ رہے تھے۔

”نہ صرف بتا دیا ہے بلکہ بیس بورکار یو اور بخشی دیا ہے اسے گولیوں سمیت۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ کام کرنے کے بعد سیدھا یہیں چلے آنا۔“ بلال بھائی نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

”شاباش..... یہ تو نے اچھا کیا۔ اسے کچھ رقم دیں گے اور علاقہ غیر کی طرف بھیج دیں گے۔ جب کیس ٹھنڈا ہوگا

تو واپس آجائے گا۔“

ابو اور بلال بھائی کی باتیں سن کر میرے جسم میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ میں بمشکل اپنے بے جان وجود کو کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لائی اور بیڈ پر گر کر ہانپنے لگی۔

اودہ میرے خدا..... اتنے ظالم لوگ..... ایک خوبصورت جیتی جاگتی..... ہنسی بستی..... لڑکی کو..... اس لیے قتل کرنے جا رہے تھے..... کہ اس نے اپنی پسند سے شادی کر لی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔



اس بات کو سننے کے بعد میرا چین و سکون سب ختم ہو گیا۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ شیرا کنول کو مار رہا ہو گا یا مار چکا ہو گا یا مارنے والا ہو گا۔ یا خدا کنول کو بچالے۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگی۔ اسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گزر گیا اور یہ ایک ہفتہ کیسے گزرا میں جانتی تھی یا میرا خدا۔

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے جب ڈور بیل ہوئی۔ امی اور مہوش بازار گئی تھیں۔ اس وقت میں اکیلی تھی یا پھر ابو جان ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں نے اندروانی دروازہ کھولا تو میرے سامنے شیرا بہتر حالت میں کھڑا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ شیوئی دن کی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ میں اسے سامنے دیکھ کر کانپ گئی۔

”چاچا زمان کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔“ وہ اضطراری طور پر دائیں و یکھ رہا تھا۔

”وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔“ میں ایک طرف ہوتے ہوئے بولی تو وہ اندر آ گیا اور ڈرائنگ روم کے پاس جا کر دروازہ ناک کرنے لگا۔ اندر سے ابو نے آواز دی تو وہ اندر چلا گیا۔ اندر جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں گھوم کر دوسرے دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی جولاؤنچ میں کھلتا تھا۔ وہ دروازہ تھوڑا ادا تھا اور باتوں کی آواز باہر آ رہی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر کان لگا دیے۔

”کام ہو گیا.....“ ابو کی سرسراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”جی چاچا، کام ہو گا۔“ شیرا کی تبھی ہوئی آواز آئی۔

”اکیلی تھی یا.....“ ابو نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”نہیں چاچا..... اکیلی نہیں تھی..... اس کا شو ہر بھی گھر میں موجود تھا۔“

میں نے آدھ کھلے دروازے کی درز سے اندر جھانکا۔ دروازے کے آگے پردہ جھول رہا تھا۔ لیکن ہوا سے ہلتے ہوئے پردے سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ابو صوفے پر براہمان تھے۔ شیرا ان کے بالکل سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ میرا دل انجانے اندیشوں سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کہیں یہ کنول کا بھائی کنول کی موت کی خبر تو لے کر نہیں آ گیا۔

”تو کیا دونوں کو ختم کر دیا؟“ ابو کی یہ بات میری سماعت پر تھوڑے کی طرح لگی۔

”ہاں چاچا..... دونوں کو مار دیا۔“ شیرا کی آواز مزید بوجھل ہو گئی۔ ”وہ صحن میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ ایک خوبصورت سا بچہ اس کے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا۔ وہ بچہ بہت خوبصورت تھا چاچا، بالکل کنول جیسا۔“ شیرا یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ابو نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ابو کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر رونے کے بعد شیرا نے خود پر کنٹرول کیا۔ آنسو پونچھے اور پھر سے بتانے لگا۔

”میں اس کے گھر میں داخل ہوا تو وہ صحن میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اس کا ننھا منہ بچہ پاس بیٹھا کھیل رہا تھا۔“

کنول کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں میں میرے لیے محبت لہرائی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ بھائی تم..... مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں موت کا خوف سمٹ آیا۔

میں نے پستول نکال کر اس کی طرف سیدھا کیا تو وہ مننائی نہیں بھائی..... خدا کے لیے..... ایسا مت کرو..... میری جان مت لو..... میرا بچہ رُل جائے گا..... بھائی میرے بچے کے لیے میری جان بخش دو..... وہ مٹیں کر رہی تھی۔ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ مگر میرے سر پر تو اس وقت خون سوار تھا۔ ڈیڑھ سال سے اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اتنی مشکلوں سے ہاتھ آئی تھی۔ اس کو مار کے اپنی ناک بھی تو اونچی کرتی تھی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ فاروں کی آواز سن کر اس کا پچروٹنے لگا اور اس کا شوہر لپک کر کمرے سے باہر آیا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ میں نے تین فائر ہی اس کے جسم پر داغے۔ اس کا جرم تو کنول سے بھی بڑا تھا۔ اس کیلئے ہی میری معصوم بہن کو ورغلا کر گھر سے بھاگنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ وہ بھی وہیں گر گیا اور میں بھاگ کر یہاں آ گیا۔ ان کا گھر گاؤں سے قدرے ہٹ کر تھا اسی لیے لوگوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

میں پتھر بنی بے حس و حرکت یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا جیسے میری تمام حسیں مفلوج ہو گئی ہوں۔ اندر ڈرائنگ روم میں بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند منٹوں بعد ابو نے اپنی جیب سے ہزار والے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور سینٹرل ٹیبل پر رکھی۔

”اسے اٹھا لو اور چند مہینوں کے لیے کہیں دور نکل جاؤ۔ پھوپھی زینب کی فکر نہ کرو۔ اسے غفور اپنے گھر لے گئے۔ وہاں اس کی اچھے طریقے سے دیکھ بھال ہو رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے چاچا..... جیسا آپ کہتے ہیں۔“ اس نے یہ کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھے۔ ابو بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ جانے کے لیے مڑا۔ چند قدم چل کر رک گیا پھر ابو کی جانب مڑا اور بولا۔

”چاچا..... کنول کے بچے کا کیا قصور ہے۔ اسے کس جرم کی سزا ملی ہے۔ اسے کون ماں باپ کا پیار دے گا۔ اسے کون پالے گا۔“ وہ پھر سے رونے لگا۔

میں ناکلیں کھینچتی ہوئی بمشکل اپنے کمرے میں پہنچی۔ وہاں جا کر بیڈ پر گری تو پھر کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔

☆.....

آنکھیں کھلیں تو خود کو ہسپتال کے صاف ستھرے کمرے میں پایا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو نانی کو اپنے سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے دیکھا جو آنکھیں بند کیے تیج کے دانے گرا رہی تھیں۔

”نانی جان۔“ میں نے نقاہت سے پکارا۔

نانی نے میری آواز سن کر جھٹ آنکھیں کھولیں اور مجھے ہوش میں دیکھ کر میری طرف لپکیں۔

”نور، میری جان..... ہوش میں آگئیں تم۔“ وہ میری بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔

”مجھے کیا ہوا تھا نانی؟“ میں نے اپنے بازو میں لگی ڈرپ کو دیکھ کر کہا۔

”چند اتم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ پورے چار دن بعد ہوش میں آئی ہو۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ تم نے کوئی بہت بری

خبر سنی ہے جس کی وجہ سے تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں کو تو یہ خدشہ بھی لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں تم کو مے میں نہ چلی جاؤ۔ شکر ہے خدا کا تمہیں ہوش آ گیا۔“

بری خبر کا سن کر میری آنکھوں کے سامنے ابو اور شیراکا وہ منظر تازہ ہو گیا جس میں شیرابو کو کنول کی موت کی خبر سنا رہا تھا۔ مجھے وہ ساری باتیں یاد آئیں تو میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار ابو سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اگر ابو شیراکا ساتھ نہ دیتے تو شیرا شاید کبھی کنول کو مارنے میں کامیاب نہ ہو پاتا۔

”نانی! امی کہاں ہیں؟“

”صبح سے تو یہیں تمہارے پاس بیٹھی تھی۔ اب گھر گئی ہے۔ ان چار دنوں میں سبھی آتے رہے ہیں۔“ نانی نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کیا ابو اور بلال بھائی بھی؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں ہاں، سب ہی آتے رہے ہیں۔ تمہاری ممانی اور ماموں بھی آئے تھے کل۔ سارا دن تمہارے پاس بیٹھے رہے ہیں۔ تم ہوش میں ہوتی تو تمہیں کچھ پتا چلتا نا۔ ویسے نورین ایسی کیا بات ہو گئی کہ تم اپنے حواس کھو بیٹھیں۔“ نانی کریدنے لگیں۔ میں نے آنکھیں موند کر خاموشی اختیار کر لی تو نانی بھی چپ ہو گئیں۔

.....☆.....

دوسرے دن ڈاکٹروں نے چھٹی دے دی اور میں گھر آ گئی۔ بلال بھائی نے ہوسپتال کے بقایا جات ادا کیے تھے اور ان کے ساتھ ہی میں گاڑی میں بیٹھ کر گھر آئی تھی۔ گاڑی وہی ڈرائیور کر رہے تھے۔ اس دوران نہ انہوں نے مجھے بلایا اور نہ میں نے۔ گھر آئی تو ابو جان لاؤنچ میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا اور خیریت دریافت کی۔ میں نے بھی سرسری سے جوابات دیئے اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

نانی، امی اور مہوش بھی میرے ساتھ میرے کمرے میں آ گئیں۔ میں بیڈ پر لیٹ گئی اور وہ پاس بیٹھ گئیں۔

”مہوش جاؤ سا جدہ سے کہو کہ نورین کے لیے یخنی چڑھا دے۔“ امی نے مہوش کو آڑ دیا۔

مہوش چارو ناچار اٹھی اور باہر نکل گئی۔

”ہاں اب بتاؤ نورین، ایسی کیا بات ہو گئی تھی میری غیر موجودگی میں۔“ امی نے مجھ سے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں امی۔“ میں ہچکچی آواز میں بولی۔

”دیکھو چندا، جب تک تم ہمیں ساری بات کھل کر نہیں بتاؤ گی ہمیں کیسے پتا چلے گا۔“ نانی بولیں۔ ”زاہدہ تم بتاؤ،

اُس دن کیا ہوا تھا؟“

”امی، اس دن میں اور مہوش بازار گئی تھیں۔ اسے اپنا سکول بیگ اور شو خریدنے تھے۔ جب ہم عصر کے وقت واپس آئیں تو یہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ پہلے تو ہم یہی سمجھتی رہیں کہ سوئی ہوئی ہے۔ ہم نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں اور مہوش خود ہی رات کا کھانا تیار کرنے لگیں۔ مگر جب دو تین گھنٹے گزر گئے اور یہ نہ جاگی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ آکر اسے ہلایا تو پتا چلا کہ یہ بے ہوش ہے پھر فوراً اس کے ابو کو ہتایا جو ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اسے گاڑی میں ڈالا اور ہوسپتال لے گئے۔ جہاں ڈاکٹروں نے امپرہنسی میں اس کا چیک اپ کیا اور اور ہتایا کہ اس نے کوئی

بہت اندوہناک واقعہ دیکھا ہے یا بہت دل دہلا دینے والی کوئی خبر سنی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا ندوس بربک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر یہ دو تین دن تک ہوش میں نہ آئی تو ہو سکتا ہے کہ مایں چلی جائے۔ یہ خبر سن کر ہمارے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کے ابو تو حد درجہ پریشان ہو گئے۔ اسی پریشانی میں آپ لوگوں کو اطلاع دی۔ اس کے چاچا اور چاچی کو فون کیا۔ ذرا سی دیر میں سبھی آ گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا ہماری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے تو دل ہی دل میں کتنی منتیں مان لی تھیں۔ اس کے ابوسب کے سامنے تو بہادر بنے پھرتے تھے مگر چوری چھپے یقیناً روتے رہتے تھے۔ کیونکہ ان کی آنکھیں سو جی ہوتی تھیں۔

چوتھے دن جب اس نے آنکھیں کھول کر آپ کو پکارا تو سب کی جان میں جان آئی۔

امی نے ساری سرگذشت نانی کو سنائی۔ میں بھی خاموشی سے سنتی رہی۔ امی کی آخری بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ ابو میری خاطر اتنے پریشان رہے ہیں اور روتے رہے ہیں۔ اس دوران مہوش دوبارہ ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

”چلو نورین بیٹی، جلدی سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟“ امی نے پھر پوچھا تو میری آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔

”امی..... شیر..... نے کنول کو..... مار دیا۔“ یہ کہہ کر میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”کیا؟“ امی نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

نانی بھی تاسف سے دونوں ہاتھ ملنے لگیں۔ مہوش کا منہ بھی کھلے کھلا رہ گیا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ مہوش کی سرسراتی آواز نکلی۔

”میں نے خود اپنے کانوں سے شیر اور ابو کے درمیان ہونے والی ساری باتیں سنی ہیں اور..... سب سے زیادہ..... دکھ کی بات تو..... یہ ہے کہ..... ابو نے یہ سب کچھ کروایا ہے۔“ میں ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور ان کو بتا رہی تھی۔ میں روتی رہی اور بتاتی رہی اور وہ تینوں گم سم بیٹھی سنتی رہیں۔

”امی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے ابو کسی کو قتل بھی کروا سکتے ہیں اور وہ بھی دو بے گناہ اور معصوم انسانوں کو..... ان کا جرم کیا تھا..... یہ کہ انہوں نے محبت کی تھی۔ کیا محبت کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ..... اس کی پاداش میں جان دینی پڑے۔“ میری آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی اور یقیناً باہر بیٹھے ابو کے کانوں تک با آسانی پہنچ رہی تھی۔

”نورین آہستہ بولو۔ تمہارے ابو اور بلال نہ سن لیں۔“ امی نے سمجھایا۔

”جو سنتا ہے..... سن لے..... مجھے کسی کی پروا نہیں۔“ میں ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ درندے ہیں یہ لوگ..... اپنے جیسے انسانوں کا شکار کرتے ہیں۔“ میری چیخوں کی آواز سن کر بلال بھائی آگ بگولا ہو کر میرے کمرے میں آئے۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟ یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟“ وہ میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”کچھ نہیں بیٹا۔ بس اس کے دماغ پر دو انیوں کا اثر ہو گیا ہے۔“ نانی نے جلدی جلدی بات سنہالی۔

”میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔“ میں چلائی۔ ”ان بے رحم قاتلوں کو پہچان گئی ہوں۔ ان قاتلوں کے ساتھ

مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔ مجھے جب بھی موقع ملا میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی، کنول کی طرح۔“ چیختے چلاتے میرا گلا خشک ہو گیا۔ میری آنکھیں وحشت سے پھیل گئی تھیں۔ منہ سے بھاگ لکل رہا تھا۔ میں بلال بھائی کو قہرناک

نظروں سے گھور رہی تھی۔

”تو پھر کان کھول کر سن لو۔“ بلال بھائی انگلی کھڑی کر کے چنگھاڑے۔ ”تمہارا انجام بھی وہی ہوگا..... جو کنول کا

ہوا ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں پھر چلائی۔ ”میں کنول نہیں ہوں..... میں نورین ہوں..... میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے

گزاروں گی..... جو میرا دل کہے گا وہ کروں گی..... نہیں کرنی مجھے شادی..... کروا کے دیکھو میری شادی..... میں دیکھتی ہوں

کیسے کرتے ہیں آپ لوگ میری شادی.....“ اس وقت مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کے اندر کسی جن کی روح گھس آئی

تھی۔ نانی، امی اور مہوش بھی ششدر بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

”اگر تمہاری پندرہ دنوں کے اندر اندر شادی نہیں کروائی تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔“ بلال بھائی نے اپنے

چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو ان کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے باہر چلے گئے تو امی اور نانی رونے لگیں۔

”کیوں اپنے لیے مشکلات کھڑی کر رہی ہو نورین؟“ امی نے روتے ہوئے کہا۔

”کیا ضرورت تھی بھائی کے آگے اتنی بحث و تکرار کرنے کی۔“ نانی بھی فکر مند ہو رہی تھیں۔

”بلال بھائی ضد کے پکے اور بہت ہٹ دھرم ہیں۔ اب نجانے کیا ہوگا۔“ مہوش بھی تشویش ناک لہجے میں

بولی۔

”کیا ہوگا.....“ میں لا پرواہی سے بولی۔ ”زیادہ سے زیادہ کیا کر لیں گے۔ مجھے بھی کنول کی طرح جان سے مار

دیں گے..... مار دیں..... اس زندگی سے تو موت زیادہ اچھی ہے، جس زندگی میں انسان کے لیے زندہ رہنے کا کوئی مقصد

ہی نہ ہو۔

☆.....

بلال بھائی کتنے ضدی اور ہٹ دھرم ہیں اس کا اندازہ مجھے اگلے تین دن میں ہی ہو گیا۔ انہوں نے میری

ہسٹریائی انداز میں کبھی گئی باتوں کو دل پر لے لیا اور اپنے لیے انا کا مسئلہ بنالیا۔

مجھے امی کے ذریعے پتا چلا کہ انہوں نے ابو سے میری شادی کی بات کی ہے۔ ابو نے ٹال مٹول سے کام لیا تو

انہوں نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی۔ جو کارگر ثابت ہوئی۔ کیونکہ ابو اپنی جائیداد اور گھر کے اکلوتے وارث کو کھونا نہیں

چاہتے تھے اور پھر میں اب ابو کی نظروں میں مٹھو کہ ہو چکی تھی۔ کیونکہ ابو نے میری اور بلال بھائی کی تمام گفتگو باہر کھڑے

ہو کر سنی تھی۔

بلال بھائی نے امی اور نانی کو سختی سے تنبیہ کی کہ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑا جائے اور نہ چھت پر

چڑھنے دیا جائے۔

مجھے دل میں ہنسی بھی آرہی تھی اور افسوس بھی ہو رہا تھا کہ بلال بھائی نے کیسے رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ آنکھوں کے

دپے ہوئے دھوکے کو بنایا دینا کراس پروہم کی عمارت کھڑی کر دی۔ یہ سارا قصور ان کی تنگ نظری اور سطحی سوچ کا تھا۔

ہونہ..... میں بھی دیکھتی ہوں کیسے پندرہ دن کے اندر اندر میری شادی کرتے ہیں۔

دو لمبے کوئی کھیتوں میں تھوڑی اُگتے ہیں کہ جاؤ اور جا کر اکھاڑ لاؤ اور نہ ہزار میں بکتے ہیں کہ جاؤ اور خرید لاؤ۔

میری شادی کے لیے انہیں باقاعدہ ایک صحت مند اور باشعور لڑکا چاہیے جو ہر عیب سے پاک ہو۔ کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے سے تو ابو مجھے بیاہنے سے رہے۔ ہاں اگر بلال بھائی کے بس میں ہو تو وہ کسی کے ساتھ بھی دو کلمے پڑھا دیں۔ مگر میرے ابو مجھے کسی اندھے کنوئیں میں دھکا نہیں دے سکتے۔ کیونکہ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ یہ تو انہوں نے بلال بھائی کو نالنے کے لیے میری ارجنٹ شادی کی حامی بھری ہے۔ سوچتے ہوں گے جو ان خون ہے کچھ دن بعد خود ہی غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو یہ بے جا کی ضد بھی چھوڑ دے گا۔ ہاں البتہ غفار یہاں دستیاب ہوتا تو شاید اس منصوبے پر عمل بھی کر ڈالتے مگر اب اس کی غیر موجودگی میں خادنان بھر میں کوئی بھی لڑکا اس معیار پر پورا اترتا دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس لیے میں بے فکر تھی اور بلال بھائی کے چیلنج کو محض دیوانے کی بڑبھراہی تھی۔



بلال بھائی نے جو ڈیڈ لائن مجھے دی تھی اس میں سے چار دن گزر گئے تھے۔ میں ابو اور بلال بھائی کی طرف دیکھتی تو مجھے کنول یاد آنے لگتی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اور باتیں دونوں ناقابلِ فراموش تھیں۔ مجھے ابو اور بلال بھائی سے نفرت محسوس ہونے لگتی۔ میں حتی الامکان کوشش کرتی کہ ان کے سامنے کم سے کم جاؤں۔

نانی ابھی تک یہیں تھیں۔ آج جمعے کا دن تھا۔ ابو اور بھائی گھر پر تھے۔ سب ناشتے سے فارغ ہو کر لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ماموں اور نمانی آ گئے۔ مجھ سے والہانہ انداز میں ملے۔ بڑی تفصیل سے میری خیریت دریافت کرتے رہے۔ میں سمجھی کہ آپیشل میری خیریت دریافت کرنے ہی آئے ہیں۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ابو نے فون کر کے باقاعدہ انہیں آنے کے لیے کہا ہے۔

دوپہر کے کھانے میں امی نے بہت اہتمام کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ابو نے اعلان کیا کہ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اس لیے مجھے اور مہوش کو چھوڑ کر باقی افراد خانہ ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئیں۔ چائے وہیں پیئیں گے۔ یہ کہہ کر ابو اور بلال بھائی ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ امی نے ساجدہ کو کہا کہ چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آنا۔

”جی اچھا بیگم صاحبہ۔“ ساجدہ نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”آپ دونوں بہنیں اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔“ امی نے مجھے اور مہوش کو حکم دیا۔

ہم دونوں کمرے میں آ گئیں۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میں اور مہوش تجسس میں جتلا ہو گئیں۔

”آخر ایسی کون سی اہم بات کرنی تھی ابو نے جو ماموں اور نمانی کو آپیشل بلایا گیا ہے۔“ مہوش بولی۔

”ہوگی کوئی بات۔ اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ میں بظاہر لاپرواہی سے بولی مگر اندر ہی اندر جہان میں جتلا تھی۔

مہری جھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس خفیہ میٹنگ کا تعلق کہیں نہ کہیں میرے مستقبل سے جڑا ہے۔

”مہوش، ایک بات تو بتاؤ۔“ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

”ہاں ہاں، پوچھو۔“

”یہ جو ثمرہ اور نمرہ ہیں۔ یہ کافی دنوں سے ہمارے گھر نہیں آئیں اور نہ ہی کبھی آنی خالدہ نے چکر لگایا ہے۔“

”تمہیں کسی بات کا نہیں پتا۔“ مہوش حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”نہیں تو..... کیوں کیا ہوا ہے؟“ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”بہت برا ہوا ان بے چاروں کے ساتھ۔“

”میں سمجھی نہیں، جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے ان کے ساتھ۔“

”بلال بھائی نے ان کے گھر جا کر پتا نہیں ان لوگوں کو کیا کیا دھمکیاں دی ہیں کہ وہ لوگ راتوں رات گھر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ یہ بات ہمیں ان کے ساتھ والے گھر میں رہنے والوں نے بتائی ہیں۔ دوسری رات آ کر اپنا سامان بھی لے گئے ہیں اور اب سنا ہے وہ یہ گھر بیچ رہے ہیں۔“

”اوہ..... یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔“ میں تاسف سے سر ہلانے لگی۔ ”بلال بھائی خود کو کیا سمجھتے ہیں، فرعون یا

نمرود۔“

”حالانکہ دونوں کا انجام دنیا جانتی ہے۔“ مہوش نے بھی لقمہ لگایا۔

”نورین!“ مہوش نے آہستگی سے میرا نام پکارا۔

”ہوں۔“

”کیا خیال ہے یہ جو اندر ڈرائنگ روم میں گول میز کانفرنس ہو رہی ہے، جا کر جائزہ نہ لیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا، چوری چھپے ان لوگوں کی باتیں سنی جائیں۔“

”بالکل۔“ وہ ڈھٹائی سے بولی۔

”اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو شامت آجائے گی۔“ میں ڈر گئی۔

”کوئی نہیں دیکھے گا۔ ہم نے کون سا ان کے سامنے جانا ہے۔ اوٹ میں کھڑے ہو کر باتیں ہی تو سنی ہیں اور وہ

بھی صرف چند منٹ۔“ مہوش نے مجھے قائل کر ہی لیا۔ ویسے بھی میں تو پہلے ہی تجسس کے ہاتھوں مجبور بیٹھی تھی۔

ہم دونوں دبے پاؤں چلتی ہوئی ڈرائنگ روم کے لاونج والے دروازے کے پاس آ گئیں۔ دروازہ تھوڑا سا دھکا

تھا۔ اندر سے باتوں کی آواز بالکل نہیں آرہی تھی۔ ایک دم خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسری کی طرف دیکھ کر

اشاروں سے حیرت کا اظہار کر رہی تھیں کہ اتنی خاموشی کیوں ہے۔ پھر اچانک نانی کی آواز ابھری۔

”میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ یہ ظلم ہے، زیادتی ہے۔ زمان تم اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟“

بات کرتے کرتے نانی کی آواز بھر گئی۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پتا نہیں ابو نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ نانی کو سن کر تکلیف ہو رہی تھی۔

”خالہ جان! نورین میری بیٹی ہے۔ اس کے مستقبل کے حوالے سے فیصلہ کرنے کا مجھے پورا اختیار ہے۔ اور پھر

آپ کو تو خوش ہونا چاہیے آپ کے پوتے سے شادی ہو رہی ہے اس کی۔“

”بھائی جان، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اب کے ماموں بولے۔ ”ہمیں آپ کی کسی بات سے اختلاف

نہیں۔ ہمارے لیے ہمارے دونوں بیٹے برابر ہیں۔ مگر ہم نے تو نورین بیٹی کا رشتہ غفار کے لیے سوچ رکھا تھا۔“

”غفار اس وقت تین ماہ کے لیے ورلڈ ٹور پر نکلا ہوا ہے اور ہم نے ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے اندر اندر شادی کرنی

ہے۔ اس لیے غفار نہیں تو جبار سہی، کیا فرق پڑتا ہے۔“ بلال بھائی کی آواز میرے کانوں میں پکھلا ہوا سیسہ بن کر ٹکرائی۔

میرا دل چاہا کہ اندر جاؤں اور بلال بھائی کا منہ نوج لوں۔ جو بڑی آسانی سے میرے احساسات اور جذبات کو کھلتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ غفار نہ سہی جبار سہی، ایک ہی بات ہے۔

”مگر مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔“ اب امی کڑک دار آواز میں بولیں۔

”تم چپ رہو۔“ ابو گر جے۔ ”تمہیں کون پوچھ رہا ہے؟“

”امی، ابو کی دھاڑ سن کر سسکیاں بھرنے لگیں۔“

”میری نظر میں جبار ہر لحاظ سے غفار سے بہتر ہے۔ برسرِ روزگار ہے۔ ذمہ دار ہے۔ روشن مستقبل اس کا منتظر ہے۔ البتہ عمر کچھ زیادہ ہے تو مردوں کے لیے یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ جبکہ غفار ایک لا اہالی اور کلنڈرانو جوان ہے۔ ہر بات کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتا ہے۔ احساسِ ذمہ داری سے کوسوں دُور ہے۔“

”بھائی جان! آپ بڑے ہیں۔ ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔“ ماموں کمزوری آواز میں بولے۔ ”میں کہتا ہوں آپ اپنے فیصلے پر پھر ایک مرتبہ نظر ثانی کر لیں۔“

”میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ مگنی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ڈائریکٹ نکاح ہی ہوگا۔ آپ ایک ہفتے بعد بارات لے آئیں۔ ہم سارے انتظامات کر لیں گے۔“

”مگر بھائی جان، ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آپ شادی اتنی جلدی کیوں کر ناچاہ رہے ہیں۔“ پہلی مرتبہ ممانی نے بھی زبان کھولی۔

”بشری بات دراصل یہ ہے کہ نورین کو ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے ہیں، جن کا واحد علاج ڈاکٹروں نے فوری شادی بتایا ہے۔ اب آپ تو ہمارے اپنے ہیں، آپ سے کیا پردہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے شادی کے لیے جلدی مچا رکھی ہے ورنہ ہماری بیٹی میں کوئی کمی ہے کیا۔ ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔“ ابو کی باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دماغ جیسے پریش سے پھٹنے والا ہو گیا۔ اس قدر غم و غصہ کہ برداشت سے باہر ہو گیا اور میں دھڑام سے فرش پر گر گئی۔ اس کے بعد ہوش و حواس سے بھی بیگانہ ہو گئی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے مہوش کی چیخ میرے کانوں نے سنی۔

☆.....

ہوش میں آئی تو میں اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور باقی سارے افراد میرے ارد گرد بیٹھے تھے۔ نانی اور امی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ دونوں مجھے ترس کھانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ مہوش بھی معصوم صورت بنائے ایک طرف کھڑی تھی۔ ایک پینٹ شرٹ والا آدمی سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے سفید کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ سفید کوٹ والا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”لیجے آپ کا مریض ہوش میں آ گیا۔ اب مجھے اجازت دیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ انجکشن لگتے ہی فوراً ہوش میں آ جائیں گی۔“ اس شخص کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے ابو سے مصافحہ کیا اور جانے کی اجازت طلب کی۔ ابو نے بلال بھائی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو چھوڑ آؤ۔ بلال بھائی ڈاکٹر کو چھوڑنے چلے گئے تو ابو میری طرف بڑھے۔

”نورین بیٹا، اب کیسی حالت ہے؟“ وہ شہد بھرے لہجے میں مجھ پر جھکے۔

تو میں چلانے لگی۔ ”دور ہو مجھ سے..... آپ میرے ابو نہیں..... دشمن ہیں۔ مت ہاتھ لگائیں مجھے۔“ میں پھر سے ہش ریائی انداز میں چیخنے لگی۔

”دیکھ لیجئے، یہی حالت ہو جاتی ہے میری بچی کی۔“ ابو بے چارگی سے بولے تو مجھے ابو سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

ماموں اور ممانی بڑے دکھ سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ماموں میرے پاس آئے۔ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

”نورین بیٹی، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم تو اتنی سمجھدار بچی تھی۔“

”ماموں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ ان لوگوں کی باتوں میں بالکل مت آئیں۔ یہ لوگ مجھے پاگل ثابت

کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ یہ لوگ دھوکے باز اور ڈرامے باز ہیں۔ یہ میری زندگی تباہ کرنے جا رہے ہیں۔ ماموں مجھے بچالیں۔ پلیز ماموں مجھے بچالیں۔“ میں ماموں کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔

”چپ ہو جاؤ بیٹی۔“ ماموں آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولے۔ ”تم واقعی ہوش میں نہیں ہو۔ ورنہ تم اپنے ابو کو

کبھی یہ سب نہ کہتی۔ تم تو اپنے باپ پر جان چھڑکتی تھی۔“

”وہ ساری بھول بھی میری۔ ماموں، ابو کا اصل چہرہ تو اب میرے سامنے آیا ہے۔ ان کو مجھ سے کوئی محبت نہیں۔

یہ صرف بلال بھائی کو چاہتے ہیں۔“ میں روتے جاری تھی اور ماموں مجھے تسلیاں دیتے جارہے تھے۔

کمرے کی فضا بہت بوجھل اور سگوار ہو گئی تھی۔ وہاں موجود ہر ذی نفس افسردہ تھا۔ ان سب کو میری ذہنی صحت

پر شک تھا۔ ابو، ماموں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں باہر لے گئے اور جاتے جاتے پھر سرگوشی میں انہیں کہہ رہے تھے۔

”ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس مسئلے کا حل صرف نورین کی جلد از جلد شادی ہے۔ اب تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ میں تمہیں

کیوں جلدی شادی کرنے کے لیے مجبور کر رہا ہوں۔ دیکھو ستار، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میری بیٹی کی زندگی

اب تم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسے پاگل ہونے سے بچالو۔“ ابو نے باہر جا کر ماموں کے سامنے روتے ہوئے دونوں

ہاتھ جوڑ دیئے تو ماموں نے ان کے ہاتھ کھول کر انہیں گلے لگا لیا۔

”بھائی جان، کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ نورین بیٹی ہمیں بھی اتنی ہی پیاری ہے جتنی آپ کو۔ ہم جمعے والے

دن بارات لے کر آجائیں گے۔“

اور اس طرح ابو اور بلال بھائی اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے سر سے بلاٹ لگئی۔ ان کو اطمینان ہو گیا

کہ اب ان کی بیٹی پڑوس کے لڑکے کے ساتھ بھاگ نہیں سکے گی۔ نانی اور امی میرے ساتھ میرے غم میں برابر کی شریک

تھیں۔ خصوصاً نانی نے تو بہت احتجاج کیا مگر ان کی ایک نہ سنی گئی۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی اپنی قسمت کو

رد رہی تھی، جس نے ایک دم پلٹا کھا کر مجھے چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔ نانی میرے پاس رنجیدہ بیٹھی تھیں۔ امی اور

مہوش شاپنگ کرنے بازار گئی تھیں۔ امی نے بہت اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ جا کر اپنی پسند کی چیزیں خرید لوں۔ مگر میں

نے سختی سے انکار کر دیا۔ مجھے کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی مرنے والے کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کا کفن لٹھے

کا ہو یا ریشم کا۔

”نورین..... ایک بات تو بتاؤ۔“ نانی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

”پوچھیں نانی۔“ میں بھرائی آواز میں بولی۔

”مجھے یقین ہے کہ بلال کی بات میں کوئی صداقت نہیں۔ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ مگر بیٹا اتنی بڑی غلط فہمی اسے کیسے ہو گئی؟“

تو کیا نانی..... آپ بھی یہی سمجھتی ہیں..... کہ..... میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں..... نہیں بیٹی..... میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے تم ایسا کچھ نہیں کر سکتی..... مگر پھر بھی شیطان..... ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے..... اور کبھی کبھی یہ بہکانے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔“ نانی بالآخر اپنا اندیشہ زبان پر لے ہی آئیں۔

”نانی، میں آپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میرا اس لڑکے سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی تو وہ لندن سے لوٹا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی چھت پر کھڑے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ پامسٹری جانتا ہے یعنی ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کر انسان کا مستقبل بتا سکتا ہے۔ بس میری عقل پر پردہ پڑ گیا کہ فٹ سے اپنا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے لکیریں دیکھ رہا تھا کہ بلال بھائی اوپر سے آگئے اور نجانے کیا سمجھ بیٹھے کہ مجھے مارنا شروع کر دیا۔“ یہ کہہ کر میں رونے لگی۔

نانی مجھے چپ کرواتے ہوئے خود بھی رو رہی تھیں۔ ”میں نے غفار سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی شادی تم سے ہی کرواؤں گی۔ اب اس کو کیا جواب دوں گی۔ جب وہ واپس آئے گا تمہیں جبار کی دلہن بنی دیکھے گا تو اس پر کیا بیٹے گی۔ یہ سوچ سوچ کر کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ اچانک یہ سب کیا ہو گیا۔ سچ کہتے ہیں انہونی جب بھی آتی ہے اچانک دبے پاؤں آتی ہے۔“ ہم دونوں نانی نواسی کافی دیر تک روتی رہیں اور ایک دوسرے کو تسلیاں دیتی رہیں۔

”نانی کچھ ایسا کرو کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ بالکل پہلے جیسا ہو جائے۔ غلط فہمیوں کے بادل چھٹ جائیں۔“ میں نانی کو جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

”نہیں میری بچی، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خود کو جھوٹی تسلیاں مت دو۔ تمہاری تقدیر میں یہی کچھ لکھا تھا۔“

”میں نہیں مانتی۔“ میں چلائی۔ ”میری تقدیر میں پہلے سے یہ سب نہیں لکھا تھا۔ میری تقدیر میرے ابو اور بلال بھائی نے اپنے ہاتھوں سے لکھی ہے اور ان کی لکھی ہوئی تقدیر مجھے ہرگز منظور نہیں۔ نہیں مانتی میں اس فیصلے کو۔ میں بغاوت کرتی ہوں ان کے ہر حکم سے۔ میں اپنی جان دے دوں گی مگر یہ شادی نہیں کروں گی۔“ میں ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی۔ میری گردن کی رگیں پھول گئیں اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھنج گئیں۔ میری یہ حالت دیکھ کر نانی گھبرا گئیں۔ انہوں نے فوراً پانی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگایا۔ ایک نیند کی گولی مجھے زبردستی کھلائی اور آرام سے لٹا دیا۔ پھر میرے پاس بیٹھ کر میرے بالوں میں شفقت سے انگلیاں بھیرنے لگیں۔

میں اب خاموش لیٹی ہانپ رہی تھی۔ نانی اب بھی بے آواز رو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ پھر مجھے غنودگی سی ہونے لگی اور میں نے آنکھیں موند لیں۔ سونے سے پہلے نانی کا زیر لب کہا گیا یہ جملہ میرے کانوں میں پڑا۔ ”یا الہی! میری بچی کے حال پر رحم فرما۔“

اسی اذیت و کرب میں یہ ایک ہفتہ گذر گیا۔ نانی نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے تنہا نہ چھوڑا۔ انہیں شاید یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ میں اپنی جان لینے کی کوشش کروں گی۔ ان کے گھر میں ان کے پوتے کی شادی تھی مگر وہ اپنے گھر نہ گئیں۔ میرے ساتھ لگی پٹی رہیں۔ کبھی میرے ساتھ رونے لگ جاتیں اور کبھی تسلیاں تحفیاں دینے لگتیں۔ کھانے کا وقت ہوتا تو اپنے ہاتھوں سے نوالے بنانا کر مجھے زبردستی کھلاتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مشکل حالات میں اگر میری نانی میرے ساتھ نہ ہوتیں تو شاید میں زندہ ہی نہ رہ پاتی۔ گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔

بالآخر مہندی کا دن آ گیا۔ مہندی سے دودن پہلے چاچا، چاچی اور صائمہ گاؤں سے آ گئے تھے۔ صائمہ کو دیکھ کر میں اس کے گلے لگ کر خوب روئی۔ وہ لوگ بھی میری اچانک شادی کا سن کر حیران تھے۔ ان کو بھی وہی رٹی رٹائی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا گیا اور میں صائمہ کو دیکھ کر یہ سوچ رہی تھی کہ صائمہ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے کہ میرے ساتھ۔ میں جو صائمہ کے ساتھ جھگڑتی تھی کہ اس نے اپنا حق رائے دہی کیوں استعمال نہیں کیا۔ تو کیا میں اپنا یہ حق استعمال کر سکتی تھی۔ میں جو عورت کی آزادی اور خود مختاری کی بڑی حمایت کرتی تھی۔ کیا خود آزاد تھی۔ کیا اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے خود مختار تھی۔ کب تک ہم عورتوں کا غیرت کے نام پر استحصال کیا جاتا رہے گا۔ کب ہمیں زندہ رہنے کا حق ملے گا۔ کب ہم اپنی سانس اپنی مرضی سے لیں گی۔

مہندی والی رات مہمانوں کا زیادہ رش نہ تھا۔ بالکل قریبی رشتہ داروں کو بلایا گیا تھا۔ لڑکیاں بالیاں ڈھولک بجا کر لوک گیت گا رہی تھیں۔ مہوش کی آواز ان سب میں نمایاں تھی۔ مجھے باہر لے جانے کی بہت کوشش کی گئی مگر میں سختی سے انکار کر دیا۔ اب بھی میں کمرے میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔ نانی ابھی ابھی باہر نکلیں تھیں، شاید واش روم میں گئی تھیں۔ ورنہ تو وہ مجھے تنہا چھوڑتی نہ تھیں۔ میں گھنٹوں میں سر دیئے وہ لوک گیت سن رہی تھی:

ساڈا	چڑیاں	دا	جھنبہ	اے
بابل	اساں	اڈ	جاناں	
ساڈی	لمبی	اڈاری	اے	
اساں	مڑ	نہیں	آؤ ناں	

قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں سمجھی نانی آئی ہوں گی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھنا ضروری نہ سمجھا۔ آنے والا میرے پاس آ کر رک گیا۔ پھر اس نے اپنی بھاری آواز میں میرا نام پکارا تو میں چونک کر دیکھنے لگی۔ میرے سامنے ابوسفید لٹھے کی شلوار قمیص پہنے کھڑے تھے۔ ان کی طرف دیکھ کر میں نے پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئے۔

”نورین بیٹا..... یہ جو کچھ ہوا ہے بالکل اچانک ہوا ہے۔ جانتا ہوں..... تم خوش نہیں ہو..... مجھ سے بہت ناراض ہو..... مگر..... بیٹا..... میں مجبور ہوں..... تم میری جگہ ہو کر سوچو گی..... تو شاید..... اندازہ کر پاؤ کہ بیٹیوں کے باپ کتنے حساس..... اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔“

میں چپ چاپ سپاٹ چہرہ لیے ابو کی باتیں سن رہی تھی۔ میرے لیے اب وہ باپ نہیں بلکہ ایک سیاستدان تھے، اداکار تھے۔ اب وہ جذباتی ایکٹنگ کر کے مجھے اموشنل بلیک میل کرنے آئے تھے۔ مگر مجھ پر اب ان کی کسی بھی بات کا کوئی اثر ہونے والا نہیں تھا۔

”میں آج تمہارے سامنے اعتراف کرتا ہوں۔“ ابو نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”کہ میں اندر سے ایک عام باپ کی طرح انتہائی ڈرپوک اور کم ہمت ہوں۔ ہر اس باپ کی طرح جو جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرتا ہے۔ ذلت و رسوائی سے ڈرتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی چچیاں نیک نامی کی چادریں اوڑھ کر اپنے گھر کی ہو جائیں اور ان کی شفاف چادروں پر بدن نامی کا کوئی چھوٹا موٹا دھبا بھی لگنے نہ پائے۔“ ابو کی آواز بھرا گئی، پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

”میری بچی..... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں..... جبار ایک تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ تمہیں خوش رکھے گا۔ اگر وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے گا تو میں ہوں ناسرز نش کرنے کے لیے۔ بدگمانی کو اپنے دل سے باہر نکال دو۔ ایک نئی زندگی منتظر ہے۔ خوشی خوشی اس کا استقبال کرو۔ اپنی زندگی کو جنت بنانا ہے یا جہنم، یہ بات اب تمہارے ہاتھ میں ہے اور ہو سکے تو اپنے اس بد نصیب باپ کو معاف کر دینا۔ جو تم سے کیے گئے وعدے پورے نہ کر سکا۔“ یہ کہہ کر ابو رونے لگے پھر بولے۔ ”اور ہاں..... کبھی بھی یہ مت سوچنا کہ..... میری محبت میں کوئی کمی آگئی ہے..... میں تمہیں اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ابو باہر چلے گئے۔ میں خاموشی سے ان کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ دفعۃً میرے ہاتھوں پر دو موٹے موٹے آنسو گرے تب مجھے پتا چلا کہ میں رو رہی تھی۔ مگر میں کیوں رو رہی تھی۔ یہ آدمی تو ایک سڑ تھا۔ ایک ٹنگ کر رہا تھا۔ مجھے بہلا رہا تھا پھسلا رہا تھا۔ پھر میں کیوں اس کی باتوں میں آگئی تھی۔ کئی اداکار واقعی اتنی اچھی اداکاری کرتے ہیں کہ ان کی ایک ٹنگ پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

میری کزنز اور سہیلیوں نے بہت کوشش کی کہ میں ہاتھوں میں مہندی لگوا لوں۔ مگر میں نہ مانی۔ مہندی کی اس رات مجھے مہندی سے نفرت ہو گئی اور اس قدر نفرت ہو گئی کہ میں نے اپنی پوری زندگی ہاتھوں میں مہندی نہیں لگائی۔ نہ کسی عید پر اور نہ کسی شادی بیاہ کے موقع پر۔



آج بارات تھی۔ ناشتے کے بعد ہڑ بونگ مچ گئی۔ ان دنوں رات کی شادی کا رواج نہ تھا۔ بارات دو پہر ایک، دو بجے تک آتی تھی۔

بارات کے بیٹھنے کے لیے گھر کے پاس ایک گراؤنڈ کو صاف کر کے کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ مرد وہاں بیٹھتے تھے جبکہ عورتوں کے لیے گھر کے لان میں انتظام کیا گیا تھا۔ ان وقتوں میں میرج ہال اتنے کامن نہ تھے۔ ویسے بھی بیٹی کو اپنے گھر سے الوداع کرنا زیادہ بہتر خیال کیا جاتا تھا۔

میرے لیے امی اور مہوش نے بھاری کا مڈا سرخ جوڑا خریدا تھا۔ جس کو میں نے جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا۔ گھر میں ہی ایک ماہر بیوٹیشن بلوایا گیا تھا۔ جس نے مجھے تیار کر کے دلہن بنانا تھا۔ بارہ، ساڑھے بارہ اس بیوٹیشن نے میرا بناؤ سنگھار شروع کر دیا تھا۔

ذریعہ بچے شور مچ گیا کہ بارات آگئی ہے۔ لڑکیاں بالیاں اور بڑی بوڑھیاں سب بارات دیکھنے میں گیٹ پر پہنچ گئیں، جن میں نانی سب سے آگے تھیں۔ ان کے پوتے کی بارات تھی اور وہ بے چاری یہاں بیٹھی تھیں۔ میں نے کئی بار

انہیں کہا کہ نانی آپ اپنے گھر جائیں اور شادی کی تیاریاں دیکھیں۔ بارات کے ساتھ آئیں۔ مگر نانی آگے سے ایک ہی جواب دیتیں کہ اب تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔ ان کا جواب سن کر میں خاموش ہو جاتی۔

اب بارات کا سن کروہ دوڑی دوڑی گئیں۔ پھر بارات کو کھانا کھلایا گیا جو کئی آٹمز پر مشتمل تھا۔ کھانے کے بعد مجھے لان میں بنائے گئے اسٹیج پر جا کر بٹھا دیا گیا۔ اتنی ساری عورتوں کے سامنے کسی شوپیس کی طرح سج سنور کر بیٹھنا مجھے انتہائی ناگوار گذر رہا تھا۔ اور عورتیں، بچے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے آنکھوں سے ایکسرے کر رہے ہوں۔ اوپر سے انتہائی بے ہودہ سوالات، جوڑا کتنے کا بنا ہے؟ کافی مہنگا لگ رہا ہے۔ زیور کتنے تو لے پہنایا ہے؟ سونے سے لاد دیا ہے چودھری زمان نے اپنی بیٹی کو۔ میں کمال ضبط سے یہ ساری بکواس سستی رہی اور پھر دلہے کو مردانے سے اٹھا کر زنانے میں لایا گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر جبار کا جائز لیا۔ بلیک شیروانی اور سفید لٹھے کی شلوار میں خاصی کچی عمر کا دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ سفید بال چھپانے کے لیے بالوں کو خضاب سے کالا کیا گیا تھا۔ میں نظریں نیچی کر کے پھر سے اپنی قسمت کو کوٹنے لگی۔ میرے سینے کی طرف سے جن عورتوں نے جبار کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ چہ میگوئیاں کرنے لگیں۔ ان کی کھسر پھسر کی آواز با آسانی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

”ہائے لڑکا تو خاصی بڑی عمر کا دکھائی دیتا ہے۔“ پہلی بولی۔

”لڑکا کہاں ہے، یہ تو ادھیڑ عمر کا مرد ہے۔“ دوسری نے جواب دیا۔

”بے چاری..... لڑکی تو بہت کم عمر اور خوبصورت ہے۔ اس کے باپ کو رشتوں کی کمی تھی بھلا۔“ ایک بڑی بی

تاسف سے بولیں۔

”اری اماں! تم کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔ ہوگی کوئی اندر کی بات ورنہ اس طرح اچانک بھی کوئی شادی کرتا ہے۔“

اور بڑی بی کی سمجھ میں فوراً اندر کی بات آگئی اور وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگی۔

پھر رخصتی کا وقت آن پہنچا۔ نکاح بارات کے آنے کے فوراً بعد ہو چکا تھا۔ پھولوں سے لدی گاڑی کو پورچ میں لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ جبار اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے بہنیں اور سہیلیاں اپنے جلو میں لے کر چلتی ہوئی آہستگی سے گاڑی کے پاس لائیں۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر میں امی اور مہوش اور باقی رشتہ دار عورتوں سے گلے ملنے لگی۔ بلکہ وہی میرے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ مجھے اس وقت کوئی فینلنگ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں بالکل سپاٹ چہرہ لیے کھڑی تھی۔ بلال بھائی، ابو اور غفور چاچا بھی پاس کھڑے تھے۔ جب عورتیں مل چکیں تو غفور چاچا نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے ساتھ لگایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرا ہاتھ چوما۔ اس کے بعد بلال بھائی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پیچھے ہٹ گئے۔ پھر ابو میری طرف بڑھے مگر میں نے ابو کو دیکھا تو فوراً گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ آگے بڑھے اور جھک کر کھڑی کے پاس چہرہ کر کے بے چارگی سے مجھے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ انہوں نے کانپتا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھا۔ چند لمحوں مجھے دیکھتے رہے اور پھر پیچھے ہٹ گئے۔ پھر انہوں نے ہاتھ سے گاڑی لے جانے کا اشارہ کیا اور فی امان اللہ کہا۔ گاڑی پورچ سے نکل اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ میرے ایک طرف نانی اور دوسری طرف ممانی بیٹھی تھیں۔ شام پانچ ساڑھے پانچ، ہم گھر پہنچ گئے۔ ممانی اور نانی نے کچھ غیر ضروری اور ہندوانہ رسمیں ادا کیں اور پھر اندر لے جا کر مسہری میں بٹھا دیا گیا۔

یہ دہی کمرہ تھا جس سے میری کچھ تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ جہاں سے جبار نے مجھے متعدد مرتبہ دھتکار کر باہر نکالا تھا اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھنے کہ میں آج پھر اسی کمرے میں موجود تھی۔ یہاں بھی عورتوں اور لڑکیوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میرا اب اس ہجوم سے اور چیخ و پکار سے دل گھبرا رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ تنہائی اور سکون میسر آئے اور میں کپڑے بدل کر سو جاؤں۔

آخر خدا خدا کر کے رات نوبے اس ہجوم سے جان چھوٹی اور وہ بھی نانی نے زبردستی سب کو باہر نکالا۔ پھر نانی نے زبردستی مجھے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر نانی تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھیں۔ میں نے بھی گاؤنٹیکے سے ٹیک لگا کر اپنی کمر کو تھوڑا آرام پہنچایا۔

”نورین!“ نانی ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ ”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے کہوں۔“

”نانی، جو کہنا چاہتی ہیں..... کہہ دیں۔“ میں نے آنکھیں موندے موندے جواب دیا۔

”نورین..... بیٹی جو ہونا تھا ہو گیا..... اب آگے کی سوچو..... میں مانتی ہوں..... جبار سخت مزاج ہے..... مگر اب وہ تمہارا شوہر ہے..... اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرو گی..... تو اس کی سخت مزاجی، خوش مزاجی میں بدل جائے گی..... بچھلی باتیں یاد کر کے کڑھتی رہو گی تو نہ تم خوش رہ پاؤ گی اور نہ جبار تم سے خوش رہے گا..... پرانی باتیں بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو..... اور یہ آغاز بڑے اچھے طریقے سے ہونا چاہیے۔ میری بات..... سمجھ رہی ہونا!“ نانی نے میری طرف دیکھا۔

”میں سمجھ رہی ہوں نانی..... آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ فکر مت کریں۔ آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔ میں ہر طرح سے اپنے فرائض پوری طرح بجالاؤں گی۔ قسمت نے جو مذاق میرے ساتھ کیا ہے..... اس پر اسے ہنسنے کا موقع نہیں دوں گی۔“

”شاباش میری بچی۔“ نانی نے میرا ہاتھ چومنا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”لو اب تم آرام کرو۔ جبار بھی آنے والا ہو گا۔“

”نانی.....“ میں نے پکارا۔

”جی نانی کی جان۔“ نانی بڑی اپنائیت سے بولیں۔

”کیا غفار کو میری اور جبار کی شادی کی اطلاع مل گئی ہے؟“

”نہیں، میں نے بشری سے پوچھا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے اس سے کافی دنوں سے کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ بے چارہ آکر سنے گا تو پتا نہیں کیسا دھماکہ ہوگا اس کے لیے۔“

نانی چلی گئیں تو میں ایک مرتبہ پھر غفار کے متعلق سوچ سوچ کر افسردہ ہونے لگی۔ پھر سر جھٹک کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرے سے پرانا سامان نکال کر اس کی جگہ میرے جینز کا نیا سا زوسامان جگہ گراہا تھا۔ ابونے میرے جینز پر دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا۔ ہر چیز سے نفاست اور امارت ٹپک رہی تھی۔ میں اٹھی اور ایک ایک چیز گھوم پھر کر دیکھنے لگی۔ پھر میز ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

عروسی جوڑے میں ملبوس یہ خوبصورت نازک سی دلہن میں ہوں۔ میں خود سے پوچھ رہی تھی۔ میری شادی ہو چکو

ہے۔ آج میری سہاگ رات ہے۔ وہ سہاگ رات جس کا تصور ہر کنواری لڑکی کے لیے طلسم ہوشربا کا سا ہوتا ہے۔ اس رات کا تصور ہی ہر لڑکی کے لیے بڑا جان لیوا اور نشہ طاری کر دینے والا ہوتا ہے۔ مگر مجھ پر کوئی نشہ کیوں طاری نہیں ہو رہا۔ میں کیوں اتنی بے حس ہو گئی ہوں۔ پھر میں جبار کے متعلق سوچنے لگی۔ کیا میں اسے بیوی کی محبت دے سکوں گی اور کیا وہ مجھے شبانہ کی جگہ دے سکے گا۔ وہ محبت اور وارفتگی دے سکے گا جس کی میں حقدار ہوں۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور جبار اندر آ گیا۔ میں پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بھی تھوڑی دیر ششدر کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔

کچھ وقت یونہی بیت گیا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں پہلی رات کی دلہن ہوں۔ میرا دلہا میرے سامنے کھڑا ہے اصولاً مجھے شرمانا چاہیے، الجانا چاہیے۔ جبکہ میں پتھر کی سورت بنی بے حجابی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میری نظریں جھک گئیں اور تب جبار بھی ہوش میں آ گیا۔ وہ داش روم میں گھس گیا اور میں بے دلی سے چلتی ہوئی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اگر میں اس شادی سے خوش نہیں تو اس میں بے چارے جبار کا کیا تصور۔ اسے اس بات کی سزا کیوں دی جائے اور پھر نانی سے کیا ہوا عہد بھی تو پورا کرنا تھا۔ ہر حال میں اپنے مجازی خدا کو خوش رکھنا تھا۔ یہی باتیں سوچتے سوچتے مجھے اٹکھ آنے لگی۔ میں نے سر جھٹک کر نیند کو بھگا یا۔ پھر جبار داش روم سے باہر آیا۔ وہ کپڑے بدل چکا تھا۔ اب وہ سفید کرتا پا جامہ پہنے میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نظریں جھکائے اس کے منہ سے کوئی خوب صورت بات سننے کی منتظر تھی۔ آخر وہ بولا۔

”یہ تم زیورات سے لدی پھندی کیوں بیٹھی ہو۔ اٹھو اور کپڑے بدل کر سو جاؤ۔“ اس نے بڑے تھکمانہ انداز میں حکم دیا اور خود ایک تکیہ اٹھا کر سامنے صوفے پر لیٹ گیا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سکون سے آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔

ہونہہ..... نہیں تو نہ سہی۔ میں بھی مری نہیں جا رہی تمہارے فراق میں..... دفعتاً غصے کی ایک شدید لہر میرے دماغ میں اٹھی اور میں پاؤں پٹختی ہوئی اٹھی۔ الماری سے لان کا سوٹ نکالا اور داش روم میں گھس گئی۔ سارے زیورات نوج نوج کر اُتارے۔ منہ دھویا، کپڑے چھینچ کئے اور باہر آ گئی۔ سارے زیور ڈرائنگ ٹیبل کی دراز میں رکھے۔ دراز کو جان بوجھ کر زور سے بند کیا۔ جبار کی طرف دیکھا تو وہ اسی طرح سوتا بن رہا تھا۔ میں نے پھر دراز کھولا اور پہلے سے بھی زیادہ زور سے بند کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

ہونہہ..... بڈھا کہیں کا۔ صرف دیکھنے کی حد تک نہیں ہر لحاظ سے بڈھا ہے۔ میں جلتی کرہتی بیڈ پر جا کر لیٹ گئی۔

”اٹھ کر لائٹ آف کرو۔“ اس نے پھر مجھے حکم دیا۔

جی میں آیا کہ دوں کہ تمہارے باپ کی ملازمہ نہیں ہوں۔ خود ہی اٹھ کر کرلو۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اٹھی۔ نیوٹ لائٹ بند کی اور زیرو واٹ کا بلب جلا دیا۔ اب کی بار لیٹی تو فوراً نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔ یہ تھی میری سہاگ رات۔

.....☆.....

اگلی صبح آنکھ کھلی تو دوار گیر کلاک سات بج رہا تھا۔ جبار کمرے میں نہیں تھا۔ البتہ اس کا تکیہ میرے پاس بیڈ پر موجود تھا۔ میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ میں اٹھی اور داش روم میں گھس گئی۔ داش روم سے فارغ ہو کر سوچا کیوں نہ نہالوں۔

اس سے طبیعت فریش ہو جائے گی اور سر کی گرانی بھی جاتی رہے گی اور واقعی نہانے سے طبیعت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔
میں ڈریسنگ کے سامنے کھڑی بال خشک کر رہی تھی کہ ممانی کمرے میں آئیں۔

”نورین بیٹی، تم ٹھیک ہونا!“ وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”جی ممانی جان، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں مسکرائی۔

مجھے مسکراتا دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی رونق آگئی۔ ”میں ابھی تمہارے لیے ناشتہ بنوا کر لاتی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے پلٹیں تو میں نے آواز دی۔ وہ رک گئیں۔

”ممانی جان..... نانی جان کہاں ہیں۔؟“

”وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ ان سے ملنا ہے تو بھیج دوں ان کو۔“

”جی..... بھیج دیں۔“

تھوڑی دیر بعد نانی میرے سامنے تھیں۔ نانی کو دیکھ کر میں نے اپنے چہرے پر زبردستی بشارت پیدا کی۔ ابھی ہم باتیں کر رہی تھیں کہ ملازمہ ناشتہ لے کر آگئی۔ میں نے اور نانی نے مل کر ناشتہ کیا۔ نانی نے مجھ سے جبار کے روپے کے متعلق پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ نانی ابھی مجھے ایڈ جسٹ ہونے میں وقت لگے گا۔ جس ٹریجڈی سے میں گذری ہوں اس سے نکلنے کے لیے مجھے ابھی کچھ ٹائم لگے گا۔ تب کہیں جا کر میرا ذہن اس اچانک بننے والے رشتے کو قبول کرے گا اور شاید جبار بھی ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ بس میں چاہتی ہوں تم ایک دوسرے کے قریب آ جاؤ۔ چاہے دیر سے ہی آؤ۔“

میں جواب میں خاموش رہی اور چپ چاپ ناشتہ کرتی رہی۔ تقریباً ایک بجے تک امی اور مہوش، چاچی اور چاچا بمعہ صائمہ کے آگئے۔ میرے کمرے میں اچانک رونق ہوگئی۔ ان کو دیکھ کر میں کھل اٹھی۔ امی بھی میرا رویہ دیکھ کر خاصی مطمئن ہو گئیں۔ میری متلاشی نظریں ابو کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھی۔

”امی کیا صرف اتنے لوگ ہی آئے ہیں؟“

”نہیں، بلال بھی آیا ہے ہمارے ساتھ۔ باہر جبار کے پاس رک گیا ہے۔“ یہ کہہ کر امی چپ کر گئیں۔

”کیا..... ابو..... نہیں آئے؟“ آخردل کی بات زبان پر آئی گئی۔

”نہیں.....“ امی افسردگی سے بولیں۔

”کیوں.....؟“ میں حیران ہوئی۔

”اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ امی اب بھی مجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”کیا ہوا ہے..... ان کی طبیعت کو؟“ میں بے چین ہوگئی۔

”کچھ خاص نہیں۔ جاؤ گی تو دیکھ لینا۔“ امی نے بات بنائی۔

”کہاں جاؤں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے گھر..... ہمارے گھر..... اور کہاں.....“ امی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔

”مہرا گھر..... میرا گھر تو اب یہ ہے امی۔“ میں طنز یہ ہنسی۔

”یہ گھر تمہارا ہے، مگر وہ گھر بھی تو تمہارا ہے۔“
 ”میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر وہ میرا گھر ہوتا تو یوں مجھے اس گھر سے بے دخل نہیں کیا جاتا۔“
 ”نورین! بھول جاؤ سب باتیں۔ کیوں اپنے آپ کو اور ہمیں تکلیف دیتی ہو ایسی باتیں کر کے۔“ امی رد ہانسی ہو کر بولیں۔

”سوری امی، میں اب دوبارہ اس گھر میں کبھی نہیں جاؤں گی۔ آپ اور مہوش دونوں جب چاہیں مجھے ملنے یہاں آ سکتی ہیں۔“

”ایسا مت کہو نورین۔ تمہارے ابو تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ تمہاری رخصتی کے بعد ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ ہم تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں۔ رسم کے مطابق آج تم اور تمہارا خاوند ہمارے ساتھ جائیں گے۔ وہاں دو، تین دن رکھیں گے پھر تمہارے سسرال والے جائیں گے اور تم دونوں کو واپس لائیں گے۔ یہ صدیوں پرانا رواج ہے۔ تم اسے بدل نہیں سکتی۔“

”میں نے کہہ دیا ہے ناکہ میں نہیں جاؤں گی۔“ میں جتنی لہجے میں بولی۔
 ”نورین بیٹی، اگر تم نہ گئی تو لوگ باتیں بنائیں گے۔“ اب کی بار چاچی بولیں۔
 ”آپ لوگ خاموش ہو جائیں۔ نورین جائے گی اور ضرور جائے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ لوگوں سے۔“ اب نانی بولیں تو میں تڑپ اٹھی۔ ”مگر نانی.....“

”بس نورین، تم چپ رہو۔ کیا اپنی نانی کی بات بھی نہیں مانو گی۔ اس دفعہ تو تمہیں جانا پڑے گا۔ آئندہ دل نہ مانا تو مت جانا۔“ نانی نے بات ختم کر دی۔

دو دو حائی بچے ویسے کا کھانا دے دیا گیا۔ چار بجے تک ہم جانے کے لیے تیار تھے۔
 ”نانی آپ بھی چلیں نا ہمارے ساتھ۔“ میں نے اصرار کیا۔

”اے لڑکی..... کیا مجھے تمام عمر اپنا دم چھلانا کر رکھو گی۔ میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے کہ اب میں نے تمہارا ہی سایہ بن کر گزارنی ہے۔“ نانی کے بات سن کر سبھی ہنسنے لگے حتیٰ کہ میں بھی۔ آج میں بڑے دنوں بعد یوں ہنسی تھی اور آج نانی بھی بڑے دنوں بعد پرانے روپ میں نظر آئی تھیں۔

.....☆.....

گھر پہنچے تو دن ڈوب چکا تھا۔ چاچا اور اس کی فیملی نے بھی جانے کی اجازت مانگی۔ ہم سب نے رکنے کے لیے کہا مگر چاچا جانے کہا کہ ان کی غیر موجودگی میں کام کا بہت حرج ہو رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں اور مہوش اپنے کمرے میں آ گئیں۔ بلال بھائی اور جبار ہا ہر چلے گئے تھے۔ امی رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئیں۔ البتہ ابو مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔

میں اور مہوش کمرے میں آ کر بیٹھیں تو میں پوچھ بیٹھی۔

”مہوش، ابو کہاں ہیں؟ امی بتا رہی تھیں کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ کیا ہوا ہے ان کی طبیعت کو؟“
 ”کچھ مت پوچھو..... تمہارے جانے کے بعد..... یہاں کیا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔“ مہوش افسردگی سے بولی۔

”کیوں..... کیا ہوا تھا.....؟“ میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”تمہیں رخصت کرنے کے بعد ہم سب اندر آئے تو سب کے چہرے اداس تھے۔ ابو تو زیادہ ہی نڈھال دکھائی دے رہے تھے۔ ابو ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ جبکہ ہم باقی افراد لاؤنج میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ہمیں ابو کی ذہنی حالت کا ذرا بھی اندازہ ہوتا تو ہم انہیں کبھی بھی تنہا نہ چھوڑتے۔ ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے چائے پی رہے تھے کہ اچانک ڈرائنگ روم سے شیشے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ابو کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

ہم لوگوں نے چائے والے کپ وہیں چھوڑے اور ڈرائنگ روم کی طرف دوڑے۔ وہاں کا منظر بڑا لرزہ خیز تھا۔ ابو اپنے دونوں ہاتھ شیشے کے بنے ہوئے بک ریٹک پر مار رہے تھے اور ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔ میں نے اپنی بچی کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ اس کی خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ ابو کے دونوں ہاتھ شیشے لگنے سے لہو لہان ہو رہے تھے۔ جبکہ نیچے فرش پر ہر طرف شیشے بکھرا پڑا تھا۔ بلال بھائی نے آگے بڑھ کر ابو کو پکڑ لیا تو وہ ان کو گالیاں دینے لگے اور کہنے لگے کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم نے میری بچی کی زندگی تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ مجھے بھی تم نے درغلا یا ہے۔ کاش میں تمہاری باتوں میں نہ آتا۔ ایک مرتبہ تو اپنی بچی کی بات سن لیتا۔ اس پر یقین کرتا۔ اسے تحفظ کا احساس دلاتا۔ میں بہت ظالم ہوں۔ چھوڑ دو مجھے۔ مجھے میرے ظلم کی سزا ملنی ہی چاہیے۔

ابو کی حالت دیکھ کر ہم سب رونے لگے۔ چاچا نے اور بلال بھائی نے ابو کو بمشکل قابو کیا۔ ابو کو بٹھا کر انہیں پانی پلایا گیا۔ بلال بھائی فوراً ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر نے ابو کے ہاتھوں کی مرہم پٹی کی اور بلڈ پریشر چیک کر کے بتایا کہ بی بی بہت بڑھ گیا ہے۔ انہیں سخت ذہنی دباؤ کا سامنا ہے۔ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ تمہیں لینے کے لیے ابو ساتھ نہیں گئے۔ بلکہ ہم نے زور ہی نہیں لگایا کہ وہ ساتھ جائیں۔ ان کا گھر میں آرام کرنا زیادہ بہتر تھا۔“

مہوش کی زبانی یہ ساری صورتحال سن کر میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائے لگیں۔

”اب ابو کہاں ہیں؟“ میں نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہیں۔ شاید سو رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ میں اٹھ کر دوپٹہ درست کرنے لگی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

”میں ابو کو دیکھنے جا رہی ہوں۔“

میں نے ابو کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ میں آہستگی سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ابو بیڈ پر لیٹے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید سو رہے تھے۔ میں چند لمحے کھڑی ابو کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ ان کا چہرہ ایک دم زرد ہو رہا تھا۔ ابو ایک دن میں ہی کتنے کمزور لگ رہے تھے۔ میری بے رخی نے ابو کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے ابو پر بے پناہ پیار آنے لگا اور خود پر بے تحاشا غصہ بھی۔ میں نے ابو کی محبت پر شک کیا۔ بہت غلط کیا۔ ماں، باپ کی محبت ہر بناوٹ اور قصص سے پاک ہوتی ہے۔ ایک دم خالص..... ساری غلطی تو بلال بھائی کی ہے جس نے بغیر سوچے سمجھے رائی کا پہاڑ بنا دیا اور ابو کے کان بھی انجانے دوسووں اور اندیشوں سے بھر دیئے۔ ابو بے چارے بھی شاید بلال بھائی کی باتوں میں آ گئے۔

میں کھڑی سوچتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی اور انہی آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ابو کی طرف سے پیدا ہونے

والی بدگمانی بھی دھلتی جا رہی تھی۔ پھر میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ابو کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے پاؤں پر اپنا چہرہ رکھ کے ان کے پاؤں بھگونے لگی۔

ابو کو اپنے پیروں پر انجانا لمس محسوس ہوا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے میں مدد دی۔

وہ میرے ساتھ لپٹ کر رونے لگے۔ ”میری بچی مجھے معاف کر دو۔ انجانے میں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو

گئی۔“

”ابو..... ایسا مت کہیں ابو..... میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”تو کیا..... تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ وہ بے تابی سے بولے۔

”جب میں ناراض ہی نہیں ہوں تو معافی کس بات کی۔“

”نہیں بیٹی..... تم کچھ بھی کہو..... میں نے اپنی انا کے زعم میں تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کر دی۔

تمہارے خواب چکنا چور کر دیئے۔“

”ابو..... میری قسمت میں شاید یہی لکھا تھا۔“

”ہرگز نہیں..... میری بچی، تم اب بھی اپنے خواب پورے کر سکتی ہو۔ تم پڑھو..... جتنا پڑھنا چاہتی ہو پڑھو۔

جبار منع کرے گا تو میں بات کروں گا اس سے۔ تم اپنے خواب پورے کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

ابو شاید اس طرح اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہ رہے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے بڑی ڈھارس ملی۔ میرے اندر پھر

سے زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہونے لگی۔ ابو کی باتوں سے مجھے اور میری باتوں سے ابو کو بہت حوصلہ ملا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ابو

نے رات کا کھانا ہمارے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھایا۔ یہی نہیں بلکہ ابو بات بے بات مسکرا بھی رہے تھے۔ جبار کو ہمارے گھر

میں خصوصی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ آخر وہ اس گھر کا داماد تھا۔ جبار بھی سب گھر والوں کے ساتھ بڑی خوش مزاجی اور انکسار

سے بات کرتا تھا۔ ابو، جبار کے رویے سے بہت خوش تھے۔

☆.....

تیسرے دن ماموں اور ممانی ہمیں لینے کے لیے آگئے۔ نانی ان کے ساتھ نہیں آئی تھی اور پھر ہم اپنے گھر آ

گئے۔

آج میں بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ خوبصورت پیلے رنگ کے کاڈار سوٹ پر سونے کا زیور خوب بہار دے

رہا تھا۔ نانی نے مجھے دیکھا تو خوب بلائیں لیں اور ساتھ ہی نظر بد سے بچنے کے لیے سورۃ کوثر پڑھ کر پھونک ماری۔ جبار جو

سب کے سامنے خوب چمک رہا تھا۔ کمرے میں تنہائی میسر آتے ہی منہ پھلائے بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے گیا۔

عجیب بد مزاج اور بد ذوق انسان ہے۔ میں نے دل میں کوٹنے دینے شروع کر دیئے۔ خلوت میں ایک

نوعر اور پرکشش لڑکی بطور ہیوی میٹھی ہے اور یہ موصوف ٹی وی پر ایک خشک اور بورنگ شو دکھ رہے تھے۔ حد ہوتی ہے خشک

مزاجی کی۔

میں نے غصے سے فرق کھولا اور اس میں سے فروٹ نکال کر کھانے لگی۔

”آپ کھائیں گے کیا؟“ ازراہ مروت میں نے پوچھا۔

”نہیں، مجھے نہیں چاہیے..... تم کھاؤ۔“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر دکھے پن سے کہا۔

”نہیں تو نہ سہی۔“ میں نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

وہ تھوڑی دیر ناک شود بکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک انڈین چینل لگا لیا جہاں اس وقت راج کپور اور زگس کی ایک فلم لگی ہوئی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے وہ فلم دیکھنے لگا۔ اس کی اس قدر بے اعتنائی سے میں چڑنے لگی۔ اُسی وقت میرے ذہن میں ایک بات آئی، میں مسکرانے لگی۔

”ایک بات بتائیں گے کیا؟“ میں شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

”پوچھو۔“ اس نے فلم سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

”آپ صرف اپنے دور کی فلمیں دیکھتے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا۔

”آج کل کی فلمیں بھی دیکھتے ہیں۔“ میں معصومیت سے بولی۔ ”ویسے مجھے تو شاہ رخ خان، عامر خان اور

سلمان خان کی فلمیں پسند ہیں اور آپ کو.....“

”زہر لگتی ہیں مجھے ان نئے ہیروز کی نئی فلمیں۔ ایک دم بندروں کی طرح اچھلتے رہتے ہیں۔ مل گیا جواب کچھ اور

تو نہیں پوچھنا۔“

”پوچھنا تو بہت کچھ ہے۔ اگر آپ بتانا پسند کریں تو۔“ مجھے اس کے اس طرح چڑنے سے بہت لطف آ رہا تھا۔

دل چاہ رہا تھا کہ اسے تھوڑا اور تنگ کروں۔

”جلدی پوچھو پوچھنا ہے۔ اس کے بعد چپ چاپ شرافت سے سو جاؤ۔“ اس نے آرڈر دیا تو میں بمشکل اپنی

ہنسی روک سکی۔

”آپ اس شادی کے لیے تیار کیسے ہو گئے؟ میں نے تو سنا تھا آپ نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

وہ میرا سوال سن کر بوکھلا گیا۔ مگر پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ ”بس امی اور ابانے اس قدر اور اس طریقے سے مجبور کیا

کہ ماننا ہی پڑا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے کہ اگر تمہاری فوری شادی نہ کی گئی تو تمہاری

جان کو خطرہ ہے۔ جبکہ مجھے تو ایسی کسی بیماری کی علامات تم میں نظر نہیں آئیں۔ اچھی بھلی نظر آرہی ہو۔“ وہ میری طرف غور

سے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کے اس طرح دیکھنے سے میں جزبہ ہو گئی، پھر بولی۔ ”تو آپ انکار کر دیتے تا۔ آپ کے لیے میری جان کی

کیا اہمیت تھی۔“

”کوئی اور بات نہیں کہنی تو اب سو جاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔

”جبار بھائی.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”اوہ سوری..... غلطی سے نکل گیا..... آئی ایم ریلی

سوری۔“

”اٹس اوکے۔“ وہ پھر ٹی دی دیکھنے لگا۔

”کیا آپ کو شہانہ بہت یاد آتی ہے؟“ میں نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہا یوں جیسے سنا ہی نہ ہو۔ میں بھی خاموش ہو گئی۔ اٹھ کر واش روم میں گئی۔ کپڑے بدلے، منہ دھویا اور آکر لیٹ گئی۔ جہار نے اٹھ کے نکیہ اور چادر پکڑ لی۔ صوفے پر رکھی اور ٹیوب لائٹ بند کر کے صوفے پر لیٹ گیا۔ میں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کیں تو تصور میں غفار آ گیا۔ اس کی باتیں، اس کی شرارتیں، اس کی مسکراہٹیں۔ جب غفار واپس آئے گا مجھے اپنی بھابی کے روپ میں دیکھے گا تو کیا محسوس کرے گا۔ کیا وہ با آسانی اس صدمے کو چھیل جائے گا۔ یقیناً نہیں..... اسے بھی میری طرح کرب و اذیت کا ایک بیکراں سمندر عبور کرنا پڑے گا۔ یہی باتیں سوچتی سوچتی کب نیند کی وادی میں اتری، پتا بھی نہ چلا۔

☆.....

دس بارہ دن اسی طرح گزر گئے۔ ہم دونوں کے درمیان خلیج برقرار رہی۔ دونوں شاید اپنے اپنے انار کے خول میں بند ایک دوسرے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

نانی نے ایک دن باتوں باتوں میں جہار کے رویے کے متعلق پوچھا تو میں نے کہہ دیا۔

”نانی، وہ مجھ سے بچوں کی طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کو ڈانٹ دے یا کوئی استاد اپنے شاگرد کو جھڑک دے۔ بیوی ہوں میں اس کی۔ اس بات کا احساس ہونا چاہیے اُسے۔“

نانی میری بات سن کر ہنسنے لگیں۔ ”اری پگلی، اس کے لیے تو، تو بچی ہی ہے۔ بارہ سال کا فرق کوئی کم فرق نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔ اس لیے بزرگی کا رعب جاتا ہے۔“

”مگر میں اب بچی نہیں ہوں..... بیوی ہوں اس کی۔ اس کی زندگی میں برابر کی ساتھی۔“ میں اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”ہاں، بھئی بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔“ نانی سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”تم اس کی بیوی ہو تو ایک مکمل اور پریکٹیکل بیوی بن کر دکھاؤ نا۔ یہ خالی نام کی بیوی بن کر کیسے رعب جھاڑ سکتی ہو اس پر۔“ نانی بڑی دور کی کوڑی لائیں۔

”مگر نانی..... جب وہ..... میرے ساتھ سوتا ہی نہیں..... تو میں عملی بیوی کیسے بن سکتی ہوں۔“ یہ بات کہتے کہتے میں شرم سے لال ہو گئی۔

”یہی تو تمہارا کام ہے۔ تم اسے صوفے سے بیڈ پر واپس کیسے لاتے ہو۔ یہ تم نے سوچنا ہے۔ بعض اوقات حق مانگنے سے نہ ملے تو چھیننا پڑتا ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہونا!“

میں سر ہلا کر رہ گئی۔

اسی وقت میں نے اپنے ذہن میں رات کے لیے ایک شاندار منصوبہ ترتیب دے لیا۔ جس کے ناکام ہونے کے چانسز ایک پرسنٹ بھی نہیں تھے۔

رات کا کھانا کھا کر ہم اپنے کمرے میں آئے تو حسب معمول جہار پرانی انڈین فلم لگا کر بیٹھ گیا۔ میں تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتی رہی مگر میرے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ میں اٹھی اور الماری کھول کر بیگ سے لٹکی بلیک ناکی کھینچ لی۔ واش روم میں گئی اور ناکی پہن کر باہر آ گئی۔ یہ ناکی ایسی تھی جو چھپانے سے زیادہ دکھانے کا کام کر رہی تھی۔ میں جہار کے

سامنے سے گذری تو وہ ٹی وی چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گڑبڑا کر پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا۔ مگر اس کا ذہن منتشر ہو چکا تھا اور یہی میں چاہتی تھی۔

پھر میں بیڈ پر بیٹھ کر بازوؤں اور ٹانگوں پر مونچھ اڑاؤں لٹکے۔ میں نوٹ کر رہی تھی کہ وہ کن اکھیوں سے میری طرف بار بار دیکھ رہا تھا۔ لوٹن ملنے کے بعد میں لیٹ گئی۔ پھر میں اس کی طرف ہو کر الٹی لیٹ کر کہنیوں پر وزن ڈال کر دیکھنے لگی۔

”ذرا سیٹے۔“ میں نے بڑی اداسے اُسے پکارا۔

”ہوں.....“ اس نے میری طرف دیکھا تو اس ہوشربا نظارے میں کھو گیا۔

”میں کہہ رہی ہوں، آپ کافی دنوں سے صوفے پر سو رہے ہیں۔ کیوں نہ آج آپ بیڈ پر آ جائیں اور میں صوفے پر سو جاؤں۔“

وہ ابھی تک شباب پر شاداب کی اونچی اونچی چنچی وادیوں میں کھویا ہوا تھا۔ میری بات شاید اس نے سنی ہی نہ تھی۔

”آپ نے جواب نہیں دیا۔“

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا کہہ رہی تھی تم؟“

”میں یہ کہہ رہی تھی کہ آج سے آپ بیڈ پر سویا کریں اور میں صوفے پر۔“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں یہاں پر۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔

مجھے اپنے مشن میں آدھی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اب آدھی باقی تھی جو نسبتاً آسان تھی۔ لوہا گرم ہو چکا تھا۔

اب اس پر کاری ضرب لگانا تھی۔ اس کے بعد جلدی ہی اس نے ٹی وی بند کر کے لائٹ بھی بند کر دی۔ پھر وہ بیڈ کی طرف نکلیے لینے آیا تو زیرو دات کی بلب کی روشنی میں مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے ہاتھ نکلیے اٹھاتے وقت کانپ رہے ہیں اور ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلما رہے ہیں۔ اس نے میری طرف دیکھنے سے اعتراف کیا اور میں بھی سوتی بن گئی۔

وہ جا کر صوفے پر لیٹ گیا۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ میں چینیں مارتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ وہ بوکھلا کر میری طرف بھاگا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ وہ میرے پاس کھڑا پوچھ رہا تھا۔ میں فوراً اٹھ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ میری قربت سے وہ مدھوش سا ہونے لگا۔

”میں نے بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ میں اسے زور سے پھینچے ہوئے بولی۔

اس نے بازوؤں کے گھیرے میں مجھے لے لیا اور پھر ایک ہاتھ سے میری کمر سہلانے لگا۔ مجھے اس کے تیز دھڑکتے دل کی دھک دھک ہا آسانی سنائی دے رہی تھی۔

”پلیز آپ میرے ساتھ سو جائیں۔ میں اکیلی نہیں سوؤں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں یہیں سو جاتا ہوں تمہارے پاس۔“ وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولا اور پھر میرے ساتھ لیٹ گیا۔ اور یوں شادی کے بیس دن بعد یہ دوری دور ہوئی اور ہم بطور میاں بیوی حقیقی معنوں میں اس رشتے سے متعارف ہوئے۔

یہ میری اور نانی کی بہت بڑی بھول تھی کہ جبار کو جب ازدواجی خوشیاں حاصل ہوں گی تو اس کی سخت مزاجی، نرم مزاجی میں بدل جائے گی۔ شادی کے بعد بھی اس کے مزاج اور موڈ میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔ وہ ہر وقت اکھڑا اکھڑا اور سرد مہر ہی رہتا۔ شاذ و نادر ہی کبھی کسی بات پر مسکراتا ورنہ منہ پھلائے ہی رہتا۔

اور جو بڑی تبدیلی اس میں آئی وہ بھی میرے حق میں بڑی ثابت ہوئی اور اس تبدیلی کی ذمہ دار بھی میں ہی تھی۔ اس رات کے بعد اب اس کی خواہش ہوتی کہ ہر رات ایسی ہی ہو۔ میرے انکار کو وہ کوئی اہمیت ہی نہ دیتا۔ میں اس کی دیوانگی اور مردانگی کا ساتھ نہ دے پاتی اور بہت جلدی تھک جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں دن بدن کمزور ہونے لگی۔ رنگ بھی پیلا زرد ہوتا جا رہا تھا۔ نانی مجھے بڑا کھلاتی پلاتیں مگر میری صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ جبار کو میری گرتی صحت کے متعلق کوئی تشویش نہ تھی۔ اسے صرف میرے جسم سے مطلب تھا اور یہ ایسا موضوع تھا کہ کوئی بھی اس سے کھل کر بات نہ کر سکتا تھا اور نہ اسے منع کر سکتا تھا۔

آخر جب آ کر نانی مجھے امی کے گھر چھوڑ آئیں۔ جبار سے دو تین دن کی اجازت لی تھی مگر یہاں آ کر نانی نے امی کو ساری صورت حال بتائی اور کہا کہ نورین کو ایک ماہ تک یہیں رکھو اور اس کی خوراک پر خصوصی توجہ دو۔ نانی نے جا کر جبار اور باقی گھر والوں سے کہہ دیا کہ نورین کی طبیعت خراب ہے وہ کچھ دن وہیں رہے گی۔ بظاہر کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا مگر جبار نے دوسرے ہی دن فون کر دیا۔

”تم دادی کے ساتھ واپس گھر کیوں نہیں آئی؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”تو کیا وہاں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ چہیتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”شائد۔“ میں لا پرواہی سے بولی۔

”کتنے دن رہو گی؟“

”امی تو ایک ماہ کا کہہ رہی ہیں۔“

”مگر تم مجھ سے دو تین دن کی اجازت لے کر گئی ہو۔“ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

”اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ امی کی یہی مرضی ہے۔“ میں نے سارا مطلب امی پر ڈال دیا۔

”میری پھوپھو سے بات کرو۔“ وہ تھکنا لہجے میں بولا۔

میں نے امی کو آواز دے کر ریسپوران کے ہاتھ میں دے دیا۔

”ہاں بیٹا..... کیسے ہو؟“ امی شفقت سے بولیں۔

”میں ٹھیک ہوں پھوپھو۔ آپ سے بات کرنی تھی۔“

”ہاں، کہو بیٹا۔“

”پھوپھو، میں نورین کو..... زیادہ دن تک وہاں رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”کیوں بیٹا، اس میں کیا حرج ہے؟ یہ اس کے والدین کا گھر ہے۔ ویسے بھی جب سے اس کی شادی ہوئی ہے

رہنے کے لیے کب آئی ہے۔ ایسے ہی پل دو پل کے لیے لائے ہو۔ اب پہلی مرتبہ ہی تو رہنے کے لیے آئی ہے۔“

امی کی لمبی چوڑی تہید کا بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”پھوپھو، یہ میری اجازت کے بنا کہیں بھی نہیں رہ سکتی۔ آپ اسے بلال کے ساتھ گھر بھیج دیں۔“

”اگر میں نہ بھیجوں تو.....“ آخر امی کو بھی غصہ آ گیا۔

”تو یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔

”یہ ایک مہینہ یہیں رہے گی۔ اس کی صحت ابھی اس بات کی اجازت نہیں دے رہی کہ یہ تمہارے پاس رہے۔ کل میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہی ہوں.....“

ابھی امی بات کر رہی تھیں کہ اس نے فون بند کر دیا۔ امی فون کا ریسیور ہاتھ میں تھا مے ششدر کھڑی تھیں۔

”اس لڑکے کا دماغ تو سا تو ایس آسمان کو چھو رہا ہے۔ کہتی رہی تمہارے باپ کو یہ رشتہ مجھے منظور نہیں مگر اس کے دماغ پر تو اس وقت نجانے کون سا خط سوار ہو گیا تھا۔“

امی نے رات کو ابو کو بھی جبار کے رویے کے متعلق بتایا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔

دوسرے دن امی مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے چند ضروری ٹیسٹ کیے اور بتایا کہ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ بس تھوڑی کمزوری ہے اور یہ ماں بننے والی ہیں۔ ڈاکٹر نے طاقت والی کچھ دوائیں لکھ دیں۔

امی یہ خوشخبری سن کر بہت خوش ہوئیں۔ گھر آ کر یہ خبر سب کو سنائی۔

”اولاد بڑے سے بڑے پتھر دل انسان کو بھی موم کر دیتی ہے۔ دیکھنا یہ خوشخبری سنتے ہی جبار دوڑ دوڑا چلا آئے گا۔“ امی مجھے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔

مگر یہ بھی امی کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ امی نے فون پر اطلاع دی تو ممانی نے اور نانی نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور یقیناً انہوں نے یہ خبر جبار کو بھی دی ہوگی مگر اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا۔ نہ اس نے فون کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور نہ ملنے آیا۔ اسے اپنی حکم عدولی کا پتا نہیں کتنا غصہ تھا کہ اس نے یہ ایک مہینہ مجھ سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ کیا۔ اس کا رویہ دیکھ کر امی اور ابو دونوں پریشان تھے۔ ابو دل ہی دل میں اپنی جلد بازی پر پچھتا رہے تھے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس ایک مہینے میں میری صحت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ امی نے بلال بھائی سے کہا کہ مجھے چھوڑ آئے بلکہ امی نے کہا کہ میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ امی نے دوسوٹ میرے اور دوسوٹ جبار کے لیے خریدے۔ مٹھائی کی ٹوکری اور ڈھیروں پھل بھی لے لیا۔ کیونکہ بیٹی میکے میں کچھ دن رہے تو خالی ہاتھ رخصت کرنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔

امی اور بلال بھائی مجھے چھوڑنے کے لیے گئے تو زیادہ دیر کے نہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرے اور واپس آ گئے۔ جبار اس وقت دفتر گیا ہوا تھا۔ باقی افراد بڑے تپاک سے ملے۔ نانی تو میرے ماں بننے پر بہت زیادہ خوش تھیں۔

اب مجھے جبار کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی یہ خبر سن کر بہت خوش تھا۔ بس ناراضگی کی وجہ سے اظہار نہیں کر رہا تھا۔ ہم صحن میں بیٹھے شام کا کھانا کھا رہے تھے کہ جبار آ گیا۔ حسب عادت وہ سلام دعا کیے اور رُکے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔ وہ کپڑے بدل کر آئینے کے آگے کھڑا کھنکھی کر رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“

”اب کیوں آئی ہو؟“ وہ پیچھے مڑ کر پھنکارا۔ ”ابھی رہتا تھا اپنی ماں کے پاس۔ جب اس کا دل بھر جاتا تب آ جاتی۔“ یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔

میں تو جو بونچکی کھڑی رہ گئی۔ کس قدر تحقیر آمیز لہجہ تھا اس آدمی کا۔ کس قدر جاہلیت ہے اس کی باتوں میں۔ جس عورت کو یہ اتنی بدتمیزی سے میری ماں کہہ رہا ہے وہ عورت اس کی سگی پھوپھو ہے۔ کیا ساس بننے سے پھوپھو والا رشتہ ختم ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بھل بھل بننے لگے۔ میں وہیں بیٹ پر گر کر رونے لگی۔

رات کو وہ چپ چاپ مجھ سے بات کیے بغیر سو گیا۔ اگلے دن نانی نے مجھے بھی دیکھ کر پوچھ لیا۔

”نورین! کیا بات ہے۔ اداس دکھائی دے رہی ہو۔“ نانی نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں جواب دینے کے بجائے رونے لگی۔

نانی گھبرا گئیں۔ ”ارے ارے کچھ بتاؤ بھی تو آخر ہوا کیا ہے؟“

”نانی، جبار مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ وہ مجھ سے بات نہیں کر رہے۔“ میں ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”حوصلہ کرو چندا، تم پر خواہ مخواہ کی دھونس جمارہا ہے۔ من ہی من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے ٹکڑے

کے۔“ نانی نے مسکراتے ہوئے مجھے تسلی دی۔

”مگر نانی..... میں نے ایسی کون سی بوی خطا کر دی جس کی سزا مجھے یوں دے رہے ہیں۔ آپ اور امی کے

کہنے پر ہی تو رکی تھی وہاں۔“

”آنے دے آج جبار کو، میں خود اس سے بات کروں گی۔ اب تم یہ رونا دھونا بند کر کے پرسکون ہو جاؤ۔ ویسے

بھی ڈاکٹر نے تمہیں ذہنی دباؤ سے دور رہنے کے لیے کہا ہے۔“ نانی کی باتوں سے مجھے کافی ڈھارس ملی اور میں خاصی حد

تک ریلیکس ہو گئی۔

اور پھر اسی شام نانی نے جبار سے بات کی۔

رات کا کھانا کھا کر ہم دونوں میاں بیوی اپنے کمرے میں آئے۔ جبار نے ٹی وی لگا لیا اور میں ایک کتاب کی

ورق گردانی کرنے لگی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ نانی، جبار سے بات کرنے آئیں گی۔ میرا دھیان دروازے کی طرف بار بار جا

رہا تھا۔ جبار کا میرے ساتھ رویہ ہنوز برقرار تھا۔ اس کی سردمہری میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ پھر دروازہ کھلا اور نانی اندر آئیں۔

میں نے فوراً کتاب بند کر کے ایک سائیڈ پر رکھ دی۔

نانی اندر آئیں تو صوفے پر لیٹا ہوا جبار بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے ٹی وی کی آواز بھی مدہم کر دی۔ نانی میرے

پاس بیٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کا رخ جبار کی طرف ہی تھا۔

”جبار! ٹی وی بند کر دو، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں“ نانی سنجیدگی سے بولیں تو جبار کے چہرے پر ناگواری کے

تاثرات ابھر آئے۔ اس نے ریموٹ پکڑا اور ٹی وی بند کر دیا۔

”جبار! تم کس بات پر ناراض ہو؟“ نانی نے پوچھا۔

”یہ آپ سے کس نے کہا ہے کہ میں اس سے ناراض ہوں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔

”یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ تم اس سے ناراض ہو۔ بلکہ یہ بات زیادہ اہم ہے کہ تم کیوں

ناراض ہو۔“

”جانتا ہوں اسی نے آپ کے کان بھرے ہیں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے زہر خند سے بولا۔ ”اب ہمارا ہر آپسی مسئلہ یہ آپ کے ساتھ ڈکس کرے گی۔“

”دیکھو جبار..... تم اس پر بلاوجہ غصہ ہو رہے ہو۔ یہ وہاں میری مرضی سے رکی تھی۔ میں نے ہی اصرار کیا تھا کہ ایک ماہ وہاں رہ کر مکمل آرام کرو اور پھر ڈاکٹر نے بھی یہی مشورہ دیا تھا۔“

”یہ وہی کرے گی جو میں چاہوں گا۔ اس کا خاوند ہوں میں۔ آپ اسے اوٹ پٹانگ مشورے مت دیا کریں۔“ اب جبار سیدھا سیدھا بدتمیزی پر اتر آیا۔

نانی کو اس کی بدمزاجی پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ پی گئیں اور پھر قہر سے بولیں۔ ”اللہ نے تمہیں اتنی بڑی خوشخبری دی ہے۔ تمہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اپنی بیوی کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اُلٹا تم اسے پریشان کر رہے ہو۔“

”نانی، یہ ہم دونوں میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“

”کیسے فکر مند نہ ہوں۔“ نانی تنک کر بولیں۔ ”یہ تو اسی ہے میری۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ اس کی اداسی میرے لیے باعث پریشانی ہے۔“

”اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ میں بچھلی باتیں بھلانے کے لیے تیار ہوں اگر آئندہ یہ کبھی ایسی غلطی نہ دہرائے۔“ جبار نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”کیسی غلطی؟“ اب کی بار میں بولی۔

”یہی کہ مجھ سے پوچھ بھاکیں آنے جانے اور رہنے کی غلطی۔“ وہ جتنی لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، آئندہ ہر کام تم سے پوچھ کر ہی کرے گی۔ اب بچھلی بات کو ختم کر کے آپس میں راضی صلح سے رہو۔ میں جارہی ہوں۔ اُمید ہے میری باتیں تم دونوں کی سمجھ میں آگئی ہوں گی۔ کیوں جبار.....“

”سمجھ گیا ہوں دادی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“

اور نانی واقعی بے فکر ہو کر کمرے سے نکلیں۔ اُن کے جانے کے بعد جبار بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

”دادی کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ سیدھی طرح خود معافی نہیں مانگ سکتی تھی۔“ وہ رعونت سے ایسے بولا جیسے مجھے معاف کر کے اس نے مجھ پر کوئی احسان عظیم کر دیا ہے۔

میں خاموش رہی تو اس کی تحسانہ آواز پھر اُبھری۔ ”اُٹھ کر لائٹ بند کرو۔“

میں کسی رو بوٹ کی طرح اُٹھی۔ لائٹ آف کی۔ زیر واث کا بلب آن کیا اور پھر سے بیڈ پر آ بیٹھی۔

”میری ٹانگیں دباؤ۔“ اس نے حکم دیا۔

”کیا؟“ میں بے اختیار بولی۔

”کیسا نہیں۔ چلو پھر سے کہہ دیتا ہوں میری ٹانگیں دباؤ۔“

”میں..... ٹانگیں دباؤں۔“ میں حیرت سے بولی۔

”تمہارے علاوہ اس وقت کمرے میں کون ہے..... اگر اور کوئی نہیں ہے تو تمہیں ہی کہہ رہا ہوں۔“

”مگر مجھے ٹانگیں دہانی نہیں آتیں۔ میں نے کبھی کسی کی ٹانگیں نہیں دہائیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ آج دباؤ کی تو دہانی آ جائیں گی۔ ہر کام زندگی میں کبھی نہ کبھی پہلی مرتبہ کرنا پڑتا ہے۔“

مجھے اس کا یہ آرڈر بہت ناگوار گذر رہا تھا۔ پتا نہیں کس دور میں جی رہا تھا یہ آدمی۔ اتنا پڑھا لکھا ہو کر بھی دقیانوسی سوچ رکھتا تھا۔ میں اب مزید کوئی بد مزگی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ہسکتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی اور اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اس کی موٹی اور سخت ٹانگیں دہانے لگی۔

”واہ..... سکون آ گیا۔ عورت کے ہاتھوں میں بھی جانے کیسا جادو ہے۔ جہاں جہاں لگاتی ہے آسودگی سی چھا جاتی ہے۔“ وہ آنکھیں موندے موندے بولا۔

میں تھوڑی دیر ٹانگیں دہاتی رہی، پھر اس نے مجھے بازو سے کھینچ کر ساتھ لپٹالیا۔

”اب بتاؤ..... ڈاکٹر کیا کیا کہتی تھی؟“ اس نے سرگوشی کی۔ میں نے اس کے صحت مند سینے میں منہ چھپالیا۔

☆.....

ایک ہفتہ بخیر و عافیت گذر گیا مگر پھر غفار آ گیا۔ وہ بالکل اچانک بغیر اطلاع دیئے آ گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں لیٹی کوئی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی کہ نانی ہانپتی کانپتی اندر آئیں۔

”نورین..... غفار آ گیا۔“ ان کی آواز میں لرزش تھی۔

”کیا.....“ میرے لیے بھی یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ ”کب..... کہاں ہے.....“ میں بدحواسی سے بولی۔

”وہ سیدھا اپنی ماں کے کمرے میں گیا ہے۔ بڑا پر جوش دکھائی دے رہا تھا۔ کسی بات پر زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اب یہ خبر سننے کا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔“ نانی بڑی فکر مند ہو رہی تھیں۔

میرا دل بھی اٹھل پھل ہو رہا تھا۔ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ جبار گھر میں نہیں تھا۔ وہ دفتر جا چکا تھا اور

اس کے آنے تک غفار شاید سنبھل جاتا۔

”اچھا میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ نانی جاتے جاتے بولیں۔ ”وہ اپنی ماں سے یہ خبر سن کر یقیناً میرے

پاس اپنے سوالوں کے جواب لینے آئے گا۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گی کہ اسے مطمئن کر سکوں۔ اس کے بعد وہ یقیناً

تمہارے پاس آئے گا۔ کیا تم ادھر اپنے کمرے میں ہی رہو گی۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ میرے کمرے میں آ جاؤ۔“ نانی نے

پیشکش کی۔

”نہیں نانی، میں اس سے بھاگ کر کہیں چھپ نہیں سکتی۔ میں یہیں اپنے کمرے میں اس کا انتظار کروں گی۔

جیسی بھی، جو بھی صورت حال ہوئی اس کا سامنا کروں گی۔“ میں اٹل لہجے میں بولی۔

”چلو ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔“ نانی کو جاتے جاتے پھر کچھ یاد آیا۔ ”مگر نورین، اس سے کہو گی کیا۔ دیکھو کچھ

بھی کہو مگر اس بات کا کوئی ذکر نہ کرنا۔“

”کس بات کا نانی؟“

”وہی ہمسایوں کے لڑکے اور بلال کے رویے کا۔ میری بچی اس واقعے کا اپنی آئندہ زندگی میں کسی سے بھی ذکر نہ کرنا۔ نہ اپنے شوہر سے اور نہ کسی اور عزیز ہستی سے۔ کیونکہ مردوں کا ظرف اس معاملے میں بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ مرد کے دل میں عورت سے متعلق کوئی شک و شبہ پیدا ہو جائے تو وہ تمام عمر سانپ کی طرح ڈستار ہتا ہے اسے۔ سمجھ گئی ہونا۔“

”ہاں نانی، سمجھ گئی ہوں۔“

نانی چلی گئیں تو میں سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر سر جھٹک کر خود کو آنے والی صورت حال کے لیے تیار کرنے لگی۔ انتظار کے یہ لمحات طویل سے طویل تر ہوتے چلے گئے۔ میں بے چینی سے کبھی ٹہلنے لگتی اور کبھی بیڈ پر بیٹھ کر پہلو بدلنے لگتی۔ انتظار تو ویسے بھی تکلیف دہ ہوتا ہے مگر اس انتظار کا تو اختتام بھی اذیت ناک ہونا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً سنسبل کر بیٹھ گئی۔ دروازہ کھلا اور غفار اندر آ گیا۔ اُسے دیکھ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا ہنسا ہوا چہرہ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

”غفار! کیسے ہیں آپ؟“ میں بے تابی سے پوچھنے لگی۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر پھینکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

”ٹھیک ہوں..... اور تم.....“ اس نے چہیتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تمہارے سامنے ہوں۔“ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

”شادی مبارک ہو۔“ وہ زخمی لہجے میں بولا۔

میں خاموش رہی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

”ان تین مہینوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ کئی دفعہ صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں سمٹ جاتا ہے۔ ہے نا!“ اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

”آپ بیٹھیں نا۔“ میں نظریں چرا کر آنسو پیتے ہوئے بولی۔

”چلتا ہوں..... اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہوں اب آرام کروں گا۔ ایک بات کا جواب دو گی۔“ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”جی پوچھیں۔“ میں اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔

”کیا تم خوش ہو؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ میری آنکھوں میں جھللا تاپانی دیکھ لیا تھا اس نے شاید۔ وہ جانے کے لیے پلٹا تو میں نے پیچھے سے آواز دی۔

”غفار..... ذرا سنیے۔“

وہ رک گیا۔

میں نے ڈیرنگ ٹیبل کا دراز کھولا۔ اس میں سے جیولری بکس نکالا۔ اس بکس میں غفار کی دی ہوئی انگوٹھی پڑی جگمگا رہی تھی۔ میں نے انگوٹھی اٹھائی۔ لا کر غفار کے آگے انگوٹھی والا ہاتھ کر دیا۔ میری ہتھیلی پر انگوٹھی جگمگ کر رہی تھی۔ وہ

حیرت سے اس انگوٹھی کو تنک رہا تھا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔
 ”آپ کا دیا ہوا قیمتی اور نایاب تحفہ۔ اب میرا اس انگوٹھی پر کوئی حق نہیں۔ یہ آپ واپس لے لیں۔“ میں آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔

”مگر کیوں؟“ وہ تڑپ اٹھا۔
 ”یہ انگوٹھی تو آپ نے اپنی ہونے والی بیوی کے لیے خریدی تھی۔ اسے سنبھال کر رکھیں۔ جب آپ کی شادی ہو گی تو سہاگ رات کو یہ انگوٹھی اپنی بیوی کو پہنائیے گا۔“

”نورین، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں تم پر کہ تم میری دی ہوئی انگوٹھی میری نشانی سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔“
 ”نہیں، ہم دونوں کے درمیان ایسا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ اب میں آپ کی بھابی اور آپ کے بڑے بھائی کی منکوحہ ہوں۔ بس یہی ایک رشتہ ہر رشتے سے زیادہ بھاری اور مقدم ہے۔ وعدہ کریں کہ کبھی کسی اور رشتے کو یاد نہیں کریں گے اور نہ دہرائیں گے۔“

غفار نے کانپتے ہاتھ سے انگوٹھی اٹھالی اور چلا گیا۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح بیڈ پر گر گئی اور کافی دیر تک روتی رہی۔

☆.....

کتاب زندگی کے کچھ اوراق اور پلٹے۔ غفار دو ماہ رہنے کے بعد اٹلی چلا گیا۔ امی اور ابو کو حج کی سعادت حاصل ہو رہی تھی ان کی درخواستیں برائے حج منظور ہو گئی تھیں۔ وہ حج کرنے چلے گئے۔ زندگی لگی بندھی روٹین کے مطابق گذر رہی تھی۔ جبار کا رویہ کبھی مناسب اور کبھی انتہائی غیر مناسب ہو جاتا تھا۔ ہر وقت نوک ٹوک کرنا، ہر کام میں مین میخ نکالنا اس کی عادت تھی۔ میں اس کی اس عادت سے بہت نالاں ہو جاتی مگر پھر صبر و تحمل سے کام لے کر خود پر قابو پالیتی۔ میں ہر ماہ لیڈی ڈاکٹر سے باقاعدگی سے چیک اپ کرواتی۔ وہ پورا یقین دلاتی کہ نارل ڈیوری ہوگی۔

امی، ابو کو حج پر گئے ایک مہینہ ہو رہا تھا جب یہ اندوہناک خبر ملی کہ تقریباً پندرہ سو کے قریب حجاج کرام سرنگ میں بھگدڑ مچ جانے سے روندے گئے اور جان سے چلے گئے۔ جبکہ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی ان گنت تھی۔ یہ خبر ان لوگوں کے لیے قیامت سے کم نہ تھی، جن کے عزیز واقارب حج ادا کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے لیے بھی یہ قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ میں اور نانی بھاگم بھاگ مہوش اور بلال بھائی کے پاس پہنچیں۔ ان دونوں کا بھی پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ چاچا، چاچی بھی یہ سن کر وہاں آئے بیٹھے تھے۔ ہم سب ٹی وی کے سامنے نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ان دنوں نیوز چینل کی اتنی بھر مار نہ تھی۔ صرف ایک دینیوز چینل تھے جو اس سانحہ کی کوریج دکھا رہے تھے۔ ان میں بھی ایک حکومت کا چینل جبکہ دوسرا ایک انگریزی چینل تھا۔ دودن ہم مسلسل ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔

آخر تیسرے دن شہید ہونے والے حجاج کرام کی لسٹ اخبارات اور ٹی وی پر آ گئی۔ ان شہدا میں امی اور ابو کا نام بھی درج تھا۔ ہمارے سروں پر تو گویا جیسے آسمان گر پڑا ہو۔ تینوں بہن بھائی پاگلوں کی طرح پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ بلال بھائی بار بار اپنے بال نوچنے لگتے اور سردیواروں سے مارنے لگتے۔ چاچا اور ماموں انہیں بمشکل سنبھال پاتے۔ اس

موقع پر نانی نے کمال ضبط اور صبر کا مظاہرہ کیا۔ بے شک یہ صدمہ ان کے لیے بڑا جان لیوا اور اذیت ناک تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی اور داماد اچانک حادثاتی موت کا شکار ہوئے تھے۔ یقیناً وہ بہت بڑے کرب سے گزر رہی تھیں۔ مگر انہوں نے خود پر قابو رکھا اور ہمیں سنبھالنے میں لگی رہیں۔ ہماری دلجوئی کرتیں اور ہمیں زبردستی کھانا کھلانے کی کوشش کرتیں۔ کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہر زخم مندمل ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ اصولِ فطرت ہے اور قانونِ قدرت ہے۔ ہمیں بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ صبر آتا چلا گیا۔ ہم بھی اسے رب کی رضا سمجھ کر شاکر ہو گئے۔ باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا سے ایک دم محروم ہونا ہماری قسمت میں تھا اور قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے بھلا۔ میں اور نانی امی ابو کا چہلم کروا کر واپس گھر لوٹیں۔ اس دوران جبار بھی وقتاً فوقتاً چکر لگا رہا تھا۔ اس نے میری زیادہ دلجوئی تو نہ کی البتہ رسمی افسوس ضرور کیا تھا۔ آنے سے پہلے مہوش کو ہم لوگوں نے بہت ڈھارس دی تھی اور بلال بھائی کو نانی نے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ وقت پر گھر آئے اور مہوش کا بہت خیال رکھے۔

ان دنوں مجھے چھٹا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک ننھی سی جان میرے وجود میں حرکت کرتی تو مجھے بہت عجیب سا احساس ہوتا۔ آہ، میرا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی نانا، نانی کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ امی، ابو بھی تو آپ دونوں نے ہماری خوشیاں دیکھنی تھیں۔ بلال اور مہوش کی شادی اپنے ہاتھوں سے کرنی تھی۔ ہمارے بچوں کو اپنی گود میں کھانا تھا۔ ایسی باتیں سوچ کر مجھے رونا آ جاتا۔ نانی مجھے بھلانے کی ہر ممکن کوشش کرتیں۔ ممانی اور ماموں بھی میرا بہت خیال رکھتے۔ بس جبار کا رویہ واجبی سا تھا۔ جذبات کی اس کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ وہ ہر بات اور کام مشینی انداز میں کرنے کا عادی تھا۔ رونا دھونا اور غم والہ کو وہ قطعی غیر ضروری خیال کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے اس سے فرار ممکن نہیں۔ لہذا اس حقیقت کو جتنی جلدی قبول کر لیا جائے اتنی تکلیف کم ہوتی ہے۔

ان دنوں میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آرزوہ ہو جاتی اور رونے کے لیے بہانے تلاش کرتی تھی۔ جبار میری اس حالت سے بہت عاجز آ چکا تھا۔ کئی دفعہ آرام سے سمجھاتا اور کئی مرتبہ سختی سے جھڑک دیتا۔ اس رات بھی جبار نے کسی بات پر مجھے بے نقط سنائیں اور کروٹ بدل کر سو گیا۔ میں بیٹھی روتی رہی۔ اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آرام سے سوتا بنا رہا۔ جب کافی دیر تک میں روتی رہی اور میری بچی بندھ گئی تو وہ غصے سے پلٹا۔

”یہ کیا شوں شوں لگا رکھی ہے۔ رونا بند کرو اور خاموشی سے سو جاؤ۔“ وہی تحکمانہ لہجہ، وہی حکمیہ انداز۔

”میں روؤں یا نہوں آپ کو اس سے کیا۔“ میں سلگ اٹھی۔

”ٹھیک ہے، اگر رونے کا اتنا ہی شوق ہے تو باہر جا کر روؤ۔ یہاں میری نیند خراب نہ کرو۔ میں نے صبح دفتر جانا ہے۔ ڈیوٹی دینی ہے۔ تمہاری طرح سارا دن پلنگ نہیں توڑنا۔“ وہ زہر خند سے بولا۔

اس کے اس قدر کٹھور پن پر میرا دل چاہا اونچی آواز میں چیخ چیخ کر روؤں اور لوگوں کو بتاؤں کہ جن لڑکیوں کے باپ مر جاتے ہیں، ان کے ساتھ دنیا والے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ مگر میں خاموش رہی اور روتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے نہ تو آواز دی اور نہ روکنے کی کوشش کی۔ بلکہ آرام سے لیٹ گیا۔

باہر آئی تو ہر طرف ہوکا عالم طامی تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ وسیع صحن سنسان پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خوف محسوس ہوا مگر اگلے لمحے میرے اندر کا درد اس بیرونی خوف پر حاوی ہو گیا۔ میں صحن میں بنی ہوئی پختہ سیزھیوں پر بیٹھ گئی

اور چہرہ گھٹنوں میں دے کر بے تحاشا رونے لگی۔ آج مجھے امی، ابو کی یاد بری طرح ستا رہی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید جبار اتنی بے اعتنائی کبھی نہ برتتے۔ خاصی دیر رونے کے بعد من کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب تو آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔

میں نے سر اٹھا کر ارد گرد کا جائزہ لیا تو پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ اتنے بڑے صحن میں، میں اکیلی اتنی رات کو بیٹھی رو رہی تھی۔ اب مجھے سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اٹھی اور مرے مرے قدموں سے کمرے کی طرف چل دی۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو پورا کمرہ جبار کے خراٹوں سے گونج رہا تھا۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ کتنا بے حس اور پتھر دل انسان ہے۔ میرا رونایا خوش ہونا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔



وقت سبک رفتاری سے گذر رہا تھا اور میں ایک خوبصورت اور گول منول بیٹے کی ماں بن گئی۔ ننھے شہزادے کی آمد سے گھر کا ہر فرد بہت خوش تھا۔ بلال بھائی اور مہوش بھی بھانجے کو پا کر بہت خوش تھے البتہ جبار کے روپے میں اب بھی کوئی خاص بدلاؤ نہ آیا۔ وہ پہلے کی طرح بد مزاج اور اکھڑ مزاج ہی رہا۔ بیٹے سے بھی سرسری پیار کرتا۔ اسے تھوڑی دیر اٹھاتا اور لٹا دیتا۔ شادی کے بعد ایک عادت جبار کی اور میرے سامنے آئی جس سے میں قطعی لاعلم تھی اور وہ تھی اس کی حد درجہ کی کنبوسی۔ پرلے درجے کا کنبوس واقع ہوا تھا۔ صاحب حیثیت ہونے کے باوجود ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑتا تھا۔ اس کی جیب سے پیسے نکلوانا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب میں نے شاہ زیب کو ڈبے کا دودھ لگایا تو اس نے بہت احتجاج کیا اور سختی سے کہہ دیا کہ میں ڈبے کا دودھ انورڈ نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنا دودھ پلاؤ یا پھر بھینس کا دودھ شروع کروادو۔

ماموں نے یہ بات سنی تو انہوں نے کہہ دیا کہ ڈبے کے دودھ کا خرچا میں اٹھاؤں گا۔ شاہ زیب کو جب تک چاہو ڈبے کا دودھ پلاؤ۔

اس طرح پورا ایک سال شاہ زیب نے ڈبے کا دودھ پیا۔ جس کا خرچ ماموں نے اٹھایا۔ بلکہ ماموں ہی میری اور میرے بیٹے کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ جبار اپنی سیلری کے پیسے جوڑتا تھا۔ اپنی ذات پر بھی نہ ہونے کے برابر خرچ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دو پہر کا کھانا باہر سے نہ کھاتا تھا۔ صبح ہیوی ناشتہ کر کے جاتا اور شام کو گھر آ کر ڈٹ کر کھانا کھاتا۔ ویسے اس کے نظام انہضام کو داد دینی پڑتی تھی، جو تین تین بندوں کا کھانا ہضم کر لیتا تھا۔

ابھی شاہ زیب صرف پانچ ماہ کا ہوا تھا کہ میں پھر سے اُمید سے ہو گئی۔ سارا سارا دن اللیاں کر کر کے نڈھال ہو جاتی۔ شاہ زیب پر بھی اب پہلے جیسی توجہ نہ رہی تھی۔ ایسے وقت میں بھی نانی نے بہت ساتھ دیا۔ سارا دن شاہ زیب کو سنبھالتی صرف رات کو میرے پاس سوتا۔ بلکہ آخری مہینوں میں نانی نے اسے اپنے پاس سلانا شروع کر دیا۔ جب شاہ زیب سو سال کا ہوا تو زود ہی میری گود میں آچکا تھا۔

نانی اور مامی نے دونوں بچے پالنے میں میری بہت مدد کی، خصوصاً نانی نے۔ حالانکہ نانی کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ کوئی چیز دیکھ کی طرح ان کے جسم و جان کو اندر ہی اندر کھا رہی تھی اور وہ چیز کیا تھی سبھی بخوبی جانتے تھے۔ وہ تھا اکلوتی بیٹی کے بے وقت دنیا سے جانے کا غم۔

میں نے اکثر نانی کو تنہائیوں میں چھپ چھپ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب میں پوچھتی کہ نانی کیوں رورہی ہیں تو صاف مکر جاتیں۔ کہتیں میں کب رورہی تھی۔ ویسے ہی آنکھ میں کوئی چیز چلی گئی تھی۔ وہ خواہ مخواہ آنکھیں ملنے لگتیں۔

”نانی، آپ صرف آنکھوں سے ہی نہیں رورہی تھیں بلکہ ساتھ ہلکی آواز میں بین بھی کر رہی تھیں۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری۔ میں تو شاہ زیب کو لوری سنارہی تھی۔“

میں نانی کو اقبال جرم کروانے میں ناکام رہتی۔ نانی کسی عادی مجرم کی طرح مان کر نہ دیتیں۔ میں نانی کو غور سے دیکھتی تو نانی جڑبڑ ہونے لگتیں۔

”نورین، تم میری ٹوہ میں ہر وقت نہ لگی رہا کرو۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“ نانی نظریں چراتے ہوئے ناراضگی سے کہتیں۔

”نانی.....“ میں پکارتی۔

”ہوں.....“ وہ شاہ زیب کے کپڑے طے کرتے ہوئے بولیں۔

”میری طرف دیکھیں۔“

وہ میری طرف دیکھنے لگیں۔

”نانی..... اب میرے پاس کچھ بھی کھونے کا حوصلہ نہیں۔“ یہ کہہ کر میں رونے لگی۔

نانی نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”پگلی کہیں کی..... میں کہاں جا رہی ہوں..... یہیں رہوں گی..... تمہارے

پاس ہمیشہ۔“

”سچ نانی..... آپ کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑیں گی نا!“ میں بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

”بالکل سچ۔“ نانی مسکرائیں۔

”نانی ایک بات کہوں۔“

”ہاں ہاں، کہو۔“

”نانی اگر آپ کو کچھ ہو گیا..... نا..... تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے نورین..... میری عمر اب جانے کی ہے۔ جبکہ تمہارے ابھی ہنسنے کھانے کے دن ہیں۔

تمہیں ابھی بہت جینا ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر..... ایک وعدہ کرو نورین۔“

”کیا نانی؟“

”آئندہ کبھی ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکالو گی اور نہ کبھی زندگی میں ایسا کوئی قدم اٹھاؤ گی۔ خودکشی حرام ہے اور

یہ صرف بزدل لوگ کرتے ہیں۔ بہادر لوگ تو زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندہ رہتے ہیں۔ حالات کوئی سے بھی

ہوں، ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔“

”وعدہ..... نانی.....“

”لاؤ ہاتھ۔“ نانی نے اپنا بوڑھا ہاتھ آگے کیا تو میں نے اپنا ہاتھ نانی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”پکا وعدہ.....“

”ایک دم پکا.....“

میں نے نانی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ آخری دم تک ایفا کیا مگر نانی میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر سکیں۔ نانی کی گرتی ہوئی صحت بالآخر ٹائیفائیڈ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ بھاری بھر کم جسم بالکل لاغر ہو گیا تھا۔ کپڑے اس ڈھانچہ نما جسم پر جھولتے رہتے تھے۔ سرخ و سفید رنگت جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ماموں نے نانی کے علاج پر بہت پیسہ خرچ کیا۔ انہیں اچھے ہسپتال میں ایڈمٹ کروایا۔ مگر نانی جانبر نہ ہو سکیں۔ ٹائیفائیڈ کی تشخیص کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر قبر میں جاسوئیں۔

نانی کے مرنے کے بعد حقیقی معنوں میں مجھے یتیمی اور مسکینی کا احساس ہوا۔ مجھے لگا جیسے میرے ماں باپ آج مرے ہوں۔ مجھے بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے مگر نانی ہر چیز سے بے نیاز چپ چاپ آنکھیں موندے منوں مٹی تلے جاسوئیں۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح نہ تو میری ڈھارس بندھائی اور نہ تسلی دی۔

نانی کے جانے کے بعد میرا ہر چیز سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ بچوں پر بھی اب پہلے سی توجہ نہ رہی۔ ہر وقت چپ بیٹھی خلاؤں میں ٹکا کرتی۔ جبار کو نانی کے جانے کا کوئی خاص انفسوس نہ ہوا۔

وہ کہتا تھا کہ عمر کا تقاضا تھا۔ آخر جانے کا کوئی بہانہ بھی تو ہوتا ہے۔ دادی کی عمر خاصی ہو گئی تھی۔ ان کے جانے کا بہانہ ٹائیفائیڈ بخار بنا۔ اس کے لیے یہ بالکل عام سی بات تھی، بلکہ شاید وہ اندر سے خوش تھا کہ نانی کی روک ٹوک سے جان چھوٹی۔ کیونکہ وہ جبار کی کسی بھی زیادتی کے سامنے ڈھال بن جاتی تھیں اور یہ بات جبار کو بہت ناگوار گذرتی تھی۔

غفار کو فون پر اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس کو گئے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ اس ہفتے کے اندر اندر آنے کی کوشش کرے گا۔

اور پھر غفار آ گیا۔ اس دن نانی کو فوت ہوئے پانچواں دن تھا۔ میں صحن میں بیٹھی سوگواری کی حالت میں زوہیب کو دودھ پلا رہی تھی۔ ماموں تھوڑی دُور کھڑے ٹک کو کھانے کی ہدایات دے رہے تھے۔ مہوش اور بلال بھائی بھی صحن میں بیٹھے تھے۔ گاؤں کی عورتیں چٹائی پر بیٹھی قرآن خوانی کر رہی تھیں۔ جب غفار گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے بھاری بھر کم بیگ دیں پھینکے اور ماموں سے لپٹ کر اونچی آواز میں گریہ و زاری کرنے لگا۔ اسے روتا دیکھ کر باتی سبھی بھی رونے لگے۔

”ابو..... میری دادی کو کیا ہوا تھا۔ آپ نے ان کا خیال نہیں رکھانا۔ میں انہیں بالکل ٹھیک چھوڑ کر گیا تھا پھر دادی کیوں ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔“

وہ دادی کو یاد کر کے شدت سے ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ ماموں اسے تسلیاں بھی دے رہے تھے اور خود بھی رو رہے تھے۔ ممانی بھی پاس کھڑی رو رہی تھیں۔ پھر وہ ماموں کو چھوڑ کر ممانی سے لپٹ گیا۔ پھر بلال بھائی اسے باہر مردانے میں لے گئے۔

غفار کو یوں ہلکتا دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ مہوش مجھے چپ کروانے لگی۔

☆.....

ایک ہفتے تک غفار کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں دونوں بچوں کو سلا کر ان کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ جبار حسب معمول دفتر

گئے تھے۔ بلال بھائی اور مہوش بھی اپنے گھر واپس چلے گئے تھے۔ گھر کی فضا آہستہ آہستہ معمول پر آ رہی تھی۔ دروازہ کھلا اور غفار اندر آ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دونوں بچوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کو بڑی محبت اور وارفتگی سے دیکھنے لگا پھر جھک کر دونوں کے چہروں پر پیار کیا۔ پھر سیدھا کھڑا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی استری آف کر کے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تو میں بھی چپ چاپ آ کر بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

”نورین! دادی کے جانے کے بعد سب سے زیادہ اُن کی کمی یقیناً تمہیں ہی محسوس ہوتی ہوگی۔“

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ نانی کی ذات میرے لیے بہت بیش قیمت تھی۔ نانی میرے لیے ہر چیز سے بڑھ کر تھیں۔“ میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

غفار کے چہرے پر بھی ملال چھلکنے لگا۔ وہ پھر بولا۔ ”میری دادی میری بیسٹ فرینڈ تھیں۔ وہ دنیا کی سب سے اچھی دادی تھیں۔ میں ان کو کبھی بھی بھول نہ پاؤں گا۔“

میں چپ رہی تو وہ پھر بولا۔ ”پھوپھو اور پھوپھا کی ناگہانی موت کا سنا تھا تو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ افسوس کہ ابھی اس صدمے سے پوری طرح نکل بھی نہ پائے تھے کہ دادی داغ مفارقت دے گئیں۔“ اس کی آواز نرم ہو گئی۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔

”تم سناؤ..... نورین..... کیسی گذر رہی ہے؟“ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔

”اچھی گذر رہی ہے۔“ میں سنجیدگی سے بولی۔

”کیا جہار بھائی کے ساتھ خوش ہو۔“ اس کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

”میرا تو پتا نہیں..... البتہ وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہیں شاید۔“

”کیا مطلب؟“ اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔

”چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ سنائیں وہاں دو سال کیسے گذرے؟“ میں نے بات بدلی۔

”کیسے گذرے..... یہ تو پتا نہیں..... بس گذر گئے۔ وقت کی یہ خوبی بہت اچھی ہوتی ہے کہ یہ گذر رہی جاتا ہے

نظر نہ نہیں..... ہے نا!“ اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

”ہاں..... واقعی..... کبھی یہ وقت ہمیں بہت بے رحم لگتا ہے۔ ہم سے ہمارا بہت کچھ چھین لیتا ہے اور کبھی بہت

مہربان دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ہمیں گذرتے لمحوں کے ساتھ ساتھ بہلانا سکھاتا ہے۔“

”بہت گہری باتیں کرنے لگی ہو۔ کس سے سیکھی ہیں؟“

”وقت سب سے بڑا استاد ہے۔“ میں پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟ کیا

واپس جائیں گے یا یہیں بزنس کریں گے؟“

”ارادہ تو یہیں سیٹل ہونے کا ہے۔ ایک بزنس ہے نظر میں۔ اسی پر قسمت آزمائی کرنے کا سوچ رہا ہوں۔“

”اور شادی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کب تک یونہی بیٹھے رہیں گے اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔“

میں نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

”چھوڑ دو بھی..... شادی میں کیا رکھا ہے۔ میں ایسا کوئی فضول کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔“ وہ لا پر دائی

سے بولا۔ ”اچھا میں اب چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اٹھ گئی۔ وہ جاتے جاتے رک گیا۔
 ”نورین.....“

”جی.....“

”شکریہ.....“

”کس چیز کے لیے؟“ میں حیران ہوئی۔

”اتنے پیارے اور خوبصورت بھیجے دینے کے لیے۔“ وہ مسکرایا تو میں جھینپ گئی۔ وہ چلا گیا تو میں اپنے دونوں بیٹوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

.....☆.....

اور پھر واقعی غفار نہ گیا اور اس نے یہیں گوجرانوالا میں برقی آلات بنانے کی فیکٹری لگالی۔ ممانی نے بھی اس کی شادی کی رٹ پکولی تو اس کے لیے فرار ناممکن ہو گیا۔ آخر اس نے ممانی اور میرے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور کہہ دیا جودل میں آتا ہے کر لیں۔ میری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔

اس رات میں بچوں کے ساتھ ممانی کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ غفار بھی پاس بیٹھا شاہ زیب سے چھوٹی چھوٹی شرارتیں کر رہا تھا۔ جب ممانی نے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا اور پوچھا۔

”غفار بیٹا! شادی کی اجازت تو تم نے دے دی ہے۔ اب ایک بات اور پوچھنی ہے تم سے۔“ ممانی نے تمہید باندھی۔

”جی پوچھئے۔“ وہ ممانی کی طرف دیکھنے لگا۔

”اگر تمہاری نظر میں..... کوئی لڑکی ہے تو ہمیں بتا دو۔“ ممانی کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ غفار بھی جیسے ساکت ہو گیا۔ وہ چند لمحوں ممانی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں، پھر بولا۔

”میری نظر میں جو لڑکی ہے وہ تو آج بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔“

اس کی بات سن کر میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کون ہے وہ؟“ ممانی بے تابی سے بولیں۔

”اب بتانے سے کیا فائدہ۔ اس کی تو شادی ہو چکی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

”مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔“

”میری بھولی ماں..... جودل میں ہوتا ہے وہ نظروں کے سامنے ہی تو ہوتا ہے۔ آپ نے وہ شعر نہیں سنا کیا۔

دل کے آئینے میں تصویرِ یار ہے

ذرا سا سر جھکایا اور دیکھ لیا“

”اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکی نہیں ہے تو ہم لڑکی تلاش کریں۔“ ممانی نے ٹٹولا۔

”ہاں بھی! کوشش کرو دیکھیں، مگر ہو لڑکی ہی۔“

”کیا مطلب؟“ ممانی نے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ نورین کی طرح سشیل اور دھیمے مزاج کی مالک ہو۔ مرد مارِ قسم کی لڑاکا عورت نہ ہو۔“

”ایسی لڑکی ہے ایک..... میری نظر میں.....“ میں جھجکتے ہوئے بولی۔

”ذرا میں بھی تو سنوں..... کون ہے وہ محترمہ۔“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

”مہوش۔“

”کیا؟“ اس کے سر پر تو گویا کسی نے بم پھوڑ دیا۔

”ہائے نورین، تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔“ ممانی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”تم دونوں خواتین اتنی بڑی زیادتی میرے ساتھ کیسے کر سکتی ہو۔“ وہ کراہا۔

”کیوں..... کیا کمی ہے..... میری بہن میں؟“ میں نے منہ بسورا۔

”کمی کوئی نہیں ہے، بس زیادتی ہے..... اس کا وزن بہت زیادہ ہے اور زبان بہت لمبی ہے اور اس کا استعمال

بھی وہ بے دریغ کرتی ہے۔“

”میری بہن، بہت زیادہ موٹی بالکل نہیں۔ بس تھوڑی اور ویٹ ہے۔“ میں تنک کر بولی۔

”جانتا ہوں امی اور تم، دونوں نے مل کر یہ سازش تیار کی ہے میرے خلاف۔ اب بچنے کی کوئی امید نہیں۔“ اس

نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ممانی اور میں دونوں ہنسنے لگیں۔

”مہوش زبان کی ذرا تیکھی ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔“ میں نے مہوش کی وکالت جاری رکھی۔

”اگر تم اس کو اپنی دیورانی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہو تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہے۔ دو سگی بہنیں جب دیورانی

جھٹانی کے رشتے میں بندھ کر ایک دوسرے کے بال کھینچیں گی تو دنیا دیکھے گی۔“

”بڑا بھیا تک نقشہ کھینچا ہے آپ نے ہمارے مستقبل کا۔ مگر جناب کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہوگی۔ ہم دونوں

بہنیں بڑے پیار اور محبت سے رہیں گی۔“ میں فخر سے بولی۔

”مگر مہوش کا رشتہ مانگنے کے لیے کس کے آگے جھولی پھیلائیں گے۔ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا تو ہے نہیں۔“ ممانی

افسردگی سے بولیں۔

”اس گھر کی بڑی اب میں ہی ہوں۔ رہا جھولی پھیلا کر رشتہ مانگنے کی بات تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کسی

دن کو جرنالہ جاؤں گی۔ مہوش سے اس کی رضامندی پوچھوں گی۔ بلال بھائی سے مشورہ کروں گی۔ چاچا اور چاچی سے

بھی صلاح مشورہ کریں گے۔ ان سب کی رضامندی پا کر منگنی کرنے جائیں گے۔ مہوش کو انگوٹھی پہنا کر ساتھ ہی شادی کے

دن فکس کر آئیں گے۔ ٹھیک کہا ہے نا میں نے!“ میں نے ممانی سے ان کی رائے لی۔

”بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے بیٹی۔ اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دے۔ تمہیں صحت و تندرستی دے۔“ ممانی نے خوش

ہو کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

”واہ کیا پلاننگ ہے۔ میری آزادی کیوں تم سے برداشت نہیں ہو رہی۔ کیوں مجھے بھی خود کی طرح عمر قید کی سزا

دینا چاہ رہی ہو۔“ غفار میری طرف گہری نظروں سے دیکھتا ہوا ذومعنی جملہ بول گیا۔

میں اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی تھی مگر چہرے سے انجان بنی بیٹھی رہی۔

”امی کو گزراے ہوئے پانچ ماہ ہونے کو آرہے ہیں۔ ان کو غفار کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ آج زندہ ہوتیں تو سب سے زیادہ وہی خوش ہوتیں۔“ ممائی آنکھوں میں پانی بھر کر بولیں تو میں اور غفار بھی افسردہ ہو گئے۔ نانی کو ہم لوگ بہانے بہانے سے ہر روز کسی نہ کسی بات میں ضرور یاد کرتے تھے۔ ان کی ہستی بھلائے جانے کے قابل نہ تھی۔

.....☆.....

اور پھر سب کچھ آنا فنا ہو گیا۔

میں نے مہوش سے اس کی مرضی معلوم کی تو اس نے شرماتے ہوئے رضا مندی ظاہر کر دی۔ بلال بھائی نے بھی یہ رشتہ بخوشی قبول کر لیا۔ چاچا، چاچی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ ہم لوگوں کی خوشی میں اپنی خوشی ظاہر کی۔ اس رشتے پر کسی کو کوئی اعتراض ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ غفار ہر لحاظ سے ایک مکمل اور آئیڈیل انسان تھا اور مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ آنے والے وقت میں ایک اچھا شوہر اور بہترین باپ ثابت ہوگا۔ جو خوشیاں میں حاصل نہ کر پائی تھی، میں چاہتی تھی کہ وہ میں بہن کی جھولی میں ڈال دوں۔ ویسے بھی اپنے خاندان میں کوئی بھی اور محقول رشتہ موجود نہ تھا۔ غیروں میں مہوش کا رشتہ طے کرنا کارسک میں نہیں لے سکتی تھی۔ کیونکہ غیروں میں شادی کرنا ایک جوئے کی مانند ہوتا ہے۔

منگنی کے ساتھ ہی ایک مہینے کے دن مقرر کئے گئے اور یہ ایک مہینہ بھاگ دوڑ میں کیسے گزر گیا، پتا ہی نہ چلا۔ سسرال کی جانب سے بھی میں نے ہی بری وغیرہ اور دوسری شاینگ کرنی تھی جبکہ مہوش کا تمام جہیز بھی مجھے ہی تیار کرنا تھا۔ مجھ پر گویا دہری ذمہ داری آپڑی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ میں نے اپنی ذمہ داریاں بڑی مشکل سے پوری کیں۔ ایک ہفتہ میکے میں رہتی تو دوسرا ہفتہ سسرال میں گزارتی۔ شادی بخیر وعافیت گذری تو سکون کا سانس لیا۔ مہوش کی شادی پر امی، ابو اور نانی کی کمی سب نے بڑی شدت سے محسوس کی خصوصاً ہم تینوں بہن بھائیوں نے۔

مہوش کی شادی بھی میری شادی کی طرح زیادہ دھوم دھڑکے سے نہ ہو سکی۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے مہوش نے رونا شروع کیا جو شادی کے دن تک جاری رہا۔ اس نے نہ تو ہاتھوں میں مہندی لگوائی اور نہ ہی کوئی اور رسم کرنے دی۔ میں نے بڑی بہن ہونے کے ناطے میکے سے مہوش کو رو دھو کر گلے لگا کر رخصت کیا تو سسرال میں جھپٹائی ہونے کے ناطے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس کے نازخڑے اٹھائے۔ ہر رسم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ان کی شادی والی رات میں نے دل سے دعا مانگی کہ اللہ کرے ان دونوں کی آپس میں ذہنی ہم آہنگی ہو اور یہ ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی گزاریں۔ خدا نے میری یہ دعا قبول کی اور مہوش نے غفار کے ساتھ مثالی زندگی گذاری۔ غفار اسے خوش رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرتا۔ اگر کبھی وہ کوئی تلخ ترش بات کہہ بھی جاتی تو وہ ہنس کر اگور کر جاتا۔ شاید وہ اسے خوش رکھ کر مجھے خوش دکھانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اپنی بہن کے معاملے میں بہت حساس ہوں۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ہمارے درمیان صرف دیوار اور بھابی کا مقدس رشتہ تھا۔ باقی تعلق ہم دونوں نے فراموش کر دیئے تھے اور یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر تھا۔ ویسے بھی میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے غفار کے ساتھ کبھی بھی محبت نہیں ہوئی تھی۔ بس دلی لگاؤ اور وقتی جذبہ تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا تھا۔

مہوش کی شادی کے ساتھ ہی بلال بھائی کی شادی بھی طے کر دی گئی تھی کیونکہ یہ وقت کی ضرورت تھی۔ مہوش اپنے گھر چلی جاتی تو ہمارا میکہ عورت کے وجود سے خالی ہو جاتا اور یوں بھی بلال بھائی کی شادی بھی تو آخر ایک دن کرنی ہی تھی۔ مہوش رخصت ہو کر اپنے گھر گئی تو دوسرے دن صائمہ رخصت ہو کر ہمارے گھر ہماری بھابی بن کر آ گئی۔ امی، ابو کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب نہ ہوئیں۔ کاش نانی ہی ہمارے سروں پر سلامت ہوتیں تو ہمارے غم کا تھوڑا مداوا ہو جاتا۔ مگر قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔

مہوش دلہن بن کر ہمارے گھر آئی تو گھر کی رونق میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ میں سارا دن بور ہونے کے بجائے اب اس سے گپ شپ لگاتی۔ وہ بھی میرے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وقت گزاری۔ جبار دفتر جبکہ غفار گوجرانوالہ اپنی فیکٹری میں چلا جاتا تو ہم دونوں بہنیں زیادہ وقت ایک ساتھ ہی گذارتیں۔ ممانی اور ماموں ہمیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے۔ ان کے دونوں بیٹوں کے گھر آباد ہو گئے تھے۔

جلدی ہی مہوش کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ یہ خوشخبری سن کر سب گھر والے بہت خوش تھے۔ خصوصاً غفار تو ہواؤں میں اڑتا پھر رہا تھا۔ شام کو آتے ہوئے مہوش کے لیے کئی اقسام کے فروٹ اور کھٹی میٹھی چیزیں لیتے ہوئے آتا۔ جو ہم دونوں ہی کھاتیں۔

جب مہوش کے گھر پہلے بیٹے کی پیدائش ہوئی تو میرے دونوں بیٹے پورے گھر میں دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ شاہ زیب تین سال کا جبکہ زوہیب دو سال کا ہونے والا تھا۔ وہ ایک اور چھوٹا بے پا کر بہت خوش تھے۔ غفار نے بڑے چاؤ سے اس کا نام ارسلان رکھا۔ ارسلان دو سال کا ہوا تو مہوش دوسرے بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس کا نام ممانی نے عدنان رکھا۔ اب میرے بچے سکول جانے لگے تھے۔

شروع شروع میں تو مہوش کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک ہی رہا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کے رویے میں بدلاؤ آنے لگا۔ عزت و احترام تو وہ شروع سے ہی نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ میرا نام لے کر مخاطب کرتی تھی۔ حالانکہ میں اس سے تین سال بڑی تھی اور اب سسرال میں بھی اس کے لیے عزت کی جگہ پر تھی۔ مگر وہ میری ہر بات مذاق میں اڑا دیتی بلکہ بعض اوقات تو مجھے اپنی تفحیک محسوس ہوتی۔ مگر میں اس کی باتوں کا کم ہی برا مناتی کیونکہ جانتی تھی کہ یہ اس کی عادت ہے اور ہم بہنیں ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کی سہیلیاں بھی ہیں۔ مگر جب وہ مذاق کی آڑ میں بعض اوقات زیادہ ہی بے عزتی کر ڈالتی تو میں بھی ہتھے سے اکھڑ جاتی اور بے نقط سنا ڈالتی۔ جب مجھے غصہ چڑھ جاتا تو وہ نیچی کھینچ لیتی اور اس طرح کبھی کوئی سنگین جھگڑا کبھی نہ ہوا۔ ممانی جان ہم دونوں بہنوں کی بات میں کبھی دخل نہ دیتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا لڑائی جھگڑا ہوائی ہوتا ہے اور ہوتا بھی یہی تھا۔ اگر ہماری کسی بات پر بحث و تکرار ہو بھی جاتی تو تھوڑی دیر گزرنے کے بعد ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا اور بول چال پھر سے شروع ہو جاتی۔

دونوں بچوں کی پیدائش پر میں نے مہوش کا بہت خیال رکھا تا کہ اسے ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے پائے۔ ان دنوں میں رات کو بھی اس کے کمرے میں اس کے پاس سوتی اور اس کے نوزائیدہ بچوں کو رات اٹھ اٹھ کے سنبھالتی۔ میری موجودگی میں غفار اپنی امی کے کمرے میں سوتا تھا۔

مہوش دو بچوں کی ماں بنی تو صائمہ بھی دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے چاچی آ جاتی

تھیں۔ اس کے ہاں پہلے بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ اس کا نام انہوں نے زریں رکھا پھر بیٹا ہوا، جس کا نام بلال بھائی نے دلا اور رکھا۔ دونوں بچے رنگ و روپ اور شکل و صورت سے باپ پر گئے تھے اس بات کی بلال بھائی کو بہت زیادہ خوشی تھی۔ وہ برملا اس بات کا اظہار صائمہ کے سامنے بھی کر دیتے۔ بڑے غرور سے کہتے کہ شکر ہے بچہ اپنی ماں پر نہیں گئے، مجھ پر گئے ہیں ورنہ کہاں منہ چھپاتا پھرتا۔ یہ بات سن کر صائمہ کے دل پر کیا گذرتی تھی یہ بات ہم بخوبی سمجھ سکتے تھے۔ مگر بلال بھائی کے سامنے کس کی جرأت تھی کہ انہیں کسی بات پر کوئی ٹوکے۔ حتیٰ کہ چچی اور چاچا کی بھی مجال نہیں تھی کہ ان کی کسی بات پر اختلاف کرتے۔ بلکہ وہ دونوں تو ان کے شکر گزار تھے کہ انہوں نے ان کی کم صورت اور کم گو بیٹی کو قبول کر کے گھر کی مالک بنادیا تھا۔

کچھ عرصہ اور گذرا تو غفار کو اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔ اب اس کے دونوں بیٹے دو اور تین سال کے ہو گئے تھے۔ اسی لیے ایک شام جب سب گھر والے ایک ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے تو اس نے بات چھیڑی۔

”اباجی! میں کافی دنوں سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا آپ لوگوں سے۔“ اس نے تمہید باندھی تو سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ آج جبار کا موڈ بھی خوشگوار نظر آ رہا تھا۔

”ہاں ہاں، کہو۔ ہم سن رہے ہیں۔“ ماموں اپنائیت سے بولے۔

”بھائی جان، یہ بات آپ بھی غور سے سنئے گا کیونکہ اس بات کا تعلق آپ کی ذات سے بھی ہے۔“

”بجھارتیں کیوں بھجوار ہے ہو۔ جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔“ جبار نے جواب دیا۔

”بات یہ ہے کہ..... میں چاہتا ہوں..... اب گاؤں چھوڑ کر شہر میں رہا جائے۔ وہاں سکول بھی زیادہ اچھے ہیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ماحول بھی زیادہ بہتر ہے۔“

”ساری زندگی تو یہاں گزار دی۔ اب اچانک اس ماحول کو کیا ہو گیا؟“ ممانی نے احتجاج کیا۔

امی..... بات کو سمجھیں..... اب وقت بدل گیا ہے۔ ہمیں بچوں کے روشن مستقبل کے لیے گاؤں چھوڑنا پڑے

گا۔“

”بیٹا! تم دونوں بھائی بھی تو یہاں پلے بڑھے ہو۔ سرکاری سکول میں پڑھے ہو۔ ویسے بھی جنہوں نے پڑھنا ہوتا ہے وہ ہر جگہ اور ہر ماحول میں پڑھ جاتے ہیں اور جنہوں نے نہیں پڑھنا ہوتا ان کو کہیں بھی لے جاؤ وہ نہیں پڑھ پاتے۔ تم خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہو۔“ ممانی نے اچھی خاصی تشریح کر ڈالی۔

”میری پیاری امی! اب وقت بدل گیا ہے۔ اب یہ پرانی تھیوری بالکل نہیں چلتی۔ اب تو یہ دور ہے کہ بچوں کی تعلیم پر پیسہ پانی کی طرح خرچ کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اعلیٰ سینئر ڈیڑھ کے سکولوں میں پڑھانا پڑتا ہے۔ مہنگی مہنگی ٹیوشنرز دینی پڑتی ہیں۔ تب کہیں جا کر بچے پڑھ لکھ پاتے ہیں۔ ہمارا زمانہ اور تھا اور ہمارے وقتوں میں تعلیم بھی اتنی مشکل نہ تھی۔ آج کل کے تعلیمی نصاب اور ہمارے تعلیمی نصاب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ غفار نے یکسر دیا تو ممانی خاموش ہو گئیں۔ ہم دونوں بہنیں بھی خاموشی سے تمام گفتگو سن رہی تھیں۔ ہمارا بولنا یوں بھی غیر ضروری تھا کیونکہ فیصلہ بہر حال مردوں نے ہی کرنا تھا۔ چند منٹوں کی خاموشی کے بعد ماموں بولے۔

”بیٹا! یہ جو کچھ بھی ہے تم دونوں بھائیوں کا ہے۔ بڑے بھائی سے پوچھ لو۔ اگر یہ بھی گاؤں چھوڑنا چاہتا ہے تو

ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ ہم میاں بیوی اب عمر کے آخری دور سے گزر رہے ہیں۔ جہاں رکھو گے رہ لیں گے۔ کیونکہ بہر حال ہمیں رہنا تو اپنی اولاد کے ساتھ ہی ہے۔ مگر بیٹا ایک بات یاد رکھنا۔ تم دونوں بھائیوں نے جہاں بھی رہنا ہے، اکٹھے رہنا ہے۔ ہم اپنی زندگی میں تمہیں الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہم کسی ایک بیٹے کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔“ ماموں اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوئے تو ماحول پر گھمبیر تاسی چھا گئی۔

اب غفار امید بھری نظروں سے جبار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ ماموں نے فیصلے کا اختیار جبار کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ جبار اس سارے معاملے میں ابھی تک چپ تھا اور اب گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”آپ کیا کہتے ہیں بھائی؟“ غفار نے پوچھا۔

”ہوں.....“ وہ چونک کر ہم سب کی طرف دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

”میرا خیال ہے..... غفار بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اس کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔“ جبار نے سنجیدگی سے جواب دیا تو غفار کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ مہوش بھی بہت خوش نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا شہر جانے کا فیصلہ دونوں میاں بیوی کا تھا۔

”ہاں بھئی لڑکیو تم دونوں کیا کہتی ہو؟“ ماموں نے ہماری رائے لینی چاہی۔

”ہمیں بھلا کیا اعتراض ہے ماموں جان۔“ مہوش نے فٹ سے جواب دیا۔ ”شہر جا کر میں تو کسی قریبی پارک میں مارننگ واک کرنے جایا کروں گی۔ میرا وزن تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔“

اس کی بات سن کر بھی ہنسنے لگے۔

”لگتا ہے تم دونوں میاں بیوی نے پوری پلاننگ کر رکھی ہے جانے کی۔ ہمارے سامنے خواہ مخواہ کا ڈراما کر رہے ہو۔“ جبار نے مسکراتے ہوئے کہا تو مہوش جھینپ گئی۔

”نہیں بھائی جان! ہم بھلا آپ کی اجازت اور رضامندی کے بغیر جاسکتے ہیں، ہرگز نہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ..... کیا کاموکی جا کر رہنے کا پروگرام ہے۔“ ماموں نے پوچھا۔

”اباجی! میں بڑے شہر میں جا کر رہنے کی بات کر رہا ہوں۔ کاموکی کب سے شہر ہو گیا۔ یہ تو چھوٹی سی تحصیل ہے۔“ غفار نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”تو کیا تم لوگ گوجرانوالہ میں رہائش اختیار کرو گے؟“

”جی بالکل..... اباجی..... ٹھیک ہے نا جبار بھائی۔“ اس نے جبار کی بھی تائید چاہی۔

”ہاں، اگر گاؤں چھوڑنا ہی ہے تو کسی بڑے شہر میں جا کر رہیں گے جہاں اعلیٰ تعلیمی مراکز ہوں اور معیار تعلیم

بھی بہترین ہو۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ غفار خوش ہو کر بولا۔ ”گوجرانوالہ میں ایک نئی ترقیاتی اسکیم بن رہی ہے، نام ہے اس کا دشا کا لونہ۔ وہاں دو کنال کا پلاٹ لے لیتے ہیں، جس پر کنال کنال کی دو بالکل ایک جیسے نقشے کی کوٹھیاں تعمیر کروائیں گے۔ ایک کوٹھی آپ کی اور دوسری میری۔ دونوں کوٹھیوں کی ہر چیز الگ الگ بنی ہوگی، بس دونوں کا لان مشترکہ ہوگا۔ یعنی دونوں گھروں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہوگی۔ ہماری فیملیاں بلا روک ٹوک، دن رات کی تیز کئے بغیر ایک

دوسرے کے گھر آجائیں گی اور اباجی اور امی جان بھی جس بیٹے کے ہاں چاہیں رہیں۔ کھائیں پیئیں، آئیں جائیں، ان کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اور ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی کہ یہ تمام عمر ہمیں اکٹھا دیکھنا چاہتے ہیں اور ہماری بیگموں کی الگ رہنے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ کیوں بیگم!“ اس نے مہوش کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ جڑبڑھونے لگی۔

”میں نے کب الگ ہونے کی فرمائش کی ہے۔ آپ بھی کبھی کبھی کمال کرتے ہیں۔“ وہ ناراض ہونے لگی۔

”چلو نہیں کی، کل کو تو کر سکتی ہونا!“ غفار نے فوراً بات بدلی، مگر سب سمجھ گئے تھے کہ مہوش الگ ہونا چاہتی ہے۔

بہر حال غفار کا یہ آئیڈیا سب کو بے حد پسند آیا۔ ماموں نے بھی بے حد سراہا۔ جبار نے بھی کہا کہ میں چھٹی والے دن تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ وہ کالونی دیکھوں گا۔ آس پاس کی لوکیشنز دیکھوں گا پھر اوکے کر دوں گا تو تم تعمیر شروع کروادینا۔

”بھائی جان! آپ کو یہ کالونی بے حد پسند آئے گی۔ اس بات کا مجھے پورا یقین ہے۔ بلکہ میں نے پلاٹ بھی پسند کر لیا ہے۔ بس آپ کو ایک نظر دکھانا ہے۔ اس پلاٹ کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا فرنٹ بہت زیادہ ہے اور اس کے بالکل قریب مسجد اور پارک ہے۔ مہوش کی واک کرنے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور بچوں کو کھیلنے کی سہولت بھی مل جائے گی۔“



چھٹی والے دن جبار، غفار کے ساتھ گوجرانوالہ گیا۔ اُسے بھی پلاٹ اور اس کے ارد گرد کی لوکیشنز بہت پسند آئیں۔ اس کالونی میں کوٹھیاں تیزی سے بن رہی تھیں۔ مارکیٹ اور مسجد بھی آباد ہو گئی تھی۔

پھر غفار نے ایک خوبصورت نقشہ بنوایا جو ہم لوگوں کو بھی پسند آیا اور پھر کوٹھیوں کی تعمیر شروع ہو گئی۔ غفار کا بزنس بھی وہیں تھا اس لیے وہ آتے جاتے ہر روز چکر لگاتا تھا۔ جبکہ جبار بھی چھٹی والے دن ضرور جاتا اور ماموں کی تو غفار نے پکی ڈیوٹی وہاں لگا دی تھی۔ ماموں اب مستقل گوجرانوالہ میں ہی رہتے۔ وہ رات کو سونے کے لیے بلال بھائی کے گھر چلے جاتے۔ رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ بلال بھائی کے گھر سے کرتے اور سارا دن وہاں کالونی میں مسرتیوں کے پاس بیٹھ کر کام کی نگرانی کرتے۔ شام کو دیہاڑی بھی وہی دیتے۔ تعمیراتی سامان غفار لا کر دیتا تھا۔

کبھی کبھا جبار ہمیں بھی بچوں سمیت گاڑی میں بٹھا کر کوٹھیاں دکھانے لے جاتے۔ آخر ایک سال کے طویل عرصہ کے بعد دونوں کوٹھیاں مکمل ہو گئیں۔ وہ جدید طرز کے بنگلہ نما گھر تھے جہاں کی ہر چیز مہنگی اور جدید تھی۔

کوٹھیوں کی تعمیر پر غفار نے پیسا پانی کی طرح بہایا تھا، کیونکہ روپے پیسے کا تمام کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اگر یہ کام جبار کو سونپا جاتا تو نچانے ان عیالیشان گھروں کی جگہ کیا ہوتا۔ پیسا خرچ کرنے پر تو اس کی جان جاتی تھی۔ پورے دو ایکڑ زمین بیچ کر غفار نے یہ نئے گھر تعمیر کیے تھے۔ جب ہم نئے گھروں میں شفٹ ہوئے تو بچے بڑے سبھی بہت پر جوش اور خوش تھے۔ کہاں گاؤں کا بڑے سے صحن والا بڑا سا گھر، اور کہاں شہر کا یہ جدید ترین بنگلا۔

یہاں آ کر غفار نے نئے گھروں کے لیے نیا اور جدید فرنیچر خریدا۔ نئے پردے اور قالین خریدے گئے۔ اس کے علاوہ بے شمار آرٹشی اشیاء اور بھاری بھر کم فائوس خریدے گئے۔ ہمارے گھر سے بلال بھائی کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ گاڑی یا موٹر سائیکل پر بمشکل آٹھ دس منٹ کا راستہ تھا۔

جب ہم نئے گھر میں شفٹ ہوئے تو مہوش تو بھاگ بھاگ کر نئے گھر کی سیٹنگ کر رہی تھی۔ وہ اپنی ہیلپ کے لیے گاؤں سے ایک کل وقتی ملازمہ بھی ساتھ لے آئی تھی۔ جو رات گئے اس کے ساتھ کام میں جتی رہتی۔ جبکہ میری پوزیشن ان دنوں بڑی نازک تھی۔ کیونکہ میں پھر سے ماں بننے والی تھی۔ اینڈ والے دن چل رہے تھے۔ انہی دنوں مجھے شریفاں مل گئی جو دلشاد کا لونی کے پاس ہی کچی بستی میں رہتی تھی۔

شریفاں بہت شریف انفس اور قابل بھروسہ عورت تھی۔ وہ صبح آتی اور شام ڈھلے گھر جاتی تھی اور کبھی کبھار تو رات کو بھی رک جاتی تھی۔ گھر میں اس کا بیٹا اور بہو تھے اس لیے گھر کی جانب سے وہ بے فکر تھی۔ ان حالات میں شریفاں کا ملنا میرے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میں نے بھی شریفاں اور بچوں کی مدد سے گھر سیٹ کر ہی لیا۔ نئے گھر میں رہتے ہوئے ابھی پچیس دن ہوئے تھے جب میں نے ایک خوبصورت لڑکی کو جنم دیا۔ بیٹی کی آمد سے پرے ہاؤس کے سارے مکین خوشی سے جھوم اُٹھے۔ غفار نے اس مشترکہ بلڈنگ کا نام پرے ہاؤس رکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سب اس کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ ہم اتنے خوبصورت گھروں کے مالک بن گئے ہیں۔

سب کی متفقہ رائے سے اس بچی کا نام فاریہ رکھا گیا۔ فاریہ کی دادی یعنی ممانی جان پوتی کو پا کر پھولی نہ سارہی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ نئے گھر میں آتے ہی اللہ نے اپنی رحمت کر دی اور اتنا خوبصورت تحفہ دے دیا۔ چونکہ فاریہ پہلی بیٹی تھی اس لیے اسے بہت پذیرائی ملی۔ جبار اور غفار کی آنکھوں کا تار اٹھی۔ بچے بھی اُسے اٹھانے کے لیے بے تاب رہا کرتے۔ ماموں اور ممانی نے مستقل مہوش کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ البتہ جہاں دل چاہتا اسی بیٹے کے گھر سے کھانا کھا لیتے۔ ہم دونوں فیملیاں رات کو باہر لان میں یا اگر سردی ہوتی تو کسی ایک گھر کے لاؤنج میں اکٹھے ہو کر خوب ہلا گلا کرتے۔ بچے لطفے سا کر بڑے بزرگوں کو خوب لطف اندوز کرتے۔ ننھی فاریہ بھی چھوٹے چھوٹے فرائک پہنے درمیان میں اڑتی پھرتی بالکل ننھی کی طرح۔ فاریہ تین سال کی ہوئی تو مہوش کے ہاں کرن نے جنم لیا اور اس طرح دونوں بہنوں کی فیملی بیٹیوں کی آمد کے ساتھ مکمل ہو گئی۔

فاریہ کی پیدائش کے بعد سے میری کمر میں اکثر تکلیف رہنے لگی۔ ڈاکٹر کو چیک اپ کروایا تو اس نے یوگا کی ایکسر سائز کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ کمر درد کا علاج صرف ایکسر سائز میں ہے۔ میڈیکل دوائیاں اس سلسلے میں بے کار ہیں۔ وقتی طور پر فائدہ دیں گی مگر صورتحال پھر ویسی ہی ہو جائے گی۔ اگر آپ مستقل اور مکمل حل چاہتی ہیں تو باقاعدگی سے یوگا کیا کریں۔ وہ ڈاکٹر خود بھی یوگا کی افادیت کا بہت معترف تھا اور باقاعدگی سے یوگا کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یوگا صرف آپ کو کمر درد سے نجات نہیں دے گا بلکہ اس کے اور بھی ان گنت فوائد ہیں، جن کا آپ کو آہستہ آہستہ پتا چلتا جائے گا۔ یہ نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ ذہنی طور پر بھی بہت فائدہ مند ہے۔ یہ انسان کو فضول قسم کی پریشان کرنے والی سوچوں سے نجات دلا کر اس کا ذہن صحت مند اور پرسکون کر دیتا ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی یوگا کی دل ہی دل میں قائل ہو گئی تھی۔ واقعی ادویات کھا کھا کر معدہ خراب کرنے کے بجائے اگر ایکسر سائز کو ترجیح دی جائے تو یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔

میں نے اسی دن بازار سے یوگا کے متعلق دو تین کتابیں خریدیں اور ایک چٹائی بھی لے آئی۔ اگلے دن میں نے باقاعدگی سے یوگا کی مشقیں شروع کر دیں۔ میں یہ مشقیں اس وقت کرتی جب جبار دفتر جبکہ بچے سکول چلے جاتے۔ اپنے

گھر کا اندرونی مین ڈور بند کر لیتی تاکہ کوئی اور مجھے یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہوئے نہ دیکھے۔ شریفاں میرے سامنے گھر کا کام کرتی رہتی۔ اس سے میرا کوئی پردہ نہ تھا۔

ہر روز آدھا گھنٹہ یوگا کی مشق کرنے سے ایک مہینے کے بعد ہی مجھے بہت سے فوائد نظر آنے لگے۔ مثلاً میری کمر کی تکلیف بالکل ختم ہو گئی۔ میں نے دو انی کھانی بند کر دی۔ میرا پیٹ ہلکا سا باہر نکلا ہوا تھا وہ بھی کافی حد تک اسٹریٹ ہو گیا۔ میری اسکن روشن اور چمکدار ہونے لگی تھی۔ پہلے میں جبار کے رویے پر جلتی کڑھتی رہتی تھی، اب اگر وہ کوئی جلی کٹی سنا تا تو میں دل پر نہ لگاتی۔ ایک دم پرسکون اور ریلیکس رہتی۔ وہ مجھے پرسکون دیکھ کر اور بھی مشتعل ہو جاتا۔ پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دہ الفاظ کا استعمال کرتا۔ اسے شاید میرا روتا ہوا اداس چہرہ دیکھ کر تسکین ملتی تھی۔ میں اس کی دی ہوئی ہر اذیت خندہ پیشانی اور ہمت سے برداشت کرنے لگی تھی۔ رونا دھونا چھوڑ دیا تھا اور یہ سب یوگا کی بدولت تھا شاید۔ اب میں بچوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل کھول کر تھپتھپ لگاتی۔ یہی وجہ تھی کہ بچے دن بدن میرے قریب آتے چلے گئے اور جبار سے دور ہوتے چلے گئے۔ اب فاریہ بھی سکول جانے لگی تھی۔ اسی طرح وقت گزرتا چلا گیا اور بچے بڑے ہوتے چلے گئے۔ ہر چیز بدل گئی سوائے جبار کے۔ بلکہ بڑھاپے میں قدم رکھ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ خشک مزاج اور تند خو ہو گیا تھا۔ مگر وہ یہ رویہ صرف میرے ساتھ ہی روا رکھتا تھا یا پھر بچے اس کی آمریت کا نشانہ بنتے تھے، خصوصاً دونوں بیٹے شاہ زیب اور زوہیب۔ فاریہ کے ساتھ اس کا رویہ کافی بہتر ہوتا تھا۔ دراصل میرے دونوں بیٹے مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور یہ بات جبار کو سخت ناپسند تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں بیچارے باپ کے عتاب کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔

باقی لوگوں کے ساتھ مثلاً مہوش اور اس کے بچوں کے ساتھ اور اپنے والدین کے ساتھ جبار کا رویہ بہت مناسب بلکہ خوش گوار ہوتا تھا۔ پتا نہیں جبار کے دل میں میرے خلاف اتنی کدورت کیوں تھی۔

میں نے جبار کو بدلنے کے لیے ہر حربہ ہر طریقہ آزما ڈالا مگر اس پتھر دل پر کوئی بھی اثر نہ ہوتا۔ اب تو میں اس کے اس رویے کی عادی ہو گئی تھی۔ بلکہ کئی دفعہ جب صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو ترکی بہ ترکی جواب بھی دینے لگتی۔ اب میں نے جبار سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب میں جوان بیٹیوں کی ماں تھی۔ میرے بچے میری ذات کے لیے ایک مضبوط سہارا تھے۔

”امی.....“ فاریہ نے پکارا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بارہ سالہ فاریہ میرے سامنے کھڑی پریشان نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”امی..... آپ کب سے سو رہی ہیں۔ رات کا کھانا تیار نہیں کرنا کیا۔ دیکھیں تو باہر شام ہو رہی ہے۔“ میں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ فاریہ سمجھ رہی تھی کہ میں سو رہی تھی جبکہ میں تو پچھلے دو تین گھنٹے سے ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ میں اُٹھ کر کچن میں گئی اور رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

.....☆.....

اگلی صبح میں سیر کرنے کے لیے گئی تو خاور کے ساتھ حسبِ معمول دس پندرہ منٹ تک گپ شپ ہوتی رہی۔

”اب کسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔“ میں خوشدلی سے بولی۔ ”بچے بتا رہے تھے کہ آپ کو شوگر ہے۔ آپ کو یہ مرض کیسے لاحق

ہو گیا؟ ویسے مجھے بہت افسوس ہوا تھا سن کر۔“

”اس بیماری کے علاوہ مجھے اور بھی بہت سے روگ چپنے ہوئے ہیں۔ کس کس کا افسوس کریں گی۔“

”ایک تو آپ بات کو گھماتے بہت ہیں۔ کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہیں۔“

”کیا کروں، عادت ہو گئی ہے شاید۔“ وہ ہنسا۔

”آپ کو ایک مشورہ دوں۔“

”جی ضرور۔“

”آپ ہر روز آدھا گھنٹہ یوگا کیا کیجئے۔ پھر دیکھئے گا آپ کی ذہنی حالت کیسے بدلتی ہے۔ منفی سوچیں دماغ میں

بالکل نہیں آئیں گی اور آپ کی شوگر بھی کنٹرول رہے گی۔“

”شوگر کو کنٹرول کرنے کے لیے ہی تو صبح کی سیر کرتا ہوں۔“

”صرف صبح کی سیر کافی نہیں۔ ساتھ آدھا گھنٹہ یوگا کی مشقیں کیا کریں۔ ایک مہینہ کر کے دیکھیں۔ آپ کو بڑی

تبدیلی محسوس ہوگی۔“ میں جوش سے بولی تو وہ مسکرانے لگا۔

”ٹھیک ہے مام، مگر میں یوگا کیسے سیکھوں گا۔ مجھے تو آتا ہی نہیں۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”بازار میں کتابیں ملتی ہیں۔ سی ڈیز ملتی ہیں۔ ان کی مدد سے سیکھیں۔ میں نے تو کتابوں کی مدد سے یوگا کرنا

سیکھا تھا۔“

”اوہ، تو آپ یوگا کی ایکسر سائز کرتی ہیں۔ تبھی میں سوچتا تھا آپ اتنی فٹ کیسے ہیں۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”آخر آپ نے اپنا سیکرٹ بتا ہی دیا۔“

”جی نہیں، اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ ہر کوئی یوگا کی افادیت کے متعلق جانتا ہے۔ اب تو یوگا کرنے

والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگوں میں صحت کے متعلق شعور ڈیلپ ہو رہا ہے۔ ویسے میرا ذاتی نظریہ یہ

ہے کہ جو انسان اپنی صحت کے لیے چوبیس گھنٹوں میں سے آدھا گھنٹہ ایکسر سائز کے لیے نہ نکال سکے، اسے صحت مندار

ایکٹوزندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں۔“

”آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کی سوچ میں شدت پسندی ہے۔“

”ہرگز نہیں، یہ شدت پسندی نہیں حقیقت پسندی ہے۔“

”تو پھر مجھے بھی یوگا سکھائیے نا۔“ اس نے کسی بچے کی طرح ضد کی۔

”اوکے..... میں آپ کو کل مطلوبہ بکس لادوں گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ایسے نہیں، ویسے سکھائیے نا..... جیسے ٹی وی میں دکھاتے ہی۔ دو چٹائیاں ساتھ ساتھ بچھا کر..... ایک پر میں

اور ایک پر آپ.....“ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

میرے کانوں کی لوئیں تپ گئیں۔ ”آپ سے تو بات کرنا فضول ہے۔ انھیں گھر چلیں۔“ میں کھڑی ہو گئی۔

”اوہ، یاد آیا۔ آپ نے تو آج اپنے ناول کا مسودہ لانا تھا۔ بھول گئیں کیا۔“

”اوہ شٹ..... واقعی بھول گئی۔ حالانکہ شاپنگ بیگ میں ڈال کر رکھا تھا۔“ میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”چلیں کوئی بات نہیں۔ کل ضرور لے آئے گا۔“
 ”ضرور، انشاء اللہ۔“ میں نے خدا حافظ کہا اور پارک سے باہر آ گئی۔

☆.....

اگلے دن میں پارک جاتے ہوئے مسودہ لے جانا نہیں بھولی تھی۔ اس دن مسودہ اس کے حوالے کیا اور کوئی بھی قابل ذکر بات چیت نہ ہوئی۔ آج وہ بھی چپ چپ تھا اور میری طبیعت بھی بوجھل سی تھی۔
 اس سے اگلی صبح وہ پارک میں نہیں آیا تھا۔ مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ میں اس کا رسپانس جاننا چاہ رہی تھی۔ اسے ناول پسند آئے گا یا نہیں۔ بار بار دل میں یہی سوال پیدا ہو رہا تھا۔ پھر خود کو سمجھایا کہ ناول پڑھنے کے لیے وقت چاہیے۔ ایک دو دن میں پڑھ کر بتا دے گا۔

گھر آ کر بھی سارا دن مضطرب سی رہی۔ بار بار دھیان اسی طرف جاتا۔ کیا وہ اس وقت میرا ناول پڑھ رہا ہوگا اور پڑھ کے کیسا محسوس کر رہا ہوگا۔ جب نہ رہا گیا تو موبائل پکڑ لیا۔ اس کا نمبر ڈائیل کیا اور پھر یہ سوچ کر فون رکھ دیا کہ اتنی بے تابی بھی ٹھیک نہیں۔

پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ بچے سکول سے آئے۔ کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں ہوم ورک کرنے لگے تو میں بھی سستانے کے لیے اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ پھر موبائل ہاتھ میں پکڑا اور اس کا نمبر جو پہلے ہی ڈائیل تھا اس کو لیس کر دیا۔ دوسری طرف بیل ٹون جا رہی تھی۔ اگلے لمحے اس کی خمار میں ڈوبی آواز ابھری۔
 ”ہیلو۔“

اس کی آواز سن کر میرا دل تیز دھڑکنے لگا۔
 ”جی..... السلام علیکم۔“ میں تھوڑا گھبرا گئی تھی۔
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ کھل اٹھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں..... آپ سنائیں۔“

”آج آپ واک کے لیے نہیں آئے۔ سوچا خیریت ہی دریافت کر لوں۔“

”ذرا نوازی ہے آپ کی۔ ورنہ خاکسار اس قابل کہاں۔“

”اب آپ کس نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ اچھا اور سنائیں کیا کر رہے تھے؟“

”آپ کا ناول پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے آکھ لگ گئی۔“

”اوہ..... سوری..... میں نے آپ کی نیند خراب کر دی۔“

”کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی آپ کے لیے میں ہر وقت اوپن ہوں۔“

اس کی بات سن کر میں جھینپ گئی۔ کس قدر بے باک ہے یہ آدمی۔ کچھ بھی بول دیتا ہے۔ ”اچھا یہ بتائیں میرا

ناول آپ کو پسند آیا۔“

”کل بتاؤں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ آج کیا ہے۔ مجھے بڑی ایکسائٹ منٹ ہو رہی ہے۔ بتائیں نا!“
 ”ابھی میں نے پورا نہیں پڑھا۔ تھوڑا سا باقی ہے۔ کل بتا دوں گا۔ اب ایسی بھی کیا بے صبری۔“
 ”جتنا پڑھا ہے وہ کیسا لگا؟“ میں بھی جیسے ضد پراڑ گئی۔
 ”وہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ جب تک اینڈ نہ پڑھ لوں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس کو مجھے ستانے میں مزا آرہا

تھا شاید۔

”تو پھر آپ کب بتائیں گے؟“ مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔

”ہوں..... کل بتا دوں گا۔“

”اگر آپ کو پسند آگیا تو آپ چھپوا دیں گے نا!“

”جی بالکل۔“

”اوہ کے..... اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“

.....☆.....

دوسرے دن میں پارک میں پہنچی تو وہ داک کر کے بیچ پر بیٹھ چکا تھا۔

”آج آپ جلدی آگئے تھے؟“

”نہیں، آج آپ لیٹ آئی ہیں۔“

”اوہ ہاں، آج آنکھ ہی دیر سے کھلی تھی۔“

میں اس کے پاس رکھے شارپریک کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ وہی بیگ تھا جس میں، میں نے ناول کا مسودہ دیا

تھا۔ اس نے مجھے بیگ کی طرف دیکھتے پایا تو بیگ پکڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔

”یہ رہا آپ کا ناول۔“

”کیا پسند نہیں آیا؟“ میں مایوسی سے بولی۔

”آپ کو اس بات کا اتنا ڈر کیوں ہے کہ مجھے ناول پسند نہیں آئے گا۔ آپ کا تو خود پر بہت اعتماد تھا۔ آپ نے

اس دن پورے یقین سے کہا تھا کہ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں اور میں آپ کے اس یقین سے بہت متاثر ہوا تھا تو پھر اب کہ

ہوا؟ کیوں آپ کا اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہا؟“

میں شارپریک کو اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”آپ مجھے باتوں میں الجھا کر جواب دینے سے کئی کترارہے ہیں

کیوں؟“

”تو پھر سنئے..... آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ میری سوچ اور اندازے سے کہیں زیادہ۔ میں واقعی آپ کی تحری

سے بہت متاثر ہوا ہوں۔“

”کیا واقعی۔“ میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بالکل، آپ کا ناول چھپے گا اور ضرور چھپے گا۔“

”تو پھر آپ مجھے واپس کیوں دے رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ میں شاید اس کی حفاظت نہ کر سکوں۔ آپ اسے اس ایڈریس پر پوسٹ کر دیں۔ باقی بات میں فون

پر کر چکا ہوں۔ انشاء اللہ دو ماہ کے اندر اندر یہ ناول کتابی شکل میں آپ کے سامنے بلکہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔“

”بہت بہت شکریہ، خاور صاحب۔“ میں نے پرچی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آ رہا

آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟“

”کر تو دیا ہے..... اب اور کیسے کریں گی..... کیا کسی اور طریقے سے ادا کرنے کا ارادہ ہے۔“

”اور طریقہ..... کیا مطلب؟“ میں ہونٹ بن کر پوچھ رہی تھی۔

”جب آپ کا ناول چھپ کر آئے گا تب بتاؤں گا۔“

”او کے.....“

”وعدہ.....“

”پکا وعدہ۔“ میں نے دل سے کہا۔

”وعدے سے مکر تو نہ جائیں گی۔“

”یہ میری عادت نہیں۔ میں جس کے ساتھ وعدہ کرتی ہوں اسے ہر حال میں پورا کرتی ہوں۔“ میں فخر سے

بولی۔

”واہ..... یہ تو اچھی بات ہے۔“

”آج میں لیٹ آئی ہوں اس لیے واک کیے بغیر ہی لوٹ رہی ہوں۔ کہیں بچوں کو ناشتے میں دیر نہ ہو جائے۔“

او کے اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ اس نے کہا اور مجھے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

گھر آ کر بچوں کے لیے ناشتہ تیار کیا۔ وہ سکول چلے گئے۔ پھر جبار کا ناشتہ بنایا وہ دفتر چلا گیا تو پھر اپنے لیے

ناشتہ بنا کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ دس بجے تک مختلف مارننگ شوز دیکھتی رہی پھر اٹھ کر برتن کچن میں رکھنے لگی۔ پھر سنور

میں رکھ دھلے کپڑے سیننے لگی۔ وہیں میری نظر ناول والے شاہ پر پڑی جو میں نے پارک سے واپسی پر سنور میں رکھا تھا۔

سوچا اٹھا کر الماری میں رکھ دیتی ہوں۔ میں نے شاہ پر پکڑا تو مجھے تھوڑا پھولا پھولا سا لگا۔ شاید میں نے اس سے پہلے غور ہی

نہیں کیا تھا۔ میں نے شاہ پر کھولا تو اس کے اندر مسودے کے ساتھ ایک اور شاہ پر تھا اور اس کے اندر والے شاہ پر کے اندر کوئی

چیز تھی۔ میں نے وہ اندر والا شاہ پر باہر نکال کر کھولا تو اس کے اندر پڑی ہوئی گرم شال کھینچ کر باہر نکالی۔

میرے ہاتھوں میں سویر سے ٹکری کی اوٹی شال تھی جو وزن میں بہت ہلکی تھی۔ اس پر نازک سی ہاتھ کی لٹڑھائی کی

گٹنی تھی۔

یہ شال خاور نے مجھے دی ہے۔ میں یہ سوال خود سے پوچھ رہی تھی، مگر کیوں؟ میں نے شال طے کر کے شاہ پر

میں واپس رکھی اور سنور سے باہر آ کر لاؤنج میں بیٹھ کر خاور کا موبائل نمبر ملا نے لگی۔ مجھے اس کا اس طرح تنہ دینا اچھا

نہیں لگ رہا تھا۔ نمبر ملاتے ملاتے میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس وقت گیارہ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ وہ

یقیناً دفتر پہنچ گیا ہوگا۔

رنگ ٹون جا رہی تھی۔

”ہیلو۔“ اس کی آواز سنائی دی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام..... زہے نصیب..... آج آپ نے بندہ ناچیز کو یاد کیا۔“ وہ حسبِ عادت شوخ ہوا۔

”خاور صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟“ میں شکایتی لہجے میں بولی۔

”میں نے ایسا کیا کر دیا جو طبع نازک پر ناگوار گذرا۔“

”آپ نے اتنی قیمتی شال مجھے کیوں تحفے میں دی۔“

”آپ کے شایانِ شان تو نہیں، پھر بھی امید کرتا ہوں آپ کو ضرور پسند آئی ہوگی۔“

”بات یہ نہیں ہے۔ میں آپ سے کوئی تحفہ تحائف نہیں لے سکتی۔“

”مگر کیوں؟ کیا ہم دوست نہیں۔“

”میں آپ پر پہلے بھی کتنی دفعہ واضح کر چکی ہوں کہ ہماری دوستی بالکل خالص بغیر کسی مطلب اور لالچ کے ہو

گی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی غرض شامل نہیں ہونی چاہیے۔“

”نورین! افسوس آپ نے میری نیت پر شک کیا۔ یقین کریں مجھے آپ سے کسی قسم کی کوئی غرض نہیں۔ میں دل

سے آپ کی عزت کرتا ہوں۔ یہ صرف ایک دوست کی جانب سے دوسرے دوست کے لیے ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔ صرف

اتنی سی بات ہے مگر آپ پتا نہیں کیا کیا سوچنے لگیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تو میں شرمندگی سی محسوس کرنے لگی۔

”سوری..... میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہ تھا۔“

”آپ کی تحریر پڑھ کر دل اتنا خوش ہوا کہ سوچا آپ کو کوئی انعام دوں آپ کی حوصلہ افزائی کے لیے۔ پھر سوچ

سوچ کر یہ شال خرید لایا۔ کیونکہ اس سے بہتر تحفہ میرے ذہن میں نہ آیا۔ آپ کو پسند نہیں آئی کیا؟“

”نہیں نہیں، بہت خوبصورت ہے۔ مجھے بہت پسند آئی ہے مگر وعدہ کریں آپ آئندہ میرے لیے کوئی گفٹ نہیں

لائیں گے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ اس نے احتجاج کیا۔

”نہیں، بس آپ کو وعدہ کرنا ہی پڑے گا۔“

”اوکے بابا..... وعدہ کرتا ہوں۔“ اس نے جلدی ہی ہار مان لی۔

”پکا وعدہ.....“ میں نے پھر پوچھا۔

”پکا وعدہ.....“ اس نے جواب دیا۔

”اوکے..... خدا حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“

میں نے اطمینان بھری گہری سانس لی اور شال کھول کر اسے اوڑھ کر آئینے کے آگے کھڑی ہو کر جائزہ لینے لگی۔

بہت خوبصورت ہے۔ خاور کی چو اُس ہر معاملے میں بہت اچھی ہے۔ میں تھوڑی دیر زوایے بدل بدل کر اپنا جائزہ لیتی رہی پھر شال طے کر کے اس پر ملائیمیت سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ اچانک مہوش آ گئی۔

”نورین..... کہاں ہو؟“

میں نے الماری کھولی، شال اس کے اندر رکھی اور اسٹور سے باہر آ گئی۔

”اچھا تو تم اسٹور میں گھسی ہوئی ہو۔“ وہ دھم سے صوفے پر گر گئی۔

میں بھی آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”آج کیا مصروفیت ہے تمہاری؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟“

”بازار جانے کا سوچ رہی ہوں۔ چلو گی میرے ساتھ۔“

”کیوں آج کیا خریدنا ہے؟“

”کچن کے لیے کچھ کراکری اور کنٹری کا سامان لینا ہے۔“

”چلی چلوں گی مجھے بھی کچھ چیزیں لینی ہیں۔“

☆.....

اور پھر خاور نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ پورے ڈیڑھ مہینے بعد میرا ناول کتابی شکل میں چھپ کر میرے ہاتھ میں تھا۔ اس دن میں مارننگ واک کے لیے گئی تو وہ بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ناول تھا۔

میں نے ناول اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور بے تابی سے اس کا سرورق دیکھنے لگی۔

”بہت خوبصورت۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”خاور آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔ میرے برسوں

پرانے خواب کو دنوں میں سچ کر دکھایا۔“ میری آواز فوراً جذبات سے کانپ رہی تھی۔ ”شکریہ۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ کی دوستی کی خاطر اتنا تو کر سکتا ہوں نا!“ وہ مجھے اتنا خوش دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنی خوشی کا اظہار کیسے کروں۔ میں رائٹر بننے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ آج میں

سچ سچ رائٹر بن گئی۔ اوگا ڈ..... آج مجھ سے سیر بالکل نہیں کی جائے گی۔ میں اڈ کر گھر جانا چاہتی ہوں۔ مہوش کو اپنی خوشی میں

شامل کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ مہوش آپ کی کامیابی پر اتنا ہی خوش ہوگی جتنی آپ توقع کر رہی ہیں۔“

”بالکل..... وہ بہن ہے میری..... یقیناً بہت خوش ہوگی۔“ میں جوش سے بولی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ خاور نے کہا اور ناولوں والا شاپر میری طرف بڑھایا۔ ”اس میں پوری دس کاپیاں

ہیں۔ اپنے عزیز واقارب میں تقسیم کریں اور ان کو حیران کر دیں۔“

”حیران تو واقعی سب نے بہت ہونا ہے۔ کیونکہ میں نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ میری کتاب چھپ رہی ہے۔ حتیٰ

کہ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں۔“

”کیوں؟ گھر والوں کو کیوں نہیں بتایا تھا؟“
 ”ویسے ہی..... سوچا اگر کسی وجہ سے نہ چھپ سکی تو مذاق کا نشانہ بنائیں گے۔“
 ”کیا مجھ پر یقین نہیں تھا؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں تو..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں گڑبڑا گئی۔ ”او کے میں چلتی ہوں، ہائے۔“
 ”گڈ ہائے۔“

میں کتابوں والا شاہ پر پکڑے تیز قدموں سے گھر کی طرف جارہی تھی۔

.....☆.....

گھر آ کر سوچا کہ بچوں کو اور جبار کورات کو بتاؤں گی۔ ابھی بتانے سے مزا نہیں آئے گا۔ انہیں بھی جانے کی جلدی ہے۔ بچے اور ان کے ابو چلے گئے تو میں نے ناشتہ کیا۔ آج تو خوشی کے مارے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔ بس برائے نام ناشتہ کیا اور ٹی وی دیکھ کر وقت گزارنے لگی۔ بار بار کلاک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے دس بجنے کا انتظار تھا کیونکہ مہوش اور اس کی فیملی دس بجے تک ناشتے کی ٹیبل پر ناشتہ کرتے تھے۔ بچے تو علی الصبح ناشتہ کر کے اسکول چلے جاتے تھے۔ بعد میں دس بجے مہوش اور غفار، ماموں اور ممانی ناشتہ کرتے تھے۔

آج تو جیسے وقت رک سا گیا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے دس بجے تو میں کھڑی ہو گئی۔ ناول ہاتھ میں پکڑا اور مہوش کے گھر پہنچ گئی۔ حسب توقع وہ چاروں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے بلکہ ناشتہ کر کے فارغ ہو چکے تھے۔ ماموں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

”آہ آج نورین بیٹی اتنی صبح صبح کیسے آگئی۔ بھئی نورین کو چائے وائے پلاؤ۔“
 ”نہیں ماموں، میں چائے پی کر آئی ہوں۔ آپ لوگوں کو کچھ دکھانے کے لیے لائی ہوں۔“
 ”کیا چیز ہے؟ مجھے دکھاؤ۔“ مہوش میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”میں نے کتاب اس کی طرف بڑھائی تو وہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔“ ”یہ کیا ہے؟“
 ”یہ ناول ہے اور اسے میں نے لکھا ہے۔“ میں فخر سے بولی تو وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھنے لگی۔
 ”کیا..... تمہارا لکھا ہوا ناول چھپ گیا؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔
 ”دیکھ لو..... اگر یقین نہیں آتا تو تم میرا نام پڑھ سکتی ہو۔“ میں گردن اٹھا کر بولی۔
 ”نورین فلک ناز..... واقعی نام تو تمہارا ہے۔ کیا واقعی یہ تمہارا ناول ہے؟“ وہ ابھی تک شک نہ تھی۔
 ماموں ممانی بھی پاس آ گئے۔ ماموں نے مہوش کے ہاتھ سے ناول لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ پھر خوشی سے سرشار لہجے میں بولے۔

”نورین بیٹی، تم نے تو کمال کر دیا۔ بیٹا بہت بہت مبارک ہو۔ میں تو جانتا ہی نہ تھا کہ تم اتنی قابل اور ہونہار ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹا۔“

ماموں کی باتیں سن کر میرا ڈھیر دھیر خون بڑھ گیا۔ ممانی نے بھی مبارک باد دی۔ پھر غفار بھی ہاتھ پونچھتا ہوا ٹیبل سے اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے بھی ناول دیکھا، کھولا، انتساب پڑھا اور بولا۔

”ورنڈر فل نورین، تم نے واقعی ایک پہاڑ سر کیا ہے یہ کتاب لکھ کر اور اسے چھپوا کر۔ جبار بھائی ہمیشہ تمہیں لکھنے اور پڑھنے سے منع کیا کرتے تھے۔ آج تمہاری یہ کتاب دیکھیں گے تو ان کی بولتی بند ہو جائے گی۔ بہت مبارک ہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”مگر تمہارا یہ ناول چھپ کیسے گیا؟“ مہوش ابھی تک حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ اس کی بات سن کر میرے دل کو ٹھیس لگی۔ یہ کیسی بہن ہے جو خوش ہونے کے بجائے ایسے اوٹ پٹانگ سوال کیے جا رہی ہے۔

”کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ میں دکھ سے بولی۔
 ”نہیں تو..... مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے۔“ وہ کھوکھلے لہجے میں بولی۔
 ”وہ تو نظر آرہی ہے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”بہر حال یہ کتاب تمہارے لیے نائی ہوں۔ پڑھ کر بتانا کیسی لگی۔“
 ”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ ضرور پڑھوں گی۔“
 ”تم نے تو جانے کب پڑھنی ہے۔ میں البتہ آج ضرور پڑھوں گا۔ اپنے ساتھ فیکٹری میں لے جاتا ہوں شام کو لے آؤں گا۔ تم ویسے بھی رات کو ہی پڑھتی ہو۔“ یہ کہہ کر غفار نے کتاب اس کے ہاتھ سے اچک لی۔
 میں اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”نورین۔“ غفار نے پکارا۔
 ”جی۔“ میں رک گئی۔

”نورین! یہ کامیابی کی سیڑھی پر تمہارا پہلا قدم ہے۔ امید ہے تم ایک ایک کر کے اسی طرح تمام زینے طے کرتی جاؤ گی۔“

”جی بالکل۔ انشاء اللہ۔“ میں پورے عزم سے بولی اور اپنے گھر آ گئی۔ مجھے رہ رہ کر مہوش کا رویہ یاد آرہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مہوش کے رویے نے مجھے بہت مایوس کیا تھا۔ پھر مجھے خاور کا کہا ہوا یہ جملہ یاد آیا کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی بہن اتنی ہی خوشی محسوس کرے گی جتنی آپ توقع کر رہی ہیں۔
 اگلے لمحے موبائل فون کی بیپ سنائی دینے لگی۔ میں نے نمبر دیکھا تو خاور کی کال تھی۔ میں مسکرانے لگی۔ میں نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

”ہیلو، خاور صاحب کیسے ہیں؟“

”فائن، آپ سنائیں۔“

”میں تو آج بہت خوش ہوں۔“

”اسی لیے اپنا وعدہ بھی بھول گئیں۔“

”وعدہ..... کیسا وعدہ.....“ میں سوچ میں پڑ گئی۔

”جانتا تھا آپ بھول گئی ہوں گی۔ چلئے میں آپ کو یاد کروادیتا ہوں۔ میں نے کہا تھا جب آپ کا ناول کتابی شکل میں چھپ کر آئے گا تو میں آپ سے جو مانگوں گا وہ آپ دیں گی۔ آپ نے اس بات کا وعدہ کیا تھا۔“

”کیا واقعی، میں نے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا؟“
 ”تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا۔
 ”اچھا..... پھر مانگئے کیا مانگتے ہیں؟“ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نجانے یہ بے باک سا بندہ کیا مانگ بیٹھے۔

”سوچ لیں، میری فرمائش ہر حال میں پوری کرنی پڑے گی۔“
 ”آپ بتائیں تو سہی، ہر اس کیوں کر رہے ہیں۔“
 ”ہوں..... مجھے آپ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلائیں گی، کھلائیں گی نا!“
 ”میں بھلا اپنے ہاتھوں سے کیوں آپ کو کھلاؤں گی۔“
 ”اوہ یار، تم اپنے ہاتھوں سے پکاؤ گی۔ کھاؤں گا میں اپنے ہاتھوں سے۔ تمہیں سننے میں غلطی لگی ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تو میں جھینپ گئی۔

”ہاں پھر ٹھیک ہے۔ آپ کی فرمائش ضرور پوری کروں گی۔ اب بتائیے آپ کو کھانے میں کیا کیا پسند ہے؟“
 ”جو آپ پیار سے کھلا دیں۔“
 ”تو پھر مشن تو رسمہ، فرائی فش اور کھیر..... ٹھیک ہے نا!“
 ”فش مجھے بالکل پسند نہیں۔ باقی چیزیں ٹھیک ہیں۔“
 ”حیرت ہے آپ کو فش پسند نہیں۔ مجھے تو فش بہت پسند ہے، آئی لوفش۔“
 ”ہم سے زیادہ تو خوش نصیب فش ہے، جس سے آپ نے محبت کا اظہار کر دیا۔“ وہ ہنس رہا تھا۔
 ”اوکے، اللہ حافظ۔“ میں نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔
 ایک یہی عادت تو اس کی خراب ہے۔ بولنے پر آئے تو کچھ بھی بول دیتا ہے۔ میں موبائل ہاتھ میں پکڑے سوچ رہی تھی۔

.....☆.....

لچے گھر آئے تو کھانے سے فارغ ہو کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔
 ”بچوں..... میرے پاس آپ لوگوں کے لیے آج ایک سرپرائز ہے۔“ میں مسکرا رہی تھی اور وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیسا سرپرائز امی؟“ زوہیب بولا۔
 ”جو جھوٹو جانیں۔“ میں نے کندھے اچکائے۔
 ”کہیں شاہ زیب کی منگنی تو طے نہیں کر دی۔“ زوہیب بڑی دور کی کوڑی لایا۔
 ”امی! اس کی ہر بات گھوم پھر کر میری منگنی پر آ کر کیوں رک جاتی ہے۔“ شاہ زیب نے احتجاج کیا۔
 ”زوہیب! تمہیں شاہ زیب کی منگنی کی اتنی جلدی کیوں ہے۔ کہیں یہ تو نہیں سوچتے کہ شاہ زیب کی منگنی جلدی ہو جائے تو تمہارا نمبر آئے۔“

”یو آر گریت مائی سویٹ مام..... آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ آپ کی عقل کی تو داد دینی پڑے گی۔“

”داد تو آپ ضرور دیں گے مجھے کیونکہ میں نے کام ہی ایسا کیا ہے۔“ میں گردن اکڑاتے ہوئے بولی۔

”امی، اب بتا بھی دیں کیوں سسٹنس پھیلا رہی ہیں۔“ اب کی بار فاریہ بولی۔

”اچھا تو پھر ابھی لو۔“ میں اٹھ کر اسٹور میں گئی۔ الماری کھولی اور اپنے ناول کی ایک کاپی نکال کر باہر لے آئی۔

”یہ دیکھو، یہ کیا ہے؟“

”لوجی، اس میں دیکھنے والی کیا بات ہے۔ یہ کتاب ہے۔ سب کو نظر آرہی ہے۔“ زوہیب نے منہ بنایا۔

”یہ کتاب ہے، لیکن یہ معمولی کتاب نہیں۔ یہ میری لکھی ہوئی کتاب ہے۔ میں نے جو ناول لاہور چھپنے کے

لیے بھیجا تھا وہ کتابی شکل میں چھپ کر آچکا ہے اور یہ رہا میرا ناول۔“ میں نے زوہیب کے ہاتھوں میں دے دیا۔

زوہیب منہ کھولے حیرت سے ناول کو تک رہا تھا۔

”شٹر بند کر دو زوہیب۔“ میں نے ہنس کر چوٹ لگائی تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”امی کیا..... واقعی آپ کا لکھا ہوا ناول چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔“

”آف کورس..... دیکھو تمہارے سامنے ہے۔“ میں نے بڑے شائل سے جواب دیا۔

شاہ زیب نے زوہیب سے ناول چھٹ لیا اور اسے الٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھا اور پھر خوشی سے میرے

ساتھ لپٹ گیا۔ فاریہ بھی شاہ زیب کو دیکھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”امی! آپ نے تو کمال کر دیا۔“ شاہ زیب پر مسرت لہجے میں بولا۔

”واقعی امی، میں بھی بہت خوش ہوں۔ ایک ناول مجھے دیں گی نائیں اپنی اسکول ٹیچر اور سب فرینڈز کو دکھاؤں

گی۔ وہ بھی حیران رہ جائیں گی یہ جان کر کہ میری امی ایک رائٹر ہیں۔“

”اوکے چندا۔“ میں نے فاریہ کا ہاتھ چوم کر کہا۔

پھر زوہیب بھی آکر لپٹ گیا۔

”امی! آئی ایم پراؤڈ آف یو۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ ہماری امی ایک غیر معمولی عورت ہیں۔“

”اب پیچھے بھی ہٹو سب۔ میری سائنس بند کرنے کا ارادہ ہے کیا۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔

پھر ہم سب صوفوں پر بیٹھ گئے۔

”امی! اب تو ہماری پارٹی بنتی ہے آپ کی طرف۔“ زوہیب جو ہمیشہ پارٹی کھانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا

تھا، اسے تو بہت اچھا بہانہ مل گیا تھا۔

”ہاں امی، واقعی۔ ہمیں کسی اچھے سے ریستورانٹ میں کھانا کھلائیں۔“ فاریہ بھی اُس کے ساتھ مل گئی۔

”ہوٹل میں کیوں جانا ہے۔ گھر میں ہی پکالیں گے۔“ میں نے ایک خیال کے تحت کہا تو شاہ زیب نے بھی

میری تائید کی۔

”امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ گھر کا کھانا تسلی بخش اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔“

”اے مسٹر صفائی پسند..... ہر وقت بے چاری صفائی کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہ پڑے رہا کرو۔“ زوہیب نے شاہ

زیب کو لتاڑا۔

”کھانا گھر میں ہی کپکے گا۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔“ میں بولی۔

”لو جی، امی تو پہلے ہی ہم پر بڑا رعب جھارتی تھیں، اب تو خیر سے رائٹر بن گئی ہیں۔ اب تو ہمارے برے دن شروع ہیں۔“ زد وہیب بڑی مظلوم صورت بنا کر بولا تو میں ہنسنے لگی۔

”شاہ زیب اور فارہ یہ غور سے سنو۔ اب ہماری ماں، ماں نہیں رہی ایک رائٹر بن گئی ہے۔ ہائے اب ہمارا کیا ہوگا۔ ہم کہاں جا کر اپنی ماں کو ڈھونڈیں گے۔“ وہ ہاتھ کھڑے کر کے باقاعدہ بین کرنے لگا تو ہم تینوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

”زد وہیب، اب بس بھی کرو۔ کیا پٹو گے مجھ سے۔“ میں نے گھر کا تو وہ خاموش ہو گیا اور پھر راگ الاپنے لگا۔
”دیکھا میں نہ کہتا تھا، اب ماں، ماں نہیں رہی رائٹر بن گئی ہے۔ اب ہم سے سوتیلوں جیسا ہی سلوک ہوگا۔“ ہم پھر سے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

”زد وہیب خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔“ میں اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی جو اتنا ہنسنے پر چھلک آئی تھیں۔

.....☆.....

شام کو جبار آیا تو بچے لاؤنچ میں بیٹھے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر اشارے کر رہے تھے۔
وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا۔ حسب معمول کھانا مانگا اور فارہ یہ کھانا ٹیبل پر رکھنے لگی۔ جب سب کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو زد وہیب مجھے اشارے کرنے لگا کہ ابو کو کتاب کے متعلق بتائیں۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا کہ کھانے کے بعد بتاؤں گی۔ کھانے کے بعد سب صوفوں پر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے۔ میں اور فارہ یہ بھی برتن سمیٹ کر آ بیٹھیں۔
جبار کو بھی دال میں کچھ کالا محسوس ہونے لگا کیونکہ اس نے زد وہیب کو میری طرف اشارہ کرتے دیکھ لیا تھا۔
”کیا بات ہے؟ اپنی ماں کو کیسے اشارے کر رہے ہو۔“ وہ کڑک دار آواز میں بولا تو زد وہیب کی مٹی گم ہو گئی۔
”نہیں تو..... میں امی کو کیوں اشارے کروں گا بھلا۔“

اس کی گھبراہٹ پر ہم سبھی مسکرانے لگے۔

”فارہ بیٹا، ادھر آؤ۔“ جبار نے فارہ کو محبت بھرے لہجے میں بلایا۔

”جی ابو۔“ وہ پاس جا کھڑی ہوئی۔

”بیٹا تم بتاؤ آج کیا خاص بات ہے، جو یہ سب میرے آس پاس بیٹھے ہیں۔ ورنہ تو یہ دونوں بھائی مجھے گھر میں دیکھ کر ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔“

”ابو..... بات یہ ہے کہ..... امی کی کتاب چھپ کر آئی ہے۔“ فارہ نے بڑے جوش سے بتایا۔

”کتاب..... کیسی کتاب.....“ جبار کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”امی نے ناول لکھ کر چھپنے کے لیے بھیجا تھا، وہ کل چھپ کر آ گیا ہے۔“

زد وہیب اٹھا اور دوڑ کر ناول اٹھا لایا اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دیا۔

”یہ دیکھیں ابو، امی نے کتنا اچھا لکھا ہے۔ آپ پڑھ کر دیکھیں آپ کو بہت پسند آئے گا۔“

جبار چند منٹ کتاب کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”یہ ناول تم نے کب لکھا تھا؟“

”ایک سال پہلے۔“ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”کس سے چھپوایا ہے؟“

”لاہور بھیجا تھا۔ پہلی کیشنز سے چھپوایا ہے۔“

”تم نے ان کا ایڈریس کہاں سے لیا تھا؟“

”ایک ناول پر لکھا ہوا تھا۔“

وہ کسی وکیل کی طرح جرح کر رہا تھا اور میں کسی ملزم کی طرح جواب دے رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ کتاب لکھ کر میں نے کوئی سنگین جرم کر دیا تھا اور اب مجھے اس کی کڑی سزا ملنے والی تھی۔ تینوں بچے بے چارے ہونق چہروں کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔

”میں نے تمہیں سختی سے منع کیا تھا کہ تم نہ کچھ لکھو گی اور نہ فضول کتابیں پڑھو گی۔ پھر تم نے یہ ناول کیسے لکھ کر بھیجا۔ بنا مجھ سے پوچھے اور اجازت لیے۔“ اس کی آواز بلند اور تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ میں نظریں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

”اب بولتی کیوں نہیں۔ جواب دو میری باتوں کا۔ میں نے ہمیشہ تمہیں ایسے فضول کاموں سے منع کیا ہے اور یہی کہا ہے کہ اپنی پوری توجہ اپنے گھر اور بچوں کی طرف دو۔ تمہاری توجہ گھر کی طرف بالکل نہیں ہے۔ یہ بات میں نے بار بار نوٹ کی ہے۔“

”تو پھر میری توجہ کہاں ہوتی ہے؟“ میں روتے ہوئے بولی۔

”یہ تو پتا چل نہیں گیا کہاں ہوتی ہے، یہاں ہوتی ہے۔“ اس نے کتاب پکڑ کر بلندی اور پھر اسے پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا۔ کتاب دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر گئی۔ اس کے صفحے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اس کا اتنا ذلت آمیز رویہ دیکھ کر میں باقاعدہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ وہ اٹھ کر باہر جانے لگا۔ مین اندرونی دروازے کے پاس جا کر کرک گیا، پھر واپس آیا اور بولا۔

”یاد رکھو..... یہ تمہاری زندگی کی پہلی اور آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد تمہاری کوئی کتاب نہیں آئے گی۔ مجھے رائٹر اور دانشور بیوی نہیں چاہیے بلکہ گھر اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے ایک سیدھی سادی وفا شعار عورت چاہیے۔ جس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہو میری اور میرے بچوں کی خدمت کرنا سمجھی تم۔“ اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کھڑی کر کے مجھے وارننگ دی اور پھر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بلند آواز میں رونے لگی۔ تینوں بچے میں میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ وہ خود بھی رو رہے تھے اور مجھے بھی چپ کر وارہے تھے۔

”آئی ایم سوری امی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ابو آپ کے ساتھ اس قدر گھٹیا سلوک کریں گے۔“ زوہیب روتے

ہوئے کہہ رہا تھا۔

”امی، آپ حوصلہ مت ہاریں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ ضرور لکھیں۔ ابو آپ سے کوئی بھی زیادتی کریں گے تو ہم منہ توڑ جواب دیں گے۔“ شاہ زیب غصے سے بولا۔

میں آنسو پونچھنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے رونے کی وجہ سے بچے بھی تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔ میں نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کتاب اٹھائی۔

”تم لوگ جا کر اپنے اپنے کمروں میں ہوم ورک کرو۔ میں بھی اب آرام کروں گی۔“ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ لاک کر کے بیڈ پر گر گئی۔ میں کھل کر رونا چاہتی تھی جو میں صرف اپنے کمرے کی تنہائی میں رو سکتی تھی۔

☆.....

اگلی صبح میں سیر کرنے کے لیے بھی نہ گئی۔ بچوں کو ناشتہ کروایا۔ اُن کے جانے کے بعد جبار کا ناشتہ بنایا۔ وہ نہا کر آیا۔ ناشتہ اس کے آگے رکھا اور خود سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کیونکہ یہ اس کا آرڈر تھا کہ جب تک وہ کھانا کھائے یا ناشتہ کرے مجھے اس کے پاس رہنا ہے۔

وہ چپ چاپ ناشتہ کرتا رہا۔ نہ اس نے مجھے بلایا اور نہ میں نے اسے مخاطب کیا۔ بلکہ میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس سے بات کروں یا اس کی طرف دیکھوں بھی۔ رات رونے کی وجہ سے میری آنکھیں جل رہی تھیں اور سر درد سے بھٹا جا رہا تھا۔

وہ دفتر چلا گیا تو میں چائے کے ساتھ دو گولیاں پین کھڑکی لے کر وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔ آج ٹی وی بھی نہ لگایا تھا۔ لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔ فون کی آواز سن کر آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ موبائل اٹھایا تو خاور کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ آج سیر کرنے نہیں گئی تھی اسی لیے اس نے فون کیا تھا۔ میں نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ فون دوبارہ سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر ٹیل جیتی رہی پھر فون بند ہوگا۔ میں نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

☆.....

سارا دن طبیعت بوجھل رہی۔ رات کو جبار آیا تو بچے اس کے آنے سے پہلے کھانا کھا کر اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ وہ شاید باپ کا سامنا نہ کرنا چاہ رہے تھے۔ میں نے بھی خاموشی سے کھانا اس کے آگے رکھا اور چپ چاپ سامنے بیٹھ گئی۔ وہ کھانا کھا کر باہر چلا گیا۔

اگلی صبح میرا پھر دل نہ چاہا کہ میں پارک میں جاؤں اور خاور کا سامنا کروں۔

بچوں کو اٹھایا تو زوہیب نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے وہ کالج نہیں جائے گا۔ شاہ زیب اور فارہ یہ چلے گئے جبکہ وہ پھر سے سو گیا۔

جبار کا ٹائم ہوا تو وہ اندر آ گیا۔ وہ صبح باہر لان میں ماموں کے پاس بیٹھ کر اخبار وغیرہ پڑھتا تھا اور گپ شپ لگاتا تھا۔ وہ آکر واش روم میں گھس گیا اور میں اس کے لیے پراٹھے تیار کرنے لگی۔ ابھی پیڑے کر کے رکھے ہی تھے کہ کال ٹیل کی آواز سنائی دی۔ جا کر دیکھا تو دودھ والا کھڑا تھا۔

”آج اتنی جلدی آگئے۔“ میں حیران ہوئی۔

”جی بابی جی، آج ہمارے گھر میں شادی ہے۔ آج میرے چھوٹے بھائی کی بارات جانی ہے اس لیے جلدی آ

گیا تاکہ جلدی واپس جاسکوں۔“ دودھ والا بڑا باتونی تھا۔

میں اندر آئی، برتن پکڑا اور جا کر دودھ لینے لگی۔ دودھ والا دودھ ڈالتے ہوئے پھر سے شروع ہو گیا۔

”باجی جی، ہمارے کام میں چھٹی نہیں ہے۔ عید والا دن ہو یا کسی قریبی عزیز کی شادی ہو، تانہ نہیں کر سکتے۔

یہاں تک کہ کوئی فوننگی بھی ہو جائے تو چھٹی نہیں کر سکتے کیونکہ بھینسوں نے تو ہر صورت دودھ دینا ہوتا ہے۔ وہ تو چھٹی نہیں کر سکتی نا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے زور سے ہنسا تو میں بھی مسکرانے لگی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کے کام میں کوئی چھٹی نہیں ہو سکتی۔“ میں نے دودھ والا برتن اٹھایا اور جلدی

جلدی اندر آئی۔ کلاک پر نظر ڈالی تو وہ ساڑھے آٹھ بج رہا تھا۔

اوہ خدایا! جبار نے مجھے ناشتہ تیار کرنے کے لیے سوا آٹھ بجے کا وقت دیا ہے۔ اب تو ساڑھے آٹھ ہو رہے

ہیں۔ میں نے فوراً آنچ تیز کی اور پراٹھا پیلنے لگی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جبار نہا کر باہر آچکا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا اور آواز دی۔

”لاؤ میرا ناشتہ لاؤ۔“

”لارہی ہوں، بس دو منٹ۔“ میں نے اندر سے آواز لگائی۔

”کیا مطلب، کیا تم نے میرا ناشتہ ابھی تک نہیں بنایا۔ کیا کر رہی تھی تم؟“ وہ دھاڑا تو میرے ہاتھ سے روٹی

گرتے گرتے بچی۔

میں نے فائنٹ ایک پراٹھا تیار کیا۔ اس کے آگے رکھا۔ دوسرا پراٹھا تو بے پروا کر سالن اس کے آگے

رکھنے لگی۔ اس کے بعد تسی کا جگ اور گلاس رکھے۔ مگر اس کے باوجود وہ کسی بے سرے ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجا شروع

ہو گیا تھا۔ اس کا کڑوا کیلا لکچر شروع ہو گیا تھا جو ناشتے کے اختتام تک جاری رہنا تھا۔ میں دوڑ کر کچن میں گئی تو دوسرا

پراٹھا جل چکا تھا۔ اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہائے اللہ اب کیا کروں۔ میں نے اسے اتارا، تو اوصاف کیا اور تیسرا

پراٹھا ڈال دیا۔

”یہ سبیل کیسی آرہی ہے باہر۔“ وہ گرجا۔ ”فوراً دوسرا پراٹھا لے آؤ۔ میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔“

”بس دو منٹ۔“ میں نے باہر جھانک کر جواب دیا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں دو منٹ انتظار کروں گا اب۔ باہر نکل کے وقت دیکھو۔ میں نے ڈیوٹی پر جانا ہے۔

وقت پر نہ جائیں تو پوچھ پڑتا مل ہوتی ہے۔ تمہاری طرح گھر بیٹھ کر صوفے میں توڑنے اور نہ بکواس پر دو گرام دیکھ دیکھ کر

وقت برباد کرنا ہے۔“

اس کی بک بک سن کر مجھے رونا آ گیا۔ میں نے پراٹھا اس کے آگے رکھا تو وہ بھی خاصا براؤن ہو گیا تھا۔

”اب یہ کیسے جلا۔“ اس نے پراٹھا پکڑ کر اٹھایا۔

”نہیں یہ تو نہیں جلا، بس تھوڑا الال ہو گیا۔“

”دل تو چاہ رہا ہے یہ پکڑ کر تمہارے منہ پر دے ماروں جس منہ سے تم اتنی بکواس کر رہی ہو۔ پتا نہیں کس مٹی کی

بنی ہوئی ہو۔ میری کسی بات کا تم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔“

وہ بکتا جھکتا دفتر چلا گیا تو میں صوفے پر بیٹھ کر رونے لگی۔

اچانک زوہیب اپنے کمرے سے باہر نکلا تو میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ میرے ذہن سے یہ بات بالکل نکل گئی تھی کہ آج زوہیب گھر پر ہے۔ اللہ کرے اس نے یہ تماشا نہ دیکھا ہو۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔

”آؤ ناشتہ کرو گے کیا؟ کیا بناؤں تمہارے لیے؟“

”کچھ نہیں، ابھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ یہ کہہ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔

”آج کس بات پر ابو آپ کی اتنی انسٹ کر رہے تھے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے ہی ہمیشہ کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر چراغ پا ہو جانا تمہارے ابو کی پرانی

عادت ہے۔“

”چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا غصہ کرنا اور اگلے بندے کی اتنی تذلیل کرنا کہاں کا انصاف ہے۔“ وہ زہریلے

انداز میں بولا۔

”چلو چھوڑو، یہ بناؤ تمہارے لیے کیا بناؤں۔“

”کچھ نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سے کمرے میں چلا گیا اور میں سر پکڑے بیٹھی رہی۔

☆.....

رات کو ہم سب کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے زوہیب کی فکر ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ صبح کا نکلا ہوا تھا اور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ مزید پریشان ہوتی یا شاہ زیب کو کچھ کہتی، وہ آگیا۔ اس کو دیکھ کر میں پرسکون ہو گئی۔

”کہاں تھے تم صبح سے زوہیب، غیر ذمہ داری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آؤ آکر کھانا کھاؤ۔“

وہ باپ کے بالکل سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میں نے پلیٹ میں چاول ڈال کر اس کے آگے رکھے تو وہ

بے دلی سے چاولوں میں چیچ چلانے لگا۔ میں بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے ابھی تک ایک بھی لقمہ منہ میں نہیں ڈالا

تھا۔ اس نے چہرہ جھکا یا ہوا تھا۔ وہ چند منٹ یونہی چیچ چلاتا رہا تو میں بول اٹھی۔

”زوہیب! تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔ صبح بھی بغیر ناشتہ کیے گھر سے نکل گئے تھے۔“

اس نے سراٹھا کر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرا دل کانپ اٹھا۔

”صبح آپ لوگوں کا کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔“

شاہ زیب کی آواز اور یہ روپ دونوں میرے لیے اجنبی تھے۔ اس کا باپ بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

یقیناً وہ بھی زوہیب کی گھر میں موجودگی سے بے خبر تھا ورنہ شاید خود پر کنٹرول رکھتا۔

جبار کا ہاتھ رک گیا۔

”یہ بات کس سے پوچھ رہے ہو؟“ وہ حیرانی سے بولا۔

”آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“ زوہیب نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”میں اب تم کو جواب دوں گا۔ کھانا کھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔“ وہ پھنکارا۔

زوہیب نے اپنے آگے رکھی پلیٹ کو ہاتھ سے پرے دھکیل دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نہیں کھانا میں نے کھانا۔ پہلے مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔“ زوہیب کے تیور مزید خراب ہوتے جا رہے تھے۔

”تمہاری اتنی جرأت کہ تم مجھ سے باز پرس کرو گے۔ میں کہتا ہوں میری نظروں سے دور ہو جاؤ ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا تم پر۔ چلے جاؤ یہاں سے۔“ جبار کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

ماحول خراب ہوتا دیکھ کر میں نے زوہیب کو سمجھایا۔ ”زوہیب بیٹا، چپ چاپ کھانا کھاؤ اور اپنے کمرے میں چلے جاؤ یا پھر مہوش آنٹی کے ہاں چلے جاؤ۔“

”میں اپنی بات کا جواب لیے بغیر یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔“ زوہیب نے اٹل لہجے میں بولا تو میں مزید پریشان ہو گئی۔

شاہ زیب اور فاریہ بھی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ شاہ زیب نے اٹھ کر زوہیب کو کھینچ کر اٹھانے کی کوشش کی مگر زوہیب اپنی ضد پر اڑا بیٹھا رہا۔

”تمہیں اپنے سوال کا جواب چاہیے نا، تو پھر سنو جواب۔“ جبار گر جا۔

”یہ میری بیوی ہے۔ میں اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کروں۔ یہ ہمارا میاں بیوی کا آپسی معاملہ ہے۔ کوئی تیسرا اس میں دخل نہیں دے سکتا۔ سمجھے تم.....“

جبار کی بات سن کر زوہیب نے اپنا ہاتھ زور سے میز پر مارا اور چیخ کر بولا۔

”وہ صرف آپ کی بیوی نہیں ہے، ماں ہے وہ ہماری اور ہماری ماں کی کوئی انسلٹ کرے یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے..... سمجھے آپ۔“ وہ دندناتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ ہم سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جبار کے سر پر تو گویا آسمان گر پڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھاے بیٹھا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اولاد کبھی اس سے بغاوت بھی کر سکتی ہے۔ چند لمحوں تک وہ سر تھاے بیٹھا رہا پھر میری طرف قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

”تو اب اس طرح تم مجھ سے بد لے لو گی۔ اب میری اولاد کو میرے خلاف استعمال کرو گی۔ گویا تم نے میرے خلاف محاذ کھول لیا ہے۔ فوج تیار کر رہی ہو تم مجھ سے لڑنے کے لیے۔“ وہ زہرا لگتا گیا اور میں چپ چاپ سن کر روتی گئی۔ وہ اٹھا اور کمرے میں جا کر بند ہو گیا۔ میں وہیں صوفے پر ڈھکی گئی۔ یا میرے مالک! یہ کیوں سی نی آ ز مائش شروع ہو گئی ہے میرے لیے۔

☆.....

رات کے گیارہ بجے تک میں لاؤنج میں بیٹھی زوہیب کا انتظار کرتی رہی۔ شاہ زیب ہر جگہ ہر ٹھکانے سے اس کا پوچھ آیا تھا مگر وہ کہیں نہیں ملا تھا۔ وہ اپنے کسی دوست کے پاس نہیں گیا تھا۔ موبائل بھی آف تھا اس کا۔ اب شاہ زیب اور فاریہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ جبار ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

میں اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں جھانک کر دیکھ چکی تھی۔ وہ بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ پتا

نہیں سو رہا تھا کہ جاگ رہا تھا۔

اس کی انا اور خود پسندی کو آج گہری چوٹ لگی تھی۔ مگر کہتے ہیں ناکہ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ہوتا ہے۔ اس کا دور فرعونیت بھی ختم ہونے والا تھا شاید۔

میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی آخر زوہیب کہاں جاسکتا ہے۔ بیٹے کی فکر جان کھا رہی تھی۔ ٹائم دیکھا تو بارہ بج رہے تھے۔ جانے کہاں رہ گیا ہے۔ پہلے تو کبھی اتنی رات گئے کبھی باہر نہیں رہا۔ اب کیا کروں۔ جبار کو اٹھاؤں۔ اس کو اٹھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہونا۔ التا ذلیل ہی کروانی ہے۔ ایسا کرتی ہوں غفار کو جا کر کہتی ہوں۔ ابھی میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ لاؤنچ کا دروازہ کھلا اور زوہیب اندر آ گیا۔

”امی! آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“ مجھے انتظار کرتا دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گیا۔ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔
 ”سوری امی.....“

”کہاں تھے تم؟“ میری آنسوؤں میں ڈوبی آواز سن کر وہ بے چین ہو گیا۔

”امی..... ایک دوست کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا۔“

”فون کر کے اطلاع دے سکتے تھے نا۔ تمہارے سب دوستوں کو شاہ زیب نے فون کر کے تمہارے متعلق پوچھا تھا مگر سب نے تمہارے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔ تمہارا سیل فون بھی بند تھا۔ جانتے ہو میں نے یہ وقت کتنی اذیت میں کاٹا ہے۔ کیسے کیسے خیالات آرہے تھے دماغ میں۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آئی ایم سوری امی..... آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ آئی پراس یو۔“ وہ مجھے ساتھ لپٹا کر تسلیاں دے رہا تھا۔
 ”بس ابو کی وجہ سے اتنا ڈپریشن تھا کہ دوست میری ڈپریشن دور کرنے کے لیے زبردستی فلم دکھانے لے گیا۔ سیل فون گھر سے نکلنے وقت غصے میں آف کیا تھا تو پھر آن کرنا یاد ہی نہ رہا۔ میری پیاری امی..... اب چپ بھی کر جائیں نا۔ کہتی ہیں تو مرغا بن جاتا ہوں..... مگر پلیز رونا بند کر دیں۔ آپ جانتی ہیں ناکہ میں آپ کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“

”کھانا کھایا ہے۔“ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، کھالیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”تو چلو پھر دودھ کا گلاس پی لو۔ فریج میں رکھا ہے۔“

”او کے مائی سویٹ مام..... ابھی لی لیتا ہوں۔“ اس نے میرا ہاتھ چوما۔

”زوہیب.....“

”ہوں.....“ وہ فریج کے پاس جا کر رک گیا۔

”بیٹا! آئندہ کبھی باپ کے ساتھ بدتمیزی نہ کرنا۔“

”اگر وہ آپ کی انسٹل کریں گے تو ضرور کروں گا۔“

”وہ اس کی عادت بن چکی ہے اور عادتیں اتنی آسانی سے توڑا جاتی ہیں۔“

”سوری امی، اب وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ساری زندگی انہوں نے بات بات پر آپ کو ذلیل کیا ہے مگر اب آپ

جوان بچوں کے ہوتے ہوئے ہرگز یہ ذلت برداشت نہیں کریں گی۔ آپ کے بیٹے آپ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو

جائیں گے۔“

زود ہی کی باتیں سن کر میرا ڈھیروں خون بڑھ گیا اور سر فخر سے بلند ہو گیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اسے جلدی سونے کی تلقین کرتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف چل دی۔

☆.....

صبح اٹھی۔ سوچنے لگی پارک جاؤں کہ نا۔ آخر فیصلہ یہ کیا کہ نہ جاؤں اور نماز، قرآن سے فارغ ہو کر ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔

بچے اور میاں چلے گئے تو اپنا ناشتہ لے کر بیٹھ گئی۔ ناشتہ کرنے کے بعد چائے کا مگ لے آئی پھر چائے پیتی جا رہی تھی اور گھر کے حالات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جو دن بدن زیادہ کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ جبار نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بچوں کو اپنا مخالف بنا لیا تھا اور اس بات کا ذمہ دار مجھے سمجھ رہا تھا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے ریموٹ پکڑا اور ٹی وی آن کیا۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے بھی دماغ میں مختلف خیالات گردش کر رہے تھے۔ پھر میں خاور کے متعلق سوچنے لگی۔ تین چار دنوں سے نہ میں اس سے ملی تھی اور نہ فون پر بات کی تھی۔ اسی دوران موبائل کی پیپ بجنے لگی۔ اٹھا کر دیکھا تو خاور کی کال آرہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتی رہی پھر فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”ہیلو.....“ میں نے دھیمی آواز سے کہا۔

”یار کہاں گم ہواتے دنوں سے۔ اب تو میں اعلان کشدگی کا اشتہار اخبار میں دینے کا سوچ رہا تھا۔“

”بس گھر میں کچھ مصروفیت ہی ایسی پیدا ہو گئی تھی۔ وقت ہی نہیں ملا۔“

”ایک ناول چھپنے سے آپ اتنی مغرور ہو گئی ہیں آپ کے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں رہا۔ اگر دو تین ناول اور چھپ گئے تو مجھے تو پچپچائیں گی بھی نہیں۔“ اس کے گلے شکوے ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔

”نہیں خاور صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں مسکرائی۔

”باقی رہا سوال نہ پچانے کا تو وہ وقت کبھی نہیں آئے گا کیونکہ یہ میرا پہلا اور آخری ناول ہوگا۔ اس کے بعد میں نے کوئی ناول نہیں چھپوانا۔“ میری آواز بھیگ گئی۔

”ارے ارے، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ گھبرا گیا۔ ”آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ یہ بات میرے علاوہ کسی

اور نے آپ سے نہیں کہی۔“ وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ میرے شوہر کا حکم ہے کہ نہ میں لکھ سکتی ہوں اور نہ اپنے لکھے ہوئے کو چھپوا سکتی ہوں۔“ اب میں رونے لگی

تھی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ مجھے روتا دیکھ کر شاید وہ بھی افسردہ ہو گیا تھا۔

”یہ بندہ آخر ہے کیا چیز۔ کیوں آپ کے ساتھ ایسا کرتا ہے۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”آپ کے بچے کیا کہتے ہیں؟“

”میرے بچے کہتے ہیں کہ میں لکھوں وہ میرے ساتھ ہیں۔ وہ میری کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ بلکہ

جبار کے علاوہ ہر فرد نے حوصلہ افزائی کی ہے۔“

”اور آپ کی بہن نے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بھی بہت خوش ہوئی تھی۔“ اس دفعہ میرا لہجہ کھوکھلا تھا۔

”تو پھر ہلکے آخریا تکلیف ہے؟“ وہ جل کر بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کی قابلیت سے حسد کرتا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ میں رو ہانسی ہو کر بولی۔

”ہوتے ہیں کچھ انسان ایسے جو اپنی بیویوں کو اپنے سے آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ

ان کی بیویاں ان سے کمتر ہوں۔ ان سے دب کر رہیں اور تمام عمر ان کی جوتیاں سیدھی کرتی رہیں اور یہ موصوف بھی ان دقینوسی اور تنگ ذہن لوگوں میں سے ایک ہیں۔ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے۔“

”چلیں چھوڑیں۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔“ میں نے سارا لمبہ قسمت پر ڈالنا چاہا۔

”پلیز آپ تو ایسی دقینوسی باتیں نہ کریں۔ انسان کی کامیابی کے لیے دو خوبیاں بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔

اول.....خود اعتمادی، جو ہر مقام پر ساتھ دیتی ہے۔ حوصلہ بلند کرتی ہے اور لوگوں کے سامنے سرخرو کرتی ہے۔ دوم.....

مضبوط قوتِ ارادی ہے جس کے تحت انسان اپنی منزل کے حصول کی خاطر کوشاں رہتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں

ہے جو نہ ہو سکے۔ ضرورت ہے تو صرف محنت کی اور اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے کی۔ آپ میری باتوں پر عمل

کر کے دیکھیں ہر رکاوٹ خود بخود دور ہوتی چلی جائے گی۔“ وہ جوش سے بولتا چلا گیا۔

”آپ واقعی بہت اچھے خطیب ہیں۔“ اس کی باتیں سن کر میں رونا بھول گئی۔ اس کی باتوں سے مجھے بہت

حوصلہ ملا تھا۔ میری اُمید کی شمع روشن ہو گئی تھی۔ ”اگر میں ہمت نہ ہاوں، لکھنا جاری رکھوں تو پوری چھپے لکھنے سے کل کو کوئی

بڑا ہنگامہ بھی برپا ہو سکتا ہے۔“ میں فکرمندی سے بولی۔

”کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ آپ کے بچے آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ باپ کو بھی قائل کر لیں گے۔“ وہ پورے یقین

سے بولا۔

”آپ جبار کو نہیں جانتے۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ اس کی ہر بات پتھر پر لکیر کی

طرح انمٹ ہوتی ہے اور ویسے بھی میں بچوں کو اس کے مد مقابل کھڑا نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ آپ کے بچے آپ کے لیے سب سے بڑا ہتھیار اور سب سے بڑی ڈھال ہیں

اور باقی رہی بات پتھر پر لکیر والی تو جناب پتھر پر بھی مسلسل پانی گرتا رہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ گھلنے لگتا ہے۔“

”او کے جناب، اس بحث میں آپ جیتے اور میں ہاری۔ بتائیں میں کیا کروں۔“

”آپ نے لکھنا نہیں چھوڑنا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ہر حال میں لکھنا ہے۔ رائٹنگ کی دنیا میں نام پیدا کرنا

ہے۔ لکھیں گی نا!“ اس نے تصدیق چاہی۔

”ضرور لکھوں گی۔“ میں پورے عزم کے ساتھ بولی۔ ”ہر حال میں لکھوں گی مگر جبار.....“

”چھوڑیں جبار کو۔ اس کا بھی حل نکل آئے گا۔ ایک بات یاد رکھیں ٹیلنٹ پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ یہ اپنا

راستہ خود ہی بنا لیتا ہے۔ ساری پابندیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔“

”شکر یہ خاور۔“

”کس بات کے لیے؟“

”میری اتنی حوصلہ افزائی کے لیے۔ میں تو بالکل ہمت ہاری بیٹھی تھی۔ سچ پوچھیں تو اندر سے ٹوٹ چکی تھی، بکھر چکی تھی۔“

”میں جب تک زندہ ہوں اسی طرح آپ کی ہمت بندھاتا رہوں گا۔ کبھی آپ کو ٹوٹنے اور بکھرنے نہیں دوں گا۔“

”بہت شکریہ۔“ میں اس کی دل سے فین ہو گئی تھی۔

”بار بار شکریہ ادا کر کے کیوں میری دوستی کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ ویسے بھی جب آپ شکریہ ادا کرتی ہیں تو ایک دم سے غیر غیری لگنے لگتی ہیں۔“

اس کا آخری جملہ سن کر میرے دل میں اٹھل پٹھل سی ہونے لگی۔

”او کے خاور..... گڈ بائے.....“

”کیوں..... کیا ہوا؟“

”کافی لمبی کال ہو گئی ہے۔ اب فون بند کر دینا چاہیے۔“

”سچ تو یہ ہے کہ آپ سے بات کرتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جبکہ آپ تو منٹ منٹ کا حساب رکھتی ہیں۔“

میں خاموش رہی تو وہ بولا۔

”او کے..... خدا حافظ.....“

”خدا حافظ.....“

.....☆.....

اگلے دو تین دن خاموشی سے گزر گئے۔ گھر کی فضا کشیدہ ہی رہی۔ جبار گھر آتا، کھانا کھاتا اور باہر نکل جاتا۔ اس کے بعد سونے کے وقت آتا اور میری طرف کروٹ بدل کر سو جاتا۔ نہ مجھ سے کوئی بات کرتا اور نہ بچوں کو بلاتا۔ تیسرے دن میں نے زوہیب کو کہا کہ آج رات کو اپنے ابو سے معافی مانگ کر انہیں مناؤ۔ پہلے تو اس نے آئیں بائیں شائیں کی اور پھر مان گیا۔ رات کو کبھی کھانا کھا رہے تھے، جب زوہیب نے کہا۔

”ابو..... سوری.....“

جبار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور نہ اس کی طرف دیکھنا گوارہ کیا۔

”ابو..... میں اس دن کی بات کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“

جبار کی خاموشی طویل ہو گئی تو میں بولی۔

”بچہ ہے..... معاف کر دیں پلیز.....“

”تم چپ رہو۔“ وہ میری طرف دیکھ کر دھاڑا۔ ”یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر

نکل گیا۔

”اب سنائیں..... اب خوش ہیں میری بے عزتی بھی کروا دی اور اپنی انسلٹ بھی کروالی۔ میں نے کہا تھا نا کہ ابو سے معافی مانگنا ایک دم فضول کام ہے۔“ زوہیب جلی کٹی شانے لگا۔

”زوہیب، ماں باپ کچھ بھی کہہ دیں اولاد کی بے عزتی نہیں ہوتی۔ ان کی کسی بھی بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ باقی رہی میری انسلٹ کی بات تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔“

اگلا دن چھٹی کا دن تھا۔ آج جبار کا موڈ قدرے خوشگوار تھا۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران جبار، فاریہ سے پوچھ رہا تھا۔

”آج میری بیٹی نے سیر کرنے کے لیے کہاں جانا ہے؟“

”اس نے خوش ہو کر گلشن اقبال پارک کا نام بتایا جو ہمارے شہر کا سب سے مشہور اور بڑا پارک تھا۔“

”اوکے..... جہاں میری بیٹی کہے گی وہیں جائیں گے۔“

میں اور دونوں بیٹے خاموشی سے سن رہے تھے۔

”ابو..... میں اور آپ صرف دونوں جائیں گے۔“ فاریہ نے پوچھا۔

”تم کیا کہتی ہو؟ جسے تم چاہو گی اسے لے جائیں گے۔“

”سچ ابو۔“ وہ خوشی سے چبکی۔

”ہاں ہاں، بالکل۔“ وہ مسکرایا۔

”تو پھر ابو سب چلتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میری جان، سب کو لے چلتے ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ فاریہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ہاں، میں اپنی گڑیا کی کوئی بات کیسے رد کر سکتا ہوں۔“

”زوہیب بھائی کو بھی لے جائیں۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

”تم کہتی ہو تو اس نالائق کو بھی لے جائیں گے۔ بس اس سے کہو کہ اپنی زبان کو اپنے کنٹرول میں رکھا کرے۔“

”ابو جان.....“ فاریہ باپ سے لپٹ گئی اور ہم سب مسکرانے لگے۔ زوہیب بول اٹھا۔

”ابو جان..... گاڑی میں چلاؤں گا۔“

”چلا لیٹنا..... بس گاڑی ہی چلایا کرو..... زبان نہ چلایا کرو۔“ جبار نے گھر کا تو وہ خفیف سی ہنسی ہنس دیا۔ گھر کا

ماحول معمول پر آیا تو میں نے سکون بھری گہری سانس خارج کی۔

☆.....

انہی دنوں ساتھ والے ہمایوں کی بیٹی کی شادی آگئی۔ مہندی والی رات لڑکوں نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر

دیا کہ لڑکی کی مہندی میں ہمارا وہاں کیا کام۔

اس لیے میں اور مہوش بمع اپنی بیٹیوں کے وہاں پہنچ گئیں۔ فاروقی صاحب اور ان کی اہلیہ نے بڑے پرتپاک

انداز میں ہمیں دیکھ کر کہا۔ وہاں ہمارے علاوہ محلے کی اور عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ جن میں خاور کی بیوی صوفیہ بھی شامل

تھی۔ نام کی حد تک تو میں اس سے واقف تھی آج پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ واقعی بلا کی تیز طرار عورت تھی۔ ویسے شکل و صورت کی اچھی تھی۔

”باجی، آپ سنا کیں کسی ہیں؟ آپ نورین باجی ہیں نا!“

”ہاں، آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟“ میں بڑی حیران ہوئی۔

”میں صوفیہ ہوں، خاور کی بیوی۔ وہ آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔“

میں اس کی بات سن کر گڑ بڑا گئی۔ مہوش میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کی بات سن کر اس نے کان کھڑے کیے۔

”وہ کیسے جانتے ہیں اسے؟“ اس نے ڈائریکٹ صوفیہ سے پوچھا۔

”وہ بھی صبح کی سیر کے لیے پارک میں جاتے ہیں۔ وہیں باجی نورین بھی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے سلام

دعا تو ہو جاتی ہے نا۔ آخر محلے دار ہیں اور ویسے بھی خاور کہہ رہے تھے کہ اُن کی آپ کے خاندان سے بڑی پرانی جان پہچان ہے۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ مہوش نے خوشدلی سے جواب دیا۔

”باجی، خاور کہہ رہے تھے کہ آپ ناول نگار ہیں۔ آپ کا ایک ناول چھپ کر آ گیا ہے۔ وہ گھر لائے تھے۔ میں

نے پڑھا ہے۔ بڑا خوبصورت لکھتی ہیں آپ۔ میں تو آپ کی فین ہو گئی ہوں۔“ وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آرہی تھی۔

”بہت شکریہ آپ کا۔“ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کی تعریف و توصیف کے جواب میں کیا کہوں۔“

تھوڑی دیر بعد مسز فاروقی اور ان کی چھوٹی بیٹی ہمارے پاس آ بیٹھیں اور موضوع بدل گیا اور میں نے بھی خدا کا

شکرا ادا کیا۔

”آئی آپ دونوں دیورانی، جیٹھانی کے علاوہ سگی بہنیں بھی ہیں نا!“ مسز فاروقی کی بیٹی بڑی بے یقینی سے پوچھ

رہی تھی۔

”ہاں بیٹا، ہم دونوں سگی بہنیں بھی ہیں۔“ میں نے بڑی شفقت سے جواب دیا۔

”تو پھر آئی آپ دونوں میں سے بڑی کون ہے؟“ اس نے معصومیت سے یہ سوال کیا تو میری ہنسی چھوٹ گئی

کیونکہ میں جانتی تھی کہ مہوش کو اس سوال سے سخت چڑ ہے۔ وہ ہر جگہ اس سوال کا اکثر سامنا کرتی تھی۔ بازار میں اکٹھی

جاتیں یا کسی فوننگی یا شادی پر جاتیں یا کسی میلاد پر، ہر نیا جاننے والا یہ سوال ضرور کرتا اور ہر دفعہ وہ سوال کرنے والے کو کھا

جانے والی نظروں سے گھورتی اور بڑے سخت لہجے میں جواب دیتی۔

آج پھر سے یہی سوال اس بچی نے پوچھ لیا تھا۔ میں نے جواب دینے سے احتراز کیا۔ ہم دونوں کی خاموشی پر

وہ بچی پھر سے بولی۔

”آئی بتائیں نا، آپ دونوں میں سے بڑی کون ہیں؟“ اب اس کی مخاطب مہوش تھی۔ ”آپ بڑی ہیں نا!“

اب تو مہوش کا صبر جواب دے گیا۔

”ہاں بیٹا، میں ہی بڑی ہوں۔“ وہ جل کر بولی۔

”مگر آئی بچے تو ان کے بڑے ہیں۔“ وہ لڑکی میری طرف اشارہ کر کے بولی۔

”وہ بیٹا بات دراصل یہ ہے کہ بڑی ہونے کے باوجود میری شادی بعد میں ہوئی ہے اور ان کی مجھ سے پانچ سال پہلے ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہ خوبصورت اور اسماٹ تھیں۔ اس لیے جو بھی رشتہ آتا انہیں پسند کر لیتا اور مجھے رنجکٹ کر دیتا کیونکہ میں سوئی تھی۔ لہذا ان کی شادی پہلے ہو گئی اور پھر میری بھی ان کی مہربانی سے ہو ہی گئی۔“

میرا اور مسز فاروقی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ صوفیہ بھی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بچی بے چاری بھی ندوس ہو گئی تھی۔

”بیٹا! آئی مذاق کر رہی ہیں۔ ان کی عادت ہے مذاق کرنے کی۔ میں بڑی ہوں ان سے۔ میری شادی بھی ان سے پورے پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ اس لیے میرے بچے بھی ان کے بچوں سے بڑے ہیں۔“

وہ لڑکی میری وضاحت سے مطمئن ہو گئی اور پھر مہوش کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”آئی..... آپ واقعی بڑی مزاحیہ ہیں۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ مہوش زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے ہوئے بولی تو میں پھر سے مسکرانے لگی۔ اب صوفیہ بھی ہم دونوں بہنوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☆.....

آج پارک میں مارٹنک واک کے لیے گئی تو خاور اپنا راؤنڈ مکمل کر کے بیچ پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور اپنا چکر لگانے لگی۔ چکر مکمل کر کے واپس آئی تو وہیں بیٹھا میرا منتظر تھا۔ میں بھی فاصلہ رکھ کے بیٹھ گئی۔

”کیسے ہیں؟“

”آپ کے سامنے ہوں۔“

”یہ کیا جواب ہوا؟“ میں مسکرائی۔

”میری دعوت کا کیا بنا۔ کہیں گول کرنے کا ارادہ تو نہیں۔“ وہ شک بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”بالکل نہیں جناب! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ بس پچھلے دنوں گھر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ اب

انشاء اللہ اس سنڈے کو ارادہ ہے سب کی دعوت کر ڈالوں۔“

”سب کی..... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اپنی فیملی اور مہوش کی فیملی کے علاوہ آپ کی۔“

”واہ جی واہ، اتنے بڑے ہجوم میں مجھے گھسیڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے منہ بنایا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

”ارے ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی تو بہر حال آپ ہی ہوں گے۔“

”ج.....“ وہ بے یقینی سے بولا۔

”بالکل سچ۔“

”تو پھر ٹھیک ہے میں سنڈے والے دن آ جاؤں گا۔ بس شرط یہ ہے کہ آپ نے سب لوگوں کے سامنے میرا

ہاتھ پکڑ کر میرا تعارف کروانا ہے اور کہنا ہے کہ یہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے اور اس پارٹی کا مہمان خصوصی ہے۔ کہیں گی نا! وہ

شرارت بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”کہہ تو دوں..... مگر مجھے آپ کی اور اپنی، دونوں کی زندگی عزیز ہے۔ چاہتی ہوں ابھی تھوڑا اور جی لوں۔“

”آپ نہیں جانتیں، آپ بہت سے لوگوں کے لیے جینے کی وجہ ہیں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلیں۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ایسی ذومعنی باتوں سے مجھے الجھن ہونے لگتی تھی۔

”چلیں۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

.....☆.....

اتوار والے دن ہمارے گھر خوب چہل پہل تھی۔ سبھی ہمارے پورشن میں جمع تھے۔ میں نے مہوش اور ماموں
ممائی وغیرہ کو ایک دن پہلے ہی انوائیٹ کر دیا تھا۔ خاور کو بھی دوبارہ کہہ دیا تھا کہ اتوار والے دن، رات کو ٹھیک آٹھ بجے آ
جانا۔

”مگر میں کس بہانے سے آؤں گا؟“ وہ فکر مند ہو گیا۔

”بس آ جانا۔ کہہ دینا کہ یہاں سے گذر رہا تھا سوچا چلتا چلوں۔“

”واہ، کیا بکواس آئیڈیا دیا ہے آپ نے۔ کبھی کبھی تو بالکل بچوں جیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔“ اس کی بات سن کر

میں لا جواب ہو گئی۔

”خیر میں کوئی بہانہ سوچ لوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

اور اب میں سوچ رہی تھی کہ اس نے کون سا بہانہ سوچا ہوگا۔ ساڑھے سات پونے آٹھ بجے تک کھانا تیار ہو گیا

تھا۔ مرد اور لڑکے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جبکہ عورتیں اور لڑکیاں لاونچ میں ڈائنگ ٹیبل پر کھانا کھاتیں۔ پورے آٹھ

بجے شاہ زیب اور زہیب کھانے کی ڈشیں ڈرائنگ روم میں لے جانے لگے۔

فاریرہ اور کرن لاونچ والی ٹیبل پر برتن رکھ رہی تھیں۔ شاہ زیب آخری ڈش یعنی کھیر والا ڈونگا لینے آیا تو مسکراتا ہوا

بولا۔

”لیجئے امی، ایک مہمان اور آگیا جو ہم دگمان میں بھی نہ تھا۔“

”کون آگیا ہے؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”خاور بھائی آئے ہیں۔ انہیں بھی زبردستی کھانے میں شامل کیا ہے۔“

”وہ کیسے آگئے اچانک؟“ میں نے پوچھا۔

”بس کہہ رہے تھے کہ گوجرانوالہ لیول پر کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ اگر آپ دونوں بھائیوں میں سے کسی نے حصہ

لینا ہے تو وہ ممبر بنوا سکتے ہیں۔“

”اچھا اچھا.....“ میں ہی دل میں خاور کی عقل کی داد دینے لگی۔

کھانے کے بعد آئس کریم کا دور چلا اور پھر اینڈ پر چائے کا، جو صرف بڑوں بزرگوں نے پی، بچوں نے پینے

سے انکار کر دیا۔

خاور کے جانے کے بعد سبھی مرد حضرات باہر آگئے اور پھر لاونچ میں خوب محفل جمی۔ رات بارہ بجے کے بعد یہ

محفل برخواست ہوئی اور سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔

☆.....

دوسرے دن میں سیر کے لیے نہ گئی۔ ویسے بھی اب میں پہلے جیسی باتقاعدگی سے نہیں جاتی تھی۔ خاور بھی اب بہت ناغہ کرنے لگا تھا۔ اس دوران اس کی بیوی صوفیہ بھی ہمارے گھر آئی تھی۔ جاتی دفعہ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی بہت تلقین کی۔ میں نے بھی آنے کا وعدہ کیا مگر وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ کہیں آجاسکوں۔

دو ماہ سکون سے گذر گئے۔ اس کے بعد جبار نے لکھنے پڑھنے کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ لگ تو یہی رہا تھا کہ زویب کے باغی رویے نے اسے محتاط کر دیا ہے۔ اب وہ میرے ساتھ بھی قدرے نرمی سے بات کرنے لگا تھا۔ میں اب اپنا دوسرا ناول تیزی سے مکمل کر رہی تھی۔ اب یہ ناول اختتامی مراحل میں داخل ہو گیا تھا۔ خاور سے اب میری بے تکلفی کافی بڑھ گئی تھی۔ اب میں اسے تم کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ مگر وہ اب بھی آپ جناب کہہ کر بلاتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ خاور کے روپ میں مجھے واقعی ایک سچا اور ہمدرد دوست مل گیا تھا۔ وہ ہر مشکل وقت میں مجھے مخلصانہ مشورہ دیتا اور جب کبھی جبار سے کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو میری ہمت بندھا تا اور دلجوئی کرتا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت ہمارے گھر میں بڑھتی جا رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے بچوں کے علاوہ جبار کے دل میں بھی کافی جگہ بنالی تھی۔ جبار جیسے آدم بے زار انسان کے دل میں جگہ بنانا واقعی قابل تحسین تھا۔ جس کا کوئی دوست نہ تھا۔ غفار بھی خاور کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا اور پیٹھ پیچھے بھی اس کو اچھے الفاظ میں یاد کرتا تھا جبکہ بچے تو اس کے دیوانے تھے۔

آج بھی میں اپنے بیڈروم میں بیٹھی ناول لکھ رہی تھی کہ خاور کی کال آگئی۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ شریفاں باہر کام کاج کر رہی تھی۔ خاور فون کرتے وقت یہ احتیاط کرتا تھا کہ اس وقت کال کرتا جب میں بھی تنہا ہوتی اور وہ بھی دفتر پہنچ چکا ہوتا۔ وہ اپنے گھر میں بیوی کے سامنے مجھے فون کرنے سے پرہیز ہی کرتا تھا۔ یہ احتیاط ہم دونوں کی ازدواجی زندگی کو بچانے کے لیے بہت ضروری تھی۔ اس کے علاوہ میں خاور سے بات کرنے کے بعد اس کا نمبر یا SMS ڈیلیٹ کر دیتی تھی۔ حالانکہ ہم نے کبھی کوئی غیر اخلاقی میسج نہیں بھیجا تھا ایک دوسرے کو اور نہ کبھی اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات آپس میں کی تھی۔ ہماری دوستی بالکل شفاف اور پاکیزہ تھی۔ اب تو مجھے خاور کے ساتھ اس قدر انسیت ہو گئی تھی کہ اس سے بات کیے بنا میرا ایک دن بھی نہ گزرتا تھا۔ میں اس کے ساتھ فون پر گھنٹوں ہر ٹاپک پر بات کرتی۔ کبھی مذہب کے موضوع پر تو کبھی تاریخ کے موضوع..... کبھی محبت ہمارا موضوع ہوتی تو کبھی انسانی نفسیات پر بحث کرتے۔ خاور اعلیٰ ادبی ذوق کا مالک تھا۔ ہر بات پر ہر موقع پر وہ کوئی نہ کوئی شعر سنا دیتا۔ اس کا حافظہ غضب کا تھا۔ اب بھی اسی کی کال آرہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا۔

”ہیلو خاور کیسے ہو؟“

”فٹ اینڈ فائن اور آپ؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“

”کیا کر رہی تھیں؟“

”ناول لکھ رہی تھی۔“

”اوہ ہاں، میں نے بھی یہی بات کرنی تھی کہ یہ ناول جلد از جلد مکمل کر کے اسی ایڈریس پر بھیج دیں۔ میں نے فون پر اس سے بات کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پہلے ناول کو مارکیٹ میں آئے ہوئے دوڑھائی ماہ ہو گئے ہیں۔ اب دوسرا ناول بھیج دیں تاکہ اس پر کام شروع کیا جاسکے۔“

”بس اختتامی مراحل میں ہے۔ ایک ہفتے تک مکمل کر کے بھیج دوں گی۔ کوئی اور بات.....“

”اب آپ کے شو ہر نامدار کا رویہ کیسا ہے آپ کے ساتھ؟“

”بس گزارہ ہو رہا ہے۔ جہاں اتنی کٹ گئی ہے باقی بھی کٹ ہی جائے گی۔“ میں افسردگی سے بولی۔

”یہی حال میرا ہے۔ گھر جاتا ہوں تو بیوی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ کئی دفعہ تو دل ہی نہیں چاہتا گھر جانے کو۔“

”تو پھر دل کہاں جانے کو چاہتا ہے؟“ میں شرارت سے بولی۔

”آپ کے ہاں جانے کو۔“ وہ برجستہ بولا تو میں ہنستی چلی گئی۔

”ایک بات پوچھوں۔“ وہ بولا۔

”جی پوچھئے۔“

”کیا ایک عورت اور مرد کے درمیان دوستی کا رشتہ ہو سکتا ہے؟“

اس کا سوال سن کر میں گڑبڑا گئی۔

”ہاں ہو سکتا ہے، کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندہ مثال ہم دونوں ہیں۔ اور ہم دونوں کی دوستی بھی مثالی ہے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ ہم دونوں کے درمیان صرف دوستی کا رشتہ ہے اور کچھ نہیں۔“

”بالکل یقین ہے، یہ صرف دوستی ہے اور کچھ نہیں۔“ میں بڑے وثوق سے بولی۔

”مگر مجھے یقین نہیں ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”اوکے..... اللہ حافظ۔“

”کیا کوئی آگیا ہے؟“

”نہیں، آیا تو کوئی نہیں، بس مجھے اپنا ناول مکمل کرنا ہے۔“

”اوکے..... اللہ حافظ۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں موبائل ہاتھ میں پکڑے سوچنے لگی۔

یہ خاور آج کیسی باتیں کر رہا ہے۔ اس کے بعد مجھ سے کچھ بھی لکھا نہ گیا۔ شام تک اس کی کبھی ہوئی باتیں میرے دماغ میں چکراتی رہیں۔ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو پھر وہی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔

کیا آپ کو یقین ہے کہ ہم دونوں کے درمیان صرف دوستی کا رشتہ ہے اور کچھ نہیں..... میں سر جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆.....

ایک ہفتے کے اندر اندر میں نے اپنا دوسرا ناول پوسٹ کر دیا۔ اس کے چھپ کر آنے سے پہلے میں نے حفظ ما

تقدم کے طور پر ماموں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن میں صبح دس ساڑھے دس مہوش کے ہاں گئی، ماموں سے بات کرنے کے لیے۔ وہ لوگ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔ مہوش برتن سمیٹ رہی تھی۔

ماموں مجھے دیکھ کر بولے۔ ”آؤ آؤ نورین بیٹا، یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔“
میں ماموں کے پاس جا بیٹھی۔ غفار پاس بیٹھا جرابیں بوٹ پہن رہا تھا۔
”ممائی نظر نہیں آرہیں۔ کہیں گئی ہیں کیا؟“ میں نے ارد گرد نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔
”ہاں، وہ ذرا درزن کے ہاں گئی ہے۔“ ماموں نے جواب دیا۔

”اوہ اچھا..... غفار بھائی آپ کو ناول کیسا لگا؟“

میں اب بھی غفار کو سب کے سامنے غفار بھائی ہی کہتی تھی۔
”ایکسیلنٹ..... بہت اچھا لکھا ہے۔“ اس نے کھلے دل سے تعریف کر ڈالی۔ ”کردار نگاری بہت کمال کی کرتی ہو۔ تمہارے ناول کے کردار بہت حقیقی ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے نظروں کے سامنے چل پھر رہے ہوں، ویلڈن۔“

”بہت شکریہ۔“ میں سر سے پاؤں تک سرشار ہو گئی۔

”ماموں! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

”ہاں ہاں، کہو بیٹا۔ کیا بات کرنی ہے؟“ ماموں بڑی محبت سے بولے۔

”ماموں..... آپ جانتے ہی ہیں کہ جبار ہمیشہ سے میرے پڑھنے اور لکھنے کے خلاف ہیں۔ میں ان سے چھپ کر چوری چوری لکھتی ہوں۔“

”ہاں بیٹا، جانتا ہوں اور اس بات پر نادم بھی ہوں۔ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اتنے تنگ ذہن اور جاہلانہ سوچ کا مالک ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔“ ماموں تاسف سے سر ہلا رہے تھے۔

”ماموں! میں نے دوسرا ناول چھپنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جب میرا یہ ناول آئے تو جبار پہلے کی طرح کوئی ہنگامہ نہ کرے اور آپ انہیں سمجھائیں کہ میرے لکھنے پر پابندی نہ لگائیں۔“

”میرے سمجھانے سے وہ سمجھ جائے گا۔“ ماموں بے یقینی سے بولے۔ ”وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ وہی کرتا ہے جو اس کے دماغ میں چلتا ہے۔ کسی کی نہیں سنتا۔“

”ماموں اگر آپ دل سے کوشش کریں گے تو وہ ضرور مان جائیں گے۔“

”اچھا بیٹی، اگر تم کہتی ہو تو یہ کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ آگے جو اللہ کو منظور۔“

”شکریہ ماموں جان۔“ میں خوش ہو گئی۔ ”تو پھر ماموں کب بات کریں گے اُن سے۔“

”آج رات کو ہی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ ماموں مسکرا کر بولے تو میں جھوم اٹھی۔

”مجھے تو جبار بھائی کی سمجھ نہیں آتی کہ آخر انہیں اس بات پر کیا اعتراض ہے۔ انہیں تو خوش ہونا چاہیے اور نورین

کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔“ غفار بھی منہ ہناتے ہوئے بولا۔

”اس کی آج تک کسی بات کی سمجھ آئی ہے جو اب آئے گی۔ ایک دم اُلٹے دماغ کا ہے۔“ ماموں نے بھی

دل کی بھڑاس نکالی۔

.....☆.....

اور پھر اسی رات ماموں ہمارے گھر آ گئے۔ ہم کھانے سے فارغ ہو کر ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ ماموں آ گئے۔ میں نے ماموں کو دیکھ کر ٹی وی کی آواز کم کر دی۔ ماموں آ کر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بچوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر مطلب کی بات پر آ گئے۔

”جبار میاں، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ ماموں نے جبار کو مخاطب کیا تو وہ بھی حیران ہوا۔

”جی اباجی، کہیے۔“

”جبار میاں، بات یہ ہے کہ تم نورین بیٹی کو پڑھنے اور لکھنے سے کبھی منع نہیں کرو گے۔“

جبار کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”یہ بات یقیناً اس نے آپ سے کی ہوگی۔“ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

”کسی نے بھی کی ہو تم اسے منع نہیں کرو گے۔ اس کا شوق ہے۔ تمہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟“

”اباجی، اس کی توجہ گھر پر نہیں رہتی۔ بٹ جاتی ہے۔ پھر یہ اپنی پڑھنے اور لکھنے والی دنیا میں مگن ہو جاتی ہے۔“

”ماموں جان یہ سراسر الزام ہے مجھ پر۔ میں گھر پر اور بچوں پر پوری توجہ دیتی ہوں۔ بے شک بچوں سے پوچھ

لیں۔ آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔“ بچے بڑے غور سے یہ تمام کارروائی دیکھ رہے تھے۔

”جبار تم نورین پر کوئی بے جا پابندی نہیں لگاؤ گے۔ یہ میرا حکم ہے۔ اسے اپنا شوق پورا کرنے دو۔ یہ کوئی برا

Pakistanipoint

Waqar

شوق نہیں ہے۔“

جبار خاموش رہا تو ماموں نے پھر پوچھا۔

”جواب دو مجھے۔“

”ٹھیک ہے اباجی، جیسا آپ کہتے ہیں مگر میرے گھر پر اس کا شوق اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔“

”نہیں ہوگا۔“ ماموں بڑے یقین سے بولے۔ ”نورین بیٹی بڑی سمجھدار ہے۔ ہے نا نورین!“

”بالکل ماموں میں اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کروں گی۔“ میں بہت خوش تھی۔ اتنی خوش کہ جیسے ہفت

اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

ماموں جانے کے لیے اٹھے تو میں بولی۔ ”ماموں بیٹھیں پلیز، میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

ماموں ہنستے ہوئے پھر سے بیٹھ گئے۔ وہ بچوں سے گپ شپ لگانے لگے۔ بچے بھی بہت خوش تھے۔ جبار اٹھ کر

باہر چلا گیا۔ میں ماموں کے لیے چائے لے کر آئی تو وہ بچوں کے ساتھ کسی بات پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ ماموں چائے پیتے

رہے اور زوہیب، دادا کو دلچسپ قصے سناتا رہا۔ ماموں چائے پی کر اٹھے تو میں بھی کھڑی ہو گئی۔

”ماموں، میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔“ میری آنکھیں بھرا آئیں۔

ماموں نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور شفقت سے میرا سر تھپتانے لگے۔

.....☆.....

خاور ٹھیک کہتا تھا اگر جذبہ سچا ہو تو ہر رکاوٹ خود بخود دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ میری بھی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ اب میں لکھنے کے لیے آزاد تھی۔

انہی دنوں شاہ زیب نے ایم اے کر لیا تھا۔ اب وہ فارغ تھا۔ بلال بھائی کئی مرتبہ اشاروں کنایوں میں اپنی بیڑا زریں اور شاہ زیب کے رشتے کی بات کر چکے تھے۔ مجھے بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ زریں باپ کی طرز خوبصورت اور ماں کی طرح صابر تھی اور ایک لڑکی کے لیے یہ دو خوبیاں بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایک دن بلال بھائی آئے تو انہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اب بچوں کی منگنی کر دینی چاہیے۔ شادی شاہ زیب کی نوکری لگنے کے بعد کریں گے۔

میں نے جبار سے اور ماموں، ممانی سے مشورہ کیا۔ سب نے بخوشی اجازت دے دی۔ پھر شاہ زیب سے اس کی مرضی پوچھی تو اس نے بھی شرماتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ شاہ زیب دل ہی دل میں زریں کو پسند کرتا ہے۔

پھر بلال بھائی کے ساتھ بیٹھ کر طے یہ کیا گیا کہ منگنی کی یہ مشترکہ تقریب ہمارے وسیع و عریض لان میں کی جائے۔ لڑکی اور لڑکے دونوں کو اکٹھا بیٹھا کر انگوٹھیاں پہنا دی جائیں۔ منگنی کے لیے ایک ہفتے بعد کا دن منتخب کیا گیا۔ منگنی کی تقریب میں صرف چند قریبی عزیزوں کو انوائٹ کیا گیا۔

خاور نے فون پر منگنی کی مبارک باد دے دی۔ منگنی والی شام ہم سب لوگ ایسے تیار ہوئے جیسے کوئی شادی ہو رہی ہو۔ ہر کوئی بہت خوش تھا کیونکہ یہ ہمارے گھر میں پہلی خوشی تھی۔ ماموں اور ممانی کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ہواؤں میں اڑتے پھرتے تھے۔ شاہ زیب تیار ہو کر کمرے سے باہر آیا تو دادا، دادی نے ڈھیروں پیار کیا۔ آج تو جبار کا چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ شاہ زیب میروں کرتے اور بلیک شلوار میں بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

پھر بلال بھائی اور صائمہ بھابی دیگر بچوں کے ساتھ زریں کو بھی لے آئے۔ زریں بھی یہاں آ کر تیار ہوئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے خریدی ہوا پنک کا مدار جوڑا اسے پہننے کے لیے دیا اور اس کے ساتھ سونے کا بھاری بھر کم جڑاؤ سیٹ اسے پہنایا۔ اس نے ہلکا پھلکا میک اپ بھی خود ہی کر لیا۔ زریں بہت حسین دکھائی دے رہی تھی۔

پھر شاہ زیب اور زریں کو لان میں بنائے گئے اسٹیج پر جا کر بٹھا دیا گیا۔ سب رشتہ داروں نے دلہا دلہن کو سلامی دی، پھر شاہ زیب نے زریں کو اور زریں نے شاہ زیب کو انگوٹھی پہنائی۔ اس کے بعد مہمانوں کو پر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ کھانے کا اور لان کی آرائش کا سارا انتظام غفار کے ہاتھ میں تھا اور اس نے خوب پیسا خرچ کیا تھا۔ بلال بھائی اور صائمہ بھابی بھی اس نئے رشتے سے بہت خوش تھے۔ بلال بھائی اب صرف میرے بھائی نہیں تھے بلکہ سمندھی بھی بن چکے تھے۔ منگنی کی تقریب ختم ہونے کے بعد بھی تقریباً ساری رات ہنگامہ برپا رہا۔ دیگر مہمان تو چلے گئے مگر بلال بھائی اور ان کی فیملی ساری رات ادھر ہی رہے۔ لڑکیوں نے پوری رات ڈھولک بجا کر گیت گائے اور بڑوں نے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر کے اور چائے پیتے ہوئے رات بتائی۔



رات کے تین بجے بلال بھائی اپنے بیوی بچوں کو لے کر چلے گئے تو ہم سب نے بھی اپنے اپنے

کمرؤں کی راہ لی۔

رات دیر سے سوئے تو دوسرے دن ایک دو بجے تک سوتے رہے۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے سب بے فکری کی

نیند سو رہے تھے۔

☆.....

مگنی کو گزرے دو دن ہوئے تو صوفیہ آگئی، مگنی کی مبارک دیئے گئی۔

”باجی، بیٹے کی مگنی کی بہت بہت مبارک قبول کریں۔“

”بہت شکریہ صوفیہ، خیر مبارک۔ تم کیسی ہو؟ بچے کیسے ہیں؟“

”سب خیریت ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ آپ سنائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”الحمد للہ، میں بھی بالکل خیریت سے ہوں۔“

وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ میں نے شریفاں کو آواز دی۔

”شریفاں..... صوفیہ کے لیے چائے اور مٹھائی لاؤ۔“

”نہیں باجی، ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔“

”بیٹے کی مگنی کی ہے منہ تو میٹھا کروانا چاہیے نا۔ تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔ شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا تو نہیں

ہوتا۔“

”لڑائی جھگڑا کس گھر میں نہیں ہوتا۔“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ہمارا بھی کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔“

”کیا خاں گرم مزاج کا ہے؟“ میں نے کریدا۔

”بہت گرم مزاج ہے باجی..... آپ کو کیا بتاؤں۔ کبھی کبھی تو جب غصہ آتا ہے تو گھر کے برتن اور چیزیں تک توڑ

دیتا ہے۔“

”اچھا.....“ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”تو اور کیا باجی..... یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ ایسے کریک آدمی کے ساتھ زندگی گزار دی۔“ وہ دنیا بھر کی مظلومیت

چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔

”کریک کیسے ہے، وہ تو اچھا بھلا سلجھا ہوا انسان دکھائی دیتا ہے۔ کہیں سے بھی کریک معلوم نہیں ہوتا۔“

”باجی جس کے ساتھ کوئی واسطہ پڑتا ہے، اسی کو پتا چلتا ہے کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ وہ بات نہیں سنی آپ نے کہ

دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔“

”میرے سامنے تو بڑا مہذب بنتا ہے۔ میرے بچے بھی اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔“

”آپ کے سامنے تو اس لیے مہذب بنتا ہے کیونکہ آپ خود بڑی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی ہیں اور اب تو آپ

کتابیں لکھنے لگی ہیں۔ باجی آپ پرتو پورے محلے کو ناز ہے۔“ وہ بڑے جوش سے بولی۔

اتنے میں شریفاں دو کپ چائے اور ایک پلیٹ میں مٹھائی لے آئی۔ ایک کپ میں نے اٹھا لیا اور دوسرا صوفیہ

نے۔ صوفیہ نے گلاب جامن منہ میں ڈالتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”سچ پوچھیں تو باجی..... خاور آپ کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے نورین باجی بالکل میری بہنوں کی طرح ہے۔“

اس کی بات سن کر کپ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے پچا۔ میں نے کپ میز پر رکھا اور کھانسی کرنے لگی۔
تو موصوف میری غیر موجودگی میں ان الفاظ میں مجھے یاد کرتے ہیں۔
صوفیہ تھوڑی دیر اور بیٹھی اور چلی گئی۔



دوسرے دن گیارہ بجے خاور کی کال آئی تو میں نے کہہ دیا کہ کل آپ کی بیگم آئی تھیں۔ آپ کی بڑی تعریف کر رہی تھیں۔

”یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ میری تعریف کرے۔ زہرہ ہی اگل کر گئی ہوگی میرے خلاف۔“ وہ ہنس کر بولا۔
”یہ بھی کہہ رہی تھی کہ آپ میرے بہت بڑے مداح ہیں اور ہر وقت میری تعریفوں کے پل باندھتے رہتے ہیں۔“

”ہاں تو اچھی بات ہے نا۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“ وہ اٹھلا کر بولا۔
”وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ آپ کہتے ہیں کہ نورین باجی میری بہنوں کی طرح ہے۔“ میں آہستہ آہستہ اس کے گرد اپنا گھیرائیگ کر رہی تھی اور من ہی من میں لطف لے رہی تھی۔

”تو اور اسے کیا کہتا..... کہ آپ میری محبوبہ ہیں۔“ اس نے اس قدر تیزی اور برجستگی سے جواب دیا کہ میں دنگ رہ گئی۔

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔ بولتے وقت کچھ تو سوچ لیا کریں۔“ میں جزبہ ہو کر بولی۔
”وہ بڑی شکی مزاج اور تنگ ذہن کی عورت ہے۔ ہر اس عورت پر شک کرنے لگتی ہے جو میرے ساتھ دو باتیں کر لے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ وہ کبھی آپ کے اور میرے رشتے کو شک کی نگاہ سے دیکھے۔“

میں خاموش رہی تو وہ پھر بولا۔ ”نورین! آج میں آپ کے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ بڑے دنوں سے یہ بات کہنا چاہ رہا تھا مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سوچتا ہوں آپ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ آپ وعدہ کریں ناراض نہیں ہوں گی۔“

اس کی بات سن کر میرا دل انجانے دوسوں سے دھڑک اٹھا۔ وہ جتنی تمہید باندھ رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

”یہ تو میں آپ کی بات سن کر ہی بتا سکوں گی کہ ناراض ہونا ہے یا نہیں۔ ویسے اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ میں آپ کی کسی بات سے ناراض ہوں گی۔“

”کیا واقعی؟“ وہ خوش ہو گیا۔

”بالکل۔“ میں نے بھی خوشدلی سے جواب دیا۔

”نورین..... بات یہ ہے کہ..... میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں..... کیسے اور کب سے..... یہ میں بھی نہیں

جانتا۔ شاید صدیوں سے، شاید برسوں سے اور شاید تب سے جب پہلی بار آپ سے ملا تھا۔ میں جانتا ہوں آپ مجھے لعن طعن کریں گی۔ مجھ پر غصہ کریں گی۔ مگر یقین جائے میں بالکل بے بس ہو گیا ہوں۔ خود کو بہت سمجھایا، شرم دلائی مگر دل ہے کہ مانتا نہیں۔ میں پور پور آپ کی محبت میں ڈوب چکا ہوں۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔“ آخر پر اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ رو رہا ہے۔

میرا دل بھی دکھ سے بھر گیا۔

”خادر..... میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں۔ تمہارے اس بے لوث جذبے کو سلام کرتی ہوں۔ مگر خادر..... میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی۔ ہم دونوں کو خود پر قابو رکھنا ہوگا۔ ہم دونوں اس پزیرش میں نہیں ہیں کہ ایک دوسرے سے محبت کر سکیں۔ تم نے ایک دفعہ مجھ سے سوال کیا تھا کہ کیا ایک مرد اور عورت میں دوستی ہو سکتی ہے تو میں نے آگے سے جواب دیا تھا کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ ہماری دوستی اس کی زندہ مثال ہے..... مگر خادر..... آج میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ ایک مرد اور عورت میں دوستی صرف دوستی کی حد تک نہیں رہتی۔ بلکہ یہ رشتہ بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ مرد اور عورت کے درمیان جو انٹرکشن اللہ نے پیدا کی ہے وہ ہم باوجود کوشش کے ختم نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہمارے مذہب نے عورت اور مرد کے آزادانہ میل جول پر پابندی رکھی ہے اور ہمارے مذہب میں عورت اور مرد کی دوستی کی کوئی گنجائش نہیں۔“ میں چپ ہوئی تو دونوں طرف تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ بولا۔

”مگر نورین یہ جذبہ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور پیدا ہوتے وقت ذات پات اور عمروں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔“

”بہر حال ہمیں اپنے جذبات کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھنا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اس عمر میں کسی اسکینڈل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً ایک عورت کی عزت تو بالکل ایک نازک آئینے کی طرح ہوتی ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔“ میں سنجیدگی سے بولی تو وہ بھی سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”نورین..... آپ کے سر کی قسم..... میرے لیے دنیا کی سب سے قیمتی چیز آپ کی عزت ہے۔ میں مرتے دم تک اس کی حفاظت کروں گا۔ میں اپنی جان دے دوں گا مگر میرے لبوں پر کبھی آپ کا نام نہ آئے گا۔ یہ راز میرے ساتھ میری قبر میں جائے گا۔“

”جانتی ہوں خادر..... مجھے تم پر بھروسہ ہے..... اپنی ذات سے بھی زیادہ اعتماد تم پر کرتی ہوں۔“

”میں سوچتا تھا کہ محبت زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے..... مگر نہیں وقت نے بتا دیا ہے کہ یہ مرض دوبارہ بھی حملہ کر سکتا ہے۔ دل کا یہ مکان کم بخت خالی ہی نہیں رہتا۔“ وہ ہنسا تو میں بھی ہنسنے لگی۔

☆.....

انہی دنوں شاہ زیب کو بینک منیجر کی نوکری مل گئی۔ سارے محلے میں، میں نے مٹھائی بانٹی۔ جہاں اس خبر سے سب خوش تھے وہیں ایک اداس کرنے والا واقعہ بھی رونما ہو گیا۔ ماموں کو ہارٹ ایک ہو گیا وہ پورا ایک ہفتہ اسپتال میں رہے اور پھر گھر آ گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ انہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کریں اور ہر قسم کی ٹینشن سے دور رکھیں۔

ایک دن پارک میں، میں نے خادر سے پوچھ ہی لیا۔

”خاور! میرا ناول کب آئے گا؟“

”آجائے گا، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے اسے بھیجے ہوئے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ایک ماہ کے بعد آجائے گا۔“

”میں نے دو ماہ کا کہا ہوگا۔ آپ کو سننے میں غلطی لگی ہوگی۔“ وہ بات پراڑا رہا۔

”چلو ٹھیک ہے، تو پھر دو ماہ تک آجائے گا نا!“

”بالکل، ضرور آجائے گا۔“ وہ مسکرایا۔ ”جب آپ کا دوسرا ناول آئے گا تو مجھے کیا ملے گا۔“

”ہوں..... جو آپ مانگیں گے۔“

”سوچ لیں۔“

”کہیں بعد میں ٹکرتو نہ جائیں گی۔“

”پہلے کبھی ٹکری ہوں جو اب ٹکروں گی۔“

”پہلے والی فرمائش میں اور اس دفعہ کی فرمائش میں بہت فرق ہو سکتا ہے۔“

”کہہ تو دیا ہے کہ آپ کی ہر فرمائش پوری کروں گی۔“

”اوکے..... یہ بتائیں کہ تیسرا ناول کہاں تک پہنچا ہے؟“

”تیسرے کے چار سو صفحات لکھ لیے ہیں۔“

”شاباش..... بہت اچھا جا رہی ہیں۔ میرا آئندہ بادر ہا تو بہت ترقی کرے گی۔ اچھا یہ بتائیں مذہب کے بارے

میں کیا خیال ہے؟ میرا مطلب ہے کتنی مذہبی ہیں؟“

”نماز باقاعدگی سے نہیں پڑھتی اس بات کا افسوس ہوتا ہے۔ باقی میری نظر میں سب سے بڑا مذہب انسانیت

کی خدمت ہے اور دنیا میں سب سے مضبوط رشتہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہے۔“

”ویلڈن..... بہت خوب..... میں مان گیا کہ آپ صرف ایک رائٹر نہیں بلکہ ایک دانشور اور مفکر بھی ہیں۔“ اس

نے ہلکے ہاتھ سے تالی بجائی۔

”ارے ارے..... کیا کر رہے ہیں..... آپ..... کوئی دیکھ کر کیا سوچے گا۔“ میں نے ارد گرد نظریں دوڑاتے

ہوئے کہا۔

”یہاں دیکھنے اور سوچنے والا ہے ہی کون۔ ابھی اس علاقے کے مکینوں میں صبح کی سیر کرنے کا شعور اجاگر نہیں

ہوا۔ بس یہ دو تین بڑے میاں اور اتنی ہی بڑی بی آ جاتی ہیں۔ یہ لوگ بھی سیر کم اور باتیں زیادہ کرتے ہیں۔“

”ان بڑے میاؤں میں ایک میاں آپ بھی ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جی بالکل، میں نے ان لوگوں میں آپ کو اور اپنے آپ کو شامل کیا تھا۔ ہم بھی تو اب بزرگوں کی لسٹ میں

شامل ہیں۔“

”تو چلیں مسٹر بزرگ، اب گھر چلیں۔“ میں نے چھیڑا۔

”چلے جائیں گے..... اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”ویسے بائی داوے..... ابھی تو ہم نے بچوں کی شادیاں بھی نہیں کیں اور ہم ابھی سے بزرگ ہو گئے۔“

”آپ کریں اپنے بچوں کی شادیاں..... میں نے شادیاں کرنے تک یہاں تھوڑی رہنا ہے۔“

”آپ نے کہاں جانا ہے؟“ میں بڑی حیران ہوئی۔

”بتاؤں آپ کو.....“

”بتائیں نا!“ میں نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

”یہ دلشاد کالونی کی جو مین سڑک ہے نا۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”ہاں ہے۔“ میں نے ہنکارا بھرا۔

”اس کے ساتھ ساتھ سیدھے چلتے جائیں، پھر دائیں مڑ جائیں۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں۔

سب سے اینڈ پر ایک چار دیواری والا احاطہ آئے گا۔ اس کو بڑا سا گیٹ بھی لگا ہوا ہے۔ بس اسی احاطے کے اندر رہائش اختیار کروں گا۔“

”اچھا اچھا۔“ میں ہونفوں کی طرح اثبات میں سر ہلانے لگی، پھر میں کچھ سوچ کر چلائی۔ ”مگر وہ تو

قبرستان ہے۔“

”ہاں، تو آخری آرام گاہ تو وہی ہوگی نامیری۔“ وہ مجھے بے وقوف بنا کر اب ہنس رہا تھا اور میں غصے سے

پتھ و تاب کھا رہی تھی۔

”خادو! ویسے مذاق کا بھی کوئی معیار ہوتا ہے۔“

”موت سے لوگ خواہ مخواہ ڈرتے ہیں، حالانکہ تکلیف تو زندگی دیتی ہے۔“ اس نے یہ کہہ کر پھر قہقہہ لگایا۔

”میں جارہی ہوں۔“ میں کھڑی ہو گئی تو اس نے یہ شعر پڑھ ڈالا۔

وقت مجھ پر دو کٹھن گذرے ہیں ساری عمر میں

اک تیرے آنے سے پہلے اک تیرے جانے کے بعد

.....☆.....

گھر جا کر روزمرہ کے کام نہنائے۔ گیارہ بجے خادو کا میسج آ گیا۔ پڑھا تو یہ شعر لکھے ہوئے تھے۔

ظاہراً موت ہے قصاً ہے عشق

ہر حقیقت میں جاں فزا ہے عشق

پوچھتے کیا ہیں بوالہوس سے وہ

مجھ سے پوچھے کوئی کہ کیا ہے عشق

تا دم مرگ ساتھ دیتا ہے

ایک محبوب با وفا ہے عشق

میں نے یہ اشعار پڑھ کر ڈیلیٹ کر دیئے اور مسکرا کر نئی وی دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ مگر ذہن میں اس کے لکھے

ہوئے اشعار چکرارے تھے۔ کتنا باذوق اور نفیس انسان ہے۔ اتنے میں بلال بھائی اور صائمہ بھابی آگئے۔ صائمہ کے ہاتھ

میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

”مبارک ہونورین۔“ صائمہ میرے گلے لگتے ہوئے بولی۔

”خیر مبارک۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ لوگوں کو بھی بہت مبارک ہو۔“

”بھئی ہمیں تو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ شاہ زیب بیٹا خیر سے نوکری پر لگ گیا ہے۔“ بلال بھائی جوش

سے بولے۔

”خوشی تو ہونی تھی۔ اب صرف بھانجا نہیں رہا، داماد جو بن گیا ہے۔“ میں نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں بچی..... ایسی کوئی بات نہیں۔ داماد نہ بھی ہوتا..... صرف بھانجا ہی ہوتا تو بھی اتنی ہی خوشی ہوتی۔“

بلال بھائی ہنستے ہوئے بولے۔

”بچوں کو بھی ساتھ لے آتے۔ اکیلے ہی چلے آئے ہیں۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”بچوں کے امتحانات ہو رہے ہیں۔ انہیں فرصت ہی کب ہے کہیں آنے جانے کی۔“ صائمہ نے جواب دیا۔

”نورین! بیٹے کے سر پر سہرا باندھنے کی تیاری کرو۔ دو ماہ تک زریں بی اے کے امتحانات سے فارغ ہو جائے

گی۔ اس کے بعد چار ماہ موسم گرما کے گزار کر اکتوبر میں شادی کر لیں گے۔“ بلال بھائی نے پوری پلاننگ کر لی تھی۔

”مگر بلال بھائی، بچے ابھی کم عمر ہیں۔ ایک دو سال اور گزر جاتے تو اچھا ہوتا۔“

”کم عمری کی شادیاں زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔“ بلال بھائی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا۔

”جلس ٹھیک ہے۔ میں جبار سے بات کروں گی۔ اگر وہ مان گئے تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہے۔“

”نزدک خیر سے اب برسرِ روزگار ہے۔ آپ لوگوں کو کس بات کی ٹینشن ہے۔“ بلال بھائی مونچھوں کو بل دیتے

ہوئے بولے تو میں خاموش رہی۔ بلال بھائی نے اپنی بات ہر حال میں منوانے کی ضد ابھی تک نہ چھوڑی تھی۔ میں نے

چائے کے ساتھ دیگر لوازمات منگوائے۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر صائمہ سے بولے۔

”چلو تھوڑی دیر مہوش کے ہاں بھی چلنا ہے۔“

”آپ چلیں، میں آرہی ہوں۔“ صائمہ نے یہ جواب دیا تو بلال بھائی اسے گھورتے ہوئے مہوش کے ہاں چلے

گئے۔

”اور سناؤ صائمہ، بلال بھائی کچھ سدھرے یا ویسے ہی ہیں۔“ میں نے صائمہ کے قریب ہوتے ہوئے

راز داری سے پوچھا۔

”وہ گڑے ہی کب ہیں، جواب سدھریں گے۔“ وہ زہر خند سے مسکرائی۔

”میرا مطلب ہے، جس عورت کے ساتھ ان کا فیئر چل رہا تھا اس کو چھوڑ دیا ہے کیا؟“

”ان کا کسی ایک عورت کے ساتھ فیئر ہوگا تو چھوڑیں گے نا۔ ان کی زندگی میں عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔

تمہارا کیا خیال ہے وہ صرف مجھ پر ہی قاعدت کر کے زندگی گزار دیتے۔ ان جیسے خاندانی مردوں کو صرف ایک عورت

خاندانی چاہیے۔ جو ان کے لیے اولاد پیدا کرنے کا فریضہ انجام دے اور پھر اس اولاد کو اچھی تربیت کر کے پروان چڑھا

دے۔ وہ فرض میں نے بھی ادا کر دیا ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ شاہ زیب اور دوسرے بچوں کو میری طرف سے بہت

پیاد دینا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ جاتے ہوئے میرے گلے لگی تو میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

☆.....

اگلے دن سیر کرنے گئی تو خاور آج نہ آیا تھا۔ مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہ اب اکثر ناغے کرنے لگا تھا۔ اس نے سارا دن نہ تو فون کیا اور نہ میٹج۔ دوسرے دن بھی وہ غیر حاضر تھا۔ میں نے گھر جا کر اسے فون کیا تو اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اب مجھے تشویش ہوئی۔ شام تک میں نے کئی مرتبہ ٹرائی کیا مگر ہر دفعہ اس کا نمبر بند تھا۔ تیسرے دن وہ پارک میں نظر آ گیا۔

”کہاں تھے آپ؟“ میں بے تابی سے اس کی طرف بڑھی۔

”ریلیکس، اتنی بے قراری اچھی نہیں ہوتی۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا اور میں جھینپ گئی۔

پھر ہم پنج پر بیٹھ گئے۔ میں نے پہلی مرتبہ خاور کو غور سے دیکھا تو پتا چلا وہ بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا اور رنگ بھی پیلا زرد ہو رہا تھا۔

”خاور! آپ ٹھیک تو ہیں نا!“ میں بے چین ہو گئی۔

”لو بھلا، مجھے کیا ہونا ہے۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

”پھر دو دن سے کہاں تھے؟ فون بھی بند کیا ہوا تھا۔“

”بس ذرا طبیعت نا ساز تھی۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”کیا ہوا تھا طبیعت کو؟“

”کچھ خاص نہیں۔ چھوڑیں اس بات کو۔ آپ سنائیں دو دن کیسے گزرے۔ شاد زیب جا رہا ہے دفتر؟“ اس

نے بات بدلی۔

”ہاں، جا رہا ہے۔“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اور جبار صاحب کیسے ہیں۔ اب تو لڑائی جھگڑا نہیں کرتے نا۔“

”وہ بھی ٹھیک ہیں اور لڑائی جھگڑا نہ کریں، یہ ہو نہیں سکتا۔“

”آپ کی کتاب دس بارہ دنوں کے اندر اندر آ جائے گی۔“

”واقعی.....“ میں سب کچھ بھول کر خوش سے بولی۔

”بالکل۔“ مجھے خوش دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ”نورین! ایک بات کہوں۔“

”جی کہیں۔“

”آپ کو خوش دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ آپ کو پتا ہے اب میں آپ سے عشق کرنے لگا ہوں۔“

”ارے..... آپ تو ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ محبت کی راہوں سے گذر کر عشق کی منزل تک جا پہنچے۔“ میں

ہنستے ہوئے بولی۔

”آپ کو پتا ہے جب محبت میں احترام بھی شامل ہو جائے تو وہ عشق بن جاتی ہے۔ چونکہ میں آپ کا دل سے

احترام کرتا ہوں اس لیے آپ کا عاشق بن گیا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تو میں بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”خاور پلیرز، اتنا سیریس مت ہوں۔ ایسے تعلقات تمام عمر نہیں چلتے۔ کبھی نہ کبھی تو ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑے گا، تب بہت زیادہ تکلیف ہوگی۔“

”میں آپ سے پھڑک کر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ یہ بات طے ہے۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔

”ایسی جذباتی باتیں مت کریں۔ ہم کوئی ٹین ایج کے لڑکا لڑکی نہیں۔ دو میچورڈ اور باشعور انسان ہیں۔ میرا

خیال ہے کہ اب ہمیں خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے قطع تعلق کر دینا چاہیے۔“

”ایسا مت کہو نورین۔“ وہ ٹپ اٹھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر میں حیران ہو رہی تھی۔

”یہی ہمارے حق میں بہتر ہے خاور۔ ہم جن راہوں پر چل پڑے ہیں وہاں ذلت اور رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں

ملنے والا اور ہم اس عمر میں ان چیزوں کو نافرو نہیں کر سکتے۔“

”نورین، میں اپنی باقی زندگی آپ کے قدموں میں بیٹھ کر گزار دینا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے

صرف مجھ سے دو گھڑی بات کر لیتی ہیں، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ نہیں جانتیں آپ سے بات کرنا اور آپ کی ایک

جھلک دیکھنا میرے زندہ رہنے کے لیے یہ دو چیزیں کافی ہیں۔ اس سے زیادہ کی مجھے تمنا نہیں۔ مجھ سے یہ دو چیزیں مت

چھینو۔ میں ان کے بغیر زندہ نہ رہ پاؤں گا۔ میں مرنے سے پہلے جینا چاہتا ہوں نورین۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگا۔ میں ششدر رہ گئی۔ پھر میں آس پاس دیکھنے لگی۔ شکر ہے خدا کا کہ کوئی پہچانے والا موجود نہ تھا۔ جو تھے وہ بھی خاصے

دور تھے۔

”خاور..... کنٹرول یور سیلف..... یہ کیا کر رہے ہو۔ اگر کوئی دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا۔“

وہ آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ ”سوری..... آج پتا نہیں کیوں دل رونے کو چاہ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اب چلتا ہوں۔ میری کوئی بات بری لگی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پارک سے باہر نکل گیا اور

میں وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ یا خدا! یہ کیا ہو رہا ہے۔ بات اتنی بڑھ جائے گی یہ تو میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ اب اسے کیسے

سمیٹوں۔ یہ شخص تو حد درجے کا جذباتی نکلا ہے۔ محبت میں ایک دفعہ چوٹ کھا چکا ہے۔ دوسری چوٹ اس کے لیے خطرناک

ثابت ہو سکتی ہے۔ اب میں کیا کروں.....

☆.....

اگلی صبح جبار سے ناشتے کے معاملے پر تلخ کلامی ہو گئی۔ ایک پراٹھا تھوڑا جل گیا تھا۔ اس نے پورا گھر سر پراٹھا

لیا۔ لگا بے بھاء کی سانے۔ آج میرا موڈ بھی سننے کا ہرگز نہ تھا۔ میں نے ایک دو باتوں کا پلٹ کر جواب دیا تو وہ بلند آواز

سے چنگاڑنے لگا۔

”تم جیسی ڈھیٹ اور بے شرم عورت میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔“

”ڈھیٹ اور بے شرم تو میں ہوں، اس لیے تم جیسے انسان کے ساتھ عمر گزار دی۔ اگر غیرت مند ہوتی تو کب کی

چھوڑ کر چلی جاتی۔“ میں بھی چیخ کر بولی تو وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے کے لیے میری طرف بڑھا۔

”جبار..... بڑک جاؤ۔“ ماموں دروازے پر کھڑے جبار کو متوشش نظروں سے گھور رہے تھے۔

جبار وہیں رک گیا۔

”تو اب تمہاری اتنی جرأت ہوگئی کہ تم نورین پر ہاتھ بھی اٹھانے لگے ہو۔ بوڑھے ہو گئے ہو۔ اولاد جوان ہوگئی ہے اب تو شرم کرو۔“ ماموں اتنے غصے سے بولے کہ ہانپنے لگے۔ ان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

”میں ماموں سے لپٹ گئی۔“ ماموں پلیر، آپ پرسکون ہو جائیں۔ سب ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہ پاسکی۔

”کیا ٹھیک ہے میری بچی، ہر وقت تجھے ذلیل کرتا رہتا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے کسی بات کی خبر نہیں۔ سب خبر ہے مجھے۔“

”اباجی، آپ خواہ خواہ ہلکان نہ ہوں۔ جا کر آرام کریں۔“ جبار روکھے پن سے بولا۔ ”یہ ہمارا میاں بیوی کا آپس کا مسئلہ ہے۔“

”اوئے تمہارا آپس کا مسئلہ کیسے ہو گیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ نورین لاوارث ہے۔ لاوارث نہیں ہے یہ۔ میری بیٹی ہے یہ..... سمجھے تم.....“ ماموں کو پھر جوش آ گیا۔

ماموں کا اس قدر جارحانہ رویہ دیکھ کر جبار نے فرار میں ہی عافیت جانی۔ اس کے جانے کے بعد ماموں مجھے اپنے ساتھ لگا کر رونے لگے۔ ہم ماموں بھانجی دونوں ہی رو رہے تھے۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹی، اس جہنم میں تجھے میں نے ہی دھکیلا ہے۔ پتا نہیں یہ ناہنجار کس پر چلا گیا ہے۔“

”ماموں اتنا غصہ آپ کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹروں نے آپ کو پرسکون رہنے اور ٹینشن سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے۔ آپ یہاں لیٹ جائیں۔“ میں نے ماموں کو صوفے پر بٹھایا اور وہ وہیں لیٹ گئے۔ میں ماموں کے پاس بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔

.....☆.....

اگلے دو دن اتنے مصروف گذرے کہ خاور سے کوئی رابطہ ہوا نہ ملاقات۔

آخر تیسرے دن اس کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسپونڈ تو وہ چھوٹی ہی گلے شکوے کرنے لگا۔

”اب تو میڈم اتنی مصروف ہوگئی ہیں کہ اس غلام کے لیے وقت ہی نہیں۔“

”ہاں بس، کچھ مصروفیت ہی ایسی تھی۔ آپ سنائیں کیسے ہیں؟“

”زندہ ہوں آپ کی یاد میں.....“

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے

زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے۔“

”بہت خوب.....“ میں نے بے اختیار داد دی۔ ”آپ کو اتنے شعر زبانی کیسے یاد رہتے ہیں۔ غضب کا حافظہ پایا ہے آپ نے۔“

اس نے ایک اور شعر سنا دیا۔

خود ہی ہیں باعث تکلیف ہم اپنے لیے ورنہ
نہ ہم ہوتے، نہ دل ہوتا، نہ دل آزاریاں ہوتیں

”کیا آج ہر بات کا جواب شعر کی شکل میں دیں گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بات کا جواب تو دیں آج۔“

”جی پوچھیں“ میں چونکی ہو گئی۔

”یہ آپ عورتوں کو صنفِ نازک کیوں کہا جاتا ہے۔ جبکہ آپ کسی طور پر بھی مردوں سے کم نہیں بلکہ زبان تو کئی گنا زیادہ لمبی ہے۔ ذرا وضاحت کریں گی۔“

”سیدھی سی بات ہے۔ عورت مرد کی نسبت کمزور اور نازک ہوتی ہے اس لیے شاعر حضرات نے اسے صنفِ نازک کا خطاب دیا ہے اور یہی زبان لمبی ہونے کی بات تو مردوں کی زبان عورتوں سے کم لمبی ہرگز نہیں۔ بس عورتیں بے چاری خواہ مخواہ بدنام ہیں۔“

”جانتا تھا جہاں بات عورت کی آئے گی۔ آپ پوری طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میدان میں اُتریں گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”بالکل جناب، جہاں بھی کوئی عورت کی قابلیت پر انگلی اٹھائے گا میں جی جان سے عورت ہونے کے ناطے، عورت کا دفاع کروں گی۔ اور عورت کو ناقص الحقل سمجھنے والے یہ جان لیں کہ بعض عورتوں نے ایسے ایسے شاندار کام سر انجام دیئے ہیں کہ تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف سے ان کے نام لکھے ہوئے جگمگا رہے ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہؓ، ملکہ نور جہاں، رضیہ سلطان، چاند بی بی وغیرہ وغیرہ۔“

”شکر ہے میں آپ کے سامنے نہیں اس وقت ورنہ آپ پتھر اٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دیتیں۔“ وہ تھپتھپے لگاتا ہوا بولا۔

”جناب، اگر عورت نہ ہوتی تو آپ مردوں کا وجود بھی نہ معرضِ وجود میں آتا۔ کیونکہ تخلیق کی ذمہ داری بھی قدرت نے عورت کے ذمہ لگائی ہے۔“ میں فخر سے بولی۔

”جناب..... تخلیق کار صاحبہ..... تخلیق کے لیے آپ عورتیں مردوں کی مرہونِ منت ہیں۔ کیا اس بات سے انکار کر سکتی ہیں۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”اچھا چھوڑیں اس بات کو۔ یہ بہت لمبی چوڑی بحث ہے۔“ میں نے فوراً بات بدلی مبادا کہ وہ کوئی اور بات نہ کہہ دے۔

”آپ کو پتا ہے، موزوں طبیعت یا ذہن صرف انسان کا طرہ امتیاز ہے۔ فرشتے، جنات یا کوئی دیگر مخلوق اس وصف سے عاری اور تخلیق کی لذت سے نا آشنا مخلوق ہے۔“ وہ بولا۔

”بالکل، یقیناً کسی بھی فن و ہنر میں کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عورت جس کا منصب چار دیواری کے اندر گھر کو جنت بنانا ہی ہوتا ہے اور جو چراغِ خانہ کھلاتی ہے کہ اسی میں اس کی عزت و آبرو ہے۔ مگر پھر بھی چند عورتوں نے اپنے علم و فن کے زور سے نہ صرف گھر بلکہ باہر پوری دنیا میں اجالا کیا اور ثابت کر دیا کہ۔“

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
”آپ نے تو لگتا ہے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے۔ میں آپ سے نہیں جیت سکتا۔“

”خاور، ایک بات ہے۔ عورت چاہے جتنا بھی نام پیدا کر لے۔ جتنی چاہے باکمال ہو۔ کسی بھی شعبے میں ہو۔ اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ وہ مردوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناجتنی ہے۔ وہ مرد چاہے اس کا باپ ہو، شوہر ہو یا بیٹا ہو۔ میں نے شوہر سے تعلق رکھنے والی ایک سپر اسٹار کے حالات زندگی پڑھے تو دل دکھ سے بھر آیا۔ حالانکہ وہ اپنے وقت کی سپر اسٹار تھیں۔“

”کس کی بات کر رہی ہیں؟“ خاور نے پوچھا۔

”میںا کماری کی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اے باپ رے..... اتنی پرانی ہیروئن کے حالات زندگی پڑھتی رہی ہیں آپ۔ وہ آپ کی امی کے زمانے کی نہیں بلکہ نانی، دادی کے زمانے کی ہیروئن رہی ہے۔ آپ اتنے پرانے اسٹارز میں بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”اولڈ از گولڈ۔“ میں نے برجستہ جواب دیا۔ ”مجھے ہر اس انسان سے دلچسپی ہے جو غیر معمولی ہے یا یہ کہ جو

معمولی یا عام نہیں ہے۔“

”اچھا جی، اس مینا کماری میں ایسی کون سی خوبیاں تھیں جنہوں نے اسے غیر معمولی بنا دیا۔“

”وہ صرف اداکارہ نہیں تھی بلکہ ایک اعلیٰ پائے کی شاعرہ بھی تھی اور جنیں تخلص تھا اس کا۔ اس نے اپنے دور کے بہت بڑے فلمی رائٹر، شاعر، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کمال امر وہوی سے شادی کر لی۔ خود شاعرہ تھی اس لیے جب اپنے محبوب شاعر کی بیوی بنی تو بہت خوش تھی۔ اپنے شوہر کو پوجنے کی حد تک چاہتی تھی۔ اپنے گھر سے بے حد پیار تھا۔ مگر اسے اس بات کی آگاہی نہیں تھی کہ شادی کے بعد عورت کی ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بیویوں کی لگام شوہروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مینا کماری جو اب تک اپنے باپ کے گھر میں ایک آزاد دلچسپی کی طرح رہتی تھی، کمال امر وہوی نے اسے پنجرے کا پنچھی بنا دیا۔ ہر بات پر روک ٹوک، پابندیاں اور سختیاں.....

مینا کماری اپنے وقت کی بڑی طرحدار اداکارہ تھی۔ اس کی آنکھیں ہر خوبصورت چیز کو دیکھنے کی متمنی رہتی تھیں۔ وہ حسن کی پرستار تھی۔ مرد کو وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا اعلیٰ نمونہ سمجھتی تھی۔ مینا کماری ایک نڈر عورت تھی۔ وہ کمزور، بزدل اور بے بس عورت نہیں تھی جیسا کہ اسے فلموں میں دکھایا جاتا رہا ہے۔ کمال امر وہوی کے گھر میں اسے ایک خاص قسم کے ماحول کا پابند ہونا پڑا تھا۔ تناؤ اور ٹکراؤ یہیں سے شروع ہوا۔ مینا کماری کسی خاص ماحول کے میوزیم میں سج جانے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ وہ تو پارے کی طرح بے قرار اور پہاڑی آبشار کی طرح رواں دواں رہنا چاہتی تھی۔ اب بھلا پہاڑی آبشار کو کیا جنگل کی ہوا کو کبھی کوئی قید کر سکتا ہے۔“ میں جذباتی انداز میں بولتی چلی گئی۔

”کول ڈاؤن یار۔“ خاور ہنسا۔ ”آپ نے تو لگتا ہے مینا کماری کی زندگی پر خاصی ریسرچ کی ہوئی ہے۔“

”ہاں واقعی، میں نے مینا کماری کی زندگی کو بڑے غور سے پڑھا ہے اور اس سے بہت متاثر بھی ہوں۔ مجھے اس کی زندگی میں اپنی زندگی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔“ میں افسردگی سے بولی۔

”اچھا، اور کیا جانتی ہیں آپ مینا کماری کے بارے میں؟“

”مینا کماری، کمال امر وہوی کی پابندیوں اور رغبتوں سے سخت نالاں تھی۔ لیکن یہ مینا کماری کا ظرف تھا کہ وہ

کمال امر وہی سے اس زیادتی کے بارے میں ایک حرف بھی زبان پر نہیں لائی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مینا کماری ایک اچھی اداکارہ ہی نہیں تھی بلکہ ایک بلند کردار کی خاتون بھی تھی۔ ایک شوہر پرست بیوی بھی تھی۔

ایک طرف تو ایسی والہانہ محبت، اپنے آپ کو نچھاور کر دینے والا انداز، دوسری طرف ایک سخت گیر شوہر کا دبدبہ، رعب اور شوہرانہ عملداری۔

ایک دفعہ مینا کماری نے اپنی بڑی بہن سے کہا تھا۔ آپا میری زندگی اس بے بس پرندے کی طرح ہے جو اپنے آزاد ساتھیوں کو اڑتے ہوئے دیکھ کر پرواز کے لیے پرتوتا ہے مگر پنجرے کی تیلیوں سے ٹکرا کر رہ جاتا ہے۔ اس قسم کی باتیں وہ اپنی بہنوں یا قریبی ساتھیوں سے کرتی تھی۔ تاکہ وہ باتیں گھر سے باہر نہ جائیں۔ مینا تو پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ شوہر کی محبت کو آگینے کی طرح سنبھال کر رکھتی کہ کہیں ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ نہ جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ مینا کماری اپنی ابتدا سے آخری دم تک ایک شمع کی طرح جلتی رہی، بجھتی رہی اور بجھنے سے پہلے بھی اپنے پیچھے روشنی کا وافر ذخیرہ دوسروں کے لیے چھوڑ گئی۔ مینا کماری کی نظم کے ایک بندے بھی اس کی محبت کے فلسفے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پیار کا ایک خوبصورت خواب

جو میری سلگتی آنکھوں میں ٹھنڈک بھر دے

محبت کا ایک پرتپاک لمحہ

جو میری بے چین روح کو پرسکون کر دے

بس انہی ایک دو چیزوں کی میں خریدار تھی

اور وقت کی دکان ان چیزوں سے خالی نکلی۔“

”بہت خوب..... میں داد دیتا ہوں مینا کماری کو اور ان کی شاعری کو۔ وہ تو واقعی بہت اعلیٰ پائے کی شاعرہ تھیں۔“

خاور بے اختیار بولا۔ ”کچھ اور یاد ہے مینا کماری کا لکھا ہوا تو وہ بھی سنا دیں۔“

”مینا کماری کی ایک اور نظم مجھے بہت پسند ہے۔ وہ پیش کرتی ہوں۔“

کہاں اب میں اس غم سے گھبرا کر جاؤں

کہ یہ غم تمہاری ودیعت ہے مجھ کو

نہ پھولوں کے جھرمٹ میں جی میرا بہلا

نہ راس آئی مجھ کو ستاروں کی محفل

سلگتی ہوئی غم کی تنہائیوں میں

یہی مجھ سے کہتا ہے میرا دکھی دل

میرا جینا مرنا تمہارے لیے تھا

تم ہی ہو مسجا میرے تم ہی قاتل

ابھی تک تمہیں ڈھونڈتی ہیں نگاہیں

ابھی تک تمہاری ضرورت ہے مجھ کو“

”واقعی مینا کماری کی کہانی بہت متاثر کن ہے۔“ خاور اب سنجیدگی سے بولا۔
 ”ہاں میں بھی پڑھ کے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اسی لیے کہتی ہوں کہ عورت چاہے جتنی بھی ترقی کر لے، نام پیدا کر لے، مکمل آزادی اور خود مختاری اس کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ایک مرد کی دست نگر بن کر جینا پڑتا ہے اسے۔“
 ”اچھا یہ بتائیں، کل پارک میں آئیں گی؟“
 ”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“
 ”کل ضرور آئیے گا۔ آپ کے لیے ایک سر پرانز ہے میرے پاس۔“
 ”وہ کیا بھلا۔“

”اگر بتا دیا تو وہ سر پرانز تو نہ رہا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ آ جاؤں گی۔“

”وعدہ.....“

”وعدہ رہا صنم.....“ میں گنگنا نے لگی۔

”اوکے..... لٹا مگنیکر صاحبہ، اب فون بند کر دینا چاہیے۔ پورا ایک گھنٹہ ہو گیا ہے ہمیں بات کرتے ہوئے۔“
 ”کیا واقعی۔“ میں بے یقینی سے بولی۔

”جی جناب، آپ تو مینا کماری کی ہسٹری میں ایسی کھوئی ہوئی تھیں کہ بڑی مشکل سے واپس آئی ہیں۔“

”ہاں یار، واقعی مینا کماری ایک عظیم عورت اور اداکارہ تھی۔ میں اس کی بہت بڑی فین ہوں۔“

”آپ سے زیادہ عظیم نہیں تھی۔ آپ اس سے بڑھ کر ہیں۔“

”بنارہے ہیں جناب۔“ میں ہنسی۔ ”خاور ایک بات بتائیں گے؟“

”جی پوچھیں میڈم۔“ وہ گنگنا یا۔

”برسوں پہلے آپ نے ایک عورت سے محبت کی تھی اور بہت شدت سے اور ٹوٹ کر کی تھی اور آج آپ مجھ سے

محبت کے دعوے دار ہیں۔ ایک آدمی دو دفعہ اتنی گہرائی سے کیسے محبت کر سکتا ہے؟“

”اس سے میں نے محبت کی تھی اور آپ سے عشق کیا ہے۔ عشق محبت سے کہیں زیادہ گہرا اور خطرناک ہوتا ہے۔

یہ آدمی کی جان بھی لے لیتا ہے۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”اوکے مسٹر عاشق..... گڈ بائے..... کافی لمبی بات ہو گئی۔“

”اوکے مائی لو.....“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

☆.....

اگلی صبح میں پارک میں گئی تو وہ میرا ہی منتظر تھا۔ اس کی گود میں رکھا شاپرڈ کچھ کر میں سمجھ گئی کہ کیا سر پرانز ہے۔

یقیناً میرا ناول آ گیا تھا اور اس کی آٹھ دس کاپیاں خاور شاپرڈ میں ڈال کر لایا تھا۔

میں جا کر پاس بیٹھی تو اس نے شاپرڈ کھولا اور ایک ناول نکال کر میرے سامنے کیا۔

”کیسا لگا؟“ اس نے ایکسائینڈ ہو کر پوچھا۔

”بہت خوبصورت۔“ میں نے کتاب ہاتھ میں پکڑ کر کہا۔

”سرور قی بہت دیدہ زیب ہے۔“ میں نے دل سے تعریف کی تو وہ مزید خوش ہو گیا۔

”نورین، میں چاہتا ہوں تمہارا ہر تین چار ماہ بعد ایک نیا ناول آتا جائے۔ تم ایک نامور رائٹر بن کر نام پیدا کرو۔ کرو گی نا!“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ تو قسمت پر ڈیپنڈ کرتا ہے نا۔“ میں مسکرائی۔

”قسمت انسان خود بناتا ہے۔ محنت کرو گی تو کامیابی خود بخود قدم چومے گی۔“

”اوکے جناب، میں محنت کروں گی اور جی جان سے کروں گی..... اب خوش۔“

”ہاں، اب خوش بلکہ بہت خوش ہوں۔ بس خدا اتنی زندگی دے دے کہ تمہیں کامیاب ہوتا ہوا دیکھ سکوں۔“

”آپ کو اپنی زندگی پر اتنی بے اعتباری کیوں ہے؟“ میں نے شکوہ کیا۔

”زندگی سے زیادہ بے اعتبار چیز اور کوئی نہیں ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں کھڑی ہو گئی۔

”اب میں چلتی ہوں۔“

”اتنی جلدی۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں، میں گھر جا کر سب کو اپنا ناول دکھانا چاہتی ہوں۔“

”اور جو وعدہ میرے ساتھ کیا ہے وہ کب پورا کریں گی؟“

”کیسا وعدہ..... اوہ ہاں یاد آیا..... آپ نے بتایا ہی نہیں آپ کو کیا چاہیے۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ بتادوں گا۔“ وہ مسکرایا۔

”کب؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”آج فون پر کسی بھی وقت..... آپ جب بالکل اکیلی ہوں مجھے کال کیجئے گا۔ میں بتادوں گا۔“

”اوکے۔“ میں تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دی۔ ہم آپس میں اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ ہاتس

کرتے کرتے آپ سے تم پر آ جاتے اور پھر تم سے آپ پر چلے جاتے۔

گھر جا کر بچوں کو اپنا نیا ناول دکھانا چاہا مگر پھر یہ سوچ کر ضبط کر گئی کہ سب یہی پوچھیں گے کہ صبح صبح ناول کہاں سے آ گیا۔ اس لیے بچوں کے واپس آنے تک صبر کرنے کا سوچا اور ناول پکڑ کر اسٹور میں الماری میں رکھ دیئے پھر بچوں کو جگانے کے لیے آوازیں دینے لگی۔

بچے اور جبار چلے گئے۔ میں بھی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو گئی تو ایک ناول پکڑ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ ناول ہاتھ میں دیکھ کر خاور کے لیے تشکر بھرے جذبات اُمٹنے لگے۔ میرے لیے کتنا کر رہا تھا، بغیر کسی لالچ اور مفاد کے۔ خاور کا خیال آتے ہی یہ خیال ستانے لگا کہ آخر وہ کیا مانگنا چاہتا ہے مجھ سے۔ پوچھوں تو سہی خواہ مخواہ کا تجسس پھیلا رہا ہے۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی۔

اب اس کی کال آرہی تھی۔ ایسا وہ میرا بل بجانے کے لیے کرتا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔

”خاور! میں آپ کا شکریہ ادا کرنا تو بھول ہی گئی۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔“
 ”دوستوں میں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔“ وہ بولا۔

”اچھا یہ بتائیں، اس دفعہ جناب کی کیا فرمائش ہے۔“

”ڈرتا ہوں کہیں میری فرمائش سن کر آپ ناراض نہ ہو جائیں۔“

”میں کیوں ناراض ہونے لگی بھلا۔ مانگئے کیا مانگتے ہیں۔“ میں حاتم طائی بنی پوچھ رہی تھی۔

”پہلے وعدہ کریں آپ ناراض نہیں ہوں گی۔ کیونکہ میں ہر بات برداشت کر سکتا ہوں، آپ کی ناراضگی نہیں۔“

وہ سنجیدگی سے بولا۔

”خاور جب میں نے ایک مرتبہ کہہ دیا کہ نہیں ہوتی ناراض تو کیا اب اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دوں۔“ میں تیزی

سے بولی۔

”تو پھر سینے میری فرمائش ہے..... بلکہ خواہش ہے..... دلی خواہش ہے.....“ وہ خاموش ہو گیا۔

”اب کیا ہو گیا۔ بتا بھی دیں۔“

”نورین..... میں تمہیں اپنے..... سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ اس خوبصورت..... دل کی دھڑکن سننا چاہتا

ہوں۔ ان ہونٹوں کو چومنا چاہتا ہوں جن سے اتنی اثر انگیز اور خوبصورت باتیں کرتی ہو..... ان جھیل جیسی گہری آنکھوں کو

چومنا چاہتا ہوں، جن سے کسی کا درد اور تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ ان ہاتھوں کو چومنا چاہتا ہوں جن سے اتنی سحر انگیز تحریریں

لکھتی ہو۔ میں تمہیں چھونا چاہتا ہوں..... تمہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں..... صرف چند لمحات میری جھولی میں ڈال دو۔ میں

ان خوبصورت لمحوں کو یاد کر کے باقی زندگی گزار لوں گا۔“

اس کی باتیں سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی کوئی ایسی فرمائش بھی کرے

گا۔ میرے دل میں اس کے خلاف اچانک نفرت کی لہر اٹھی۔ میں نے کال کاٹ کر فون رکھ دیا۔ میرا دماغ سائیں سائیں

کر رہا تھا۔ خاور سے مجھے اس قدر عایمانہ باتوں کی اُمید نہ تھی۔

خاور تم بھی آخر ایک عام مرد ہی نکلے۔ جو عورت کے جسم کو حاصل کرنا ہی محبت کی منزل سمجھتا ہے۔ افسوس میں

تمہیں پہچان ہی نہ سکی۔ دنیا کے سارے مرد شاید ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ جسموں کے بھوکے اور ہوس کے مارے۔ غصے

کی شدت سے میرے آنسو بہنے لگے۔ مجھے تمہیں سمجھنے میں غلطی کیسے لگ گئی خاور۔ تم تو ہرگز ایسے نہ تھے۔ اچانک میز پر پڑا

فون بجنے لگا۔ میں نے اٹھا کر دیکھا خاور کا نمبر آ رہا تھا۔ میں نے کال کاٹ کر فون رکھ دیا۔ فون پھر سے بجنے لگا۔ میں نے

بار بار کال کاٹنی ضروری نہ سمجھی۔ کافی دیر تک بیل ہوتی رہی پھر فون خاموش ہو گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد خاور کا مٹیج آ گیا۔ میں نے آنسو صاف کیے اور مٹیج پڑھنے لگی۔

”نورین پلیز، مجھے غلط نہ سمجھو۔ اگر تم میری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی تو نہ کرو۔ مگر پلیز مجھ سے ناراض مت

ہو۔ میں تمہاری ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا۔“

میں نے اس کا مٹیج پڑھ کر ڈیلیٹ کر دیا اور فون بند کر دیا۔ فون بند کر کے اسے الماری میں کپڑوں کے نیچے رکھ

دیا۔ پھر باہر آ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ ناول چھپنے کی ساری خوشی کا فور ہو گئی تھی۔ اس لمحے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تو یہ

شخص مجھ سے ناول چھپوانے کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ جب میں نے پہلے دن سے اس پر واضح کر دیا تھا کہ ہم کبھی بھی اخلاقی حدود کو کراس نہیں کریں گے تو پھر اس کے دل میں ایسی خواہش کیونکر پیدا ہوئی۔ میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ کیا یہ مجھے ایک لوز کریکٹر عورت سمجھتا ہے۔

بچے گھر آئے۔ میز پر ناول پڑا دیکھا تو خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ ”امی آپ کا دوسرا ناول آگیا اور آپ یوں چپ چاپ لیٹی ہوئی ہیں۔ آپ کو تو خوشی منانی چاہیے۔“

”تو کیا اٹھ کر بھنگڑا ڈالوں۔“ میں روکھے پن سے بولی تو تینوں بچے حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔

”ای می بہت بڑی بات ہے۔ آپ اسے اتنا ہلکا لے رہی ہیں۔“ زوہیب زور دے کر بولا۔

”ای اب تو ہوٹل میں جا کر ڈنر کریں گے۔“ فاریہ بھی چبکی۔

”ای آپ کیوں اتنی بکھی بکھی دکھائی دے رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ شاہ زیب نے غور سے

مجھے دیکھا۔

”ہاں واقعی، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے تم لوگوں کے لیے کھانا بھی تیار نہیں کر سکی۔ جاؤ بازار سے کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔“ میں نے شاہ زیب کو کہا۔

☆.....

رات تک میں کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ کھانا تیار کیا۔ بچوں اور میاں کو کھلایا۔ ابھی کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ مہوش، اس کے بچے، غفار، ماموں اور ممانی آ گئے۔ وہ سب مجھے نئے ناول کی مبارک باد دینے آئے تھے۔ انہیں فاریہ جا کر بتا آئی تھی۔

جبار نے یہ خبر سن کر کوئی رسپانس نہ دیا۔ وہ چپ چاپ ٹی وی دیکھتا رہا۔ اس سے میں نے کوئی توقع باندھی بھی نہ تھی۔

یہ محفل رات گیارہ بجے تک جمی رہی۔ جب سب چلے گئے تو بچوں نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔ جبار نے بھی سونے کے لیے اپنے کمرے کی راہ لی۔ میں وہیں لاؤنچ میں بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اب میں غصے کے بجائے پورے ہوش و حواس سے سوچ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خاور کا جرم اب کم سنگین لگ رہا تھا۔

وہ میرا عاشق ہے، محبوب ہے، دوست ہے، غم گسار ہے، ہمدرد ہے۔ تو پھر کیا اس کی یہ خواہش فطری نہیں ہے۔ کیا میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ اس سوال کا جواب میں خود کو دیتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ میں خاور سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی سوہان روح تھا۔

اگلے تین دن تک میں نے خاور سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ میرا سیل فون بھی بند تھا اور نہ ہی میں مارنگ واک کے لیے گئی۔ یہ تین دن میرے لیے بڑے اذیت ناک تھے۔ کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں خاور پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں نے الماری سے اپنا سیل فون نکالا۔ اس کو آن کیا تو خاور کے بھیجے ہوئے لاتعداد میسج نمودار ہونے لگے۔ وہ معافیاں مانگ رہا تھا۔ اپنی کہی ہوئی باتوں پر شرمندہ تھا۔ ایک میسج میں اس نے لکھا تھا کہ پلزی نورین میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دو۔ وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ یوں سمجھ لو دل کی باتیں میری زبان پر آ گئیں۔ میں اپنی حیثیت

اور تمہارا مقام بھول گیا تھا۔ میں پھر کبھی اپنی غلطی کو نہیں دہراؤں گا۔ بس مجھ سے بات کرنا بند مت کرو۔ پلیز..... نہیں تو میں مر جاؤں گا۔

یہ میسج پڑھ کر میرا دل پسج گیا۔ سوچا اسے فون کر کے معاف کرنے کا سگنل دے دیتی ہوں۔ پھر کچھ سچا کر رک گئی۔ سارے میسج ڈیلیٹ کیے اور فون ٹیبل پر رکھ کر سوچنے لگی۔

اگر یہ تعلق ٹوٹ رہا ہے تو توٹنے دوں۔ اچھا خاصا بہانہ مل گیا ہے۔ قطع تعلقی ہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔ چار دن تکلیف ہوگی پھر رفتہ رفتہ سب کچھ نارمل ہوتا چلا جائے گا۔ دونوں اپنی اپنی زندگی میں واپس لوٹ جائیں یہی بہتر ہے۔ میں کافی دیر سوچتی رہی اور پھر اس فیصلے پر پہنچی کہ رابطہ نہ کرنا ہی مناسب ہے۔ میں اس فیصلے پر کتنے دن قائم رہتی، یہ میں بھی نہیں جانتی تھی۔ میں انہی سوچوں میں غلطیاں تھی کہ ڈوریل بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو وہ ساڑھے گیارہ بج رہی تھی۔

”شریفان جاؤ جا کر دیکھو دروازے پر کون ہے؟“ میں نے شریفان کو آواز دی جو کپڑے استری کر رہی تھی۔
 ”جی بیگم صاحبہ۔“ وہ گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہمراہ صوفیہ تھی۔ خاور کی بیوی صوفیہ.....
 ”السلام علیکم باجی۔“

”وعلیکم السلام، صوفیہ تم سناؤ۔“ میں ہنہ کر اس کے گلے ملی اور پھر ہم دونوں بیٹھ گئیں۔
 میں نے صوفیہ کی طرف غور سے دیکھا تو وہ بہت افسردہ اور غمگین دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے روتی رہی ہو اور ٹھیک سے سو بھی نہ سکی ہو۔
 ”خیریت تو ہے نا صوفیہ، تم بہت اداس دکھائی دے رہی ہو؟“

”بس باجی، خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ وہ آنکھوں میں پانی بھر کر بولی۔
 ”کیوں، کیا ہوا؟“ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ”کیا پھر خاور سے جھگڑا ہو گیا۔“
 ”نہیں باجی، کاش، جھگڑا ہی ہوا ہوتا۔“ وہ یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں اس کے پاس جا بیٹھی اور اسے تسلیاں دینے لگی۔ میرا دل انجانے وسوسوں سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔
 ”صوفیہ پلیز چپ ہو جاؤ اور مجھے بتاؤ آخر ہوا کیا ہے؟“
 وہ تھوڑی دیر روتی رہی اور پھر ہچکیوں میں مبتلا بننے لگی۔

”باجی، خاور کو..... برین ٹیومر ہے..... جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے..... ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ کتنی دیر کا مہمان ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ شاید چند دنوں کا یا پھر چند مہینوں کا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سے رونے لگی۔

اور میں..... میں جیسے کسی گہری کھائی میں گرتی جا رہی تھی۔

اوپر خدا! یہ بندہ موت کو ہر وقت ساتھ لیے پھر رہا ہے اور پھر بھی اتنا زندہ دل اور اتنا ہنس مکھ..... میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ذہن میں خاور کی کہی ہوئی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ اسی لیے وہ کئی مرتبہ اچانک اتنا اداس ہو جاتا تھا اور ذہنی باتیں کرنے لگتا تھا اور میں اس کی باتوں کو ہمیشہ مذاق ہی سمجھتی رہتی۔ کبھی اس کی باتوں کی گہرائی

میں نہ جاسکی۔ صوفیہ بے چاری روتی جا رہی تھی اور اپنی دکھ بھری داستان سناتی جا رہی تھی۔

”باجی..... ہمیں اس اندوہناک بیماری کا پتا پرسوں رات کو ہی چلا ہے۔ اس نے یہ مرض ہم سب سے چھپایا ہو تھا۔ کئی دفعہ اس کے دماغ کو جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر کراہنا شروع کر دیتا تھا۔ بلکہ کئی دفعہ تو چلنا شروع کر دیتا تھا۔ میں اور بچے اس کی حالت دیکھ کر روننا شروع کر دیتے تھے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے کہتے تو وہ منع کر دیتا اور کہتا کہ میں اپنا علاج کروا رہا ہوں۔ جلدی ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ باجی وہ جانتا تھا کہ وہ ایک موذی مرض کا شکار ہے جو لا علاج ہے۔ وہ ہر بات جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی زندگی آندھی میں چلتے ہوئے دیئے کی مانند ہے۔ جو کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ مگر اس نے یہ بات ہم سے چھپائی تاکہ ہمیں تکلیف نہ پہنچے۔ وہ ہمیں دکھ کرنے کی خاطر اکیلا ہی اپنی جان پر یہ دکھ بھیتا رہا..... اور میں کتنی ظالم اور کھنور تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کی دل آزاری کر ڈالتی تھی۔ معمولی باتوں کو وجہ بنا کر لڑائی جھگڑا شروع کر دیتی تھی۔ ہائے مجھے پہلے پتا چلتا تو خاور میں تم سے کبھی ایسا سلوک نہ کرتی۔“ وہ باتیں کرتی رہی اور روتی رہی۔ جب کافی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ میں تو کچھ بول ہی نہیں رہی تو وہ آنسو پونچھ کر میری طرف متوجہ ہوئی۔

”باجی....“ اس نے میری ران پر ہاتھ رکھ کر مجھے مخاطب کیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنا دکھی کر دیا۔ آپ چپ ہو جائیں۔ میں جانتی نہ تھی کہ آپ اتنا نرم دل رکھتی ہیں۔ بس باجی میں خود پر کنٹرول ہی نہیں رکھ سکی۔ دل چاہ رہا تھا کسی غم گسار اور ہمدرد کے کندھے پر سر رکھ کے جی بھر کر روؤں۔ پھر آپ کا خیال آیا۔ آپ تو میرے لیے سگی بہنوں سے بڑھ کر ہیں۔ میں اپنے دل کی ہر بات آپ سے شیئر کر سکتی ہوں۔ اسی لیے یہ بات بھی شیئر کر لی۔ باجی آپ مجھے حوصلہ دینے کے بجائے خود ہی حوصلہ ہار گئی ہیں۔ مجھے کون تسلی دے گا۔“ وہ پھر سے رونے لگی۔

”باجی میرے بچے ابھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ خاور چلا گیا تو میں کیا کروں گی؟“

”صوفیہ پلینز خاموش ہو جاؤ۔“ میں نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے۔

میری حالت دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھی اور اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اندرونی دروازہ بند کر کے خوب روئی۔ اتنا روئی کہ شاید کبھی کسی کے مرنے پر بھی نہ روئی ہوں گی۔

بچوں کے آنے تک میں بری طرح بخار میں پھنک رہی تھی۔ اس لیے وہ میری سوجی ہوئی لال آنکھوں کو بھی بخار کے کھاتے میں ڈالنے لگے۔

”امی انھیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”بیٹا، پہلے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے کھانے کا بندوبست کر دو۔ میں تو آج کچھ بھی نہیں پکا سکی۔“

”کوئی بات نہیں امی۔ ہم کچھ نہ کچھ کھالیں گے۔ مہوش آنٹی کو کہتے ہیں کچھ بنا دیں گی۔ آپ شاہ زیب کے ساتھ جا کر دوائی لے آئیں۔“ زوہیب بھی بڑی فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔

”شام تک آرام نہ آیا تو ڈاکٹر کے پاس چلی چلوں گی۔ اب تم کھانے کے لیے باہر سے کچھ لے آؤ یا پھر آنٹی مہوش کو بلا لاؤ۔“

”جی امی۔“ زوہیب یہ کہہ کر مہوش کے ہاں چلا گیا اور پھر پندرہ منٹ بعد چکن بریانی کی ڈش اٹھائے واپس آیا۔

”امی! آنٹی نے چکن بریانی بنائی ہے۔ کہہ رہی ہیں کہ یہاں سے لے جاؤ اور تینوں بہن بھائی مل بانٹ کر کھا لو۔ شام کو تمہیں الگ سے کچھ بنا دوں گی۔“

تینوں بہن بھائی بریانی کھانے لگے۔

”امی آپ بھی تھوڑی سی کھالیں۔“ فاریہ نے جج میری طرف بڑھایا۔

”نہیں بیٹی، تم کھاؤ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے منہ پھیر لیا۔

تھوڑی دیر بعد مہوش آگئی۔

”کیا ہو گیا؟“

”بخار ہو گیا ہے۔“

اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ارے تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ جا کر دوا لے آؤ۔ شاہ زیب، امی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“ اس نے شاہ زیب کو حکم دیا۔

”آنٹی میں نے امی سے بہت اصرار کیا ہے مگر وہ مانتی ہی نہیں۔“

”مہوش تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ جانتی تو ہو مجھے جب بھی بخار ہوتا ہے ایک دو دن میں خود ہی اتر جاتا ہے۔“

”او کے..... جانتی ہوں..... بہت ضدی ہو۔ کسی کی نہیں مانتی۔ اپنی ہی منواتی..... اچھا اب جلدی سے بتاؤ رات کے لیے کیا بنانا ہے۔“

”جودل چاہے بنا دو۔ بچوں سے پوچھ لو۔“ میں نقاہت سے بولی۔

”ہاں بھئی بچوں..... کیا کھاؤ گے؟ کیا بناؤں؟“

”کچھ نہیں۔ ہم آج باہر سے منگوائیں گے پکا پکایا۔ کیوں بھائی؟“ فاریہ نے دونوں بھائیوں سے تائید چاہی۔

”بالکل..... میرا دل بھی آج بلوچی جی کھانے کو چاہ رہا ہے۔“ زوہیب نے ہانک لگائی۔

میں اور مہوش ہنسنے لگیں۔

”لو بھئی تمہارا پکانا کا مسئلہ تو چٹکیوں میں حل ہو گیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلو یہ ٹینشن تو ختم ہوئی۔ اب مریضہ صاحبہ تم بتاؤ تمہارے لیے کیا بناؤں۔ ویسے بائی دادو تمہیں یہ بخار کس

خوشی میں چڑھا ہے۔“

”آنٹی بخار کسی خوشی میں نہیں بلکہ غم سے چڑھتا ہے۔“ فاریہ بڑی دور کی کوڑی لائی۔

”چلو یہی بتا دو کہ کس غم میں چڑھا ہے؟“

”مہوش تم بھی بال کی کھال اتارنے لگتی ہو۔ بخار چڑھنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری ہے کیا۔ مجھے ایک کپ

چائے کا بنا دو اور ساتھ ایک گولی پینا ڈول کی دے دو۔“

”ٹھیک ہے، ابھی بنا دیتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور فاریہ میرے پاس بیٹھ کر میرا سر دبانے لگی۔

.....☆.....

شام تک طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ آخر ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑا۔ شاہ زیب مجھے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ جبار کو پتا چل چکا تھا کہ مجھے بخار ہے مگر اس نے نہ تو پوچھنا گوارہ کیا اور نہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی آفر کی۔ میں اب اس کے اس رویے کی عادی ہو گئی تھی۔

دوسرے دن طبیعت کافی سنبھل گئی تھی مگر پھر بھی شاہ زیب نے مجھے اٹھنے سے منع کر دیا۔ اس نے اپنے لیے اور فاریہ، زوہیب کے لیے انڈوں کے آلیٹ بنائے اور ساتھ بریڈ کے سلاکس سینک لیے۔ اپنے ابو کے لیے بھی اس نے چار سلاکس اور دو انڈے بنا کر رکھ دیئے۔ چارو ناچار آج جبار کو بھی انڈوں کے ساتھ سلاکس ہی کھانے پڑے، ورنہ عام دنوں میں وہ یہ ناشتہ کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ پراٹھے کھانا زیادہ پسند کرتا تھا۔

سب کے جانے کے بعد میں نے چائے تیار کی اور لاؤنج میں بیٹھ کر پینے لگی۔

دل چاہ رہا تھا کہ خاور سے بات کروں۔ مگر خاور کا سامنا کرنے یا اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ خاور کی آواز سنتے ہی میرا ضبط جواب دے جائے گا اور میں زار و قطار رونا شروع کر دوں گی۔ ویسے اس وقت میری شدت سے خواہش ہو رہی تھی کہ میں خاور کے گلے لگ کر خوب روؤں۔

آخر میں نے خود کو سمجھا بھجا کر ریلیکس کیا اور خاور کا نمبر ملایا۔ بیل جاری تھی پھر اس کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو.....“

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام..... میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ آپ نے مجھے فون کیا ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ اس کی

آواز سے نقاہت چھلک رہی تھی۔

”کیسے ہیں؟“ میں لرزتی آواز میں بولی۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک..... اے دن..... بھلا مجھے کیا ہونا ہے۔ بس یہ چار پانچ دن جلدی اذیت میں گزرے

ہیں۔ احساسِ جرم نے ایک منٹ بھی سکون سے بیٹھے نہیں دیا۔ میں نے انجانے میں آپ کا دل دکھا دیا۔ آئی ایم سوری۔

نورین کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا۔“ وہ ہنسکی ہوئی آواز میں پوچھ رہا تھا اور میرے آنسو اس وقت میرے دل پر گر رہے

تھے۔

”ہاں خاور، میں نے تمہیں معاف کر دیا اور پھر تمہاری غلطی اتنی سنگین نہیں تھی جو معاف نہ کی جاسکے۔“

”کیا واقعی..... اب آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔“ وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، بالکل نہیں۔“ ضبط کرتے کرتے میری آواز ساتھ چھوڑنے لگی تھی۔

”آپ کی آواز کو کیا ہو گیا ہے آج۔ کیا آپ روتی رہی ہیں۔“ وہ جھپٹ چمک ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”نہیں..... نہیں تو.....“ میں جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔ ”بھلا میں کیوں رونے لگی۔ بس ذرا گلا خراب

ہے۔“

”نورین..... آج میں بہت خوش ہوں..... آپ نے مجھے معاف کر دیا..... میرا من ہلکا ہو گیا..... ایسا لگ رہا تھا جیسے روح پرمنوں بوجھ تھا جو تمہارے راضی ہونے سے اتر گیا ہے۔“

تم مجھے موقع تو دو اعتبار بنانے کا فراز
تھک جاؤ گے میری وفاؤں کے ساتھ چلتے چلتے“

اس کی زبان سے فراز کا یہ شعر سن کر میری آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔ ”خادر میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“
”کیا.....“ اسے شاید اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

”میں نے کہا ہے کہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”ملنے تو رہتے ہیں..... پارک میں۔ پھر وہی مل لیں گے۔“ وہ سنہلے ہوئے بولا۔ وہ شاید کسی خوش گمانی کو دل

میں جگہ دینا نہیں چاہتا تھا۔

”میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔ جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہ ہو۔“ میں گہری سنجیدگی سے بولی تو وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”خیریت تو ہے نا..... تنہائی میں کیوں ملنا چاہ رہی ہیں۔“

”بس ہے کوئی کام۔ یہ بتائیں ایسا موقع مل سکتا ہے کیا؟“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ کل میں گھر میں بالکل تنہا ہوں گا۔ اگر آ سکتی ہیں تو آ جائیے۔“

”صوفیہ وغیرہ کہاں ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”صوفیہ اور میری دونوں بھابھیاں ایک فوننگی ہو گئی ہے وہیں جا رہی ہیں۔ جبکہ ان کے بچے اور میرے بچے کالج

سکولوں میں ہوں گے۔ دو بجے سے پہلے کوئی نہیں آئے گا۔ آپ دس گیارہ بجے تک آ جائیے گا۔“

”ٹھیک ہے کل پورے گیارہ بجے میں تمہارے پاس تمہارے گھر میں ہوں گی۔“ میں فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”اوکے..... میں انتظار کروں گا۔“

”اوکے..... اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور آنے والے کل کے متعلق سوچنے لگی۔



دوسرے دن بچوں اور جبار کے جانے کے بعد میں ناشتہ لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ مجھ سے کچھ کھایا ہی نہ جا رہا تھا۔ بلکہ جب سے خاور کی بیماری کے متعلق سنا تھا کھانا پینا برائے نام رہ گیا تھا۔ میں نے دو چار لقمے زہر مار کیے اور چائے کا گم اٹھا لیا۔

اوپر سے ماموں اور ممانی آ گئے۔ میں انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ماموں اور ممانی نے پیار کیا اور میرے پاس

بیٹھ گئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے ہماری بیٹی کی؟“ ماموں بڑی شفقت سے پوچھ رہے تھے۔

”ماموں اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا خاک ٹھیک ہو۔ رنگ پیلا ہو رہا ہے اور آنکھوں کے نیچے ہلکے پڑ رہے ہیں۔“ اب ممانی بولیں۔ ”کیا کچھ

کھاتی پیتی نہیں ہو۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں ممانی جان۔ وہم ہے آپ کا۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں وہم نہیں ہے میرا۔ ذرا اٹھ کر آئینہ دیکھو غور سے تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔“

میں نے ممانی کے ساتھ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ پھر میں اٹھی۔ ”ماموں آپ

لوگ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

میں نے انہیں چائے بنا کر پلائی۔ وہ چائے پیتے رہے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر چلے گئے۔ میں نے کلاک کی طرف دیکھا وہ ساڑھے دس بج رہا تھا۔ میں اٹھ کر سنور میں آئی۔ اپنی الماری کھولی اور کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ آخر ایک پیلے رنگ کے سوٹ کو کھینچ لیا، جس پر سرخ کلر کی کڑھائی کی گئی تھی۔ میں نے وہ سوٹ زیب تن کیا اور پھر آئینے کے آگے کھڑی ہو کر ہال بنانے لگی۔ بالوں کو سنوار کر ان میں کچر لگایا۔ سر پر سرخ دوپٹہ اوڑھا۔ ہینڈ بیگ پکڑا اور شریفان کو ہدایات دیتی ہوئی باہر آ گئی۔

”بی بی جی، کب تک آجائیں گی؟“ وہ میرے پیچھے آتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

میں پورچ میں رک گئی۔ ”تقریباً ایک گھنٹہ تک۔“

”مگر یہ تو بتا دیں..... جا کہاں رہی ہیں۔“ اس نے استفسار کیا۔ میری تیوری پر بل پڑ گئے۔

”تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔ کہا ہے ناکہ ایک گھنٹہ تک آ جاؤں گی۔“ میں ذرا سخت لہجے میں بولی تو وہ

ڈر گئی۔

”ٹھیک ہے بی بی جی، میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی کہ اگر کوئی آپ کی غیر موجودگی میں آئے اور آپ کا پوچھ تو

اسے کیا بتاؤں۔“

میں باہر نکل کر خاور کے گھر کی طرف چل دی۔ جو دوسری گلی میں تھا۔ خاور کے گھر کا ایڈریس مجھے معلوم تھا کیونکہ میں ایک دفعہ پہلے بھی صوفیہ کے بلانے پر یہاں آ چکی تھی۔ صوفیہ نے تب اپنے گھر میں میلاد کروایا تھا اور اس نے محلے کی دیگر عورتوں کے ساتھ مجھے بھی انوائٹ کیا تھا۔ تب میں اور مہوش دونوں آئی تھیں۔

چند منٹوں بعد میں دروازے کے آگے کھڑی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ڈور بیل پر انگلی رکھی۔

ایک منٹ سے بھی پہلے خاور نے دروازہ کھول دیا۔ وہ جیسے بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ ایک سائیڈ پر کھڑا ہو گیا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں تب تک لاؤنچ میں جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ خاور اندر آیا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ حد درجہ کمزور اور مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہو رہی تھیں۔ رنگت بھی پیلی زرد ہو رہی تھی۔ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ بے چین ہونے لگا۔

”کیا کوئی خاص بات کرنی تھی آپ نے؟“ وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں..... خاص..... بلکہ بہت ہی خاص۔“ میں اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی پھر میں اس کے بالکل سامنے..... بالکل پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اتنی پاس کہ ہم دونوں کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ رہ گیا۔ وہ گھبرا کر چند

قدم پیچھے ہٹا تو میں پھر اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ وہ بھی اب میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت حیرانگی نمایاں تھی۔ میری آنکھیں بھرا آئیں اور میں اس سے لپٹ گئی۔ میں شدت جذبات سے بلک بلک کر رونے لگی۔ میں نے مضبوطی سے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ رکھا تھا۔ میرا پورا وجود لرز رہا تھا۔

وہ اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا تھا۔ پھر اس نے بھی اپنے بازوؤں کے حلقے میں مجھے جکڑ لیا۔ جب میں کافی دیر تک روتی رہی تو وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے صوفے پر آ بیٹھا۔

”اب بتاؤ جان..... آخر ہوا کیا ہے؟ کیوں اتنی پریشان ہو؟“ وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

”خاور تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی؟“ میں روتے روتے بولی۔

”کون سی بات جان؟“ وہ حیران ہوا۔

”یہی..... کہ تمہیں برین ٹیومر ہے۔“ میں اب ہچکیاں لے رہی تھی۔

”اوہ..... تو آخر تمہیں پتا چل ہی گیا۔“ وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ”بہت برا ہوا۔ میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔“ وہ سر جھکائے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”کیا ہم ایک دوسرے کے دوست نہیں ہیں، تو پھر کیوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دکھ درد شیئر نہیں کر سکتے۔“ میں سکتے ہوئے بولی۔

”ہم دوستوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ ہمارے درمیان جو تعلق جڑ چکا ہے اس کے لیے یہ لفظ بہت چھوٹا ہے۔ یہ بات تم بھی بخوبی جانتی ہو۔ نورین سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنا یہ مرض دوسروں سے اس لیے مخفی رکھا کیونکہ مجھے رحم اور ترس سے سخت نفرت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر کوئی ترس کھا کر مجھ سے ہمدردی جتلائے۔ میں تو چاہتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد لوگوں کو اس بیماری کا پتا چلے مگر تمہاری ناراضگی کے بعد پڑنے والا دورہ اتنا شدید اور جان لیوا تھا کہ جب میرے بھائی مجھے ہسپتال لے کر گئے تو ڈاکٹروں نے سب کچھ سچ سچ انہیں بتا دیا تھا۔ میرے بھائیوں اور بیوی بچوں پر یہ کتنا بھاری ثابت ہوا تھا اس کا اندازہ تم بخوبی لگا سکتی ہو۔“

”ہاں میں ان کی کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔ پرسوں صوفیہ ہمارے گھر آئی تھی۔ اسی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ بہت دیر تک وہ روتی رہی تھی۔“

”صرف وہی روتی رہی تھی۔“ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”نہیں، میں بھی اس کے ساتھ روتی رہی تھی۔ اتنا روئی کہ بخار چڑھ گیا۔ دودن بخار میں پھنکتی رہی ہوں۔ آج طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔“

”اور آج پھر سے رونا شروع کر دیا تاکہ شام تک پھر سے بخار ہو جائے۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر مت کرو۔ اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔ بشرط آپ کا ساتھ رہے۔ اگر آپ نے ہاتھ چھوڑ دیا تو پھر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے ایک فائدہ ہو گیا ہے۔ بلکہ ایک نہیں دو، دو فائدے حاصل ہوئے ہیں مجھے۔“

”کیا کیا؟“ میں نے روتے روتے پوچھا۔

”نمبر ایک جب سے صوفیہ کو اس بیماری کا پتا چلا ہے اس نے لڑائی جھگڑا بالکل بند کر دیا ہے۔ اللہ میاں کی گائے بن گئی ہے اب تو۔ جب بھی گھڑا تاہوں ٹانگیں دبائے لگتی ہے میری۔ کاش اس عورت کا رویہ شروع سے ہی ایسا ہوتا تو آج مجھے یہ بیماریاں لگتی ہی نہ۔“ وہ افسردہ سے لہجے میں بولا۔

”اور دوسرا فائدہ کیا ہوا ہے؟“ میں اس سوال کا جواب جانتی تھی مگر پھر بھی اس کے منہ سے سننا چاہ رہی تھی۔
 ”دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ..... آپ میرے اتنے قریب آ گئی ہیں..... جتنی میں صرف خوابوں میں سوچا کرتا تھا۔“
 وہ میری طرف والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میں جھینپ رہی تھی۔ پھر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے اب چلنا چاہیے۔“ میں نے جانے کے لیے قدم اٹھائے تو وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔
 ”نورین کیا اب بھی میری خواہش پوری نہیں کروگی۔ ہو سکتا ہے یہ میری زندگی کی آخری خواہش ہو۔ میں مرنے سے پہلے جینا چاہتا ہوں..... صرف ایک بار...“ وہ لجاجت سے بولا۔

میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے چپ کر دیا اور پھر اس کے سینے سے لگ گئی۔ میرا دل اس وقت اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ یقیناً خاور بھی دھڑکن کی آواز سن رہا تھا۔

خاور کا قرب اس قدر جان لیوا اور نشہ طاری کر دینے والا ہو گیا کہ میں نہیں جانتی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مرد کے سینے سے لگی ہوں۔ دل چاہ رہا تھا کہ میں خاور کے سینے سے لگی کھڑی رہوں اور عمر تمام ہو جائے۔ وقت رک جائے۔ گھڑیاں ختم جائیں اور ہم یونہی ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے کھڑے رہیں۔

خاور نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اوپر اٹھایا اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ پھر نرمی سے ہونٹوں کو بوسہ دیا اور پھر میری بھیگی ہوئی آنکھوں کو باری باری چوما۔ میرے پورے وجود پر جیسے کوئی سرشاری سی چھا گئی تھی۔ یہ میری زندگی کا انوکھا اور اچھوتا تجربہ تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اپنی خمار آلود آنکھیں کھول کر خاور کی طرف دیکھا اور نشیلی آواز میں بولی۔

”اب میں جاؤں.....“

”یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ میں اس احسان کا بدلہ تمام عمر نہیں چکا سکوں گا۔“ وہ خمار آلود آواز میں بولا اور پھر اس نے میرا داہنا ہاتھ پکڑا۔ اس کی پشت پر اپنے ہونٹ رکھے اور بولا۔

”شکریہ جان..... بہت بہت شکریہ..... تم نے ایک فقیر کی جھولی میں اس کی من چاہی مراد ڈال دی۔ تمہاری یہ سخاوت میرے لیے میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔“ میں اپنا ہاتھ چھڑا کر تیز تیز قدموں سے اس کے گھر سے باہر آ گئی، بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے۔ مجھے ڈر تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں گی تو پتھر کی بن جاؤں گی یا پھر خاور کی محبت کی گرمی سے پکھل کر موم کی طرح بہہ جاؤں گی۔ میں جلدی جلدی گھر پہنچ گئی۔ دیکھا تو شریقاں کام میں مصروف تھی۔

”میری غیر موجودگی میں کوئی آیا تو نہیں۔“ میں نے سرسری لہجے میں اس سے پوچھا۔

”صرف مہوش بی بی آئی تھیں۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں اور تو کوئی نہیں آیا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں وہیں صوفی پر دراز ہو گئی اور پھر سے قربت کے ان حسین لمحات میں کھو گئی۔

آنے والے دو تین دن میری ذہنی کیفیت عجیب سی رہی۔ کبھی وجود پر کیف آوری سرشاری چھانے لگتی اور کبھی اندر ہی اندر احساسِ ندامت کچوکے لگانے لگتا۔ ضمیر ملامت کرنے لگتا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، ٹھیک نہیں کیا۔ شریف اور عزت دار عورتیں کسی غیر محرم کے اس قدر قریب نہیں جاتیں۔ پھر خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتی کہ ”محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔“ میں نے کون سا اپنی حد سے تجاوز کیا ہے مگر یہ تسلیاں تشفیاں مجھے مکمل طور پر پرسکون نہ کر پاتیں۔ بیٹھے بٹھائے کوئی خلش سی چپھنے لگتی اور میں بے چین ہو جاتی۔

دوسرے دن خاور کا فون آیا۔ میں نے ریسیو کیا تو اس نے یہ شعر پڑھ کر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔

یہ قربتیں بھی بڑے امتحان لیتی ہیں
کسی سے واسطہ رکھنا تو دور کا رکھنا

اس کا شعر میرے دل کے جذبات کی بھی ترجمانی کر رہا تھا مگر میں نے خود پر قابو پایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔
”خاور پلیز..... اس ملاقات کو بھول جائیں۔ آئندہ آپ کبھی اس کا ذکر نہیں کریں گے۔“
”کیا آپ بھول سکتی ہیں؟“ وہ برجستہ بولا۔ ”میرے لیے تو اس ملاقات کی خوشگوار یادیں کسی قیمتی اثاثے سے کم نہیں ہیں اور میں اپنا یہ قیمتی اثاثہ بہت سنبھال کر رکھوں گا۔“
”چلیں ٹھیک ہے رکھیں سنبھال کر..... مگر میرے سامنے ذکر نہیں کریں گے۔“
”کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔

”مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کر دیا ہے۔“ میں نے آہستگی سے جواب دیا تو وہ بھی چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔

”یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر۔ آپ نے اپنی مرضی اور موڈ کے خلاف میری آخری خواہش پوری کی۔ لیکن مجھے لہذا نہ تھا کہ میری یہ ضد پوری کر کے آپ ضمیر کی چکی میں پسنے لگیں گی۔ آئی ایم سوری نورین۔ میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔“ وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

”نہیں خاور، ایسی کوئی بات نہیں۔ پلیز آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ اچھا یہ بتائیں اب طبیعت کیسی ہے۔ پھر تو وہ جھٹکے نہیں لگے۔“ میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”زلدہ شدید تو نہیں البتہ ہلکے ہلکے جھٹکے تو کسی وقت بھی لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر میں افسردہ ہو گئی۔ ”خاور بس آپ ہمت نہ ہاریں۔ مایوسی اور ناامیدی آپ کے لیے بہت خطرناک ہے۔ ہمیشہ امید کا دامن تھامے رکھیں۔ اللہ کوئی نہ کوئی بہتری پیدا کر دے گا انشاء اللہ۔“ میں نے ڈھارس بندھانے کی پوری کوشش کی۔

”فکر نہ کریں۔ اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ موت سے اتنے خوفزدہ کیوں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ تکلیف موت نہیں زندگی دیتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

اس کی بات سن کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”او کے خاور..... اللہ حافظ۔“

”کیوں..... کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، مہوش آوازیں دے رہی ہے۔“ میں نے فون بند کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”او کے جان..... آئی لو یو.....“ وہ وارنٹی سے بولا اور پھر ایک اور شعر پڑھ ڈالا۔

بدلہ وفا کا دیں گے بڑی سادگی سے ہم

تم ہم سے روٹھ جاؤ گے اور زندگی سے ہم

میں فون بند کر کے کافی دیر تک روتی رہی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ خاور تم میری زندگی میں نہ آتے۔ کسی اپنے کو،

جو جان سے زیادہ عزیز ہو، ہل ہل موت کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھنا بہت اذیت ناک اور جان لیوا ہوتا ہے۔ یہ میں اب سمجھتی تھی۔



اسی رات ایک اور حادثہ میرا منتظر تھا۔ رات کے دو بجے جبار کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ فون اٹھایا تو غفار کا نمبر دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ غفار کا فون اس وقت۔ میں بھی جاگ چکی تھی۔ جب اس نے زیر لب کہا کہ غفار کا فون اس وقت..... تو میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ فوراً سے بھی پیشتر ماموں کا خیال آیا۔ رات کے اس پہر غفار کا فون آنا کوئی اچھی خبر نہیں ہو سکتی۔ میں بھی پریشان ہو کر اٹھ بیٹھی۔

اتنی دیر تک جبار کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا چکا تھا۔

”ہاں غفار، کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا!“

دوسری طرف سے غفار نے نجانے کیا کہا کہ جبار فون بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے پریشانی میں پوچھا۔

”کہہ رہا ہے کہ ابا جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انہیں پھر سے ہارٹ ایک ہوا ہے شاید۔“

میں بھی پاؤں میں چہل ڈالے دوپٹہ کندھے پر رکھ کے اس کے پیچھے دوڑی۔

ہم وہاں پہنچے تو ماموں سخت تکلیف میں تھے۔ وہ پسینے میں شرابور تھے۔ انہوں نے دل والی جگہ پر ہاتھ رکھا ہوا

تھا اور درد سے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ مہوش اور ممانی انہیں سنبھال رہی تھیں۔ غفار نے جبار کو دیکھتے ہی گاڑی کی چابی پکڑی اور پورچ میں جا کر گاڑی اشارت کر کے واپس اندر آیا۔ پھر دونوں بھائیوں نے ماموں کو اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ میں نے اور ممانی نے ساتھ جانے کی بڑی ضد کی مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ ابھی جا کر ان کا چیک اپ کروائیں گے۔ اگر ایڈمٹ ہو گئے تو آکر آپ لوگوں کو لے جائیں گے۔ وہ چلے گئے تو ہم تینوں خواتین بیٹھ کر رونے لگیں۔

”ہمیں رونے کے بجائے ان کے لیے دعا کرنی چاہیے۔“ ممانی نے کہا اور جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئیں۔ جبکہ

ہم دونوں بہنیں بھی زیر لب درود و شریف پڑھنے لگیں۔

مگر سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ کیونکہ میں نے پونے گھنٹے کے بعد جبار کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ ابا جی کی ڈیجھ ہو گئی ہے اور وہ ڈیڈ ہاڈی لے کر واپس گھر آ رہے ہیں۔ میں یہ خبر سنتے ہی اونچی آواز میں رونے لگی۔ مجھے آہ و بکا کرتے دیکھ کر ممانی اور مہوش بھی تمام صورت حال سمجھ گئیں۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد

ماموں کو لے کر وہ دونوں بھائی واپس آ گئے۔

غفار گاڑی سے نکلے ہی اونچی آواز میں روتا ہوا مامانی سے لپٹ گیا۔ جبکہ جبار بھی خاموش کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

ماموں کی لاش ایسبولینس میں لائی گئی تھی۔

”امی، ابوراستے میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ مگر ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید تکلیف کی شدت سے بیہوش ہو گئے ہیں۔ ہم انہیں ہسپتال لے کر گئے تو ڈاکٹروں نے دیکھتے ہی بتا دیا کہ وہ گذر چکے ہیں۔“ غفار روتے ہوئے تفصیل بتا رہا تھا۔

جبار گیا اور سب بچوں کو جگا دیا۔ انہوں نے جب اپنے پیارے دادا کی موت کی خبر سنی تو سب بچے روتے ہوئے دادا جان کی میت کے پاس آ بیٹھے۔ جبار نے ہی تمام رشتہ داروں کو فون کر کے ماموں کے فوت ہونے کی اطلاع دی، کیونکہ غفار تو اس وقت اس قابل نہ تھا۔ فجر کے وقت قریبی مسجد میں ماموں کے انتقال کا اعلان کر دیا گیا۔ اہل محلہ نماز فجر کے بعد ہمارے گھروں میں آنا شروع ہو گئے۔ مردوں کے لیے باہر لان میں دری بچھا دی گئی۔ جبکہ عورتیں سیدھی اندر آ کر بیٹھ رہی تھیں۔ ان میں صوفیہ بھی شامل تھی اور باہر مردوں میں یقیناً خاور بھی موجود تھا۔ کیونکہ وہ فجر کے وقت اٹھ کر نماز باقاعدگی سے ادا کرتا تھا۔ پھر قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا اور پھر مارنگ واک کے لیے پارک میں جاتا تھا۔

ماموں کے جنازے کا وقت گیارہ بجے رکھا گیا۔ نو بجے تک تمام رشتہ دار اور عزیز و اقارب آچکے تھے۔ اور پھر ماموں چار کندھوں پر سوار ہو کر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف چلے گئے اور ہم سب روتے بلکتے انہیں الوداع کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔



رات کو سونے کے لیے لیٹی تو بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ پچھلی رات سے لے کر آج کا پورا دن بیٹھ کر اور روتے ہوئے گزارا تھا۔ ایک پل کے لیے بھی کمر سیدھی نہ کی تھی۔ پہلے خاور کی بیماری کا سن کر حد درجہ صدمہ جھیل چکی تھی۔ پھر بخار نے دودن میں جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اب ماموں کی ناگہانی موت نے جیسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک ایک کر کے ساری شقیں ہمتیاں مجھ سے چھن رہی تھیں۔ میری زندگی کا خالی پن بڑھتا جا رہا تھا۔

آج موت کے بے رحم اور سفاک عفریت نے ایک اور قیمتی جان نگل لی۔ ایک اور چاند سا چہرہ منوں مٹی تلے دفن ہو گیا۔ موت ایک ایسی اٹل اور خوفناک حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ یہ لمحوں میں زندگی کا ٹٹمٹا چراغ گل کر دیتی ہے۔ یہ ہنستے مسکراتے، زندگی کی حرارت سے بھرپور انسان کو چند ثانیے میں بے جان گوشت کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ گوشت جو زیادہ دیر گرمی میں پڑا رہے تو بدبودینے لگتا ہے۔

آہ..... موت تو اتنی سنگدل ہے کہ یہ بھی نہیں سوچتی کہ جس جان کو تو نگل رہی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے کتنی اہم

اور بیش قیمت ہے.....

سوچ سوچ کر آنکھیں پھر سے نمناک ہو گئیں۔ سر باندھ کر لیٹی تو تھوڑی دیر بعد نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔



دوسرے دن رسم قیل کے بعد باقی ماندہ مہمان بھی رخصت ہونے لگے۔ صوفیہ اور باقی محلے دار عورتیں ابھی

میرے پاس بیٹھی تھیں۔ ہم سب عورتیں کھجور کی گٹھلیوں پر آیت کریمہ پڑھ رہی تھیں، ماموں کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے۔ ممانی جانِ عدت میں بیٹھ گئی تھیں۔ اگلا ایک ہفتہ بڑی گہما گہمی اور مصروفیت میں گذرا۔ میں اور مہوش بچوں کو رخصت کر کے گٹھلیاں لے کر بیٹھ جاتیں اور پھر شام تک بیٹھی پڑھتی رہتیں۔ اس دوران تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ عورتیں ہمارے پاس آکر ٹیٹھتیں جبکہ مرد غفار کے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھتے۔ جبار فوتگی کے بعد چوتھے دن اپنی نوکری پر چلے گئے تھے کیونکہ انہیں اس سے زیادہ چھٹیاں نہیں ملی تھیں۔

ساتویں دن بریانی کی دیکیں پکوا کر دروسوں میں بھیج دی گئیں اور سوگ ختم کر دیا گیا۔

زندگی پھر سے پرانی ڈگر پر لوٹ آئی۔ مجھے ماموں بہت یاد آتے۔ ان کا خوبصورت اور شفیق چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا۔ ان کا میٹھا میٹھا بولنا، ہر بات پر مسکراتا، میری حمایت میں جبار سے لڑتے رہنا۔ ہر چیز یاد آتی۔ ان سات دنوں میں خادو اور اس کی بیوی صوفیہ نے ایک نغمہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ہر روز گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ضرور آتے رہے تھے۔

آٹھویں دن صبح ساڑھے دس میں نے خادو کو فون کیا۔ اس کا حال احوال پوچھا۔ جواباً اس نے بڑے خوبصورت الفاظ میں ماموں جان کی وفات کا افسوس کیا اور انہیں اچھے لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا۔

”خادو ایک ایک کر کے سبھی محبت کرنے والے ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔“ میں بات کرتے کرتے رو پڑی۔ ”حوصلہ کرو۔ میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ اٹل لہجے سے بولا تو میں دل میں ہنسی کہ جس کی زندگی کا ایک لمحے کا اعتبار نہیں۔ وہ ہمیشہ ساتھ نبھانے کی بات کر رہا ہے۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کبھی اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاؤں گی۔“ میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”خود کو سنبھالو یا ر۔ موت، زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔“

”خادو کیا کبھی..... تم نے سوچا ہے کہ ہماری محبت..... کا انجام کیا ہوگا۔“ میں تشویش سے بولی۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔ خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ میری زندگی ہی کتنی ہے جو یہ راز فاش ہوگا۔ یہ راز میرے ساتھ ہی میری قبر میں چلا جائے گا۔ تم رو دھو کر صبر کر لینا۔ اللہ اللہ خیر صلا..... کسی کو خبر نہیں ہونی کہ ایک پروانہ جلتی ہوئی شمع پر نثار ہو گیا۔“ یہ کہہ کر وہ ہچکی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تو عمر بھر ساتھ نبھانے کی بات کر رہے تھے۔“ میں خفگی سے بولی۔

”حقیقت پسند بنو۔ وہ تو صرف تمہیں دلاسا دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ورنہ کیا تم نہیں جانتی کہ میں اپنے دماغ میں ٹائم بم لیے پھر رہا ہوں جو کسی بھی وقت بلاسٹ ہو سکتا ہے۔“ اس نے پھر مذاق کے رنگ میں اتنی سنگین بات کہہ ڈالی۔ ”کچھ اور نہیں کہنا تو فون بند کر دوں۔“ میں سنجیدگی سے بولی تو وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”آئی ایم سوری نورین، اگر میری کسی بات کا برا لگ گیا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ مگر حقیقت سے نظریں بھی تو نہیں چرائی جاسکتیں۔ اچھا یہ بتاؤ کبھی بچوں کو تو شک نہیں ہوا۔“

”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔ خادو انہیں کبھی میرے اور تمہارے تعلق کا پتا چلا تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ اُن کی

نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر جاؤں گی اور نظروں سے گرا ہوا انسان کبھی اٹھ نہیں پاتا۔“ میں رو ہنسی ہو کر بولی۔
 ”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ مجھ پر بڑا اعتماد کرتے ہیں۔ میری بہت عزت کرتے ہیں اور میں ان کے بھروسے کو کبھی
 ٹوٹنے نہیں دوں گا۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ ان بچوں کی خاطر ہی میں نے جبار کے ساتھ پوری زندگی گزار دی ہے۔ انہی کی خاطر
 اسے برداشت کیا ہے۔ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے خود ہر روز ذلت سہتی ہوں..... اور اگر یہی
 بچے مجھ سے نفرت کرنے لگے تو میرے پاس جینے کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی۔“ میں بہت جذباتی ہو گئی تھی۔
 ”ریلیکس جان..... ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔“ اس نے پھر سے مجھے تسلی دی۔ ”ہم کون سا ملاقاتیں کر رہے
 ہیں صرف فون پر کبھی کبھار بات ہی کرتے ہیں نا۔ اور اگر تمہیں ذرا بھی خطرہ محسوس ہوا تو مجھے بتا دینا۔ ہم بات کرنا بھی بند کر
 دیں گے۔ میرے لیے یہی کافی ہوگا کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں اور میرے لیے دعا کرتی ہیں..... اور پھر یہ بات میں
 پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے آپ کی عزت سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔“
 اس کی باتوں سے میں خاصی حد تک پرسکون ہو گئی۔ مجھے خاور پر فخر محسوس ہونے لگا۔ مجھے ناز تھا کہ جس انسان
 سے میں محبت کرتی ہوں وہ کوئی عام یا معمولی انسان نہیں۔ بہت محبت کرنے اور چاہے جانے کے لائق ہے۔
 ”خاور.....“ میں محبت میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

”جی.....“

”آئی لو یو.....“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ آج میں نے پہلی مرتبہ کسی سے یہ الفاظ کہے تھے۔ میرے الفاظ
 کا خاور پر کیا ری ایکشن ہوا تھا وہ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر پورے پانچ منٹ بعد اس کا SMS اس شعر کی
 شکل میں آ گیا۔

اس قدر ٹوٹ کے چاہا ہے کہ حساب نہیں
 تم میری زندگی کا حصہ ہو خواب نہیں
 اگر لگا ہے محبت پہ کفر کا فتویٰ
 میرے نصیب میں گناہ ہے پھر ثواب نہیں

.....☆.....

وقت اپنی جیسی رفتار سے گزرتا چلا گیا۔ موسم گرما اپنے اختتام کو پہنچا۔ ماموں کی وفات کا غم کافی حد تک کم ہو چکا
 تھا۔ ممانی کی عدت پوری ہونے میں دس پندرہ دن رہ گئے تھے۔ اس دوران خاور سے بہت کم ملاقات ہوئی۔ کیونکہ ہماری
 ملاقات کا واحد ذریعہ مارننگ واک تھی اور وہ میں نے چھوڑ دی تھی۔ ہاں کبھی کبھار دل چاہتا تو ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد جاتی اور
 ایک چکر لگا کے آ جاتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جس دن میں جاتی اس دن خاور نہ آتا۔ صوفیہ کبھی کبھار ہمارے گھر آ جاتی تھی۔
 اب تو اس کی مہوش سے بھی خاصی ہیلو ہائے ہو جاتی تھی۔ میں بھی دو تین مرتبہ صوفیہ کے ہاں گئی تھی اور ایک دفعہ خاور سے بھی
 گھر پر ملاقات ہو گئی تھی۔ صوفیہ کے سامنے خاور نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس نے نہ تو زیادہ بات کی تھی مجھ سے اور
 نہ زیادہ دیر ہمارے پاس بیٹھا تھا۔

ہاں البتہ فون پر تقریباً ہر روز ہماری بات ہوتی تھی جو کبھی مختصر اور کبھی طویل ہو جاتی۔ دوران گفتگو اکثر کوئی نہ کوئی متنازعہ موضوع چھڑ جاتا، جس پر ہم دونوں خوب بحث و تکرار کرتے۔ ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے اور ہماری گفتگو کا اختتام ہمیشہ خوشگواریت پر ہی ہوتا۔

اکتوبر چڑھنے کی دیر تھی کہ بلال بھائی آدھمکے۔

”ہاں تو نورین کب آرہی ہو ہمارے گھر دن لینے کے لیے؟“ وہ دعا سلام کر کے بیٹھے تو فٹ سے حرف مدعا زبان پر لے آئے۔

”بھائی جان، مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو اتنی جلدی کس بات کی ہے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔

”مانا کہ لڑکے کی ماں ہو۔ تھوڑے بہت نخرے کرنا تو تمہارا حق بنتا ہے مگر اتنے نخرے ٹھیک نہیں۔“ اب کی بار مہوش بولی، جو بلال بھائی کے ساتھ آئی تھی۔

”بلال بھائی، آج آپ صائمہ بھابی کو لانے کے بجائے مہوش کو لے آئے۔ ہاں سوچتے ہوں گے کہ وہ بے چاری تو چپ چاپ بیٹھی منہ نکلتی رہتی ہے۔ کسی چالاک ساتھی کو ساتھ لے کر جانا چاہیے جو ڈراؤنڈ کر بات کرے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے مہوش کی طرف دیکھا۔

”زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں دونوں طرف سے برابر کی رشتے دار ہوں۔ لڑکے کی خالہ اور لڑکی کی پھوپھو ہوں۔“ وہ اتراتے ہوئے بولی۔

”لڑکا خیر سے برسرِ روزگار ہے۔ اب تمہیں کیا اعتراض ہے نورین۔“ بلال بھائی نے مجھے گھورا۔

”بلال بھائی ابھی دونوں بچے بہت کم عمر ہیں۔ ایک سال اور گزر جاتا تو بہتر تھا۔“ میں منمنائی۔

”ہوں..... تو تم ایک سال اور اپنے بیٹے کی کمائی کھانا چاہتی ہو۔“ مہوش نے پھر اپنے ترکش سے تیر چھوڑا۔

”ویسے برا نہ منانا نورین۔ جبار بھائی کی تنخواہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔“

”تم تو چونچ بند رکھو۔“ مجھے بھی غصہ آ گیا۔

”اوہو..... تم دونوں بہنوں کا بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔ یہ آپس میں لڑنا بند کرو اور مجھے بتاؤ کب آرہی ہو دن مقرر

کرنے کے لیے۔“ بلال بھائی نے گھر کا تو دونوں خاموش ہو گئیں۔

”اب آئے ہیں تو اپنی مرضی بھی بتاتے جائیں۔ ہم اس دن آجائیں گے بارات لے کر۔“ میں نے طنز یہ لہجہ

میں کہا تو بلال بھائی خجل ہو گئے۔

”جھلے..... اس طرح دن تھوڑے مقرر کیے جاتے ہیں۔ لڑکے والے لڑکی والوں کے ہاں جاتے ہیں۔ رات کو

بیٹہ کر سب کے صلاح مشورے سے ڈیٹ فکس کی جاتی ہے۔“ بلال بھائی اب بڑے پیار سے بولے۔

”ٹھیک ہے بلال بھائی، جبار آتے ہیں تو میں ان سے مشورہ کر کے آپ کو بتاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں چلتا ہوں۔ ”وہ کھڑے ہو کر پھر بولے۔“ مگر ایک بات یاد رکھنا شادی ہر حال میں اکتوبر

کے اینڈ پر ہی ہونی ہے۔ ہماری طرف سے یوں بتا دیا کہ بلال بھائی چلے گئے تو میں بول اٹھی۔

”یہ بلال بھائی کو اچانک کیوں آگ لگ گئی ہے تادی رنے کی۔“ میری بات سن کر مہوش کے تو ہنس ہنس کر

پیٹ میں بل پڑ گئے۔
 ”بلال بھائی کے سامنے کیسے بھیگی ملی بنی بیٹھی تھی اور اب ان کے جاتے ہی شیر بن گئی۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سے ہنسنے لگی۔

”اور تم جوان کی چچی بن کر ان کے ساتھ آئی ہو تو مجھے زہر لگتی ہو۔“
 ”کیوں زہر لگتی ہوں، بھائی ہیں وہ میرے۔ بہن ہونے کا فرض ادا نہ کروں صرف تمہاری دیورانی ہی بنی پھرتی رہوں۔“ وہ ترنت بولی اور میں اپنا سامنہ لے کر رہ گئی..... اور ویسے بھی باتوں میں، میں اس سے کب جیت سکتی تھی۔
 اور پھر اسی رات بڑے بزرگوں کی کانفرنس ہوئی۔ جس کی مہمان خصوصی ممانی جان تھیں۔ اس میٹنگ میں سب کے باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ بلال بھائی کی بات مان لینی چاہیے۔ کیونکہ ہم پنجابیوں کی ایک ریت یہ بھی ہے کہ جب لڑکی والے شادی کے لیے مجبور کریں تو ان کی بات فوراً مان لی جانی چاہیے۔
 ممانی کی عدت جمعے والے دن پوری ہو رہی تھی۔ لہذا یہ طے پایا کہ دن مقرر کرنے کے لیے ہفتے کو جایا جائے۔

☆.....

ہفتے والے دن ہم اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ تیار بیٹھے تھے۔ بس شاہ زیب اور زوہیب مٹھائی اور فروٹ لینے گئے تھے۔ ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ ہم سب بچے بڑے لان میں تیار ہو کر کرسیوں پر بیٹھے شاہ زیب وغیرہ کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ چوکیدار کو، جو چوبیس گھنٹے وہیں کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس کو گھر کی رکھوالی کے لیے پرے ہاؤس میں چھوڑا اور ہم سب، یعنی پرے ہاؤس کے تمام مکین دو گاڑیوں میں سوار ہو کر بلال بھائی کے گھر سر شام جا پہنچے۔

بلال بھائی اور صائمہ بھابی نے ہمارا پر تپاک استقبال کیا۔ ان کی چھوٹی بیٹی فاطمہ اور زریں کی سہیلیوں نے ہم پر گلاب کی پتیاں نچھاور کیں اور پھر ہم سب لاؤنچ میں بیٹھ گئے۔ چاچا اور چاچی بھی بلال بھائی کی طرف سے بلائے گئے تھے۔

”مہوش تم آج کس طرف ہو۔ ذرا واضح کر دو۔“ جبار نے ہنستے ہوئے مہوش پر چوٹ کی۔

”ہاں ہاں بتاؤ ذرا۔ آج شاہ زیب کی خالہ بن کر آئی ہو یا زریں کی پھوپھی۔“ میں بولی۔

”نہ شاہ زیب کی خالہ اور نہ زریں کی پھوپھی۔ میں تو آج شاہ زیب کی چاچی بن کر آئی ہوں۔ کیوں شاہ زیب کے چاچا جی۔“ اس نے غفار کی طرف دیکھ کر ایک ادا سے کہا تو سب ہنسنے لگے۔

”شاہ زیب کی چاچی تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج تو ہم صرف شاہ زیب کے چاچا اور چاچی ہیں اور ہمارا یہ رشتہ باقی ہر رشتے پر بھاری ہے۔“ غفار بھی ہنستے ہوئے بولا۔

”بیٹا تمہارا ہر رشتہ بہت قریبی اور بھاری ہے۔“ چاچا غفور بڑی شفقت سے بولے۔

شاہ زیب ہماری باتیں سن سن کر شرمسار ہوا تھا۔ جبکہ زوہیب ہر بات کا برجستہ جواب دے کر محفل کو زعفران زار بنا رہا تھا۔ زریں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں دبکی ہوئی تھیں۔ زریں اور فاطمہ کو وہی کمرہ دیا گیا تھا جو کبھی میرے اور مہوش کے استعمال میں رہتا تھا۔ اس گھر سے میری بہت سی خوشگوار اور ناخوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ سب ہنس کھیل رہے

تھے اور مجھے امی، ابو اور نانی کی کمی بری طرح محسوس ہو رہی تھی اور اب تو ماموں کی ان کی کمی سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ میں ان گذروں ہوؤں کو یاد کر کے افسردہ سی ہو گئی۔ اگر آج یہ سب لوگ ہمارے درمیان ہوتے تو کتنے خوش ہوتے اور اس محفل کی رونق بھی کتنی گنا زیادہ ہوتی۔

”امی کہاں کھو گئیں ہیں؟“ زوہیب نے مجھے بازو سے پکڑ کر ہلایا۔

”کہیں نہیں۔“ میں چونکی..... میں پھر سے ہنسنے بولنے لگی اور باتوں میں حصہ لینے لگی۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ پروفیسر عابد صاحب اپنی پوتی کے ساتھ تشریف لائے۔ میں پروفیسر صاحب کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ آگے بڑھ کر انہیں ملی۔

انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میں نے ان کی پوتی حادیہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ حادیہ سب کو سلام کر کے اندر زریں کے پاس اس کے کمرے میں چلی گئی۔ کیونکہ وہ زریں کی گہری سیٹلی اور کلاس فیلو تھی۔ اسی وجہ سے زریں نے آج اسے بھی انوائٹ کیا تھا۔ جبکہ پروفیسر عابد صاحب وہیں ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ پروفیسر عابد صاحب ہمارے استاد تھے۔ وہ بچپن میں ہمیں ٹیوشن پڑھانے کے لیے ہمارے گھر آتے تھے۔ اس کے علاوہ کالج میں بھی بلال بھائی کے ٹیچر تھے۔ پروفیسر عابد صاحب بڑے نفیس انسان تھے۔ وہ اردو کے پروفیسر تھے۔ بیٹھے ہی بولے۔

”نورین بیٹا بہت مبارک ہو۔ آج بیٹے کی شادی کی ڈیٹ فکس کر رہی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وقت کتنی تیزی سے گذرتا چلا جاتا ہے۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے جب تمہاری شادی ہوئی تھی اور میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اور آج دیکھو خیر سے تم اپنے بیٹے کی شادی کرنے جا رہی ہو۔ ویسے بڑی جلدی شادی کر رہے ہو..... دونوں بہن بھائی..... کیا ایک دوسرے کے سمندھی بننے کا بہت شوق ہے۔“ یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے بڑے زور سے ہتھکڑیاں لگایا اور ہم سب بھی مسکرانے لگے۔ پروفیسر صاحب بڑے خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔

”سرجی..... ان ذمہ داریوں سے جتنی جلدی فراغت مل جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ بلال بھائی بڑی متانت سے بولے تو پروفیسر صاحب نے پھر ایک جاندار ہتھکڑیاں لگایا۔

”بھئی تم اتنے ذمہ دار کب سے ہو گئے۔ میرا یہ نالائق شاگرد آج اتنا سمجھدار ہو گیا ہے۔ یقین نہیں آتا۔“

”سرجی..... بچے سن رہے ہیں۔“ بلال بھائی دھیمی آواز میں بولے تو بچے مسکرانے لگے۔

”اور ہاں نورین، ایک بات کے لیے پھر سے مبارک باد قبول کرو۔“ پروفیسر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے تو بلال بھائی نے سکون کی سانس لی۔

”کس بات کی سر؟“ میں حیران ہوئی۔

”رائٹر بننے کی اور کس بات کی۔ خیر سے ہماری بیٹی ناول نگار بن گئی ہے۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔ میں تو شروع سے تمہاری ذہانت و فطانت کا قائل تھا۔ تمہارے ابو سے اکثر کہتا رہتا تھا کہ چودھری صاحب اس لڑکی کی اگر حوصلہ افزائی کریں گے تو یہ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گی۔ مگر اس وقت تمہارا دھیان آرٹ کی طرف تھا۔ وہ شوق چھوڑ دیا کیا؟“

”جی سر.....“ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں؟ تم تو بڑی اچھی ڈرائنگ بنانے لگی تھیں، پھر کیا ہوا تھا۔“ پروفیسر صاحب کی باتیں سن کر میں بلال

بھائی کی طرف دیکھنے لگی اور وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔

”بس سر..... پھر شادی ہوگئی۔“ میں دھیمے لہجے میں بولی۔

”مجھے تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہارے ابو نے اچانک تمہاری شادی کیوں کر دی۔ آخر اتنی جلدی اور اچانک کیوں۔“ پروفیسر صاحب کی باتیں سن کر سب کو جیسے سانپ سوگھ گیا تھا۔ ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ جبکہ بچے حیرت سے ہمارے منہ تک رہے تھے۔

”سر..... چھوڑیں نا..... ان باتوں کو۔ ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ نورین کی شادی شاید اس لیے ابو نے جلدی جلدی کر دی تھی کیونکہ ان کی زندگی کم تھی اور وہ اپنی زندگی میں اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ اس کی شادی کے چند مہینوں بعد ہی امی اور ابو دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ یہ تو پھر بھی خوش قسمت ہے کہ ماں باپ نے اپنی شفقت کے سائے تلے اسے رخصت کیا۔ جبکہ میں اور بلال بھائی تو اس سعادت سے محروم رہے۔“ مہوش اداس لہجے میں بولی تو سبھی دکھی ہو گئے۔

”بہر حال نورین بیٹی، تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ میں نے تمہارے دونوں ناول پڑھے ہیں۔ بہت اچھا لکھتی ہو۔ کوشش جاری رکھنا، ہمت نہ ہارنا۔ اس شوق کو جاری رکھنا۔ اس کو بھی بیچ راہ میں نہ چھوڑ دینا۔ آرٹ نہ سہی، ادب ہی سہی۔ ہے تو فنون لطیفہ ہی کی شاخ۔“ وہ مسکرائے۔

”انشاء اللہ سر..... میں یہ مشغلہ تا عمر جاری رکھوں گی۔“ میں نے محسوس کیا کہ ہماری اس گفتگو سے جبار اور مہوش ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔ ناگواری ان دونوں کے چہروں سے عیاں تھی جبکہ غفار بڑی دلچسپی سے یہ گفتگوں رہا تھا۔ بلال بھائی بھی اکتاہٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ ”میں دیکھتا ہوں کھانے میں کتنی دیر ہے۔“ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد بلال بھائی نے کہا کہ کھانا لگ چکا ہے۔ انھیں اور کھانا کھالیں۔

کھانا ڈرائنگ روم میں بڑی ڈائننگ ٹیبل پر لگایا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی خوش گپیاں اور ہنسی مذاق جاری رہا۔ کھانے کے دوران سر عابد نے مہوش سے پوچھا۔

”ہاں بھئی مہوش، تم سناؤ تمہارے کیا کیا مشاغل ہیں؟ یا تم آج بھی کھانے اور سونے کے علاوہ کچھ نہیں کرتی۔“ یہ بات سن کر سبھی ہنسنے لگے اور مہوش خفت زدہ ہو گئی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں سر۔ گھر کی ذمہ داریاں کچھ کم نہیں ہوتیں۔ سارا دن سر کھانے کی فرصت نہیں ملتی۔“

”تو تمہارا مطلب ہے نورین اپنی گھریلو ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی۔“ سر نے ترنت جواب دیا تو مہوش کھسیا کر بولی۔

”میرا مطلب یہ تو نہیں تھا سر۔ اب ہر کام ہر کوئی تو نہیں کر سکتا نا۔ اس میں لکھنے کا فن ہے تو مجھ میں ہو سکتا ہے کوئی اور خوبی ایسی ہو جو اس میں نہ ہو۔“ مہوش کے لہجے سے حسد کی بو آرہی تھی۔

”کوئی ایسی خوبی..... مجھے تو آج تک نظر نہیں آئی۔“ غفار نے بھی موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

”اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔ مجھے اس طرح کے فضول شوق بالکل پسند نہیں۔ خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنا اور

”قہمت لی لہا بیاں تخلیق کرنا۔“ مہوش زہر خند سے بولی تو پروفیسر صاحب حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں بھی اس کی بات سے الجھ کر رہ گئی۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب زیادہ تر خاموش رہے۔ انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس کے بعد شادی کے دن کے لیے اچھی خاصی بحث چھڑ گئی۔ آخر سب کی متفقہ رائے سے تیس اکتوبر کا دن مقرر کیا گیا اور مہندی کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں گھرانے ایک جگہ جمع ہو کر مہندی کی رسومات کر لیں کیونکہ تھے تو آپس میں ہی اور اس کے لیے ہمارے پرے ہاؤس کا وسیع و عریض لان منتخب کیا گیا۔

بارات اور ویسے کے لیے بھی ایک ہی میرج ہال پسند کر لیا گیا۔ دن مقرر کرنے کے بعد ہماری لائی ہوئی مٹھائی کی ٹوکریوں کو کھولا گیا اور سب کا منہ میٹھا کر لیا گیا۔ پروفیسر صاحب اور زریں کی سہیلیاں تو کھانا کھانے کے بعد رخصت ہو گئے جبکہ ہم رات گیارہ بجے تک وہیں بیٹھے رہے۔ پھر زریں کو بھی کھینچ کر باہر سب کے بیچ بٹھایا گیا۔ مہوش اسے کھینچ کر باہر لے آئی تھی۔ رات کے گیارہ سوا گیارہ ہم جانے کے لیے اٹھے اور یہ شاندار محفل برخاست ہو گئی۔

☆.....

شادی میں کل دن باقی تھے، تقریباً پچیس پچیس..... اور اس قلیل مدت میں ساری تیاریاں مکمل کرنی تھیں۔ ویسے تو اصل تیاری لڑکی والوں نے کرنی ہوتی ہے۔ لڑکے کی شادی کا انتظام تو ایک ہفتے میں بھی ہو سکتا ہے بس نقدی پاس ہونی چاہیے۔ ہر چیز بازار میں ریڈی میڈ اور تیار مل جاتی ہے۔

دونوں گھروں میں پہلے پہلے بچے کی شادی تھی۔ خوب ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا۔ اب تو خادر سے بھی کئی کئی دن فون پر بات نہ ہو پاتی۔ وہ اکثر گلے شکوے کرتا رہتا کہ آپ بیٹے کی شادی میں ایسی مصروف ہوئی ہیں کہ مجھے تو بھول ہی گئی ہیں۔

”خادر تم جانتے تو ہوا تنے کم دن رہ گئے ہیں اور ابھی بہت ساری چیزیں لانی باقی ہیں۔ ویسے تم تو تیاری کر رہے ہونا شادی کی۔“

”ایسی ویسی..... آپ شادی پر دیکھیں گی مجھے تو پھڑک انھیں گی۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔

”ایسا کیا کرو گے کہ میں پھڑک ہی جاؤں گی۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔

”سر پرانز ہے..... پہلے کیوں بتاؤں۔“ وہ بچوں کی طرح اٹھلا کر بولا تو مجھے اس پر بہت پیار آیا۔

”اچھا مہندی پر تو آؤ گے نا۔“ میں نے پوچھا۔

”اگر آپ بلائیں گی تو ضرور آؤں گا۔“

”مہندی میں صرف خاص خاص لوگوں کو ہی انوائٹ کیا جائے گا۔ دونوں گھرانوں کی مشترکہ مہندی ہوگی اور وہ

بھی ہمارے لان میں۔ کس گید رنگ ہوگی اس لیے سب اپنے خاص رشتے دار ہی ہوں گے۔“

”اوہ، پھر تو میرا نام مناسب نہیں ہوگا۔ یہ خالص آپ کا فیملی فنکشن ہوگا۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”ہرگز نہیں..... تم آؤ گے بلکہ تمہاری پوری فیملی آئے گی..... سمجھ تم۔“ میں زور دے کر بولی۔

”اوکے میڈم..... جو آپ کا حکم..... یہ غلام آپ کے کسی بھی حکم سے سرتابی کی جرات نہیں کر سکتا۔“

”یہ کیسا غلام ہے جو اپنے آقا کو صرف باتوں سے راضی کرتا ہے۔“ آج میرا موڈ شرارت پر اکسا رہا تھا۔

”آپ حکم کریں آقا..... غلام حاضر ہے..... کیا خدمت کروانا چاہتی ہیں؟“ وہ بھی شرارت بھرے لہجے میں

بولی۔

”اگر میں کہوں کہ میری ٹانگیں دبا دو..... تو کیا دباؤ گئے۔“

”صرف ٹانگیں ہی نہیں بلکہ پاؤں بھی دباؤں گا۔ آپ ایک دفعہ حکم تو دے کر دیکھیں۔ کام تسلی بخش نہ ہوا تو غلام ہر سزا جھیلنے کے لیے تیار ہوگا۔ ویسے ایک کام اور میں بہت اچھا کرتا ہوں۔ وہ کروائیں گی تو طبیعت خوش ہو جائے گی آپ کی۔“

”وہ کیا؟“ اس کی باتوں سے میرے وجود پر عجیب سی سرشاری چھا رہی تھی۔ اس لیے بے خیالی میں پوچھ بیٹھی۔

”باڈی مساج۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔

”باڈی مساج۔“ میں دھیرے سے بولی..... پھر جب الفاظ پر غور کیا تو چلا اٹھی۔

”کیا..... تم ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہے ہو؟“

”سوری آقا..... کیا غلام سے کوئی گستاخی ہوگئی۔“ وہ معصومت سے بولا۔

”تم بھی کئی دفعہ حد کراس کر جاتے ہو خاور۔“ میں ڈپٹ کر بولی اور فون بند کر دیا۔

اُف اس کی بات سن کر میں تو پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ سچ کہتے ہیں مرد ہوتے ہی بے شرم ہیں۔

☆.....

شادی کے لیے میں نے اپنے لیے اور فاریہ کے لیے خوب شاپنگ کی۔ زوہیب نے بھی باپ سے شاپنگ کے لیے بھاری رقم وصول کی۔ جبار ہر بات پر ٹوکتا اور نصیحتیں کرتا کہ یہ نہ کرو وہ نہ خریدو۔ یہ فضول خرچی ہے مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔ میرے پہلے بیٹے کی شادی تھی۔ سارے ارمان نکالنا چاہتی تھی۔

شادی کا ڈچھپ کر آئے تو اسی رات غفار اور جبار کا رڈ لے کر لکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ جب خاور کی باری آئی تو ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ جبار کا کہنا تھا کہ خاور اور اس کی فیملی کو بارات اور ویسے پر بلایا جائے، مہندی پر نہ بلایا جائے۔ جبکہ بچے ضد کرنے لگے کہ خاور بھائی کو مہندی پر ضرور بلایا جائے۔

غفار چپ چاپ بال پن پکڑے یہ بحث سنتا رہا۔ شادی کا رڈ وہی لکھ رہا تھا کیونکہ اس کی ہینڈ رائٹنگ زیادہ خوبصورت تھی۔ آخر بچے جیتے اور جبار کو مانتے ہی بنی۔ پھر خاور کے کارڈ میں مہندی والا کارڈ بھی ڈال دیا گیا اور میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔

☆.....

پھر مہندی والا دن بھی آن پہنچا۔ صبح ہی لائیں لگانے والے آگئے۔ پورے پرے ہاؤس کو لائٹوں اور رنگین ققموں سے سجایا گیا۔ لان میں دلہا دلہن کے لیے سٹیج تیار کیا گیا اور اسٹیج کے سامنے کرسیاں لگائی گئیں۔ کرسیوں نے بھی پیلے رنگ کے پیرہن پہن رکھے تھے۔ نیچے گھاس پر دبیز قالین بچھا دیا گیا تھا۔

سرشام ہی لائیں آن کر کے پرے ہاؤس کو بقیہ نور بنا دیا گیا۔ فاریہ اور کرن نے مہندی کے لیے پیلے گوٹی کناری والے سوٹ بنوائے تھے جبکہ مہوش نے گرین اور میں نے لائٹ اور نچ کلر کا کاڈار سوٹ بنوایا تھا۔ کرسیوں کی دو

قطاریں تھیں۔ ایک قطار عورتوں کے لیے جبکہ دوسری مردوں کے لیے مخصوص تھی۔ درمیان میں گزرنے کے لیے راستہ بنایا گیا تھا۔

اُٹھ بجے مہمان آنا شروع ہو گئے۔ ہم مہمانوں کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ میری نگاہیں بار بار گیٹ کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ آخر خاور اور صوفیہ آ ہی گئے۔ صوفیہ نے مٹھائی کا ڈبہ پکڑا ہوا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر اُن کی طرف لپکی۔

”السلام علیکم۔“ وہ دونوں اکٹھے ہی بولے۔

”وعلیکم السلام۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”بیٹے کی شادی بہت مبارک ہو۔“ خاور بڑی شائستگی سے بولا۔ اس کی نظریں مسلسل میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”خیر مبارک۔“ اتنی دیر تک غفار قریب آ گیا پھر خاور اس سے ملنے لگا اور غفار اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اسے مردوں والے حصے کی طرف لے گیا اور میں صوفیہ کو لے کر عورتوں والی سائیڈ پر آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بلال بھائی اپنے مہمانوں سمیت آ گئے۔ دلہن بھی ہمراہ تھی۔

ہم لوگوں نے بھی بڑے جوش و خروش سے ان مہمانوں کا استقبال کیا۔ ان پر پھولوں کی پتیوں نچھاور کیں۔ پھر سب مہمانوں کو پر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ جو وہیں لان کے ایک طرف لگایا گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر رسم حنا کا افتتاح کیا گیا جس کی شروعات مہمانی جان سے کی گئیں۔ سب سے پہلے انہوں نے سٹیج پر چڑھ کر اپنے پوتے شاہ زیب کو اور اس کی دلہن کو مہندی لگائی۔

مہندی کی رسم شروع کرنے سے پہلے دونوں کا نکاح پڑھوایا گیا تھا۔ نکاح کے بعد مبارک سلامت کا شور مچ گیا تھا۔ پھر ہماری طرف سے چھوہارے بانٹے گئے اور پھر مہندی لگانے کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔

مہمانی مہندی لگا کر نیچے اُتریں تو پھر چاچا اور چاچی کو بھیجا گیا۔ ان کے بعد ہماری باری آئی۔ یعنی میں اور جبار اسٹیج پر گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھے۔ میں نے بچوں کو مہندی لگائی اور جبار چپ چاپ بیٹھے سووی بنواتے رہے۔ اس کے بعد غفار اور مہوش گئے۔ اس کے بعد سب جوڑی جوڑی کر کے جاتے گئے اور مہندی لگاتے گئے۔ مہندی صرف عورتیں ہی لگاتیں، مرد صرف ساتھ جاتے اور بیٹھ کر واپس آ جاتے۔

میں صوفیہ کے پاس گئی۔ ”اٹھو صوفیہ جا کر شاہ زیب کو مہندی لگاؤ۔“

”نہیں بابی..... میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ کسمائی۔

”کیوں..... کیوں نہیں جاؤ گی؟ تم بھی اپنے ساتھی کے ساتھ جاؤ اور مہندی لگاؤ بچوں کو۔“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا تو وہ کھڑی ہو گئی اور خاور کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی خاور کی طرف دیکھا تو وہ چارونا چار اٹھا اور صوفیہ کے ساتھ اسٹیج کی طرف چل دیا۔ میں انہیں جاتا ہوا دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ دل میں ایک کسک سی اُٹھ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کاش صوفیہ کی جگہ میں ہوتی۔ مگر دل میں اٹھنے والی ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔

خاور جا کر اسٹیج پر شاہ زیب کے پہلو میں بیٹھا۔ میں ابھی تک اسے ہی غور سے دیکھ رہی تھی۔ آج خاور بہت

ہینڈسم اور کم عمر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آف وائٹ سلک کی شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی، جس کے گلے پر نفیس کڑھائی کا باریک باریک کام کیا گیا تھا۔

خاور نے بھی بھانپ لیا تھا کہ میں اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ کن اکھیوں سے بار بار میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اسٹیج سے نیچے اترتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرایا تو میں جھینپ کر اس پاس دیکھنے لگی کہ کوئی میرا جائزہ تو نہیں لے رہا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ سب اپنی دنیا میں مگن تھے۔

دس بجے تک کافی مہمان رخصت ہو گئے تھے پھر صوفیہ اور خاور بھی میرے پاس آئے اور رخصت ہونے کی اجازت طلب کرنے لگے۔

”اگر میں جانے کی اجازت نہ دوں تو کیا آپ لوگ رک جائیں گے۔“ میں نے خاور کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”باجی، بچے گھر میں اکیلے ہیں۔ رات بھی کافی ہو گئی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ صوفیہ نے جلدی جلدی جواب دیا۔

”صوفیہ تم نہیں جاسکتی۔“ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”ابھی ہم نے ڈھولک بجانی ہے۔ خوب ناچ گانا ہو گا اور تمہیں بڑے بڑے ماہیے آتے ہیں۔ یہ بات میں جانتی ہوں۔“
 ”مگر بچے۔“ وہ کراہی۔

”بچے اکیلے تھوڑی ہیں۔ بھرا پر اگھر تو ہے تمہارا۔ پھر کس بات کا ڈر ہے اور پھر بچوں کے پاپا جا رہے ہیں نا ان کے پاس۔“ میں نے خاور کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا مطلب ہے یہاں صرف اس کی ضرورت ہے۔ میری ضرورت کسی کو نہیں۔“ وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔
 ”جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔ یہاں صرف ان کی ضرورت ہے۔ آپ گھر جائیں آرام کریں۔ آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں اور پھر بچے بھی اکیلے ہیں۔“
 ”اوکے..... تو پھر میں چلتا ہوں..... اللہ حافظ۔“ وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے آواز دی۔

”خاور صاحب میری باتوں کا برا مت منائیے گا۔ اگر آپ رکنا چاہتے ہیں تو شوق سے رکیے۔ جبار اور غفار آپ کو پوری کمپنی دیں گے۔“

”صرف جبار اور غفار ہی کیوں، میں بھی یہیں ہوں۔“ بلال بھائی نے پیچھے سے آکر خاور کی پیٹھ پر تھپ ماری تو وہ ہنسنے لگا۔

”جی جی، کیوں نہیں بلال صاحب۔ مگر میں اب آرام کرنا چاہوں گا۔ بڑی تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے۔“ اس نے چند منٹ کھڑے ہو کر بلال بھائی سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور رخصت ہو گیا۔

مہمانوں کے چلے جانے کے بعد صرف گھر کے افراد یا پھر چاچی چاچا اور چند اور قریبی رشتہ دار رہ گئے تھے۔ سب اندر لاؤنج میں آگئے۔ مردوں نے ڈرائنگ روم میں ڈیرہ جمالیا۔ عورتوں اور لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی۔ پھر وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ خدا پناہ۔ صوفیہ کے پاس تو گویا گانوں اور ٹپوں کا ایک پٹارہ تھا جو ایک بار کھلا تو پھر بند ہی نہ ہوا۔ اس نے دنیا جہان کے ٹپے اور ماہیے سنا ڈالے۔ ڈھولک بجا بجا کر جب تھک گئیں تو پھر گد اور قرض شروع ہو گیا۔ مہوش نے خود بھی

بہت ڈانس کیا اور ہر عورت اور لڑکی کو کھینچ کھینچ کر زبردستی ڈانس کروایا۔ پھر ہم دونوں بہنوں نے مل کر گدا ڈالا۔ ہمیں ناپتے ہوئے دیکھ کر ممانی جان ہم پرواری صدقے جا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اٹھ کر سوسو کے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ہم پر لٹانے لگیں۔ لال لال نوٹ ہر طرف اڑنے لگے۔ ملازمائیں اور ان کے بچے نوٹ اٹھانے لگے۔ رات کے دو بجے تک یہ ہنگامہ برپا رہا۔ پھر سب تھک ہار کر ایسے سوئے کہ کسی کو اپنے آپ کی خبر نہ رہی۔

☆.....

اگلے دن بارات تھی۔ وہ بھی رات کا ہی فنکشن تھا۔ ولیمہ بھی ہم نے رات کا ہی رکھا تھا۔ اس لیے دن چڑھے تک سب سوتے رہے۔

بارہ بجے کے بعد سب نے جاگنا شروع کیا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے دو ڈھائی بج گئے۔ اس کے بعد رات کی تیاری شروع ہو گئی۔ لڑکیوں اور عورتوں نے اپنے کپڑے اور زیورات اٹھائے اور پارلر کا رخ کیا۔ پارلر ہمارے گھر کے ساتھ ہی تھا۔

میں بھی بچوں کو اور ان کے ابو کو کپڑے وغیرہ دے کر پارلر چلی گئی۔ شاہ زیب کو تیار کرنے کے لیے بیوٹی سیلون والا گھر آ گیا تھا۔

سات بجے تک ہمارے لان میں مہمان آنا شروع ہو گئے۔ شاہ زیب بلیک ویلوٹ کی شیروانی اور سفید لٹھے کی شلوار پہنے بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ سر پر میرون پگڑی باندھی گئی تھی۔ میں نے بیٹے کو دلہے کے روپ میں دیکھا تو خوشی سے آنکھیں چھلک گئیں۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی بلائیں لیں اور اس کا ماتھا چوم لیا۔ زوہیب بھی لائٹ گرین کرتا شلوار میں خوب دمک رہا تھا۔

”امی آپ نے شاہ زیب بھائی کے ماتھے پر پیار کیا ہے۔ مجھے بھی پیار کریں نا۔“ وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے آگے کرتا ہوا بولا۔

”ہر بات میں اس سے جلیس ہو جاتے ہو۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔ ”چلو پیچھے ہٹو۔ جب تمہاری شادی ہوگی تو تمہارا منہ بھی چوموں گی۔ آئی پراس۔“

”میری شادی کس نے دیکھنی ہے۔ آنے والے وقت کا کیا بھروسہ۔ آپ ابھی مجھے پیار کریں۔“ وہ ضد پراڑ گیا۔

میں اس کے ماتھے پر بوسہ دینے لگی تو وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”اونہوں..... یہاں نہیں..... یہاں۔“ اس نے اپنا گال آگے کیا۔

میں نے اس کے رخسار پر بوسہ دیا تو میری لپ اسٹک کا رنگ اس کے گال پر رہ گیا۔ پاس کھڑے مہمان ہنسنے لگے۔

”اپنا گال صاف کرلو۔ یہ نہ ہود دیکھنے والے غلط سمجھ بیٹھیں۔“ شاہ زیب کے اس فقرے پر ایک مرتبہ پھر ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔

زوہیب جھنجھل ہو کر اپنا گال صاف کرنے لگا۔

پھر شاہ زیب کو باہر لان میں صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ جہاں سب عزیز واقارب نے اسے سلامیاں دیں۔ مودوی والا مودوی بناتا جا رہا تھا۔ پھر فاریہ اور کرن دولہا بھائی کے دائیں بائیں بیٹھ کر باگ پکڑائی کے پیسے مانگنے لگیں۔ یہ بہنوں کا ٹینگ ہوتا ہے جو دولہا گھوڑی پر بیٹھ کر دیتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ دولہا جب گھوڑی پر بیٹھتا تھا تو بہنیں دلہے کی گھوڑی کی باگ پکڑ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ پھر جب تک دولہا انہیں حسب توفیق پیسے نہیں دیتا تھا، بہنیں نہیں ملتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھوڑی کی جگہ گاڑی نے لے لی۔ مگر یہ رسم، بہنوں کی باگ پکڑائی والی ابھی تک برقرار ہے۔

دونوں بہنیں، بھائی کے کانوں میں کھسر پھسر کرتی رہیں اور بھائی بھی ان کے ساتھ سرگوشیوں میں سودے بازی کرتا رہا۔ ہم سب پاس کھڑے دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آخر دس دس ہزار سودا ملے پا گیا۔ شاہ زیب نے دونوں کو دس، دس ہزار دیئے تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ پورے آٹھ بجے سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر میرج ہال کی جانب روانہ ہو گئے جو بلال بھائی کے گھر کے بالکل پاس ہی تھا۔

بارات کا پرتیاک استقبال کیا گیا۔ عورتوں کے گلے میں گلاب کے پھولوں کے ہار ڈالے گئے جبکہ مردوں پر بھی پھولوں کی پتیوں نچھاور کی گئیں۔

زریں سرخ جوڑے میں لہن بنی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ بلال بھائی نے بیٹی کو بہت زیور بنوا کر دیا تھا۔ مجھے اور مہوش کو بھی سونے کے گانگی سیٹ دیئے تھے۔ جبکہ فاریہ اور کرن کو انہوں نے سونے کے بریسلٹ پہنائے۔ یہ سب کچھ ہمیں زریں کے سرسالیوں کے طور پر مل رہا تھا۔ نکاح ایک دن پہلے ہی ہو چکا تھا۔ آتے ہی ہمیں کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد چھوٹی موٹی رسومات ادا کی گئیں جن میں دودھ پلائی کی رسم بھی شامل تھی۔ میں نے بھی فاطمہ کے لیے ایک چھوٹا سا ٹیکس سیٹ بنوا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ میں نے دودھ پلائی کے موقع پر فاطمہ کو بطور سالی پہنا دیا۔

پھر رخصتی کا وقت آ گیا۔ زریں کو بلال بھائی اپنی بانہوں کے گھیرے میں باہر گاڑی تک لائے۔ صائمہ بھابی اور دوسرے رشتہ دار بھی ساتھ ساتھ آئے۔ پھر گاڑی کے پاس آ کر بلال بھائی صائمہ کا ہاتھ چوم کر ایک طرف ہو گئے، شاید اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لیے۔ پھر صائمہ بھابی، چاچا غفور اور چاچی، زریں کے گلے ملے اور اسے گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

زریں کے ساتھ مہوش بیٹھ گئی جبکہ دولہا کی گاڑی تو پہلے ہی غفار ڈرائیور کر رہا تھا۔ شاہ زیب، غفار کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ خاور اور صوفیہ بھی اپنی گاڑی میں آئے تھے البتہ وہ ان دونوں میں اپنے ساتھ کوئی بھی بچہ نہیں لائے تھے، صرف میاں بیوی اکیلے ہی آتے تھے۔

بارات والے دن میرا خاور سے سامنا بہت کم ہوا۔ گھر پہنچ کر بھی رات گئے تک کئی رسمیں ہوتی رہیں۔ زوہیب نے شاہ زیب اور زریں کو بہت تنگ کیا اور فضول رسموں کے نام پر کافی پیسے بھی بٹورے۔

خدا خدا کر کے رات ایک بجے تک سکون ہوا۔ سب نے اپنے اپنے بستر کی راہ لی۔ میرا تو تھکاوٹ کے مارے برا حال تھا۔ جہاں بھی آج بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں جب تنہائی میسر آئی تو اس نے پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

”بیٹے کی شادی مبارک ہو۔“

”آپ کو بھی۔“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے الماری سے اپنا سپل لیلن کا سوٹ بیگر سے کھینچا اور واش روم کی طرف جانے لگی تو اس نے میرا بازو

پکڑ لیا۔

”کیا کرنے جا رہی ہو؟“

”کپڑے چننے کرنے جا رہی ہوں۔“ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی جو بڑے والہانہ پن سے میری

طرف دیکھ رہا تھا۔

”مت کرو چننے۔ آج ایسے ہی رہنے دو۔ بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ سچ پوچھو تو میں تو تمہیں ہی دیکھتا رہا

ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہو رہی تھی۔

”جبار پلیر، چھوڑیں کیا کر رہے ہیں؟“ میں ہنستے ہوئے کسمائی۔

”کیوں نہ آج ہم بھی سہاگ رات منائیں۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”شادی کو چوبیس سال ہو رہے ہیں اور آج آپ کو سہاگ رات منانے کا پھر سے شوق پیدا ہو گیا۔“

”پھر سے کیا مطلب..... پہلے کب منائی ہے..... تمہیں یاد نہیں اپنی شادی کی رات..... میں نے تمہیں خاموشی

سے سو جانے کی تلقین کی تھی۔“ وہ بڑی حسرت سے یاد دلارہا تھا۔

”تو کیا پھر اس کے بعد آپ کی زندگی میں کبھی سہاگ رات نہیں آئی۔“ میں اس کی حالت سے پوری طرح

لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”اس کے بعد جتنی مرضی راتیں آئیں، جیسی بھی آئیں، وہ سہاگ رات نہیں ہوتیں۔ سہاگ رات وہی ہوتی

ہے جو شادی والی پہلی رات ہوتی ہے۔“

”اچھا جی..... پھر تو وہ رات کبھی آپ کی زندگی میں دوبارہ نہیں آ سکتی..... تو پھر آج کی یہ رات بھی سہاگ رات

نہیں ہو سکتی..... سمجھے آپ۔“ میں نے اسے دھکا دے کر دروازہ اور واش روم میں گھس گئی۔

میں کپڑے تبدیل کر کے واپس آ کر بیڈ پر لیٹی تو وہ بھی لیٹ چکا تھا۔ پھر وہ میری طرف کروٹ بدل کر بولا۔

”بیٹے کی شادی کے ہنگاموں میں اس قدر اصراف ہو گئی ہو کہ مجھے تو کوئی لفٹ ہی نہیں کروا تیں۔“

”لفٹ آج کل خراب ہے۔“ میں نے کروٹ بدل کر اس کی طرف پیٹھ موڑ لی۔

وہ آ کر پیچھے سے لپٹ گیا۔ ”کیوں، کیا ہوا ہے؟“ اس نے سرگوشی کی۔

”کوئی تکنیکی خرابی ہے۔“

”اوہ شٹ یار..... آج تو پورا موڈ تھا۔“

”اب فطرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔“ میں لا پرواہی سے بولی۔

”اوکے..... گنڈ نائٹ۔“ اس نے میرے گال پر پیار کیا اور اپنی جگہ پر جا کر سو گیا۔

میں نے تھوڑی دیر بعد پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہ آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ آج اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر مجھے پھر سے احساسِ شرمندگی نے گھیر لیا۔ کیا میں اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی ہوں۔ کیا اس کو دھوکا دے رہی ہوں۔ کیا اس کے اعتماد کا خون کر رہی ہوں۔ جب اتنے سارے کیا دماغ میں اکٹھے ہو کر بھگتڑا ڈالنے لگے تو میں نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔

.....☆.....

ویسے کی پر شکوہ تقریب بھی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ ویسے والی رات سب مردوں اور لڑکوں نے دو لمبے سمیت پینٹ کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ جبکہ لیڈیز نے بھی اس موقع پر ذرا ہلکے کام والے کپڑے پہنے تھے۔ کیونکہ مہندی اور بارات پر بھاری بھر کم جوڑے پہننے کے بعد آج سب کاموڈ ہلکا پہننے کا تھا۔

دلہن کا ڈریس بھی لائٹ کلر کا قدرے ہلکے کام والا تیار کروایا گیا تھا۔

ویسے پر کوئی ہنگامہ خیزی یا رسومات وغیرہ تو ہوتی نہیں۔ بس مہمان آتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ ویسے کی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ شاہ زیب اور زریں کو حسب روایت بلال بھائی اور ان کی فیملی اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے اور ہم لوگ اپنے گھر واپس آ گئے۔

اتنے دنوں کی ہنگامہ خیزیوں سے سبھی اکتائے ہوئے تھے۔ گھر آ کر بچا ہوا کھانا اہل محلہ میں تقسیم کیا۔ اس کام میں مہوش ماہر تھی۔ اسی نے محلے کے جان پہچان والے ہر گھر میں کھانا پہنچایا اور پھر سب نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔ جہاں تھوڑی دیر ممانی کے پاس چلے گئے اور میں کپڑے پیچ کر کے بیڈ پر گر گئی۔ میں نے موبائل اٹھایا اور خاد کو گڈ نائٹ کا میسج کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا جوابی میسج آیا۔ اٹھا کر پڑھا تو یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

الجھا رہی ہے مجھے یہی کشمکش مسلسل فراز

وہ آ بسا ہے مجھ میں یا میں اس میں کھو گیا ہوں

اس کا شعر پڑھ کر میں بے اختیار مسکرائے لگی۔ میسج ڈیلیٹ کیا اور موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

.....☆.....

دوسرے دن ہم سب نے شاہ زیب اور زریں کو لینے جانا تھا۔ یہ شادی کا اینڈ تھا۔ سر شام ہی ہم ٹوٹل گھر والے تیار ہو کر بلال بھائی کے گھر جا چکے۔ وہاں پر شکوہ کھانا کھایا۔ دلہن دلہا کو ساتھ لیا اور واپس گھر آ گئے۔ دس بجے تک ہم واپس گھر آ گئے تھے۔

پھر سب بارہ بجے تک اکٹھے بیٹھے گپیں مارتے رہے۔ زوہیب نے لطیفوں اور چٹکوں سے سب کو خوب ہنسیا اور تو اور اس کی نئی نیلی بھابی بھی کھل کر ہنس رہی تھی۔ شاہ زیب کا چہرہ بھی گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ پھر ارسلان آکس کریم لے آیا۔ کھاتے کھاتے بارہ بج گئے پھر سب نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

.....☆.....

اگلی صبح جہاں دفتر جبکہ فارہ سکول اور زوہیب کالج چلے گئے۔ مہوش کے بچے بھی اپنے اپنے تعلیمی مراکز چلے گئے۔ غفار بھی فیکلٹی چلا گیا۔ صرف شاہ زیب گھر تھا۔ اس نے اپنے دفتر سے ایک مہینے کی چٹھیاں لے رکھی تھیں۔ میں

شریفاں سے اپنی نگرانی میں گھر کی صفائی سھرائی کروا رہی تھی۔ شاہ زیب اور زریں ابھی سوئے ہوئے تھے اور ایک دوجے سے پہلے ان کے اٹھنے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔

دفعتا میرے موبائل کی پیپ بجنے لگی۔ میں نے دیکھا تو خاور کی کال آرہی تھی۔ میں شریفاں سے دور اپنے بیڈ روم میں آگئی۔

”جی جناب، کیسے ہیں؟“ میں نے کال ریسیو کر کے کہا۔

”میں جیوں یا مروں..... آپ کی بلا سے۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”خدا خیر کرے..... ایسا کیا ہو گیا۔“ میں فکر مندی سے بولی۔

”ہونا کیا ہے، آپ بیٹے کی شادی کر کے مغرور ہو گئی ہیں۔“

”ارے ارے..... اتنا سنگین الزام۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”یہ الزام نہیں، حقیقت ہے۔ آپ بدل گئی ہیں۔ اب بہو گھر میں آگئی ہے اب مجھے کیوں پوچھیں گی بھلا۔“

”خاور کبھی کبھار تو تم مجھے بچے لگتے ہو۔ اس طرح تو بچے شکایتیں لگاتے ہیں۔“ میں ہنسنے لگی۔

”تو اچھا ہے نا، آپ کو مجھ میں ہر درنائی مل جاتی ہے۔ کسی چیز کی کمی تو محسوس نہیں ہوتی نا۔ اچھا یہ بتاؤ، ہٹلرڈیوٹی

پر چلا گیا کیا۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ہاں چلا گیا۔ خاور تم اسے ہٹلر مت کہا کرو۔“

”کیوں؟ کیا غصہ لگتا ہے۔“

”بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔ وہ جیسا بھی ہے میرا شو ہر ہے۔“ میں آہستگی سے بولی۔

”ہوں..... تو اب مجازی خدا کی محبت دل میں جا گئے گی ہے۔“ وہ ہنسا۔

”شاید۔“ میں بے نیازی سے بولی تو وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

”او کے آئندہ خیال رکھوں گا۔ اسے ہٹلر نہیں بلکہ صاحب کہوں گا۔ اگر آپ میری میڈم ہیں تو وہ بھی تو میرے

لیے صاحب ہوئے نا۔“

”کیا جیلس ہو گئے ہو؟“ میں نے فقرہ کسا۔

”کس سے..... صاحب سے..... ہرگز نہیں۔ ان سے بھلا میں کیسے جیلس ہو سکتا ہوں۔ وہ آپ کے شو ہر نامدار

ہیں۔ آپ کے بچوں کے باپ ہیں۔ میرے لیے تو وہ قابل احترام ہیں۔ یہ ہٹلر وغیرہ تو میں ازراہ مذاق کہہ دیتا ہوں ورنہ

حقیقت میں تو میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں۔“

میں خاموش رہی تو پھر بولا۔ ”اور سنائیں، لکھنے کا مشغلہ تو اب ختم ہو گیا ہوگا۔ اب تو وقت ہی نہیں ملتا ہوگا۔“

”ہاں واقعی، جب سے شاہ زیب کی شادی کے دن فکس کیے ہیں تب سے ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکی۔“

”دوسرے ناول کے بارے میں سب نے کیا ریپانس دیا ہے؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”بہت اچھا..... سب نے اتنی تعریف کی کہ مجھے میری محنت وصول ہو گئی۔ میرے استاد مجھے بلال بھائی کے گھر

ملے تھے۔ انہوں نے اتنی حوصلہ افزائی کی کہ ان کے کہے ہوئے الفاظ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔“

”اب جلدی سے تیسرا ناول لکھیں۔ میں آپ کو اس کا معاوضہ بھی دلاؤں گا اور دیکھئے گاٹی وی ڈراموں کے پروڈیوسر آپ سے رابطہ کریں گے۔ وہ آپ کے لکھے ہوئے ناولوں پر ڈرامے بنائیں گے۔“

”اب اتنا زیادہ خوش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے پاؤں زمین پر ہی رہنے دو۔“ میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ آپ جن باتوں کو مذاق سمجھ رہی ہیں۔ ایک دن حقیقت بن کر آپ کے سامنے کھڑی ہوں گی۔ مجھے آپ کی کامیابی کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی موت کا۔“

”خاور پلیز..... ہر بات میں موت کا ذکر کیوں لے آتے ہو؟“

”اور آپ موت سے اتنی خائف کیوں ہیں۔ اچھا بابا..... آئندہ موت کا ذکر نہیں کروں گا۔ تمہارے ناولوں میں ایک غلطی میں بھی آج نکالوں گا۔“

”وہ کیا؟“ میں فوراً بولی۔

”اس غلطی کو آپ غلط نہیں کہہ سکتے۔ آپ تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ پریشان مت ہوں۔ غلطی یہ ہے کہ آپ کے ناول بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا ایک دو گھنٹے میں ناول پڑھ کر فارغ ہو جاتا ہے۔ آپ کہانی کو جلدی جلدی پھیلا کر اور پھر جلدی جلدی سمیٹ بھی دیتی ہیں۔ جبکہ دیگر رائٹروں کو دیکھیں وہ اسٹوری کو بڑے سلو طریقے سے آگے بڑھاتے ہیں۔ مغربی مصنفوں کے ناول اٹھا کر پڑھیں تو ان کے ناول ضخیم اور بھاری بھر کم ہوتے ہیں کہ ہم اردو لکھنے اور پڑھنے والے تو ان کے ناولز دیکھ کر ہی احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے ناولز کی ضخامت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر کئی کئی صفحات چھوڑ کر بھی ناول پڑھا جائے تو کہانی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔“

”او کے..... آئندہ میں کہانی کو خوب پھیلا کر اور ہر بات کو خوب لٹکا کر ناول لکھا کروں گی۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”پروفیسر صاحب کوئی اور نصیحت کرنی ہے یا فون بند کر دوں۔“

”ایک تو آپ کو فون بند کرنے کی بڑی جلدی ہوتی ہے۔“

”میں شریفاں سے پورے گھر کی صفائی کروا رہی ہوں۔ شادی کے دنوں میں گند بھی تو بہت پڑا ہے۔“

”او کے میڈم، جائیں جا کر صفائی کروائیں۔ میں فون بند کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور میں پھر سے شریفاں کے سر پر سوار ہو گئی۔



شام کو جبار آیا تو اس کے ہاتھ میں فروٹ کے کئی شاپر تھے اور موڈ بھی بڑا خوشگوار تھا۔

”لو بھئی، یہ فروٹ دھو کر فریج میں رکھ دو۔“ اس نے تمام شاپر میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ بچے اور زریں بھی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ وہ بھی ابو کو اتنا خوش دیکھ کر کھل اٹھے۔

”السلام علیکم ماموں جان۔“ زریں نے فٹ سے جبار کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام..... بیٹی جیتی رہو۔“ جبار نے بڑی شفقت سے جواب دیا تو میرا دل انجانی خوشی سے بھر گیا۔

چلو شکر ہے بہو کے آنے سے ہی بدل گیا۔ لگتا ہے زریں ہمارے لیے خوش بخت ثابت ہوگی۔ میں دل میں سوچ سوچ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

”نورین بیگم، آج کیا پکایا ہے۔“ اس نے محبت بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کیا تو میں بے ہوش ہوتے ہوتے پچی۔

”قیمہ اور مٹر..... ساتھ کسٹرڈ بنایا ہے۔“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”کھانا گاؤں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں..... کھانے کو چھوڑ دو..... آج کہیں باہر چل کر کھاتے ہیں۔ کیوں بچوں.....“ اس نے بچوں کو باری باری دیکھا۔

”ہر آ.....“ زوہیب نے نعرہ لگایا۔

”ابو آج پیزا ہٹ چلتے ہیں۔“ فاریہ نے بھی فرمائش کر دی۔

”نہیں، آج زریں فرمائش کرے گی۔ جہاں زریں جائے گی وہیں جائیں گے۔ ہاں تو زریں بیٹی بتاؤ کہاں چلنا ہے؟“

”ماموں جان، جہاں فاریہ کہتی ہے وہیں چلتے ہیں۔ کیونکہ میں بھی پیزا اشوق سے کھاتی ہوں۔“

”تو پھر چلو تیار ہو جاؤ۔ میں بھی کپڑے چھینچ کر کے ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلا گیا اور ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت سے اشارے کرنے لگے۔

”امی آج سورج مشرق کے بجائے مغرب سے کیسے نکل آیا۔“ زوہیب سے رہانہ گیا، بول اٹھا۔

”یہ دن نہیں رات ہے اور رات کو تم کون سا سورج چڑھا رہے ہو۔“ شاہ زیب بولا۔ ”اس وقت مثال دینی ہے تو چاند کی دو۔“

”ارے واہ..... شادی کروا کے یہ تو بڑا حاضر دماغ ہو گیا۔“ زوہیب بولا۔ ”ویسے بھائی تمہارا چاند تمہارے

سامنے بیٹھا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم چاند کی ہی مثالیں دینی شروع کر دو۔“

اس کی بات سن کر ہم ہنسنے لگے اور زریں جھینپ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”حدادب.....“ شاہ زیب بولا۔ ”میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔“

”تو میں نے کون سی آپ کی شان میں گستاخی کر دی ہے بھائی جان۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

”یہ بحث و تکرار کرنے کی عادت ابھی تک گئی نہیں تمہاری۔“ میں بولی تو وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

اتنے میں جبار کمرے سے باہر آ گئے۔ وہ دفتر میں پینٹ شرٹ پہن کر جاتے تھے۔ گھر آ کر شلواری قمیص پہن لیتے

تھے۔ اب بھی وہ شلواری قمیص پہنے ہوئے تھے۔

”چلیں.....“ وہ باہر آ کر بولے۔

”جی چلیں.....“ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”فاریہ جاؤ بھائی کو آواز دو۔“ میں نے فاریہ سے کہا۔

اس سے اگلے دن شاہ زیب اور زریں شمالی علاقہ جات میں ہنری مون منانے کے لیے چلے گئے۔ ان کا ارادہ پندرہ بیس دن رہ کے آنے کا تھا۔

شاہ زیب اور زریں کے جانے سے گھر کی رونق تقریباً آدھی رہ گئی۔ ہاں البتہ جبار کے رویے میں واضح تبدیلی آنی شروع ہو گئی تھی۔ وہ اب گرج برس کے نہیں بولتا تھا۔ بلکہ نسبتاً نارل آواز اور لہجے میں بات کرنے لگا تھا اور یہ ہم سب کے لیے بڑی خوش آئند بات تھی۔

ایک شام ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جبار کھانا کھا کر باہر نکل گئے تھے۔ وہ رات کا کھانا کھا کر اکثر باہر نکل جاتا تھا۔ اپنے ایک دوست کے ہاں چلا جاتا تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم میں سب دوست اکٹھے ہو کر گپیں مارنے کے علاوہ تاش کھیلتے تھے۔ بیرونی گیٹ کی ایک چابی وہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ واپس آتے آتے اسے کئی دفعہ بارہ ساڑھے بارہ بھی بج جاتے اور یہی وقت میرے لیے بہترین تھا لکھنے اور پڑھنے کے لیے۔ میں یہ قیمتی وقت ٹی وی دیکھنے کے بجائے لکھنا شروع کر دیتی۔ نوے گیارہ بجے تک میں کافی صفحات لکھ لیتی تھی۔ گیارہ بجے کے بعد میں سونے کی تیاری کرنے لگتی۔

اس رات بھی جبار کے جانے کے بعد میں سوچ رہی تھی کہ آج سے لکھنا شروع کر دوں کیونکہ شاہ زیب کی شادی کی وجہ سے میں پورے ایک مہینے سے کچھ بھی نہ لکھ پائی تھی۔ ابھی میں اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ شاہ زیب معلوم کرنے گیا۔ واپس آیا تو ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے لگا۔ اندر کسی مہمان کو بیٹھا کر باہر لاؤنج میں آیا اور بولا۔

”امی ایک کپ چائے کا بنادیں اور گھر میں کوئی بسکٹ وغیرہ ہیں تو وہ بھی ساتھ رکھ دیں۔“

”کون آیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خاور بھائی آئے ہیں۔“ اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا اور واپس ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

میں چائے بنا کر کپ میں انڈیلنے لگی تو اچانک ایک شرارت سوچھی۔ میں نے خالی کپ اٹھایا اور اسے اس جگہ سے ہونٹوں سے لگایا جہاں سے یقیناً خاور ہونٹ لگا کر چائے پیتا۔ میں نے خالی کپ پر اپنے ہونٹ ثبت کیے اور کپ ٹرے میں رکھ دیا۔ پھر اس میں چائے انڈیلی۔ ساتھ بسکٹ رکھے اور زوہیب کو آواز دی۔ زوہیب باہر آیا اور چائے لے کر اندر چلا گیا۔

میں باہر لاؤنج میں بیٹھی اپنی کارروائی پر دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی کہ مہوش آگئی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ پھر ڈرائنگ روم میں روشنی دیکھ کر بولی۔ ”کیا کوئی مہمان آیا ہے؟“

”ہاں..... خاور آیا ہے۔“ میں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

”صوفیہ کا شوہر خاور.....؟“ اس نے تصدیق چاہی۔

”ہاں، وہی خاور۔“ میں نے جواب دیا۔

”صوفیہ بتا رہی تھی کہ اس کو برین ٹیومر ہے۔ جو کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے۔“

ہاں، ایسا ہی ہے۔“ میں اداس ہو گئی۔

”بے چارہ..... ابھی تو بالکل جوان ہے۔ بچے بھی ابھی چھوٹے چھوٹے ہی ہوں گے۔“ وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

ہاں..... یقیناً.....“ میں آہستگی سے بولی۔

”اچھا یہ بتاؤ، شاہ زیب اور زرین خیریت سے پہنچ گئے ہیں نا۔ میں یہی پوچھنے آئی تھی۔“
 ”ہاں شاہ زیب کا تھوڑی دیر پہلے ہی فون آیا تھا۔ وہ لوگ ناراض پہنچ گئے ہیں۔ کہہ رہا تھا کہ صبح جھیل سیف الملوک جائیں گے۔ بہت خوش محسوس کر رہا تھا۔“

”ہاں بھئی خوش تو ہونا ہی تھا۔ یہ دن ہی خوشی کے ہوتے ہیں۔“ مہوش ٹھٹھہ مار کر ہنسی۔
 وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر چلی گئی۔ اسی اثناء میں خاور بھی چلا گیا تھا۔ زوہیب برتن لے کر باہر آیا تو بولا۔

”امی چائے بہت اچھی بنی تھی۔ خاور بھائی نے بڑی تعریف کی تھی۔“

”اچھا جی۔“ میں مسکرائی۔

میں اٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور موبائل نکال کر خاور کو SMS کیا۔

”سوری.....“

”کس بات کے لیے؟“ اس نے رپلائی کیا۔

”اپنی جھوٹی چائے پلانے کے لیے۔“

”اوہ..... تبھی میں کہوں..... چائے میں اتنی مٹھاس کیوں ہے۔ بغیر چینی کے بھی چائے میٹھی لگ رہی تھی۔“

”سوری جان..... میں نے بڑی غلط حرکت کی ہے۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔“

”جب مجھے کوئی اعتراض نہیں تو تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو۔“

”اچھا یہ بتائیں، کیا کر رہے ہیں؟“

”آپ کو یاد کر رہا ہوں۔“

”اس کے علاوہ بھی کوئی کام کر لیا کریں۔“

”تمہارے عشق نے نکما کر دیا ہے اب کسی کام کے قابل ہی نہیں رہا۔“

”اچھا..... مسٹر عاشق..... گڈ نائٹ۔“

”اتنی جلدی..... چلیں ٹھیک ہے۔ گڈ نائٹ اینڈ آئی لو یو۔“

میں نے فون بند کر دیا اور سر ہانے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

.....☆.....

آج جبار دفتر سے آیا۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو بولا آج میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔

میں بڑی حیران ہوئی۔ ”آپ نے آج باہر سے کھانا کھایا ہے؟“

”نہیں، وہاں دفتر میں ایک ساتھی ورکر کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس نے دعوت کی تھی سب ساتھیوں کی۔ خوب

ڈٹ کر کھانا کھایا ہے۔“ جبار نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر زوردار ڈکار لی تو مجھے ابائی آتے آتے رہ گئی۔

ڈٹ کر تو کھانا تھا، مفت کا جو تھا۔ میں دل میں بولی۔

”تم ایسا کرو آج میرے ساتھ مارکیٹ چلو۔ مجھے اپنے لیے کچھ پینٹنس اور شرٹس خریدنی ہیں۔ سارے کپڑے پرانے پرانے سے لگتے ہیں۔“

فاریہ نے ساتھ جانے کی ضد کی مگر میں نے منع کر دیا کہ گھر میں رہ کر پڑھائی کرو۔ آج وہ بھی شرافت سے مان گئی۔ ہم دونوں میاں بیوی ایک بڑے مال میں گئے جہاں ہر چیز با آسانی مل جاتی تھی۔ ہم اس فلور پر گئے جہاں صرف ریڈی میڈ ملبوسات کی دکانیں تھیں۔ میں اور جبار گھوم پھر کر کپڑے دیکھ رہے تھے۔ جبار نے تین پینٹنس اور تین شرٹس پسند کیں اور پھر شرٹائی روم میں پہن کر دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ میں اکیلی ہی ادھر ادھر گھوم کر مختلف چیزیں دیکھنے لگی۔ ایک جگہ پر ہینڈ بیک دیکھ رہی تھی کہ ایک صاحب آکر پاس کھڑے ہو گئے۔

”ہیلو..... نورین کیسی ہو؟“

میں نے نظریں اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پینتالیس، پچاس کا ہونے کے باوجود بہت ہینڈم اور گریس فل دکھائی دے رہا تھا۔ سر کے بال کنپٹیوں سے سفید ہو رہے تھے۔ جو اس کی پرسنائی کو مزید وقار بخش رہے تھے۔ میں غور سے اسے دیکھنے لگی۔ شکل و صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔

مجھے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر وہ مسکرا رہا تھا۔

”نہیں پہچان پائیں نا..... ویری بیڈ..... ہاں پہچانیں گی بھی کیسے..... کیونکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں نا..... جبکہ آپ تو ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ اسمارٹ اور سلم اور پہلے سے بھی زیادہ پرکشش۔“ وہ دلچسپ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا۔ میری حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”فیصل آپ.....“

”شکر ہے..... خدا کا آپ نے مجھے پہچان تو لیا۔ اب تو میرا تقریباً دل ٹوٹنے کے قریب پہنچ ہی چکا تھا۔“ وہ

ہنسا۔

”آپ بالکل نہیں بدلے۔ آج بھی ویسے ہی ہیں..... جولی اور زندہ دل۔“ میں مسکرائی۔

”جب کبھی آپ کی یاد آتی تھی تو یہ ٹیسی اور زندہ دلی فوراً غائب ہو جاتی تھی۔ ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا کہ نجانے آپ کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ کیونکہ آپ کا بھائی بواخونخوار قسم کا تھا، ہمیں تو اس نے اتنا ڈرایا دھمکایا کہ امی اور ابو نے فوراً وہ گھر چھوڑ دیا۔ وہ ہمیں لے کر لاہور اپنے بھائی کے پاس چلے گئے۔ ابو کہتے تھے کہ آپ کے ابو اور بھائی بڑے خطرناک لوگ ہیں۔“ میں اس کی باتیں سن کر خاموش رہی تو وہ پھر بولا۔

”مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ ان لوگوں نے فوراً آپ کی شادی آپ کے پھوپھو زادے سے کر دی تھی۔ کیا ایسا ہی ہوا

تھا؟“

”ہاں..... ایسا ہی ہوا تھا۔“ میں آہستگی سے بولی۔ ”میرے میاں بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔“

”کیا.....“ وہ حیرت سے بولا۔ ”وہ بوڑھا تمہارا شوہر ہے جو تمہارے ساتھ مال میں گھوم پھر رہا تھا۔“
میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پھر بولا۔ ”بڑا ظلم کیا ہے تمہارے باپ نے تمہارے ساتھ۔ وہ کسی اینگل سے
بھی تمہارا ہسبنڈ نہیں لگتا..... بلکہ باپ لگتا ہے تمہارا..... آئی ایم سوری نورین میری وجہ سے تمہاری زندگی تباہ ہو گئی۔ مجھے
ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہ لوگ اس قدر تنگ ذہن اور تنگ نظر ہیں۔“ وہ تاسف سے سر ہل رہا تھا اور میں چپ چاپ سنتی رہی۔
”اچھا یہ بتاؤ کتنے بچے ہیں؟“

”تین..... دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بڑے بیٹے کی پچھلے دنوں شادی کی ہے۔“
”کیا.....“ وہ ایک مرتبہ پھر سے شاکڈ ہو گیا۔ ”کیا تمہارا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ تم نے اس کی
شادی کر دی۔“

”بائیس سال سے تھوڑا اوپر ہو گیا ہے۔“ میں بتاتے ہوئے شرمندگی سی محسوس کر رہی تھی۔
”بائیس سال..... صرف بائیس سال کا ہوا اور تم نے اس کی شادی کر دی۔ ویری اسٹریٹج..... یار جو ظلم تمہارے
ساتھ ہوا۔ وہی تم نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا۔“
”دیکھئے مسٹر فیصل..... یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔“ میں رکھائی سے بولی تو وہ جھل
ہو گیا۔ ”آئی ایم سوری مس نورین، میں کچھ زیادہ ہی پرسنل ہو گیا تھا۔“
میں وہاں سے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ جبار آ گیا۔
”ہیلو..... یہ کون صاحب ہیں نورین..... کیا تعارف نہیں کرواؤ گی؟“
”کیوں نہیں۔ یہ فیصل ہیں ہمارے پرانے ممبر۔ اتنے سالوں بعد ملے ہیں اس لیے بچوں کے متعلق پوچھ
رہے تھے۔“

”اچھا اچھا..... تو آئیے مسٹر فیصل ہمارے گھر چلے۔ آپ کو چائے کافی پلاتے ہیں۔ پھر وہاں بیٹھ کر پرانی
باتیں بھی یاد کر لیجئے گا۔“ جبار نے بڑی خوش مزاجی سے اسے ساتھ چلنے کی آفر کی، مگر میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے اس
نے انکار کر دیا۔

”شکریہ جبار صاحب..... پھر کبھی سہی..... آج ذرا جلدی ہے۔ گوجرانوالہ میں میری سسرال ہے۔ سالے کی
شادی پر آیا ہوں۔ سوچا کوئی اچھی سی بیلت ہی خرید لاؤں۔ یہاں آیا تو مس نورین سے ملاقات ہو گئی۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا
اور ہم لوگ بھی ادائیگی کر کے شاپنگ مال سے باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھے تو جبار نے پوچھا۔
”کچھ کھاؤ گی؟“

”کیا؟“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

”منہ کھولے میری طرف کیا دیکھ رہی ہو۔ میں نے پوچھا ہے کچھ کھاؤ گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”نہیں..... میں کھانا کھا کر آئی تھی۔“ میں نے انک انک کر جواب دیا۔

”کھانا تو میں بھی کھا چکا ہوں۔ تو چلو کہیں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہیں۔“ اس نے ایک آئس پارلر کے آگے

گاڑی روکی۔

آکس کریم کھاتے ہوئے بھی وہ بڑی اپنائیت سے مجھ سے باتیں کرتا رہا اور میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔



گھر پہنچے تو دس بج رہے تھے۔ میں نے بچوں کو دودھ کے گلاس دیئے اور خود جبار کا گلاس پکڑے کمرے میں آ گئی۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔ میں نے دودھ سائینڈ ٹیبل پر رکھا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”نورین.....“ اس نے بڑی محبت سے مجھے پکارا۔

”جی.....“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

”آج میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ فون ایک طرف رکھ کے میری طرف متوجہ ہوا۔

”جی کہیں..... میں سن رہی ہوں۔“

”مجھے اب..... اس عمر میں آکر احساس ہوا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ میرا رویہ ہمیشہ سے تم سے بہت تلخ رہا ہے۔ میں اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا سارا غصہ تم پر نکالتا رہا ہوں۔ نتیجہ کیا نکلا..... نہ تمہارے دل میں جگہ بنا سکا اور نہ بچوں کے دل میں کوئی مقام۔ اب جا کر اس حقیقت کو سمجھا ہوں کہ اگر نفرت بانٹو گے تو جواب میں نفرت ہی ملے گی اور اگر پیار تقسیم کرو گے تو بدلے میں پیار ہی پاؤ گے۔ بول کے درخت پر کانٹے ہی اگتے ہیں..... سیب نہیں۔“

میں چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی، وہ پھر بولا۔

”نورین..... میں اپنی پچھلی ساری غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو محبت ساری عمر تمہیں نہ دے سکا اب دوں گا۔ مجھے یقین ہے میں تمہارے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ہو جاؤں گا نا!“ اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

”ہوں.....“ میں چونکی۔ ”ہاں..... ہاں۔“ مجھے اس وقت پھر سے احساسِ ندامت پریشان کر رہا تھا۔ میں نے اپنے شوہر سے بے وفائی کر کے اچھا نہیں کیا۔ دل ہی دل میں یہ خیال مجھے کچھ کے لگا رہا تھا۔ جبار جیسا بھی ہے۔ اس میں لاکھ برائیاں سہی، مگر وہ بے وفاتو نہیں ہے نا۔ کبھی کسی پرانی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اس نے۔

”کن خیالوں میں کھو گئی ہو۔“ جبار نے پکارا تو میں ہوش کی دنیا میں واپس آ کر ہونفوں کی طرح اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت بڑے والہانہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

”دور کیوں بیٹھی ہو۔ ادھر میرے پاس آؤ نا۔“

میں لڑکھڑاتے ہوئے اٹھی اور اس کے پاس بیڈ پر جا بیٹھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے سہلانے لگا۔

جبار تم نے بہت دیر کر دی..... میرے دل سے ایک ہوک سی نکلی۔



دوسرے دن دس بجے خاور کی کال آئی۔

”ہیلو.....“ میں نے کہا۔

”ہائے جان، کیسی ہو؟“ وہ چپکتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے آنکھوں سے جواب دیا۔

”خیریت تو ہے نا، بڑی بھیجی بھیجی لگ رہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ ایک سانس میں کتنے سوال پوچھ گیا۔

”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے اور آپ کی؟“

”اگر تمہارا ساتھ رہا تو مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب تو ڈاکٹر بھی حیران ہو رہے ہیں کہ میں اتنے مہینے کیسے نکال گیا۔

انہیں کیا خبر کہ ان سے بھی بڑا مسیحا میرے ساتھ ہے اور سنائیں کیا کر رہی تھیں؟“

”کچھ خاص نہیں۔ ناشتے سے ابھی ابھی فارغ ہوئی ہوں۔“

”میں بھی ابھی ابھی دفتر آیا ہوں۔ سوچا پہلے اپنے محسن کو سلام کر لوں۔ باقی کام بعد میں کروں گا۔ ویسے بھی صبح

صبح آپ کی آواز سن لوں تو باقی کا دن اچھا گزرتا ہے۔“

”ہوں.....“ میں ہوں کر کے خاموش ہو گئی۔

”کیا بات ہے نورین؟“ وہ میرا رویہ دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ ”کیا مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے؟“

”نہیں.....“ میں آنکھوں میں آنی نمی چھپا رہی تھی۔

”تو کیا جبار صاحب سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔“ وہ بے چین سا ہو گیا تھا۔

”نہیں.....“ میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

”تو پھر کیوں ایسا ہی بہو کر رہی ہو؟“ وہ حیران ہو رہا تھا۔

”خاور بس..... اب اور نہیں..... مجھ سے ضمیر کی مارا ب مزید نہیں سہی جاتی۔“ میں باقاعدہ رونے لگی۔

تھوڑی دیر کے لیے دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر اس کی درد میں ڈوبی آواز ابھری۔

”سمجھ گیا..... آپ مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہیں۔ اکتا گئی ہیں مجھ سے..... اوکے میں آئندہ کبھی آپ کو تنگ

نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں فون ٹیبل پر رکھ کے دونوں ہاتھوں سے سر تھاڑے رونے لگی۔

یا خدا! میں کیا کروں۔ ایک مرتے ہوئے آدمی کو زندگی کی طرف لاتی ہوں تو شوہر کی مجرم اور بچوں کے لیے چور

بن جاتی ہوں اور اگر اس کا ہاتھ چھوڑ دوں تو یہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا۔ مرنا تو اس نے ویسے بھی ہے تو پھر کیوں یہ درد کر

اور تڑپ تڑپ کر مرے۔ اگر میری وجہ سے اس کی زندگی کے آخری دن خوشی خوشی گزر جائیں تو میرا کیا نقصان ہوگا اور اگر

میری وجہ سے اس کی آخری گھڑیاں اذیت میں گزریں تو کیا یہ میرے ضمیر پر بوجھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ ذہنی دباؤ سے گزرتا ہوا

موت کو وقت سے پہلے گلے لگا لے تو کیا میں خود کو معاف کر سکوں گی۔

یا اللہ! میں کیا کروں..... یہ میں کس دورا ہے پر آکھڑی ہوئی ہوں..... میں سر پکڑے بیٹھی روتی رہی، پھر کچھ

سوچ کر آنسو پونچھے۔ خاور کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”ہیلو۔“ صاف لگ رہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

”آئی ایم سوری خاور۔“ میں بشکل بولی۔

”کس بات کے لیے؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”تمہار دل دکھانے کے لیے۔“

”کوئی بات نہیں۔ اس دل کو عادت ہو گئی ہے۔“

”پلیز خاور مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا۔ ہر رشتے اور تعلق کی ایک عمر ہوتی ہے۔

مقررہ مدت کے بعد اس تعلق کو ختم ہو جانا ہوتا ہے۔“ میں بڑی نرمی سے اس کو سمجھا رہی تھی۔

”آپ نے یہی کہنا تھا..... فون بند کر دوں۔“ وہ دکھ سے بولا۔

”اگر ناراض ہو تو پھر نہیں۔“

”میری کیا حیثیت ہے، کیا رشتہ ہے آپ سے۔ ناراض ہونے کے لیے حیثیت اور رشتہ بڑی اہمیت

رکھتے ہیں۔“

”خاور تم کیا سمجھتے ہو میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ تم دنیا کے پہلے اور آخری مرد ہو جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا ہے۔

میں مرتے دم تک تم سے محبت کرتی رہوں گی۔ اس بات کا یقین کیوں نہیں کر لیتے۔“ میری آواز آنسوؤں سے رندھ گئی۔

”تو پھر کیوں ایسی دل جلانے والی باتیں کرتی ہو۔ ایک بات بتاؤ نورین، کیا میں نے کبھی کوئی فحش گوئی کی

ہے تم سے۔ کیا کبھی تمہارے جسم کی خواہش کی ہے۔ کبھی کوئی ڈیمانڈ کی ہو۔ صرف ایک مرتبہ ایک فرمائش کی تھی، وہ تم

نے پوری کر دی۔ یہ بہت بڑا احسان ہے تمہارا مجھ پر۔ کیا اس کے بعد کبھی کوئی فرمائش کی ہے؟“ وہ دیوانہ وار بولتا جا رہا

تھا۔ ”بتاؤ جواب دو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو خاور۔ تم عام مردوں سے بالکل ہٹ کر ہو۔ ویسے بھی میری محبت عام کیسے ہو سکتی ہے۔“

”تو پھر پلیز مجھ سے تعلق توڑنے کی باتیں مت کیا کرو۔ میری زندگی کے جو بچے کچھ دن رہ گئے ہیں۔ وہ مجھے

ہنسی خوشی گزار لینے دو۔ مجھے خوشی خوشی اپنے ہاتھوں سے وداع کرو۔“

”خاور پلیز ایسی باتیں نہ کیا کرو میرے ساتھ۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔“ میں پھر سے رونے لگی۔

”وعدہ کرو جان..... آئندہ کبھی ساتھ چھوڑنے کی بات نہیں کرو گی۔ ہمارا ساتھ ہے ہی کتنا۔ صرف دو گھڑی

فون پر بات چیت۔“

”اوکے..... آئندہ ایسی بات نہیں کروں گی۔“ میں آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”بس خاور کبھی کبھی یہ خیال دل

میں آتا ہے کہ میں کس خاندان کی بیٹی ہوں۔ کس باپ کی بیٹی ہوں۔ ہمارے خاندان میں تو ذرا ذرا سی بات پر غیرت کے

نام پر عورتوں کو قتل کر دیا جاتا ہے تو پھر میرا یہ جرم قابلِ معافی ہو گا کیا۔“

”ان فضول باتوں کو دماغ پر سوار مت کرو۔ ہم ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے، جس کی وجہ سے واجب القتل قرار

دیئے جائیں۔ اب ریلیکس ہو جاؤ۔ صبح خود بھی روکی ہو اور مجھے بھی اتنا رلا لیا ہے۔ اوکے جان اللہ حافظ۔“ اس نے بڑی

اپنائیت سے کہا اور فون بند کرنے سے پہلے ”آئی لو یو“ کہا۔

میں فون رکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ دیکھئے اب قسمت کیا رنگ دکھاتی ہے۔ ”یا اللہ میری پاکیزہ محبت کی حفاظت

کرنا۔“ میں نے دل سے دعا مانگی اور خود کو وقت کے بہتے دھارے کے حوالے کر دیا۔ اسی وقت خاور کا SMS آ گیا۔ فون اٹھا کر پڑھا تو فراز کا یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا۔

جہاں بھر میں کسی کو میرا خیال نہیں
تمہارے بعد یہاں میرا کوئی حال نہیں
جو مر چکے ہیں تمہیں ان کی فکر ہے لیکن
جو مر رہے ہیں تمہیں ان کا کچھ ملال نہیں

میں نے SMS پڑھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ SMS اور خاور کی کالیں ڈیلیٹ کیں اور فون ٹیبل پر رکھ کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

.....☆.....

اگلا ایک ہفتہ بغیر کسی قابل ذکر واقعہ کے سکون سے گزر گیا۔ اس دوران خاور سے تقریباً ہر روز فون پر بات ہوتی رہی۔ جبار کا رویہ بھی بہت بہتر ہو گیا تھا۔ اب اس نے چمٹنا چلانا اور ہر کسی کی انسلٹ کرنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ اب تو وہ مجھے لکھنے اور پڑھنے پر بھی نہیں ٹوکتا تھا۔ اب میں اس کے سامنے بھی لکھ سکتی تھی۔ اب میں پوری توجہ اپنے تیسرے ناول کو ختم کرنے پر لگا رہی تھی اور اب وہ تقریباً ختم ہو ہی گیا تھا۔

شاہ زیب اور زریں بھی کل آرہے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ ان کے آنے سے پہلے ناول مکمل کر کے خاور کے حوالے کر دوں۔ آج بھی میں ناول کی اختتامی لائنیں لکھ رہی تھی کہ خاور کا فون آ گیا۔

”السلام علیکم۔“ میں نے کال ریسیو کر کے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو یاد کر رہا ہوں۔“

”جانتی تھی، یہی جواب ملے گا۔“

”جب جانتی ہیں تو پوچھتی کیوں ہیں؟“

”آپ کے منہ سے سننا اچھا لگتا ہے۔“ میں مسکرائی۔ ”اچھا یہ بتائیں، طبیعت کیسی ہے؟“

”طبیعت کا کیا بتاؤں یار۔ پل میں تولہ اور پل میں ماشہ۔ بس جی رہا ہوں۔“

”ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ تمہارے لیے مایوسی بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“ میں فکر مندی سے بولی۔

”چلیں چھوڑیں یہ باتیں۔ یہ بتائیں ناول کمپلیٹ ہو گیا کیا؟“

”ہاں ہو گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر ایسا کریں۔ صبح پارک میں آکر میرے حوالے کر جائیں۔“

”ٹھیک ہے۔ صبح میں لے آؤں گی۔“

”اسی بہانے آپ کا دیدار بھی ہو جائے گا۔ یہ کون جانتا ہے کب کون سی ملاقات آخری ملاقات ثابت ہو جائے۔“ وہ ہنسا۔

چندر سی باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

☆.....

دوسرے دن میں علی الصبح اٹھ بیٹھی۔ نماز ادا کی۔ تھوڑی دیر تلاوت قرآن مجید کی اور پھر ناول کا مسودہ ایک شاپر میں ڈالا اور گھر سے نکل گئی۔ خاور میرا منتظر تھا۔ وہ پہلے پہنچ چکا تھا۔ میں نے مسودہ اس کے حوالے کیا۔ ایک چکر لگایا۔ واپس آئی تو وہ ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

”آپ چکر نہیں لگائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، بہت لگا لیے چکر..... اب مزید نہیں لگتے۔“

”اوکے..... اللہ حافظ میں جا رہی ہوں۔“

”تھوڑی دیر بیٹھ جائیں نا۔“ وہ لجاجت سے بولا۔

”نہیں آج مجھے جلدی جانا ہے۔“ میں نے گیٹ کی طرف قدم اٹھائے تو وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”آج شاہ زیب اور زریں بھی واپس آرہے ہیں۔ ان کے آتے ہی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اسی

لیے میں نے دن رات ایک کر کے یہ ناول کمپیٹ کیا ہے۔ کیوں کہ جانتی ہوں اب ٹائم ملنا مشکل ہو جائے گا۔“ میں چلتے چلتے اُسے بتا رہی تھی۔

”ہوں..... اس کا مطلب ہے اب آپ کے پاس میرے لیے بھی وقت نہیں ہوگا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”تمہارے لیے تو میں وقت نکال ہی لوں گی۔ چاہے جیسے بھی نکالوں۔“ میں مسکرا کر بولی تو وہ بھی مسکرانے لگا۔

”تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے تو زندہ ہوں ورنہ کب کا مر کھ پ گیا ہوتا۔ نورین ایک بات کا یقین کرو گی۔“

اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ضرور کروں گی۔ تمہاری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کروں گی۔ تم اس بات کا یقین کرو گے کہ میں اپنی

ذات سے زیادہ تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔“

”کیا واقعی.....“ وہ بے یقینی سے بولا۔

”بالکل.....“ میں بولی۔

”مگر کیوں..... مجھ پر اتنا بھروسہ کیوں؟“

”یہ میں بھی نہیں جانتی۔ اب تم بتاؤ کیا بے یقینی والی بات کرنے جا رہے تھے۔“

”چلو چھوڑو۔ میری بات سے تمہیں تکلیف پہنچے گی۔“

”یا تو بات شروع نہ کیا کرو۔ اب شروع کی ہے تو بتانی پڑے گی۔“ میں زور دے کر بولی۔

”نورین..... تمہارے گھر کے پاس جو مسجد ہے۔ اس میں ایک دن میری موت کا اعلان ہوگا۔“ وہ بات کرتے

ہوئے رک گیا تھا۔ ”تم جب وہ اعلان سنو گی نا تو اس بات کا یقین کر لینا کہ مرنے سے پہلے یہ دیوانہ تمہیں یاد کرتے ہوئے

جان سے گذرا ہے۔“ اس کی بات سن کر میں جیسے پتھر کی ہو گئی۔ دماغ شل ہو گیا۔
 ”اب چلیں۔“ وہ بولا۔ ”جانتا تھا میری بات سے تمہیں تکلیف پہنچے گی۔ اس لیے بتانے سے گریز کر رہا تھا۔“
 وہ آہستگی سے بولا اور چلنے لگا۔ میں بھی مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔
 اس کی گلی آئی تو وہ رک گیا۔ ”ہمارے پچھڑنے کا وقت آ گیا نورین۔ یہاں سے ہمارے راستے الگ ہو رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی گلی میں داخل ہو گیا اور میں سیدھی چلتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

.....☆.....

شام تک شاہ زیب اور زریں بھی آ گئے۔ دونوں کا تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ مگر پھر بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ بڑے والہانہ انداز میں سب سے ملے۔

”نہا دھو کر فریش ہو جاؤ تب تک کھانا تیار ہو جائے گا۔ تمہارے ابو بھی آتے ہوں گے۔ مل کر کھائیں گے۔“
 میں نے انہیں کہا تو وہ دونوں اپنے اپنے سفری بیگ اٹھائے اپنے کمرے میں چلے گئے۔
 جب تک وہ تازہ دم ہو کر باہر آئے، جبار بھی آچکا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو جبار نے بڑی خوشدلی سے جواب دیا اور اُن سے خیر خیریت پوچھی۔ جبار اپنے کمرے میں کپڑے چھینچ کرنے کے لیے گیا تو زریں میرے پاس کچن میں آ گئی۔

”پھوپھو کیا پکار رہی ہیں؟“

”چکن بریانی اور کرلیے گوشت۔ جانتی تھی کہ آج تم لوگ آ رہے ہو اس لیے خصوصی اہتمام کیا ہے۔“ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”سو سو یٹ پھوپھو۔“ اس نے میرے گال پر پیار کیا۔ ”پھوپھو میں نے سنا تھا کہ ماموں بڑے سخت گیر اور خشک مزاج انسان ہیں مگر ان کے ساتھ رہ کے مجھے تو ایسا نہیں لگا۔ وہ تو بڑے نرم مزاج اور پیار کرنے والے ہیں۔“
 ”یہ کرشمہ تمہارے آنے کے سبب ہی ہوا ہے۔ تمہارے قدم ہم سب کے لیے بڑے مبارک ثابت ہوئے ہیں۔“ میں نے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔

”اللہ کرے ماموں ہمیشہ ایسے ہی رہیں۔“ اس نے کہا۔

”آمین.....“ میں نے صدقِ دل سے کہا۔

”کھانا تیار ہو گیا ہے تو ٹیبل پر لگا دو۔“ جبار نے آواز دی تو میں فوراً بولی۔

”جی تیار ہو گیا ہے۔ ابھی لگانی ہوں۔“ زریں اور فاریہ دونوں ٹیبل پر برتن لگانے لگیں۔

.....☆.....

اگلے دس پندرہ دن بہت مصروف گذرے۔ سب سے پہلے مہوش نے دعوت کی اور اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر بلال بھائی نے، اس کے بعد چاچا چچی نے اور اس کے بعد شاہ زیب کے تین چار دوستوں نے۔ خدا خدا کر کے دعوتوں کا سلسلہ تھا تو کچھ سکون آیا۔ ان دس پندرہ دنوں میں، میں نے خاور سے صرف تین دفعہ بات کی اور وہ بھی بہت مختصر اور رسمی سی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ناول چھپنے کے لیے لاہور بھیج دیا ہے ایک ماہ تک آجائے گا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

انہی دنوں زریں الٹیاں کرنے لگی۔ ہم نے سوچا کہ شاید دعوتیں کھا کھا کر بد پرہیزی ہو گئی ہے۔ میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تو اس نے یہ خوشخبری سنائی کہ زریں ماں بننے والی ہے۔ اسے ایک ماہ تک مکمل بیڈ ریست دی جائے۔ یہ خبر سن کر میں خوشی سے پھولی نہ سارہی تھی۔ اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں دادی بننے جا رہی تھی۔

گھر پہنچ کر میں نے یہ خبر سب کو سنادی۔ شاہ زیب بری طرح شرمارہا تھا۔ جبکہ زوہیب چاچو بننے کی خوشی میں مٹھائی لینے چلا گیا۔ مہوش، غفار، ممانی جان اور مہوش کے بچے سب بہت خوش تھے۔

”ممانی جان آپ پردادی بننے والی ہیں۔“ میں خوشی سے بولی۔ ”بہت خوش قسمت ہیں آپ۔ ورنہ تو کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے بچوں کی خوشیاں بھی دیکھ نہیں پاتے۔“

”بس اللہ کا کرم ہے بیٹی، ورنہ میں تو بڑی گناہ گار ہوں۔“ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ زوہیب مٹھائی لایا تو سب نے منہ میٹھا کیا اور رات بارہ بجے تک محفل جمی رہی۔

”امی جان آپ تو بوڑھی ہو گئی ہیں۔ آپ پردادی بن رہی ہیں۔“ غفار ممانی کو بار بار چھیڑتا۔ ”ہاں تو بیٹا، میں پہلے کون سا جوان لڑکی تھی۔ جو اب ایک دم سے بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ ممانی ہنس رہی تھیں۔ ”میں تو یہ سوچتا ہوں آج اگر دادی زندہ ہوتیں تو وہ کیا ہوتیں۔ پردادی کے بعد کون سا رشتہ آتا ہے۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ پردادی کے بعد کون سا رشتہ آتا ہے۔

”ویسے ایک بات ہے۔ دادی نے یہ تسلیم نہیں کرنا تھا کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہیں۔“ غفار آج باتوں باتوں میں نانی جان کو خوب یاد کر رہا تھا۔ نانی کو یاد کر کے میرا دل بھی بھر آیا۔

اگلی صبح میں مارننگ واک کے لیے گئی تو خاور غیر حاضر تھا۔ میں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ گھر آئی، ضروری امور نمٹائے۔

شاہ زیب اور زریں سو کر اٹھے۔ زریں نے اپنے لیے اور شاہ زیب کے لیے ناشتہ تیار کیا۔ ناشتہ کر کے وہ لوگ فارغ ہوئے تو میں نے شاہ زیب سے کہا۔

”شاہ زیب بیٹا! زریں کو چندرہ بیس دن کے لیے اس کی امی کے ہاں چھوڑ آؤ۔“

”جی امی، ابھی چھوڑ آتا ہوں۔“ شاہ زیب نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ زریں یقیناً اسے لیڈی ڈاکٹر کی ہدایات بتا چکی تھی۔ لہذا وہ دونوں ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس دوری کے لیے تیار کر چکے تھے۔

”زریں بیٹا، تم اپنے ضروری کپڑے بیگ میں ڈال لو۔ شاہ زیب تمہیں چھوڑ آئے گا۔“

”جی پھوپھو۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ایک گھنٹے بعد وہ باہر نکلی۔ اس کے پیچھے شاہ زیب نے اس کے کپڑوں کا بیگ اٹھا رکھا تھا۔

”شاہ زیب تم ڈیوٹی کب جو ان کرو گے؟“

”کل تو چھٹی ہے، اتوار ہے۔ پرسوں سے انشاء اللہ دفتر جانا شروع کر دوں گا۔“ وہ چلے گئے تو میں ٹی وی کا

ریسٹ اٹھا کر چینل بدلنے لگی۔

☆.....

اگلے دن سنڈے تھا۔ سب لیٹ ہی اٹھے۔ میں اٹھ کر ناشتے کی تیاری کرنے لگی۔ آج سوچا سب کے فیورٹ آلو کے پراٹھے بناتی ہوں۔ میں نے آلو اٹھانے کے لیے رکھ دیئے اور خود آج کا تازہ اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ جولاؤنچ میں نیبل پر رکھا تھا۔ یہ یقیناً جبار نے باہر سے اٹھا کر یہاں رکھا تھا۔ ورنہ ہا کر تو پورچ میں اخبار پھینک کر چلا جاتا تھا۔ سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا اور پراٹھوں کی بڑی تعریف کی۔

جبار ناشتہ کرنے کے بعد باہر چلا گیا۔ شاہ زیب اور زویب کرکٹ کھیلنے کے لیے گراؤنڈ میں چلے گئے۔ فاریہ اپنے کمرے میں جا کر ہوم ورک کرنے لگی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ خاور کو بتاؤں کہ میں دادی بننے والی ہوں۔ حالانکہ میں نے چھٹی والے دن کبھی خاور کو نہ کال کی تھی اور نہ کبھی کوئی میسج کیا تھا۔ کیونکہ جبار کے گھر ہوتے ہوئے میں کبھی ایسا رسک نہیں لے سکتی تھی اور وہ بھی اس بات کا بہت خیال رکھتا تھا۔ مگر میری بد نصیبی کہ اس دن میری عقل پر پردہ پڑ گیا یا پھر اس پریم کہانی کا اینڈ خدا کو ایسا ہی منظور تھا۔

میں نے خاور کو میسج کیا۔

”اگر آپ چاہیں تو مجھے مبارک باد دے سکتے ہیں۔“

”کس بات کی؟“ اس نے رپلائی کیا۔

”میں دادی بننے والی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ..... میری طرف سے بہت بہت مبارک قبول ہو۔“

”شکریہ۔“ میں نے لکھا۔

”کم بخت دل کا کیا کروں۔ آیا بھی تو ایک دادی پر۔“ وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔

”افسوس ہو رہا ہے تو چھوڑ دو اس دادی کو اور کوئی جوان لڑکی ڈھونڈ لو۔“ میں نے لکھا۔ ساتھ ساتھ میں مسکرا

رہی تھی۔

”جوان لڑکی اب مجھ سے کیسے سنبھلے گی بھلا۔ میرے لیے یہ مائی ہی ٹھیک ہے۔“

”ہا ہا ہا.....“ میں نے ہنسنے کا SMS کیا۔ اسی وقت اوپر سے جبار آ گیا۔ اسے دیکھ کر میرا رنگ اڑ گیا۔ میں

بڑی طرح گھبرا گئی۔ میں نے موبائل مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اب ٹی وی کی طرف متوجہ تھا۔ خاور کا میسج کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

”دونوں لڑکے کہاں ہیں؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ طبیعت تو

ٹھیک ہے نا۔“

”ہا..... ہا..... ہا..... میری طبیعت کو کیا ہوا ہے۔“ میں ہکلاتے ہوئے بولی۔

”تو پھر تمہاری پیشانی پر پسینے کے قطرے کیوں چمک رہے ہیں۔“ اب وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا

تھا۔ ابھی میں کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ میرے فون کی میسج ٹیون بجنے لگی۔

”دکھاؤ کس کا منیج آیا ہے۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔
میں نے اس کے ہاتھ پر فون رکھنے کے بجائے سختی سے بھیج لیا۔
”نورین، اپنا فون دو۔“ اب جبار سختی سے بولا۔

”جبار..... میری ایک دوت کا منیج ہے..... کوئی پرائیویٹ بات ہے..... میں نہیں..... دکھا سکتی۔“ میں انک
انک کر بول رہی تھی۔

”میں کہتا ہوں اپنا فون مجھے دو۔“ وہ دھاڑا تو میں نے سہم کر کانپتے ہاتھ سے فون اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ منیج
کھول کر پڑھنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ میرے بدن میں اس وقت گویا کسی نے سارا خون نچوڑ لیا تھا۔
یوں لگ رہا تھا جیسے میں ابھی بے ہوش ہو کر گر جاؤں گی۔
”ہوں.....“ اس نے میری طرف قہرناک نظروں سے گھورا اور بولا۔ ”اب تمہاری اس دوست کا منیج میں تمہیں
پڑھ کر سنا تا ہوں۔ اس نے دکھا ہے۔

جان..... تم دادی بن جاؤ یا پردادی..... میں تم سے اسی طرح محبت کرتا رہوں گا۔“
یہ جملہ سن کر میرے جسم سے رہی سہی جان بھی نکل گئی۔
”اب ذرا اپنی اس سہیلی کا نام بھی بتا دو۔“ وہ غضب ناک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
میں نظریں جھکائے خشک لبوں پر بار بار زبان پھیر رہی تھی۔
”میں نے نام پوچھا ہے۔“ وہ پھر سے پھنکارا۔

”جبار..... پلیز میں..... آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ بس آپ بچوں کو کچھ مت بتائیے گا۔“ میں گڑ گڑانے لگی۔
”کیوں؟ تاکہ تم ان کے سامنے پاکدامن اور معصوم بنی رہو۔ وہ تو تمہیں خدا سمجھتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو تمہیں
سجدہ بھی کر گزریں۔ آج تمہاری اصلیت کھل کر ان کے سامنے آ جائے گی۔ تمہارا اصلی روپ دیکھ کر نفرت کرنے لگیں گے تم
سے۔“ وہ زہرا گل رہا تھا۔

”ٹھہر دو ذرا میں خود تو پہلے یہ سارے تازہ ترین SMS پڑھ لوں، پھر بعد میں یہ پتا بھی چل جائے گا کہ یہ کیوں
بے غیرت ہے جو چھپ چھپ کر میری بیوی کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیل رہا ہے۔“

پھر وہ شروع سے سارے SMS اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔ وہ پڑھتا جا رہا تھا اور میں شرم سے زمین میں گڑھتی
جا رہی تھی۔ تمام SMS پڑھ کر اس نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورا۔ اس کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔
میں اس کی طرف دیکھ کر لرز گئی۔

”جبار..... چاہو تو مجھے گولی مار دو۔ مجھے زہر دے دو۔ میرا گلا دبا دو مگر پلیز میرے بچوں کو کچھ مت بتانا۔ میں
تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں..... بلکہ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔“ اور پھر میں جی جی اُنھ کے قدموں پر گر
گئی۔ ”مجھ پر ترس کھاؤ جبار۔“

اس نے پاؤں کی ٹھوک سے مجھے دور کر دیا۔

”تم ترس کھانے کے قابل ہرگز نہیں۔“

”تو پھر میری جان لے لو۔“ میں گڑ گڑائی۔

”یہ تمہارے لیے بہت چھوٹی سزا ہے۔ میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔ بلکہ تمہاری زندگی موت سے بدتر کر دوں گا۔ تم موت کی دعائیں مانگو گی مگر اتنی آسانی سے تمہیں موت بھی نہیں ملے گی۔“ جبار دانت پیس پیس کر بول رہا تھا۔ پھر اس نے میرا موبائل اپنی جیب میں ڈال لیا اور اپنا موبائل نکال کر شاہ زیب کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہونے پر اس نے شاہ زیب سے کہا۔

”شاہ زیب تم کہاں ہو؟ اچھا ٹھیک ہے۔ جہاں بھی ہو زوہیب کو ساتھ لے کر گھر آ جاؤ۔ فوراً..... ہاں، ہاں..... جو بھی پوچھنا ہے گھر آ کر پوچھنا۔“ پھر اس نے بلال بھائی کا نمبر ملایا۔

”بلال تم جہاں بھی ہو فوراً ہمارے گھر آ جاؤ..... ہاں ایمر جنسی ہے۔“

پھر اس نے مہوش کو فون کیا۔ ”مہوش پانچ منٹ تک ہمارے گھر آ جاؤ..... اور ہاں اکیلی ہی آنا..... بچوں کو ساتھ مت لانا۔ امی اور غفار کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے موبائل بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کون ہے وہ؟ اور کتنی دیر سے یہ چکر چل رہا ہے؟“

میں خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی۔

”چلو نہ بتاؤ۔ اپنے بھائی اور بچوں کو تو بتاؤ گی نا۔“

اسی اثنا میں مہوش آگئی۔ وہ آ کر بیٹھی تو شاہ زیب اور زوہیب بھی آ گئے۔

”ابو..... خیریت تو ہے نا۔“ شاہ زیب پوچھنے لگا۔ ان دونوں بھائیوں کے چہروں سے پریشانی ہو رہی تھی۔

”ابھی تھوڑی دیر تک ساری صورت حال کا پتا چل جائے گا۔ ابھی بیٹھو۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے

دونوں کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئے پھر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں تو گویا مر چکی تھی۔ اس وقت صرف میرا جسم زندہ تھا۔ بلکہ جسم بھی بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ صرف دماغ زندہ تھا۔ مگر کچھ سوچنے سمجھنے سے وہ بھی قاصر تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ جو تھوڑی دیر بعد ٹوٹ جائے گا۔ مگر انسوس وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ میری زندگی کی سب سے تلخ اور ناقابل فراموش حقیقت۔ مزید دس منٹ گزرے تو بلال بھائی بھی آ گئے۔ ان کے چہرے سے بھی فکر مندی چھلک رہی تھی۔ وہ آ کر کھڑے ہو گئے۔

”کیا کوئی خاص بات ہے۔ فون سن کر میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔“

”بات تو خاص ہی ہے..... بلکہ بہت خاص ہے۔ بہتر ہوگا کہ یہ بات ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کی جائے۔“

جبار نے یہ کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چلے سب ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ شاہ زیب تم لاؤنج کے داخلی

دروازے کو لاک کر کے اندر آ جاؤ اور ہاں فاریہ سے کہو کہ اپنے کمرے سے تھوڑی دیر باہر نہ نکلے۔“

”جی ابو.....“ شاہ زیب نے جواب دیا اور ہم سب ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

میں دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ اے کاش جبار کو مجھ پر ترس آجائے۔ میری زندگی کی پہلی نادانی سمجھ کر معاف کر دے۔ جتنی دعائیں، جتنی سورتیں یاد تھیں۔ دل ہی دل میں ان کا ورد کر رہی تھی۔

سب بیٹھ گئے۔ شاہ زیب بھی آکر بیٹھ گیا۔ سب کی نظریں جبار پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر کسی کے چہرے پر سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

آخر جبار بولا۔ ”میں نے آپ سب کو کسی اچھی خبر کے سنانے کے لیے اکٹھا نہیں کیا۔ بلکہ آپ سب کے لیے بہت افسوسناک خبر ہے۔“

”جبار بھائی بتا بھی دیں۔ کیوں سانس خشک کر رہے ہیں۔“ بلال بھائی بولے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جبار پھر بولا۔ ”یہ بات جو میں آپ لوگوں کو بتانے جا رہا ہوں۔ جانتا ہوں آپ سب کے لیے بڑی اذیت ناک ہوگی۔ میں خود بھی بہت بڑی اذیت سے گزر رہا ہوں۔“ وہ تھوڑی دیر خاموش ہوا اور پھر بولا۔ ”بات یہ ہے کہ نورین کے کسی اور مرد سے ناجائز تعلقات ہیں۔“ اُف یہ الفاظ تھے کہ پکھلا ہوا سیسہ۔ کاش یہ سننے سے پہلے میری جان نکل جاتی۔ مگر یہ تو شروعات تھی۔ اس کے بعد میں نے اتنا کچھ سنا اور سہا کہ اپنی قوت برداشت پر حیرت ہوتی تھی۔ جبار کا یہ جملہ سن کر سب شاکد ہو گئے۔ چند لمحوں کے لیے ڈرائنگ روم میں موت جیسی خاموشی چھا گئی۔ پھر بلال بھائی کی آواز ابھری۔ ”آپ کس بنا پر یہ سب کہہ رہے ہیں۔ کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“

”میرے پاس پکا اور ٹھوس ثبوت ہے۔ میں محض شک کی بنیاد پر کبھی اتنا بڑا الزام نہ لگاتا۔“ اس وقت جبار بڑے تحمل سے نارٹل لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس نے میرے والا موبائل جیب سے نکالا اور بلال کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”لو پڑھ لو تم بھی اس نے کیا کیا لکھ کر بھیجا ہے اور اس نے کیا کیا جوابات دیئے ہیں۔“

بلال بھائی سیج پڑھنے لگے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے کی رنگت بدلتی گئی۔ میں نے شاہ زیب اور زوہیب کی جانب دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی اور منہ ادھ کھلے تھے۔ وہ بے یقینی سے بار بار میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مہوش بھی غصے سے مجھے گھور رہی تھی۔ بلال بھائی نے SMS پڑھ کر فون میز پر رکھ دیا۔ جبار نے فون اٹھایا اور شاہ زیب سے کہا۔

”لو تم بھی اپنی ماں کے کرتوت دیکھو۔ یہ موبائل پکڑو SMS پڑھ کر زوہیب کو بھی پڑھاؤ۔“

شاہ زیب نے موبائل باپ کے ہاتھ سے پکڑا اور SMS پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے بعد اس نے فون زوہیب کی جانب بڑھا دیا۔ میں نے شاہ زیب کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں تو اس وقت جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ میرے جذبات اور احساسات جیسے سن ہو گئے تھے۔ میری آنکھیں خشک اور پتھرائی ہوئی تھیں۔ میں ٹکر ٹکر سب کی طرف دیکھے جا رہی تھی، جیسے وہ میری نہیں کسی اور کی باتیں کر رہے تھے۔

زوہیب نے SMS پڑھ کر موبائل ٹیبل پر رکھا تو جبار نے پھر موبائل اٹھایا اور مہوش کے ہاتھ میں دے دیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ یہ SMS پڑھ لیں۔ اس کے بعد ہم لوگ اس موضوع پر بات کریں گے۔“

مہوش نے سب کچھ پڑھ کر فون میز پر رکھ دیا۔ وہ اب شعلہ بارنگا ہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

”اب جیسا کہ تمام صورت حال آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ یہ آپ لوگ مجھے بتائیں گے۔“

”وہ آدمی کون ہے؟“ بلال بھائی نے پوچھا۔

”یہ تم اس سے پوچھو گے۔“ جبار نے جواب دیا۔

”بتاؤ نورین، کون ہے وہ آدمی؟ تم اتنی بے غیرت نکلو گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ میں خاموش رہی تو مہوش

ہوئی۔

”جس نمبر سے SMS کیے گئے ہیں اس نمبر پر رنگ کریں۔ جو بھی ہوگا سامنے آ جائے گا۔ ویسے میری چھٹی

حس کہتی ہے کہ وہ آدمی کوئی اور نہیں بلکہ خاور ہے۔“

”خاور کی اتنی جرأت نہیں کہ وہ میری بہن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ وہ نہیں ہو سکتا۔“ بلال بھائی پورے

یقین سے بولے۔

”آپ اس نمبر پر نورین کے موبائل سے فون کریں۔ جو بھی ہوگا سامنے آ جائے گا۔“ وہ پھر بولی۔

”مہوش ٹھیک کہتی ہے۔“ جبار بولا۔

بلال بھائی نے میرا فون اٹھا کر خاور کے نمبر پر کال کی اور فون کا اسپیکر آن کر کے میز پر رکھ دیا۔ بیل جا رہی تھی۔

میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ خاور فون مت اٹھانا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگنے

لگی۔ مگر میری ہر دعا کی طرح یہ دعا بھی بے اثر گئی۔

کمرے کی خاموش فضا میں خاور کی آواز ابھری۔

”ہیلو.....“ اس نے دو تین مرتبہ ہیلو کہا مگر ادھر سے خاموشی رہی تو وہ بولا۔

”نورین..... جان بول کیوں نہیں رہی۔ کچھ تو بولو۔ چپ کیوں ہو۔“

بلال نے ہاتھ آگے کر کے فون بند کر دیا اور پھر اس کی سم نکال کر جیب میں ڈال لی۔

ایک دفعہ پھر گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ آخر مہوش ہوئی۔

”میں نے کہا تھا نا کہ خاور ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جس طرح اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ ایکسائینڈ ہو جاتی تھی۔

میں شک میں پڑ جاتی تھی مگر بات اس حد تک جاسکتی ہے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کا مطلب ہے جب

بلال بھائی نے تمہیں ہمسائیوں کے لڑکے کے ساتھ پکڑا تھا..... جھوٹ وہ بھی نہیں تھا۔ وہ بھی سچ تھا۔ مگر اس وقت تو تم نے

پورا گھر سر پر اٹھا لیا تھا..... کہتی تھی کہ بلال بھائی نے تم پر بہتان لگایا ہے۔ اب کیا کہتی ہو..... اب تو رنگے ہاتھوں پکڑی گئی

ہو وہ بھی پورے شو توں کے ساتھ۔ کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ ہی کر لیا ہوتا۔ جوان بچوں کی ماں ہو اور ایک بیٹا بیاہ بھی چکی ہو

..... اور اب تو خیر سے دادی بننے جا رہی ہو..... مگر لخص دیکھو اپنے۔ یہ تمہاری عمر عزت بنانے کی تھی..... مگر تم نے ساری

بنی بنائی عزت خاک میں ملا دی۔“

مہوش کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ تھے کہ نشتر..... جو میرے جسم اور روح کو چھلنی کیے جا رہے تھے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں تاکہ وہ مزید بکواس نہ کرے۔ مگر نہیں اس کی زبان تو

اس وقت فینچی سے زیادہ تیز دھا رہی تھی۔ میں نے اپنے دونوں بیٹوں کی طرف دیکھا۔ دونوں سر جھکائے آنسو بہا

رہے تھے۔

”مہوش خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔ مجھ پر نہیں تو میرے بچوں پر ترس کھاؤ۔“ میں ہاتھ جوڑتے ہوئے

بلک پڑی۔

”ارے واہ..... میں تمہارے بچوں پر ترس کھاؤں۔ یہ بھی خوب کہی..... تم جب عشق لڑا رہی تھی ایک غیر مرد سے..... تمہیں اس وقت ان کا خیال نہیں آیا تھا..... آوارہ، بدچلن..... یہ میری وجہ سے نہیں بلکہ تمہاری وجہ سے رو رہے ہیں۔“ وہ ہاتھ نہچاتے ہوئے بولی۔

”یہ ہمسایوں کے لڑکے والا کیا چکر ہے؟“ جبار نے پوچھا۔

”وہ جبار بھائی..... بڑی پرانی بات ہے۔ آپ کی شادی سے بھی پہلے کی۔ یہ چھت پر جا کر ہمسایوں کے لڑکے سے گپیں مارتی تھی۔ ایک دن بلال بھائی نے دیکھ لیا اور اسے مارتے ہوئے نیچے لے کر آئے۔ ابو کو ساری صورت حال کا پتا چلا تو انہوں نے پندرہ دن کے اندر اندر اس کی شادی آپ سے کر دی..... مگر جس بات کا ذکر تھا وہ تو ہو کر رہی..... جوانی خیریت سے کاٹ لی تو اب بڑھاپے میں گل کھلانے چلی ہے۔ اس کی فطرت ہی گھٹیا ہے۔“ مہوش کی زبان زہرا گل رہی تھی۔ وہ سراپا نفرت بنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود نفرت میں ڈوبا ہوا تھا اور اس وقت زندگی میں پہلی مرتبہ میں اس بات سے آگاہ ہوئی کہ مہوش من ہی من میں مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ بس وہ نفرت اس نے دل میں چھپا کر رکھی تھی۔ آج اظہار کا موقع ملا تو اس نے ساری زندگی کی سنبھالی ہوئی نفرت مجھ پر انڈیلنا شروع کر دی۔

میں سمجھتی تھی کہ مہوش مجھ سے چڑتی ہے یا کئی مرتبہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے جلیسی محسوس کرتی ہے..... مگر میں اس کو اپنا واہمہ سمجھ کر سر جھٹک دیتی تھی کہ بھلا ایک بہن اپنی دوسری بہن سے کیسے حسد محسوس کر سکتی ہے۔ بہنیں تو ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی شریک ہوتی ہیں۔ غم والہ کی ساتھی ہوتی ہیں مگر یہ کیسی بہن تھی جو دوسری بہن کی عزت نفس کی دھجیاں بکھیر رہی تھی۔ وہ بھی اس کی جوان اولاد اور شوہر کے سامنے۔

”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آرہی کہ خاوار کی ہمت کیسے پڑی میری بہن کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی۔“ بلال بھائی

بڑے طیش میں بولے۔

”یقیناً..... اس نے ہی دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہوگا اس کی طرف۔“ مہوش پھر زہر بھرے لہجے میں بولی۔ ”رائٹر ہے نا..... کھلے ڈلے ذہن کی مالک ہے۔ روشن خیال سوچ رکھتی ہے۔“ وہ طنز سے بھرپور لہجے میں بولے جا رہی تھی۔ ”ہونہہ..... بڑی چلی تھی رائٹر بننے..... اب ذرا اپنی پریم کہانی بھی لکھ ڈالو۔ یہ بے حیائی کی داستان کیسے شروع ہوئی اور کیسے ختم..... یہ کہانی بھی رقم کر ڈالو..... سچی لو اسٹوری ہوگی، خوب پذیرائی ملے گی..... ارے میں تو کہتی ہوں شکر کرو نا تم پر پکڑی گئی ہے۔ کیا پتا اس کے ساتھ ہی فراہ ہو جاتی..... پھر کہاں منہ چھپائے پھرتے ہم سب۔“

”آئی خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔“ شاہ زیب دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چلایا تو مہوش سہم کر چپ ہو گئی۔

شاہ زیب اب دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ مہوش اس کی حالت دیکھ کر اس کی طرف پلکی۔

”چپ ہو جاؤ میرے بچے۔“ اس نے بیٹھے ہوئے شاہ زیب کو اپنے ساتھ لگالیا۔

”دیکھو بے غیرت..... ذرا اپنے بیٹوں کی طرف دیکھو۔ ان کی حالت دیکھ کر شرم سے ڈوب مرو۔“ مہوش پلٹ

کر میری طرف دیکھ کر بولی۔

”مہوش تم بھی اپنی زبان بند کرو۔“ بلال بھائی نے مہوش کو حکم دیا تو وہ پھر بولی۔

”بھائی جان، اس کی حرکتیں دیکھ کر میرا تو خون کھول رہا ہے۔ اس نے ہماری عزت کو مٹی میں ملا دیا ہے۔“

”اب تم کچھ نہیں بولو گی۔ ہمیں بات کرنے دو۔“ بلال نے پھر مہوش کو ڈانٹا تو وہ سوسے بہاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”بات یہ ہے کہ اس نے جو کرنا تھا..... وہ کر چکی..... اب ہم نے کیا کرنا ہے، یہ بات سوچنے والی ہے۔“ چند

لحوظ کے لیے سکوت چھا گیا، پھر بلال بھائی بولے۔

”جبار بھائی..... اس کی اس مذموم حرکت کے لیے ہم بہت شرمسار ہیں۔ آپ سے نظریں ملانے کے قابل

نہیں رہے۔ آپ اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کریں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں اس پر سختی کریں۔ اس کا

گھر سے نکلنا بالکل بند کر دیں۔ اگر کوئی کنواری یا کسن لڑکی ہو تو ایسی صورت حال میں کہا جاتا ہے کہ اس کی فوری شادی کر

دی جائے۔ مگر اس عمر میں اس کا کیا حل نکالا جاسکتا ہے سوائے اس کے کہ اس پر سخت پابندیاں اور پہرہ لگا دیا جائے۔ میرا تو

سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو رہا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے۔“ بات ختم کر کے بلال بھائی نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

”اور اس کا لکھنا پڑھنا بالکل بند کر دیا جائے۔“ مہوش نے پھر تیر چھوڑا۔ ”رومانوی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اور عشق

و محبت کے ناول لکھ لکھ کر اس کا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ خود کو کسی ناول کی ہیروئن ہی سمجھنے لگی ہے۔“

”مہوش آئی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ امی نے جب سے لکھنا شروع کیا ہے تب سے امی کا دماغ خراب ہونا شروع

ہوا ہے شاید۔“ زوہیب نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور پھر بولتا چلا گیا۔

”جس ماں پر ہمیں کل تک فخر تھا..... اس ماں کی طرف دیکھتے ہوئے آج شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ

رندھی ہوئی آواز میں بولا تو میں تڑپ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کو

دیکھتے ہوئے شاہ زیب بھی آنکھیں پونچھتا ہوا چلا گیا۔

پھر بلال بھائی بھی کھڑے ہو گئے۔

”نورین..... آج تم میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر گئی۔ سمجھو آج سے تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ تم میرے

لیے مر گئی ہو اور میں تمہارے لیے۔“ بلال بھائی نے جانے کے لیے قدم اٹھائے تو مہوش بھی ان کے پیچھے پیچھے نکل گئی۔

سب چلے گئے تھے۔ اب جبار اکیلا میرے سامنے بیٹھا مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

”اب اکڑو میرے سامنے..... بڑا مان تھا نا تمہیں اپنی اولاد پر..... ان کو میرے خلاف استعمال کرتی تھی

اب بتاؤ..... کہاں گئی تمہاری اولاد..... نفرت ہو گئی ہے انہیں تم سے..... آج تم بالکل اکیلی اور تہی دست ہو گئی ہو۔

اولاد سے، بھائی سے، بہن سے اور شوہر سے..... ہر رشتے سے محروم ہو گئی ہو۔ میں خواہ خواہ احساسِ ندامت سے

ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ شاید میرا وہ یہ تمہارے ساتھ مناسب نہیں رہا تمام عمر..... مگر تم تو اس سے بھی

زیادہ برے سلوک کی مستحق تھی۔“

وہ بھی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جاتے جاتے رک گیا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔ وہ ہمسایوں کا لڑکا وہی آدمی تھا نا جو اس دن مال میں ملا تھا۔“ میں تو پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔

اس کی بات کا جواب کیا دیتی۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا میری طرف نفرت سے دیکھتا رہا، پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں

کافی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی خلاؤں میں تکتی رہی۔

یہ میرے ساتھ اچانک کیا ہو گیا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پاتال کی گہرائی میں گرتی جا رہی تھی۔
یا خدا! یہ دن دکھانے سے پہلے مجھے موت ہی دے دیتا۔ میں خدا سے شکوہ کرنے لگی۔ پھر میں شاک سے
باہر آئی اور زار و قطار رونے لگی۔ روتے روتے اونچی آواز میں چلانے لگی۔ چنچیں مار مار کر اس گھر کے در و دیوار ہلا دینا
چاہتی تھی۔

”امی..... امی..... پلیز چپ ہو جائیں۔“ فاریہ آ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پہلے سے
بھی زیادہ شدت سے رونے لگی۔ وہ گہرا گئی اور وہ بھی رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جبار اندر آیا اور دھاڑا۔
”بند کرو یہ تماشا۔ اپنے ساتھ میری بچی کو کیوں رُلا رہی ہو۔“ اس نے فاریہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ ”اٹھو
بیٹی..... جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”مگر ابو..... امی کیوں رو رہی ہیں؟“ فاریہ نے روتے ہوئے پوچھا۔
”بیٹا..... اس کی باقی عمر اب ایسے ہی روتے ہوئے گزرنی ہے۔ تم پریشان نہ ہو..... اٹھو باہر چلو۔“ وہ اسے
اپنے ساتھ دھکیلتا ہوا باہر لے جانے لگا تو وہ بچل گئی۔
”میں امی کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

”میں نے کہا ہے نا کہ باہر جاؤ۔“ جبار گر جا تو وہ سہم گئی اور چپ چاپ اس کے ساتھ باہر چلی گئی۔
میں ایک دفعہ پھر اکیلی رہ گئی۔ میں تھی یا میری تنہائی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ لگتا تھا باہر شام
ہو رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر لائٹ نہ جلائی۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد گہپ اندھیرا پھیل گیا۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے میرا جسم
اکڑ گیا تھا اور اب شام ہونے کے بعد ہلکی ہلکی سردی بھی لگ رہی تھی۔ میں دونوں ٹانگیں اوپر کر کے اپنا سر گھٹنوں میں دے کر
بیٹھ گئی۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے طویل اور بھیا تک رات تھی۔ آہ خاور میں نے تمہیں کھونے کے ساتھ ساتھ سب
کو کھو دیا۔ میں بالکل تہی دست اور مفلس ہو گئی ہوں۔ ہر رشتے سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں۔ سب نفرت کرنے لگے ہیں مجھ
سے۔ میں پھر سے ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا جو گہپ اندھیرے میں بھی اپنی
سنہری رنگت کی بدولت سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ آٹھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔

پتا نہیں بچوں نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ سب نے صبح کے وہی آلو والے پراٹھے کھائے ہوئے ہیں۔ اب تو لازماً
اُن کو بھوک ستا رہی ہوگی۔ میری تو بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی۔

جبار کہتا ہے کہ میرے بچے مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ بھلا میرے بچے مجھ سے کیسے نفرت کر سکتے ہیں۔
میں ماں ہوں اُن کی وہ بھلا اپنی ماں سے کیسے نفرت کر سکتے ہیں۔ بکواس کرتا ہے وہ۔ میری اولاد مجھ سے بہت محبت کرتی
ہے۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ دکھنے لگا تھا۔ جب بیٹھ بیٹھ کر تھک گئی تو وہیں صوفے پر ٹیڑھی میٹھی ہو کر لیٹ گئی۔ اب رات
کے دس بج رہے تھے۔ مجھے بہت سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھٹھرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسی
طرح گزر گیا۔ مجھے غنودگی سی ہونے لگی۔

دفعتاً مجھے یوں لگا جیسے میرے ٹھٹھرتے ہوئے جسم کو حرارت مل گئی ہو۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو فاریہ میرے

اد پر کمبل ڈال کر اب میرے پاس کھڑی مجھے دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”فاربیہ۔“ میرے حلق سے بمشکل ہی آواز نکلی۔

”جی امی۔“ وہ میرے چہرے پر جھکی۔

”بیٹا کچھ کھایا ہے تم لوگوں نے۔“

”نہیں امی..... کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ شاہ زیب بھائی نے مجھے ایک انڈہ اور دو سلاکس گرم کر کے دیئے تھے مگر

مجھ سے کھائے ہی نہیں گئے۔ بس ایک دو بانٹ ہی کھا سکی۔ امی آپ نے کچھ کھانا ہے تو لاؤں۔“

”نہیں میری جان..... مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”امی انھیں یہاں سے۔ میرے روم میں آ جائیں۔ میرے پاس سو جائیں۔ آپ ابو سے ناراض ہے، مجھ سے

تو ناراض نہیں۔“

”تم سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں میری جان۔“

”تو پھر انھیں..... چلیں میرے کمرے میں چلیں۔“ وہ ضد کرنے لگی۔

”نہیں بیٹا، آج اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ کل سے تمہارے ساتھ تمہارے کمرے میں سوؤں گی۔“

”پراس.....“

”پکا پراس.....“

اس نے میری پیشانی پر پیار کیا اور چلی گئی۔ میں نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

☆.....

اگلی صبح اس وقت آنکھ کھلی جب کسی نے مجھ سے کبل کھینچ کر دور پھینک دیا۔ میں نے منہ ہی آنکھیں کھولیں تو

جبار پاس کھڑا تھرا آلود نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

”اٹھو..... اور اٹھ کر ناشتہ تیار کرو..... تمہیں نہیں پتا کہ میں نے اور شاہ زیب نے دفتر جانا ہے جبکہ دوسرے

دونوں بچوں نے اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں جانا ہے۔“

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے بخار ہو گیا تھا۔ کیونکہ جسم آگ کی

طرح دھک رہا تھا۔

”اٹھو گی کہ میں اٹھاؤں۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے بازو سے کھینچ کر صوفے سے نیچے پٹخ دیا۔ میرے منہ سے بے

اختیار چیخ نکل گئی۔ اس نے پھر بازو سے پکڑ کر مجھے کھڑا کیا۔ ”چلو کچن میں چل کر ناشتہ تیار کرو۔“ اس نے بڑی حقارت

سے حکم دیا اور باہر چلا گیا۔

اپنی بے بسی اور تذلیل پر آنکھیں چھٹک پڑیں۔ جو پہلے ہی کل سے رو رو کر سوچ گئی تھیں۔ اب تو بے تحاشا جلن

ہو رہی تھی آنکھوں میں۔ میں لڑکھڑاتی ہوئی کچن میں گئی۔ آٹا چھان کر گوند ہنے لگی۔ آٹا گوند ہنے تک میری حالت غیر ہو گئی۔

باہر لاؤنج میں رکھے صوفے پر گر کر ہانپنے لگی۔ جبار شاید باہر چلا گیا تھا۔ شاہ زیب باہر نکلا۔ ایک چکر لگا کر پھر سے کمرے

میں چلا گیا۔ مجھے اس نے بلانا تک گوارہ نہ کیا پھر فاربیہ باہر آئی۔ مجھے دیکھ کر روڑی آئی۔

”امی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ بڑی فکر مند ہو رہی تھی۔

”نہیں بیٹی، مجھے لگتا ہے..... بخار ہو گیا ہے۔“ میں نقاہت سے بولی۔

”ارے..... آپ کو تو واقعی بڑا تیز بخار ہے۔“ اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اندر جا کر

آرام کریں۔ یہاں سردی میں کیوں بیٹھی ہیں۔“

”ابھی تمہارے ابو کے لیے پراٹھے بنانے ہیں۔ پھر جا کر آرام کروں گی۔“ اتنی بات کرتے کرتے میری

سانس پھول گئی۔

”رہنے دیں..... ابو کے پراٹھے..... میں انہیں بتا دوں گی کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ باہر سے کچھ کھا

لیں گے۔“

اتنے میں جبار آ گیا۔

”میں نہانے جا رہا ہوں۔ میرا ناشتہ تیار کرو۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اٹھنے کی ہمت جمع کر رہی

رہی تھی کہ شاہ زیب تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلا۔ اس نے پیٹ شرٹ کے ساتھ ٹائی لگا رکھی تھی۔ وہ مجھے نظر انداز کرتا ہوا

میرے پاس سے گزرنے لگا تو میں نے پکارا۔

”شاہ زیب بیٹا..... ناشتہ نہیں کرو گے۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا اور تیزی سے گزر گیا۔

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ رات کو بھی بھوکا سویا ہے اور صبح بھی بھوکے پیٹ جا رہا ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہو رہا

ہے۔ میں نے اپنے ہنستے ہنستے گھر کو اجاڑ دیا۔ میں واقعی نفرت کے قابل ہوں۔ میں آنسو پونچھتے ہوئے کچن میں جا کھڑی

ہوئی۔ جبار کے لیے پراٹھے بنانے لگی۔ فاریہ میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔

وہ برتن ٹیبل پر رکھنے لگی۔ جبار نہا کر باہر آیا تو میں اس کا ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ ناشتہ تیار کر کے میں فاریہ کے

کمرے میں جا کر فاریہ کے بیڈ پر لیٹ گئی۔

”تم سکول کے لیے تیار کیوں نہیں ہوئی؟“ جبار فاریہ سے پوچھ رہا تھا۔ آواز دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے اندر

تک آ رہی تھی۔

”میں نے آج سکول نہیں جانا کیونکہ امی کو بہت تیز بخار ہے۔“ فاریہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔ اس کے بعد جبار

نے مزید کوئی بات نہ کی۔ چپ چاپ ناشتہ کرتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد فاریہ اندر میرے پاس چلی آئی۔

”امی آپ کے لیے چائے بناؤں۔“ وہ میرے پاس بیٹھ کر میرا سر دبانے لگی۔

”دودھ والا دودھ دے گیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”جی امی، دے گیا ہے۔ میں نے دیکھی میں ڈال کر چو لہے پر چڑھا دیا ہے۔“

”آج ہلکی رکھنی تھی کہیں اُبل نہ جائے۔“

”نہیں اُبلے گا۔ میں نے آج ہلکی رکھی ہے۔ اب بتائیں چائے بنا کر لاؤں۔ ساتھ دو تین پاپے کھالیں۔“

میری بیٹی کو میری کتنی فکر ہو رہی تھی۔ اس نے ابھی میرا اصل روپ نہیں دیکھا۔ اگر اس پر بھی میری اصلیت کھل

گئی تو یہ بھی مجھ سے نفرت کرنے لگے گی، اپنے بھائیوں کی طرح۔
”بیٹا میری فکر چھوڑو اور تم کچھ کھا لو۔“

”نہیں امی، جب تک آپ کچھ نہیں کھائیں گی۔ میں بھی نہیں کھاؤں گی۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔
”اچھا ٹھیک ہے۔ میرے لیے ایک کپ چائے بنا کر ساتھ دو پاپے لے آؤ۔“ میری بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔
جلدی سے کچن میں گئی اور ایک بڑا مگ چائے کا بنا کر لے آئی۔ ساتھ دو پاپے پلیٹ میں رکھے ہوئے تھے۔
میں نے پاپے زہر مار کیے اور چائے پینے لگی۔ اس کے بعد اس نے دو پینا ڈول کی گولیاں میری ہتھیلی پر رکھیں۔
اب انہیں بھی تھوڑی چائے کے ساتھ نگل لیں۔“ میں نے گولیاں منہ میں رکھیں اور چائے کے آخری دو تین گھونٹوں کے ساتھ نگل گئی۔

”اب آپ لیٹ جائیں۔“ اس نے میرے اوپر کبل ڈالا اور بولی۔ ”میں اب اپنے لیے ناشتہ بنا کر لے آؤں۔“ وہ باہر چلی گئی تو سوچوں کی یلغار نے پھر سے ذہن کو اپنے حصار میں لے لیا۔
خاور کو جب میرا نمبر بند ملے گا تو وہ کیا سوچے گا۔ یقیناً وہ ساری صورت حال سمجھ گیا ہو گیا۔ کیونکہ پہلے میرے نمبر سے اسے کال کی گئی تھی اور جب اس نے ہیلو بولو کہا تو فون بند کر دیا گیا تھا۔ اگر اب تک نہیں بھی سمجھا تو آئندہ ایک دو دن تک سمجھ جائے گا۔ سمجھ جائے گا کہ ہمارا راز فاش ہو چکا ہے۔ جب ساری صورت حال اس پر واضح ہوگی تو تب اس پر کیا گذرے گی۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تو میں نے آنکھیں موند لیں۔
”سو گئیں کیا؟“ فاریہ اپنے ناشتے کی ٹرے لیے میرے پاس کھڑی تھی۔
”نہیں..... جاگ رہی ہوں۔“

وہ میرے پاس بیڈ پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ برتن کچن میں رکھ کر واپس آئی اور میری ٹانگیں دبائے لگی۔

”امی.....“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔
”ہوں.....“ میں نے دھیرے سے کہا۔
”ابو کی اور آپ کی کس بات پر لڑائی ہوئی ہے۔ لڑائی جھگڑے تو پہلے بھی آپ دونوں کے درمیان ہوتے رہے ہیں مگر یہ جھگڑا تو لگتا ہے زیادہ ہی سیریس ہے۔“
”بس ہو گئی ہے لڑائی کسی بات پر۔ اس بات کو چھوڑو کہ کس بات پر ہوئی ہے۔“ میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئی اور ٹانگیں دباتی رہی۔

”فاریہ.....“

”جی امی.....“

”زود ہی ابھی تک سو رہا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں امی..... میں نے آتے وقت زود ہی ابھی بھائی کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ بستر میں لیٹے چھپتے ہوئے تھے۔ میرے طرف دیکھ کر بھی خاموش ہی رہے۔“ میں پھر سے دکھ کی آگ میں جلنے لگی۔ ہائے یہ ایک دن میں

کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں سے پھر سے آنسو بہنے لگے۔
 ”امی یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو..... بار بار رونے لگتی ہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فاریہ نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا..... میری بچی.....“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ پریشان ہو گئی۔
 ”امی خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔“ جب میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تو وہ دوڑ کر باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد وہ مہوش کو ساتھ لے کر آ گئی۔ ”آئی دیکھیں امی کل سے مسلسل روئے چلی جا رہی ہیں اور اب تو اتنا تیز بخار بھی ہو گیا ہے۔ مگر پھر بھی رونے سے باز نہیں آ رہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں۔“ فاریہ بتاتے ہوئے رونے لگی۔
 مہوش میرے پاس بیٹھ گئی۔ ”فاریہ یہ بیٹا تم تھوڑی دیر دادی کے پاس چلی جاؤ۔ میں تمہاری امی کو اکیلے میں سمجھانا چاہتی ہوں۔“ اس نے فاریہ کو بہانے سے باہر بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑی دیر مجھے روتا ہوا دیکھتی رہی پھر بولی۔
 ”دیکھو نورین..... یہ جو کچھ ہوا ہے..... اس کی ذمہ دار تم ہو۔ اب رونے دھونے سے یا بچھڑانے سے کیا فائدہ۔ اپنے آپ کو سنبھالو..... اس گھر کو اور تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”سنہیلنے کے قابل چھوڑا کب ہے تم نے۔ تم نے اپنی زبان سے ایسے گھاؤ دیئے ہیں جو میرے مرنے تک نہ بھر سکیں گی۔ اگر اتنی نفرت تھی مجھ سے تو میرے منہ پر تھپڑ مار لیتی۔ میری جوان اولاد کے سامنے مجھے اس طرح ذلیل درو سا تو نہ کرتی..... تم بہن ہو میری..... اگر بہنیں ایسی ہوتی ہیں تو دشمن کیسے ہوتے ہوں گے۔ آج سے میری کوئی بہن نہیں۔ جہاں میرے دوسرے رشتے ختم ہو گئے ہیں یہ رشتہ بھی ختم سمجھو۔ تم جا سکتی ہو..... مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم نے میرے ساتھ جو کچھ کر دیا ہے وہی کافی ہے۔“ میں نفرت سے بولتی چلی گئی۔ وہ چپ چاپ سنی رہی پھر تنک کر بولی۔
 ”میں تو سمجھتی تھی کہ اتنی مٹی پلید ہونے کے بعد ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔ مگر تمہارا دماغ تو پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گیا ہے۔ چلتی ہوں۔“ وہ کھڑی ہو کر پھر بولی۔ ”جبار بھائی نے تمہارا باہر جانا بالکل بند کر دیا ہے۔ مو بائل تم سے چھین لیا ہے۔ اب اس چار دیواری میں اکیلی رہ کر گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گی۔“

”مر جاؤ گی..... مگر تم سے بات نہیں کروں گی..... چلی جاؤ یہاں سے۔“ میں چلائی۔ ”دوبارہ یہاں اس وقت آنا جب میں مر جاؤں گی۔ اس سے پہلے ہرگز نہ آنا۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ مجھے نفرت ہو گئی ہے تم سے۔“ میں ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی تو وہ چلی گئی۔ میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میرے دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے والی ہو گئی تھیں۔ جسم لرز رہا تھا۔ اسی وقت فاریہ پریشان چہرہ لیے اندر آئی۔

”امی..... یہ کیا ہو رہا ہے..... میں آئی کو لے کر آئی تھی تاکہ آپ کو سمجھا سکیں..... مگر وہ تو خود روتی ہوئی یہاں سے گئی ہیں۔“

”جانے دو اور ہاں خبردار آئندہ کبھی تم اسے بلانے لگتی۔“ میں نے فاریہ کو تنبیہ کی تو وہ سہم کر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد طبیعت میں ذرا ٹھہراؤ آیا تو میں نے فاریہ کو پکارا۔
 ”جی امی.....“ وہ آہستگی سے بولی۔

”زوہیب بھائی کو ناشتے کا پوچھو۔“

”وہ تو باہر نکل گئے۔ میں جب آئی کے گھر سے آرہی تھی تو وہ بائیک پر بیٹھ رہے تھے۔“
”اچھا.....“ میں تھک ہار کر لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں۔

☆.....

سارا دن اسی طرح سوتے جاگتے اور روتے ہوئے گذر گیا۔ فاریہ بے چاری مجھے دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی رہی۔ پچھلے پہر ممانی جان آ کر میرے پاس بیٹھ گئیں۔

”نورین یہ کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔ شکل دیکھی ہے اپنی آئینے میں۔ کس بات پر جھگڑا ہوا ہے دونوں بہنوں میں۔ وہ بھی صبح سے رورہی ہے۔ اب تم دونوں کے بچے جوان ہو گئے ہیں، اب تو یہ لڑنا جھگڑنا بند کر دو۔“ ممانی بول رہی تھیں اور میں چپ چاپ نظریں جھکا کے سنتی جا رہی تھی۔ ”اٹھو اور اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے چنچ کر دو۔ بال سنوارو۔ کچھ نہیں تو اپنی بنی کا ہی خیال کر لو۔ دیکھو کیسی شکل بنائے تمہارے پاس بیٹھی ہے۔“
”جی ممانی۔“ میں سر جھکائے بولی۔ پھر ممانی چلی گئیں تو فاریہ بولی۔

”تو آپ کا جھگڑا آئی سے ہوا ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ ابو سے ہوا ہے۔ مگر ابو بھی تو اتنا ڈانٹ رہے تھے رات کو۔ کیا ابو سے اور آئی سے..... دونوں سے جھگڑا ہو گیا ہے۔“ فاریہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ میرا پھر دل بھر آیا۔
”سب سے جھگڑا ہو گیا ہے میری جان..... تمہیں نکال کے۔“ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”فاریہ.....“

”جی امی.....“

”بیٹا تم تو مجھ سے کبھی جھگڑا نہیں کرو گی نا۔“

”نہیں امی..... کبھی نہیں۔ امی آپ منہ دھو کر کپڑے بدل لیں۔ دادی کیا کہہ رہی تھیں بھول گئیں کیا۔“

”او کے میری جان۔“ میں کھڑی ہوئی تو مجھے کچھ یاد آیا۔ ”فاریہ! آج شریفان نہیں آئی کیا؟“

”آئی تھی..... آپ اس وقت سو رہی تھیں۔ صرف کچن کا کام کر کے چلی گئی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اُس کی طبیعت

خراب ہے۔ آپ کا بھی اُس نے پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ کی بھی طبیعت خراب ہے اور آپ سو رہی ہیں۔“

”اچھا.....“ میں نے الماری کھولی اور کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔

☆.....

شام ہونے تک طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ میں نے خود کو سمجھا بھجا کر پرسکون کیا۔ جو ہوا تھا بہت برا ہوا تھا، مگر ہو چکا تھا۔ اب میں کبھی بھی اپنے بچوں یا خاوند کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا وقار بحال نہیں کر سکتی تھی۔ رورو کے بھوکی رہ کے جان بھی دے دیتی، تب بھی نہیں۔ اگر کسی اور کو میری ضرورت نہ بھی ہوتی، مگر میری بچی کو تو میری ضرورت تھی نا۔ مجھے یہ حق تو ہرگز نہیں پہنچتا تھا کہ میں ایک بچی سے اس کی ماں کو چھین لوں۔ ماؤں کے بغیر بیٹیوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔
میں نے اُٹھ کے چکن پلاؤ بنایا۔

رات کے پونے سات بجار آیا۔ اس نے ایک غصے بھری نظر مجھ پر ڈالی اور دندناتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ میں

اور فاریہ لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر میں پھر سے افسردہ ہو گئی۔

اس کے پندرہ بیس منٹ بعد شاہ زیب بھی آ گیا۔ وہ بھی مجھ سے سلام دعا کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں جبار کی بے رخی تو برداشت کر سکتی تھی مگر اپنی اولاد کی نہیں۔

جبار کپڑے بدل کر باہر آیا تو تحسانہ لہجے میں بولا۔ ”لاؤ، کھانا لاؤ۔“

میں فوراً کچن میں گئی۔ چاول ڈش میں نکالے اور اس کے سامنے لار رکھے۔ فریج سے دہی کا رائیہ اور سلا د بھی اس کے آگے رکھے۔ فاریہ نے پانی کا جگ اور ساتھ گلاس رکھے۔ میں نے شاہ زیب کے کمرے میں جھانکا۔ وہ کپڑے بدل کر بیڈ پر درازٹی وی دیکھ رہا تھا۔

”شاہ زیب بیٹا..... باہر آ کر کھانا کھالو۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔ باہر سے کھا آیا ہوں۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا اور میں آنکھوں میں نمی لیے لاؤنج میں آ بیٹھی۔

جبار کن اکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کھانا کھا کر اس نے فاریہ سے کہا۔ ”فاریہ یہ برتن اندر کچن میں رکھو۔“

فاریہ برتن رکھ آئی تو پھر بولا۔ ”بیٹا اب ہمارے بیڈروم میں جاؤ اور اپنی امی والی سائیڈ ٹیبل کا درمیان والا دراز کھول کر اس میں جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ باہر لے آؤ۔“

”جی۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”اس میں تو امی کے لکھنے والے پیپر، بال پوائنٹس اور چشمہ ہے۔“

”ہاں ہاں وہی چیزیں۔ اب تمہاری امی نے لکھنے لکھانے والا کام بند کر دیا ہے۔“

فاریہ اندر گئی اور تمام چیزیں لا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ اس نے تمام کاغذات اٹھائے اور انہیں ایک ایک کر کے پھاڑنے لگا۔ ان میں، میں نے کچھ افسانے لکھ کر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ چند دن پہلے اپنا چوتھا ناول شروع کیا تھا۔ جس کے پچاس ساٹھ صفحے لکھ چکی تھی۔ وہ تھوڑے تھوڑے کر کے صفحات پھاڑتا جا رہا تھا اور فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میرا دل رور رہا تھا، کیونکہ لکھنا اب صرف میرا شوق ہی نہیں جنون بن چکا تھا اور ان حالات میں تو مجھے کاغذ اور قلم کے سہارے کی بہت زیادہ ضرورت تھی تاکہ میں اپنے ذہنی خلفشار کو کاغذوں پر انڈیل کر ذہنی پراگندگی سے بچ سکتی۔ ان کورے کاغذات پر اپنی دلی کیفیت لکھ کر من کا بوجھ ہلکا کر سکتی تھی۔ مگر اس سنگدل نے میرے سامنے میری تخلیقات کو ریزہ ریزہ کر کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ پھر میرا چشمہ اٹھایا اور اسے فرش پر رکھ کر اپنے جوتوں سے توڑ دیا۔ جب وہ کرچی کرچی ہو گیا تو فاریہ سے کہا کہ یہ بھی اٹھاؤ اور ٹوکری میں پھینک دو۔

”ابو..... آپ جانتے تو ہیں کہ امی بغیر چشمے کے کچھ بھی نہیں پڑھ سکتیں۔ پھر بھی آپ نے ان کا چشمہ توڑ دیا۔“

فاریہ آنکھوں میں پانی بھر کر بولی۔

”بیٹا..... انہیں ایسے کاموں سے باز رکھنے کے لیے ہی تو توڑا ہے۔ کہا تو ہے کہ اب یہ پڑھنے لکھنے والا کوئی کام

نہیں کریں گی۔“

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جبار پھر فاریہ سے مخاطب ہوا۔

”فار یہ بیٹا، تمہیں پتا ہے ناجائے نماز کہاں رکھا ہے۔“

”جی ابو، پتا ہے۔“

”تو جاؤ بیٹا وہ لے کر آؤ۔“

فار یہ گئی اور جائے نماز لے آئی۔

”بیٹا، اپنی امی کو دے دو۔“

فار یہ نے وہ جائے نماز میری گود میں رکھ دیا۔

”یہ جائے نماز اپنے پاس رکھو۔“ وہ مجھے مخاطب کر کے پھنکارا۔ ”پانچ وقت کی نماز پڑھا کرو اور اپنے رب سے اپنے گناہوں کی رورو کے معافی مانگو۔ تم معافی کے قابل تو ہرگز نہیں پھر بھی شاید اللہ کو تم پر ترس آجائے اور وہ تمہیں معاف کر دے۔“ میں چپ چاپ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی تو وہ پھر بولا۔

”آج سے تمہاری زندگی کے صرف دو مقصد رہ گئے ہیں۔ عبادت کر کے خدا کو راضی کرنا اور ہماری خدمت کر کے ہمیں مطمئن کرنا۔“

فار یہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی جبار کو دیکھ رہی تھی اور میں روتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ خدا کو منانا زیادہ آسان ہے یا آپ لوگوں کو۔

.....☆.....

شاہ زیب نے باہر نکل کر نہ تو کھانا کھایا اور نہ دودھ پیا۔ جبکہ زوہیب صبح گیارہ بجے کا نکلا ہوا ابھی تک نہ آیا تھا۔ اب تورات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں لاؤنچ میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ فار یہ اپنے کمرے میں سوچتی تھی۔ جبار بھی کمرے میں چلا گیا تھا۔ جب سے یہ سانحہ رونما ہوا تھا ہمارے گھر میں موت جیسا سناٹا چھا گیا تھا۔

میں وہیں لاؤنچ میں ہی سر ہانہ اور کبیل لے آئی اور ایک صوفے پر لیٹ گئی۔ میں زوہیب کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ یہی بیٹا تھا جو مجھ سے بات کیے بنا ایک پل بھی نہیں گذارتا تھا اور یہی بیٹا اب میری شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ لیٹے لیٹے مجھے اگکھی آنے لگی۔ دفعتاً مجھے یوں لگا جیسے میرے پاس سے کوئی سایہ گزرا ہو۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو زوہیب گزر رہا تھا۔

”زوہیب۔“ میں نے آہستگی سے پکارا۔

وہ رک گیا، مگر پیچھے پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا۔

”زوہیب..... ادھر آؤ میرے پاس۔“ میں لجاجت سے بولی۔

”مجھے نیند آرہی ہے۔ اب سونا چاہتا ہوں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”زوہیب..... ایسا مت کرو..... میرے ساتھ۔“ میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

”تم لوگوں کا رویہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں مرجاؤں گی۔“ میں دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر

رونے لگی۔

”مار تو آپ نے ہمیں دیا ہے۔“ وہ پلٹ کر چلایا۔ ”جیتے جی مر چکے ہیں ہم۔ اپنی لاشوں کو اٹھائے پھر رہے

ہیں۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہماری ماں کے کسی غیر مرد سے درپردہ ناجائز تعلقات ہیں۔“

”پلیز چپ ہو جاؤ۔“ میں دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے چیخی۔ ”میرے کان پھٹ جائیں گے۔ یا خدا! یہ سننے سے پہلے میں مر کیوں نہیں گئی۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ رات بھی میری تقریباً روتے ہوئے گزری۔ میں نے جو اپنے آپ کو تھوڑا سنبھالا دیا تھا اور خود کو تسلی دی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہوتا جائے گا پھر سے بکھر گئی۔ اب مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ اس وقت میرے دل میں یہ خواہش شدت سے پیدا ہونے لگی کہ مجھے مر جانا چاہیے۔ اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہوگی۔ پھر میں بڑی سنجیدگی سے خودکشی کے متعلق سوچنے لگی۔

ایسا کون سا طریقہ ہو کہ جان بھی جلدی نکل جائے اور مرتے وقت زیادہ اذیت بھی نہ ہو۔ جا کر دوسری منزل کی چھت سے چھلانگ لگا دیتی ہوں۔ مگر نہیں اگر خدا خواستہ بیچ گئی تو معذور تو یقیناً ہو ہی جاؤں گی۔ اور باقی کی زندگی بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینا پڑے گا۔ نہیں نہیں یہ طریقہ بالکل ٹھیک نہیں۔ ایسا کرتی ہوں بجلی کا کرنٹ لگواتی ہوں مگر اس میں تو بڑی تکلیف ہوگی۔ کیا کروں..... کیسے اس شرمناک زندگی کا خاتمہ کروں۔ سوچ سوچ کر دماغ دکھنے لگا تھا۔ سب سے آسان اور کم تکلیف وہ طریقہ یہ تھا کہ انسان مٹھی بھر نیند کی گولیاں پھانک لے۔ میں نے سنا تھا کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا اور وہ اس جہان سے اُس جہان میں منتقل ہو جاتا ہے۔ بے ہوشی میں ہی بغیر کسی تکلیف کے جان نکل جاتی ہے۔ اسی لیے پڑھ لکھے لوگ فلمی اداکار وغیرہ خودکشی کے لیے یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ مجھے بھی سب سے زیادہ یہی طریقہ اچھا لگا۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں نیند کی گولیاں کہاں سے حاصل کروں۔ کون مجھے لا کر دے سکتا ہے۔ سوچ سوچ کر آخر غفار کا خیال ذہن میں آیا۔ اگر غفار کو میں مطمئن کر لوں اس کے ذہن میں کوئی شک پیدا نہ ہو تو وہ با آسانی یہ کام کر سکتا ہے۔ ساری پلاننگ ذہن میں ترتیب دے کر میں مطمئن ہو گئی۔ وقت دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں اٹھی، کبیل اٹھایا اور جا کر فاریہ کے بیڈ پر اس کے پاس لیٹ گئی۔



اگلے دن فاریہ کو میں نے اٹھایا اور کہا کہ سکول جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

میں باہر نکلی تو جبار بھی اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ وہ باہر لان میں چلا گیا اور میں کچن میں گھس گئی۔ جبار نے آج بھی خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا تھا۔ جبکہ آج زوہیب بھی کالج کے لیے تیار ہو کر باہر آیا تھا۔ اس نے فاریہ کو کہا کہ جلدی کرو۔ لیٹ ہو رہے ہیں۔ فاریہ اس وقت ناشتہ کر رہی تھی۔

”زوہیب تم بھی کچھ کھا لو۔“ میں کزوری آواز میں بولی۔

”دل نہیں چاہ رہا۔ کالج کینٹین سے کچھ کھا لوں گا۔“ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ میں مزید کچھ نہ بولی۔ شاہ زیب بھی ناشتہ کیے بنا ہی چلا گیا۔ سب کے جانے کے بعد میں لاؤنج میں رکھے صوفے پر گر گئی۔ پھر اٹھی اور اپنے لیے چائے بنا لائی۔

تھوڑی دیر بعد شریفان آ گئی۔ وہ سیدھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”بی بی جی..... آپ کو کیا ہوا ہے؟ بہت بیمار اور کمزور نظر آ رہی ہیں۔“ وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”کچھ خاص نہیں، بس بخار ہو گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔“

”ٹھیک نہیں ہیں۔ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنا چیک اپ کروائیں۔ کئی دفعہ بخار بندے کے اندر چلا جاتا ہے۔ باہر سے انسان ٹھنڈا ہو جاتا ہے مگر اس کے اندر بخار ہوتا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے جان چھڑانے کی خاطر کہہ دیا۔

”باجی جی..... آپ اس وقت اکیلی ہی ہیں نا۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے رازداری سے بولی۔

”ہاں ہاں..... اکیلی ہی ہوں..... کیا کوئی خاص بات ہے؟“ اس کی باتیں مجھے سسپنس میں مبتلا کر رہی تھیں۔

پھر اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک سفید رنگ کا تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

”یہ جی خاور صاحب نے مجھے آج صبح دیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ نورین باجی کو اس وقت دینا جب وہ بالکل

اکیلی ہوں۔“

”اچھا۔“ میں نے کانپتے ہاتھ سے کاغذ پکڑ لیا۔

”اچھا بی بی جی، اب میں کام کر لوں۔“ وہ اٹھ کر مصروف ہو گئی۔ میں نے وہ کاغذ کھولا تو لکھا تھا۔

”میری پیاری دوست اور محسنہ!

سلام عرض کرتا ہوں۔ پچھلے تین دن سے آپ سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ آپ کا فون مسلسل بند جا رہا ہے۔ سخت ذہنی اذیت میں ہوں۔ خدا را مجھے بتائیے کیا ہوا ہے۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی ہے۔ کل زوہیب سر راہ ملا۔ میں نے اسے بلایا تو وہ مجھ سے بات کیے بنا ہی آگے گذر گیا۔ اس کے روپے سے میرے شہبے کو مزید تقویت ملی ہے۔ جو بھی صورت حال ہے۔ مجھے فوراً لکھ کر بھیجیں۔ میں شریفاں سے لے لوں گا۔

”آپ کا غلام“

اس نے اس رقعے میں نہ اپنا نام لکھا تھا اور نہ کہیں میرا نام ظاہر کیا تھا۔

میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور اسے لکھ ڈالا۔

”میرے غمگسار اور ہمدرد.....

آپ کو میرا آخری سلام قبول ہو۔

صورت حال بڑی افسوسناک ہے۔ آخری مرتبہ ہم نے فون پر ایک دوسرے کو جو SMS کیے تھے، وہ جبار کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اس نے خود پڑھ کے پھر میرے بچوں اور بہن بھائیوں کو پڑھوائے ہیں۔ وہ سب مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ کوئی میری صورت دیکھنے کا روادار نہیں۔ ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ ہمیشہ ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ آپ ایک وعدہ کریں..... کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں لیں گے۔ جینے کی امید نہیں چھوڑیں گے۔ مایوسی کو دل میں جگہ نہیں دیں گے۔ ہمیشہ آپ کی صحت کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔

”آپ کی خیر خواہ“

اور ہاں آئندہ کبھی مجھ سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ کیجئے گا۔“

میں نے کاغذ تہہ کیا اور شریفاں کو دیتے ہوئے کہا۔

”شریفاں اسے سنبھال کر رکھنا۔ جب بھی خاور صاحب لینے آئیں انہیں دے دینا مگر صرف اکیلے میں۔ کسی کے سامنے نہیں۔“

”جی اچھا، بی بی جی..... آپ بالکل فکر نہ کریں۔“

”خاور صاحب صبح خود تمہارے گھر آئے تھے؟“ میں نے فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

”جی ہاں..... وہ خود آئے تھے۔ بڑے کمزور اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔“ وہ بڑے افسوس سے بولی۔
خاور کی حالت کا سن کر میں بھی الجھ گئی۔ آہ خاور..... اس سے تو بہتر تھا کہ..... تم میری زندگی میں آتے

بی نا.....

☆.....

اگلا ایک ہفتہ بڑی اذیت میں گذرا۔ دونوں لڑکے ابھی تک نہ مجھ سے بات کر رہے تھے اور نہ گھر سے کھانا کھا رہے تھے۔ یہ صورت حال میرے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ مہوش نے بھی اس کے بعد چکر نہیں لگایا تھا۔ کتابیں میں بغیر چشمے کے پڑھ نہیں سکتی تھی کیونکہ ان کی لکھائی بہت باریک ہوتی ہے اور ویسے بھی جبار نے میری تمام کتابیں الماری میں رکھ کر انہیں تالا لگا دیا تھا۔ بچوں اور ان کے ابو کے جانے کے بعد میں پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ مجھے کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ تنہائی سے دل گھبراتا تو ٹی وی لگا لیتی۔ مگر جلدی ہی بور ہو کر بند کر دیتی کیونکہ مجھے ٹی وی دیکھنا زیادہ پسند نہیں تھا۔ میرا دل تو کتابوں کی دنیا میں لگتا تھا۔ کتابوں سے میری دوستی بہت پرانی اور گہری تھی۔ میں دس بارہ سال کی عمر سے مطالعہ کرتی آرہی تھی۔ یہ شوق اب میری ضرورت بن گیا تھا۔ اس کے بغیر اب مجھے جینا محال لگ رہا تھا۔ خودکشی کا خیال بھی دل سے نکال دیا تھا کیونکہ میں نے ایک مرتبہ اپنی نانی سے وعدہ کیا تھا کہ چاہے زندگی میں کچھ بھی ہو جائے زندگی کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو جائے، میں خودکشی کا خیال کبھی دل میں نہیں لاؤں گی۔ اور نانی سے کیا گیا کوئی بھی وعدہ میں کبھی توڑ نہیں سکتی تھی۔

مجھے اس وقت نانی کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ آج سے چوبیس سال پہلے بھی میری زندگی میں ایک ایسا ہی بھونچال آیا تھا مگر اس وقت نانی تم نے مجھے سنبھال لیا تھا۔ مجھے بکھرنے نہیں دیا تھا اور آج میں بالکل اکیلی تن تنہا اس طوفان کا مقابلہ کر رہی تھی۔ مگر نانی مجھے لگتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ ہمت ہار رہی ہوں۔ اندر سے ٹوٹتی جا رہی ہوں۔ کیوں کہ یہ طوفان اس بھونچال سے کہیں زیادہ بڑا اور خطرناک ہے۔ میں اکیلی بیٹھی روتی رہتی اور اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی۔ کتنی مرتبہ شریفاں میری طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلاتی اور کئی مرتبہ پوچھتی۔ ”بی بی جی، آپ اکیلی بیٹھی کس سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ مہوش بی بی کے ہاں ہی چلی جایا کریں یا پھر اُسے بلا لیا کریں۔ تنہا رہتے رہتے تو آپ کا دماغ ہل جائے گا۔ میرا مطلب ہے آپ کے ذہن پر برا اثر پڑ سکتا ہے جی۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے مجھے مشورہ دیا۔ جواب میں، میں اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ ڈرگئی اور تیزی سے کپڑے استری کرنے لگی۔

اسی دن میں نے جبار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

رات کا کھانا کھا کر وہ فارغ ہوا تو اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ ویسے بھی اب وہ باہر کم ہی نکلتا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ ابھی وہ آکر بیڈ پر بیٹھا ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر تیوری پر ہل پڑ گئے۔

”کس لیے آئی ہو؟“ اس نے بڑے تلخ لہجے میں پوچھا۔
 ”بات کرنی تھی آپ سے۔“

”جو بکنا ہے جلدی بکو..... اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔“

اُف اتنی نفرت اور تذلیل۔ میری روح تک جھلس گئی مگر میں پھر بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اور آواز کانپ رہی تھی۔

”جبار مجھے پلیز پڑھنے اور لکھنے کی اجازت دے دو۔ میں تمہارے رہتے تھن کا شکار ہو جاتی ہوں۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ دیکھو تم نے کہا تھا کہ میں باہر نہیں جاسکتی اور میں نے ایک دفعہ بھی اپنے بیرونی گیٹ کی دلیز عبور نہیں کی۔ تم جیسا جیسا کہتے جاؤ گے، میں کرتی جاؤں گی۔ تمہاری ہر بات مانوں گی۔ بدلے میں تم صرف میری ایک بات مان لو۔ میرے پیپرز اور عینک واپس کر دو۔ میری کتابیں واپس کر دو۔ تمہیں آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ پلیز جبار..... مجھ پر رحم کھاؤ..... ورنہ..... ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ میں یہ کہہ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”اگر تم پاگل ہو گئی تو تمہیں پاگل خانے چھوڑ آؤں گا اور اگر مر گئی تو دفن آؤں گا اور ویسے بھی تمہاری زندگی کی اب ضرورت ہی کسے ہے۔ تمہارا امر جاننا ہی بہتر ہے۔“ اس نے حقارت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں اپنی بات ختم کی اور کہا۔
 ”اب تم جاسکتی ہو۔ زیادہ دیر میرے سامنے رہو تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔“

میں نے بمشکل اپنا بے جان ہوتا ہوا وجود اٹھایا اور مرے مرے قدموں سے باہر آ گئی۔ پھر فاریہ کے کمرے میں جان کر اونچی آواز میں خوب روئی۔ یا خدا مجھے اٹھالے..... میری دعا کیوں نہیں سنتا۔ ابھی کتنی ذلت مجھے دکھائے گا..... اب تان نہیں رہی ذلیل ہونے کی..... میں روتی رہی اور خدا سے شکوے کرتی رہی.....

.....☆.....

اگلے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ ویسے بھی پوری رات سو نہیں سکی تھی۔ نیند تو جیسے مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ ساری ساری رات کروٹیں بدل بدل کر تھک جاتی۔ کبھی کبھی آدھی رات کو اٹھ کر باہر لان میں نکل جاتی۔ سردی سے ٹھٹھرنے لگتی تو اندر آ جاتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اب مجھے اندھیرے سے کوئی ڈر محسوس نہ ہوتا۔

رات نہ سونے کی وجہ سے میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح ڈکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اچانک مسجد سے کسی کے فوت ہونے کا اعلان نشر ہونے لگا۔ مسجد ہمارے گھر سے بہت قریب تھی۔ اس لیے آواز بہت واضح آرہی تھی۔ میں ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی باہر لاؤنچ میں آئی۔ لاؤنچ کا داخلی دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی۔ اعلان پھر سے دہرایا جا رہا تھا۔

خواتین و حضرات اعلان دوبارہ سنیں..... فلاں کے بیٹے، فلاں فلاں کے بھائی خاور احمد صاحب وفات پا چکے ہیں۔ اللہ و انالعلیہ راجعون..... ان کی نماز جنازہ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

اعلان کا سننا تھا کہ میں وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ میرے کانوں میں خاور کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ جب کبھی بھی آپ کی قریبی مسجد میں میرے مرنے کا اعلان ہوا تو اس بات کا یقین کر لیجئے گا کہ میں مرنے سے

پہلے آپ کو یاد کرتا ہوا مرا ہوں۔

میں ہذیبانی انداز میں چیخنے چلانے لگی۔

میری چیخیں سن کر جبار اور دونوں لڑکے اپنے اپنے کمرے سے نکل کر میری طرف لپکے۔

”زوہیب..... خادو مر گیا ہے.....“ میں زور زور سے چلا رہی تھی۔

”اچھا ہوا مر گیا ہے..... ہمیں مارنا نہیں پڑا.....“ خس کم جہاں پاک.....“ زوہیب منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

”خادو مر گیا ہے تو تمہیں تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟ تم کیوں تڑپ رہی ہو؟“ جبار میرے پاس کھڑا گرج رہا تھا۔

پھر اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا تو میں اس کے بازوؤں میں جھول کر ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

پھر جب آنکھیں کھلیں تو میں فاریہ کے بیڈ پر کبل میں لپٹی پڑی تھی۔ میرے بازو پر ڈرپ چڑھی ہوئی تھی۔

ممائی اور مہوش میرے پاس بیٹھی تھیں۔ جبکہ فاریہ میرے سر ہانے والی سائیڈ پر بیٹھی تھی۔ ان تینوں کے علاوہ

کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ممائی کے چہرے پر رونق آ گئی۔ ”خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔

پچھلے دس گھنٹوں سے بے ہوش پڑی ہو۔“ مہوش بھی فکر مندی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”اب کیسی ہو؟“ اس نے

آہستگی سے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ آنکھیں موند لیں۔

”میں جبار کو اور ڈاکٹر صاحب کو اندر بھیجتی ہوں۔“ ممائی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

”مہوش! خادو مر گیا ہے۔“ میں غم میں ڈولی آواز میں بولی۔

”ہاں اعلان میں نے بھی سنا تھا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”بہت برا ہوا۔ ابھی بے چارے کے چھوٹے چھوٹے

بچے تھے۔“

”کیا اس کا جنازہ ہو گیا؟“ میں نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

”ہاں ہو گیا ہے۔ جنازے کا وقت چار بجے کا تھا جبکہ اب پانچ بج رہے ہیں۔ غفار بھی وہیں گئے ہیں۔ ابھی

واپس نہیں آئے۔“ اس کے لہجے سے ندامت چھلک رہی تھی۔

”میں آخری مرتبہ بھی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔“ میری آنکھوں سے پھر سے آنسو بہنے لگے اور کانوں کی لوؤں کو

بھگونے لگے۔ مہوش خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”فاریہ.....“ میں نے فاریہ کو پکارا۔ ”نام کیا ہوا ہے؟“

”سو پانچ ہونے والے ہیں امی۔“ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے مہوش نے باتوں کے دوران وقت بتایا تھا مگر میں

بھول گئی تھی۔ کچھ ایسی ہی یادداشت ہو گئی تھی میری۔ ہر بات تھوڑی دیر بعد بھول جاتی تھی۔ رورو کے اب تو آنکھوں کی

بینائی بھی بہت کم ہو گئی تھی۔

اسی وقت جبار ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے آگے آ کر میری نبض چیک کی اور پھر ڈرپ چیک کی کہ

ٹھیک چل رہی ہے نا۔

”اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟ مجھے جبار صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کو بہت بڑا ذہنی صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ

سے آپ اپنے حواس میں نہیں رہی تھیں۔ اس لیے میں نے آپ کو نیند کا انجکشن لگا دیا تھا تاکہ آپ لمبے عرصے تک سوتی رہیں۔ اب تو آپ کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں گی۔“ ڈاکٹر نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

”بہتر محسوس کر رہی ہوں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نقاہت سے بولی۔

”اب آپ نے اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالنا۔ سن رہی ہیں نا آپ۔“

”جی۔“ میں آہستگی سے بولی۔

”جبار صاحب انہیں ذہنی پریشانی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ یہ دوائی میں لکھ دیتا ہوں جا کر اسٹور سے لے آئیں۔ مگر ایک بات یاد رکھیں۔ اس دوائے اتنا اثر نہیں کرنا جتنا آپ سب کے رویے نے کرنا ہے۔ ان کا دل بہلائیے۔ انہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کریں ورنہ نتائج خطرناک بھی نکل سکتے ہیں۔“

”اوکے ڈاکٹر صاحب..... آئیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔“

ڈاکٹر نے میری ڈرپ اتاری اور مجھے پھر ایک بار خوش رہنے کی تاکید کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر اور جبار کے جانے کے بعد مہوش بولی۔

”نورین..... تم یہ سب بھول کیوں نہیں جاتی۔ دیکھو کیا حال کر لیا ہے اپنا۔“ وہ دکھ سے بول رہی تھی۔

”تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہیں مہوش۔ تم پلیز مجھ سے ہمدردی مت جتایا کرو۔“ میں کڑواہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

”میں مانتی ہوں..... اس دن میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔ مگر تم بھی سوچو ذرا نورین..... یہ تم نے کیا حماقت کی ہے۔ بھلا اس عمر میں جوان بچوں کی موجودگی میں تمہیں کیا سوجھی تھی دل لگانے کی..... ہر کام کی ایک عمر ہوتی ہے.....“ وہ آہستگی سے بولی۔ پھر اسے اچانک فاریہ کا خیال آیا۔

”فاریہ بیٹا..... تم تھوڑی دیر کے لیے باہر چلی جاؤ۔“ اس نے فاریہ کو بھیج دیا اور پھر بولی۔

”خود کو سنبھالو نورین..... کیوں اپنی زندگی کا تماشا بنا رہی ہو۔ تمہاری بہو کو اگر صورت حال کا پتا چل جائے تو

سوچو تمہاری پوزیشن کتنی نازک ہوگی..... دیکھو میں تمہاری بہن ہوں..... کوئی دشمن نہیں.....“

”مت کہو خود کو میری بہن..... تم میری بہن ہرگز نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی کوئی بہن اپنی دوسری بہن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتی جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے..... بہنیں تو ایک دوسرے کی عزت کی محافظ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے عیبوں پر پردہ ڈالتی ہیں۔ تم کیسی بہن ہو کہ جس نے میری عزت کی دھجیاں بکھیر دیں۔ میرے شوہر اور میرے بچوں کے سامنے مجھے بدکردار اور فاحشہ ثابت کر دیا..... چوبیس سال پرانی غلط فہمی کو بھی میرا سابقہ معاشرۂ بنا کر پیش کیا..... مجھ سے نفرت تھی کم از کم میرے بچوں پر ہی ترس کھا لیتی۔ یہ تو سوچتی کہ ان کے سامنے ان کی ماں کی مٹی پلید کر رہی ہو..... نفرت کرنے لگے ہیں میرے بچے اور شوہر مجھ سے..... میری زندگی جہنم سے بھی بدتر ہو گئی ہے..... یہی چاہتی تھی نا تم..... اب تو تمہارے کلیجے میں یقیناً ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی.....“ میری آواز تلخ سے تلخ تر ہوتی جا رہی تھی۔

”نورین..... تم سارا ملبہ مجھ پر ڈالے جا رہی ہو۔ اپنی غلطی تمہیں نظر ہی نہیں آرہی..... تم ایسی غلطی کرتی اور نہ

میں ایسے الفاظ منہ سے نکالتی۔“ اب وہ بھی ترش لہجے میں بولی۔

”مہوش خدا کے لیے چلی جاؤ یہاں سے..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“ میں چلائی۔
 ”چلی جاتی ہوں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے بھی کوئی شوق نہیں تمہاری بکواس سننے کا۔“ وہ جانے کے لیے پلٹی تو

میں بولی۔

”مہوش جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا ہے، اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی..... اور میرا خدا بھی تجھے معاف نہیں کرے گا۔“ میں مسلسل روئے جا رہی تھی۔

”اگر تم جیسی عورت کو خدا معاف کر دے گا، جو غیر مردوں سے تعلقات رکھتی ہے تو پھر مجھے بھی معاف کر دے گا۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی تو میں پھر سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اس کی باتیں پھر سے میرے زخموں کو اُدیڑ کر رکھ گئی تھیں۔ فاریہ دوڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ ”امی کیا ہو گیا ہے۔ پلیز چپ کر جائیں۔“

اوپر سے جبار بھی آ کر کھڑا ہو گیا۔

”فاریہ جاؤ اپنی ماں کے لیے پانی لاؤ..... اور اسے یہ دوا کھلاؤ.....“ اس نے دوائی والا شاپر میرے پاس بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

”جی ابو۔“ وہ پانی لینے کے لیے گئی تو جبار بولا۔

”اپنے یار کے مرنے کا سوگ بند کرو..... میرے گھر اور بچوں پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ بڑی گہری محبت تھی اپنے محبوب سے..... اچھا ہوا حرا مزادہ خود ہی مر گیا..... اب تم اپنے دماغ سے اس کی محبت کا بخار اتار پھینکو..... گھر سنبھالو اور بچوں کو دیکھو..... یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولا اور باہر نکل گیا۔

رات کو شاہ زیب، زریں کو لے آیا۔ اس کے ساتھ صائمہ بھابی بھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر صائمہ بھابی مجھ سے لپٹ گئی اور زار و قطار رو روئے لگیں۔

”نورین تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ چند دنوں پہلے تک تو بھلی چنگی تھی۔ پھر اچانک ایسا کیا ہو گیا جو تم اس حال کو پہنچ گئی ہو۔“ وہ روتے روتے بولیں۔

”کچھ نہیں بھابی۔“ میں نقاہت سے بولی۔ ”بس یہ بخار ہی جان نہیں چھوڑ رہا۔“

وہ پیچھے ہٹی تو زریں میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”پھوپھو آپ اتنی پیار رہی ہیں اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں، آخر کیوں؟ کیا میں اب اس گھر کا حصہ نہیں۔“ وہ بھی رو رہی تھی۔

”مت رو چندا۔ میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”کیا خاک ٹھیک ہیں۔ آئینے میں خود کو دیکھیں ذرا۔“

”تمہیں اس لیے نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس لیے تمہیں پریشان نہیں کرنا

چاہتی تھی۔“ میں نے بہانہ بنایا۔

”بہت کر لیا آرام..... اب میں یہاں رہوں گی۔ آپ کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ اب آپ آرام کریں

گی۔“ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا۔

”او کے میری جان۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

صائمہ تھوڑی دیر بیٹھی اور چلی گئی۔ میرا بڑا دل چاہا کہ پوچھوں بلال بھائی کیوں نہیں آئے..... یا یہ پوچھوں کہ انہیں میرے بیمار ہونے کی خبر ہے یا نہیں..... مگر چپ رہی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ انہیں کسی نے میری حالت کے متعلق بتایا نہ ہو۔ پھر میں نے خود کو ڈانٹا کہ کیوں فضول کی آس لگا رہی ہوں جبکہ بلال بھائی جاتی دفعہ کہہ گئے تھے کہ میں ان کے لیے مر گئی ہوں تو پھر مرے ہوؤں کو کوئی کیوں ملنے آئے گا۔ میری آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔

زریں نے آتے ہی رات کا کھانا تیار کیا۔ سب کو کھلایا اور پھر میرے پاس آ بیٹھی۔ ابھی تک میرے دونوں بیٹے میرے سامنے نہیں آئے تھے۔

زریں میری ٹانگیں دبانے لگی اور پوچھنے لگی۔ ”پھوپھو آپ کے لیے کھانا لے آؤں۔“

”کیا بنایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”گو بھی گوشت۔“ اس نے جواب دیا۔

”دل نہیں چاہ رہا۔“ میں بے زاری سے بولی۔

”تھوڑا بہت کھالیں۔ کھائیں گی تو جلدی صحت یاب ہوں گی۔“ وہ بولی اور باہر نکل گئی۔

پھر وہ ٹرے میں کھانا لیے اندر آئی۔ اس نے کھانے والی ٹرے میرے سامنے رکھی اور لقمہ توڑ کر میرے منہ کی طرف بڑھایا۔ میں نے لقمہ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر منہ میں ڈالا اور پوچھنے لگی۔

”کیا سب نے کھانا کھالیا؟“

”ہاں سب نے کھالیا ہے۔ فاریہ کو بھی اپنی نگرانی میں کھلایا ہے۔“ وہ جانتی تھی کہ میں فاریہ کے کھانے پینے کے

متعلق بڑی فکر مند رہتی ہوں اس لیے اس نے فاریہ کے متعلق خصوصی طور پر بتایا۔

”شاہ زیب اور زوہیب نے بھی؟“ میں نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں، شاہ زیب، زوہیب اور ماموں جان نے بھی۔ آپ مطمئن ہو کر کھانا کھائیں۔“

میں کھاتے کھاتے سوچنے لگی۔ یعنی انہیں میرے ہاتھ کا پکا کھانا قبول نہیں تھا۔ زریں کے ہاتھ سے پکایا کھانا وہ بخوشی کھا سکتے تھے۔ میں نے دو چار نوالے لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔

”بس بیٹا..... برتن لے جاؤ۔“

”بس..... تھوڑا اور کھائیں نا..... آپ نے تو بہت کم کھایا ہے۔“

”بس..... دل نہیں چاہ رہا۔“

وہ برتن اٹھا کر باہر نکل گئی اور میں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔

.....☆.....

زریں نے میرا گھر سنبھال لیا۔ ویسے بھی اب میں کچھ بھی سنبھالنے کے قابل کہاں رہی تھی۔ سارا سارا دن سوچ میں کھوئی رہتی۔ خاور کی مختلف اوقات میں کبھی باتیں ذہن میں گردش کرتی رہتیں۔ کبھی اس کی کوئی بات یاد آتی تو مسکرانے

لگتی اور کبھی کوئی بات یاد آتی تو رونے لگتی۔

آہ خاور..... تم کتنی جلدی چلے گئے..... میں تمہیں کبھی مرتے دم تک بھول نہ پاؤں گی..... تم آج بھی مجھ میں زندہ ہو..... اپنی یادوں کی شکل میں اور ہمیشہ زندہ رہو گے۔

اب تو میرے دونوں بیٹے بھی مجھے مخاطب کرنے لگے تھے۔ پاس سے گذرتے ہوئے سرسری سا حال احوال پوچھ لیتے تھے۔ اب ان کے رویے میں میرے لیے وہ پہلی سی گرم جوشی اور محبت نہ رہی تھی۔ سچ کہا ہے کسی نے بلندی سے گر کر کوئی اٹھ سکتا ہے۔ مگر نظروں سے گرے ہوئے کبھی اٹھ نہیں کرتے۔

ممائی ہر روز ایک دو چکر لگا لیتی تھیں۔ مہوش نے اب مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔ ایک شام ٹی وی پر کوئی کامیڈی ڈراما چل رہا تھا۔ ہم تینوں لاؤنج میں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ فاریہ اور زریں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ زریں نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ڈراما ختم ہو گیا۔ فاریہ پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زریں نے اٹھ کر ٹی وی بند کیا مگر مجھے کسی بات کا احساس نہ ہوسکا۔ میں بدستور سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

زریں میرے پاس آ بیٹھی۔ اس نے میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھا تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
”پھوپھو..... آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے..... کون سا روگ لگ گیا ہے آپ کو..... جو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے آپ کو..... کیا مجھے نہیں بتائیں گی؟“ وہ بڑی نرمی اور اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔ میں خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولی۔

”میں جب سے واپس آئی ہوں۔ گھر کی فضا میں ایک عجیب سی سوگواری اور کھنچاؤ ہے۔ سبھی لوگ مجھے مجھ سے ہیں جبکہ آپ کی صورت حال سب سے زیادہ سیریس ہے۔ ماموں کا رویہ بھی آپ کے ساتھ انتہائی غیر مناسب ہے۔ آخر ایسی کون سی خطا ہو گئی ہے آپ سے..... مجھے بتائیں..... آپ کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور شاید میں آپ کو کوئی حل بھی بتا سکوں۔“

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”کچھ نہیں ہوا ہے..... تبہارا وہم ہے..... بالکل بے فکر ہو جاؤ۔“

”کیسے بے فکر ہو جاؤں۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔ ”جب میں گئی تھی تو گھر کا ماحول بڑا خوشگوار تھا اور آپ..... آپ کی تو عادت تھی نا..... بات بات پر خوب کھل کر ہنسنے کی..... اور اب..... اب میں نے آپ کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مسکراتا تو دور کی بات ہے..... آپ تو بات بھی نہیں کرتیں۔ بڑی مجبوری ہو تو لب کھولتیں ہیں..... مہوش پھوپھو کے ساتھ بھی بول چال بند ہے آپ کی۔ ان سے بھی بڑا کرید کرید کر پوچھا ہے کہ آخر اس لڑائی اور سرد مہری کی وجہ کیا ہے..... وہ ایک ہی بات کہتی ہیں کہ اپنی ساس سے جا کر پوچھو۔ دادی بھی لاعلم ہیں..... شاہ زیب بھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ آخر کوئی مجھے بتانا کیوں نہیں کہ اصل بات کیا ہے۔“ وہ باقاعدہ رونے لگی۔ مجھے اس پر بڑا پیار آیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

”میں نے کہا ہے نا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے

مزید اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چپ چاپ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

☆.....

اسی رات جبار دفتر سے آیا۔ وہ ہمارے پاس سے گذر کر کمرے میں چلا گیا۔ پھر چیخ کر کے باہر آیا اور مجھے آرڈر دیا۔ ”اٹھ کر میرے لیے کھانا لاؤ۔“ میرے اٹھنے سے پہلے زریں کھڑی ہو گئی۔

”تم بیٹھ جاؤ زریں۔“ وہ گرج کر بولا۔ ”میں نے اسے کہا ہے تو یہی جائے گی۔ میرا ہر کام یہ اپنے ہاتھ سے کرے گی۔ بہت کر لیا ہے اس نے آرام۔ چلو اٹھو جاؤ۔“

زریں بے چاری سہم کر بیٹھ گئی اور میں کچن میں جا کر کھانا ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ کھانا اس کے آگے رکھا تو وہ پھر دھاڑا۔ ”فرنج کھولو، اس میں ہیومیو پیٹھک ڈراپس پڑے ہیں وہ باہر نکالو۔ جب میں کھانا کھا لوں گا تو ایک گلاس پانی میں پندرہ ڈراپس ڈال کر مجھے دینا اور یہ آج سے تمہاری ڈیوٹی میں شامل ہے۔ جب بھی میں کھانا کھاؤں تمہارا کام ہے کہ ایک گلاس پانی میں تم نے یہ ڈراپس ڈال کر میرے آگے رکھ دینا ہے۔ دماغ کی بند کھڑکیاں کھول کر یہ بات سن لو۔ میں نے ہر کام ایک مرتبہ ہی کہنا ہے۔ کوئی بھی بات مجھے دہرائی نہ پڑے۔ ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی..... اور ہاں مجھے یہ بھی نہ کہنا کہ یاد نہیں رہا۔ اگر تمہیں بھول جانے کا ڈر ہے تو یہ بات کسی ڈائری میں لکھ لو۔ بہت بہانے بنالئے..... اب تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلنے والا۔ اپنے ذہن سے ساری انکرنکال دو۔“

میں چپ چاپ اس کی بکواس سنتی رہی۔ فرنج سے ڈراپس نکال کر پانی میں پندرہ قطرے گن کر ڈالنے لگی۔ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ ڈراپس کس چیز کے ہیں یا تمہیں کیا بیماری ہے۔

وہ کھانا کھا کر اور ڈراپس والا پانی پی کر باہر چلا گیا تو زریں جو حیران پریشان بیٹھی دیکھ رہی تھی، بول اٹھی۔ ”اُف..... ماموں کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کے ساتھ اتنا تو جین آمیز رویہ..... پتا نہیں آپ یہ سب کیسے برداشت کر لیتی ہیں۔“

اوپر سے شاہ زیب آگیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی امی؟“

”ٹھیک ہوں۔“ میں آہستگی سے بولی۔

”آج آپ اتنی دیر سے کیوں آئے ہیں۔“ زریں اس سے پوچھ رہی تھی۔

”بس..... ایک ضروری میٹنگ تھی..... کھانے میں کیا بنایا ہے۔“ وہ پوچھنے لگا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے یعنی فاریہ کے کمرے میں آ گئی۔ کیونکہ اب یہی میرا کمرہ تھا۔ اپنے کمرے سے تو جبار نے کب کا بے دخل کر دیا تھا۔

☆.....

رات کو سوتے ہوئے خواب دیکھا جو بہت ڈراؤنا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اور خاور ایک باغ میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے ہیں پھر اچانک بلال بھائی اور جبار کہیں سے آ جاتے ہیں۔ ہم دونوں خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ بلال بھائی اچانک نیپے میں اڑسا ہوا پستول نکال کر خاور پر تان لیتے ہیں۔ میں ان کی بہت منت سماجت کرتی

ہوں۔ بار بار یہی کہتی ہوں کہ خاور کی جان مت لیں۔ اس کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ بے قصور ہے۔ اگر جان لینی ہے تو یہی لے لیں مگر خاور کو چھوڑ دیں۔ بلال بھائی میری ایک نہیں سنتے۔ اُن کی آنکھوں میں اس وقت خون اتر رہا ہوتا ہے۔ پھر جبار لہتا ہے۔ بلال گولی چلاؤ۔ کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے تمہیں جو بتایا تھا وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب تو تمہیں یقین آ گیا ہے نا۔

پھر بلال بھائی یکے بعد دیگرے تین فار کرتے ہیں۔ جو خاور کے سینے میں لگتے ہیں۔ وہ خون میں لت پت گر کر تڑپنے لگتا ہے۔ میں چیختی چلاتی اس کی طرف دوڑتی ہوں تو جبار مجھے پکڑ لیتا ہے۔ وہ دونوں بازوؤں میں مجھے جکڑ لیتا ہے۔ میں اس کی آہنی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بری طرح زور لگاتی ہوں مگر ناکام رہتی ہوں۔ پھر بلال بھائی میری طرف بڑھتے ہیں۔ میرے پاس آ کر رک جاتے ہیں۔ چند منٹ قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورتے ہیں پھر اپنی جیب سے ایک رستی نکالتے ہیں۔ اس کا پھندا بنا کر میرے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر اس کی گرہ کو میری گردن پر کسے لگتے ہیں۔ پھر دونوں مجھے زمین پر گرا کر رستی کو پوری قوت سے کھینچتے ہیں۔ میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوں۔ میری آنکھیں باہر کو اٹنے لگتی ہیں۔ میں پوری قوت سے چلاتی ہوں۔ چھوڑ دو مجھے..... خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو.....

اچانک فار یہ مجھے جھنجھوڑنے لگی تو میں ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

”امی کیا ہو گیا آپ کو؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے کیا۔“ وہ میری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو رہی تھی۔ اتنی سردی کے باوجود میں پسینے میں شرابور تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑا ہوا تھا۔ فار یہ کو اپنے پاس دیکھ کر میں اس سے لپٹ گئی۔

”فار یہ مجھے بچالو..... یہ مجھے مار ڈالیں گے..... جیسے کنول کو ان لوگوں نے مارا تھا ویسے ہی مجھے ختم کر دیں گے..... پلیز مجھے بچالو۔“ میرا وجود خزاں رسیدہ ہونے کی طرح لرز رہا تھا۔

فار یہ نے پاس رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔ پانی پی کر میرا خشک حلق تر ہوا۔

”اب بتائیں..... ایسا کیا دیکھ لیا خواب میں..... جو یہ حالت ہو گئی آپ کی۔“ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں۔“ میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”فار یہ میرا دم گھٹ رہا ہے..... میں باہر جانا چاہتی ہوں.....“

”کیا..... اس وقت..... امی رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔“ وہ حیرت سے بولی۔ ”اور اس وقت اتنی ٹھنڈ میں کہاں جائیں گی آپ۔“

”میں چھت پر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے میری شال لا دو۔“ فار یہ جانتی تھی کہ میں کس شال کی بات کر رہی ہوں۔ کیوں کہ باہر نکلتے وقت میں صرف یہی شال استعمال کرتی تھی۔ فار یہ نے شال لا کر مجھے اوڑھادی۔ یہ وہی شال تھی جو خاور نے مجھے تحفہ بنا دی تھی۔ اس شال سے مجھے خاور کی محبت اور اپنائیت کی خوشبو آتی تھی۔ یہ شال اوڑھ کر مجھے خاور کی اپنے پاس موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

میں مثال اچھی طرح لپیٹ کر کھڑی ہو گئی اور کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج سٹائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگی۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو فار یہ میرے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

”تم کیوں میرے پیچھے آ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کا اکیلے اتنی رات کو چھت پر جانا ٹھیک نہیں۔“ وہ بولی۔

”مگر میں اس وقت اکیلی ہی جانا چاہتی ہوں۔ میں کھلی فضا میں تھوڑی دیر بیٹھوں گی اور پھر نیچے آ جاؤں گی۔

ویسے بھی مجھے اب اور کہاں جانا ہے۔ اسی جیل میں اپنی سانسیں پوری کروں گی۔“

وہ رک گئی اور میں اوپر چڑھ گئی۔ سیڑھیاں ادھر والے لاؤنج میں نکلتی تھیں۔ میں لاؤنج میں جا کر رک گئی۔ پھر چھت کی طرف کھلنے والے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ ہینڈل لاک تھا۔ چابی اس کے کی ہول میں ہی تھی۔ میں نے چابی کو گھمایا اور دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی بخ ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی۔ میں باہر چھت پر آ گئی اور لمبی لمبی سانسیں لے کر سینے میں دبی ہوئی گھٹن نکالنے لگی۔ پھر لاؤنج سے ایک کرسی کھینچ کر باہر لے آئی اور اس پر بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ چاند پورا گول تھا اور اس کی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور آنکھیں موند لیں۔ چادر کو میں نے اچھی طرح اپنے وجود پر پھیلا لیا تھا پھر فراز کا کہا ہوا یہ شعر زیر لب گنگٹانے لگی۔

بن اس کے زندگی درد ہے تنہائی ہے

میری آنکھوں میں کیوں موت سمٹ آئی ہے

کہتے ہیں لوگ عشق کو عبادت یارو

عبادت میں پھر کیوں اتنی رسوائی ہے

پھر ایک اور فراز کا شعر یاد آیا۔

اُترے جو تیری زندگی کی گہرائی میں ہم

محفل میں رہ کے بھی رہے تنہائی میں ہم

دیوانگی نہیں تو اسے اور کیا کہیں

تجھے ڈھونڈتے رہے اپنی ہی پرچھائی میں ہم

پھر خادر کا سنایا ہوا یہ شعر یاد آیا۔

پیاسا ہے دل اس کی محبت کے لیے

چھوڑا ہے جہاں کو اس کی محبت کے لیے

لوگ سوتے ہیں سکون سے

ہم نے کھویا ہے سکون اس کی محبت کے لیے

میں جو ہمیشہ جھنجھلا جاتی تھی کہ مجھے شعر کیوں یاد نہیں رہتے۔ آج خود بخود زبان پر آتے جا رہے تھے۔ جیسے یہ

شعر کہ۔

خاموش فضا تھی کہیں سایہ بھی نہیں تھا
اس شہر میں کوئی ہم سا تنہا بھی نہیں تھا
کس جرم میں چھینی گئی مجھ سے میری ہنسی
ہم نے تو کسی کا دل دکھایا بھی نہیں تھا
میں خاور کو یاد کر کے شعر پڑھتی رہی اور روتی رہی۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور جسم سردی سے اڑنے لگا تو
اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیچے آ کر دیکھا تو فاریہ گرم بستر میں دیکھی سو رہی تھی۔ میں بھی رضائی میں گھس گئی۔

.....☆.....

ایک دفعہ پھر میں جبار کے سامنے سوالی بن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ رات کا کھانا کھا کر باہر نکل گیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا
تھا کہ آج اس سے بات کروں گی اور قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ میں اس کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھی رہی۔
سب بچے اپنے اپنے کمروں میں جا کر بستر میں دبک گئے تھے۔ جبکہ میں لاؤنج میں بیٹھ کر جبار کا انتظار کر رہی تھی۔ دل
میں سوہوم سی امید تھی کہ شاید میرے صیاد کو مجھ پر ترس آ جائے اور وہ میری سزا میں تھوڑی تخصیص کر دے۔
تن تنہا رات کی تنہائی میں جبار کا انتظار کرنا بڑا تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ہاں اگر
ہاتھ میں کاغذ قلم ہوتا یا کوئی کتاب زیر مطالعہ ہوتی تو وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ میں جو کہتی تھی کہ پڑھنے اور لکھنے
کے بغیر میں زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی..... اب جی رہی تھی..... ہر چیز کے بغیر جی رہی تھی۔

زندگی وہی تھی جو تیری محفل میں گزار آئے جاناں
اب تو فقط جینے کی رسم ادا کرتے ہیں
قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر لاؤنج کا داخلی دروازہ کھول کر جبار اندر آیا۔ مجھے سامنے بیٹھا دیکھ کر ٹھنک گیا۔
پھر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو میں نے آواز دی۔ ”جبار بٹھریں..... مجھے آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔“
وہ چلتے چلتے رک گیا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا پھر پلٹ کر بولا۔ ”کہو۔“
”بیٹھ جائیں۔“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

وہ تھوڑی دیر متوش نظروں سے دیکھتا رہا پھر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
”جلدی کہو..... جو کہنا ہے..... مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ ساٹ لہجے میں بولا۔
”جبار پلیز..... مجھ پر عائد کردہ پابندیاں اب اٹھا لو۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ میں خود کو جیل میں قید، کسی قیدی کی
طرح محسوس کرتی ہوں..... میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔“ میں رونے لگی۔
”تو مر جاؤ..... تمہاری زندگی اب ہم سب کے لیے بے وقعت اور بے معنی ہے۔“ وہ سفاکی سے بولا۔
”اب تو خاور بھی مر چکا ہے..... اسے فوت ہوئے مہینہ ہونے کو آ رہا ہے..... اب تمہیں کسی چیز کا خطرہ ہے۔“
میں ہیکلی آواز میں بولی۔

”جب تک تم زندہ ہو..... مجھے تم سے خطرہ ہے۔ ایک عشق جوانی میں کیا تھا..... اور اب ایک بڑھاپے میں کر
چکی ہو۔ آئندہ زندگی میں کتنے کروگی..... کیا پتا..... تمہیں جب بھی باہر جانے کی آزادی مل گئی پھر کوئی نیا یا رڈھونڈ لوگی۔ اس

لیے اس خیال کو دل سے نکال دو کہ تمہیں کبھی باہر جانے کی آزادی ملے گی یا تمہیں کبھی زندگی بھر موہاں فون ملے گا۔“
 ”چلو ٹھیک ہے۔ میں کبھی باہر نہیں جاؤں گی..... کبھی موہاں رکھنے کی ضد نہیں کروں گی..... بس مجھے میری کتابیں، چشمہ اور قلم واپس کر دو۔ میں تم سے کبھی کچھ اور نہیں مانگوں گی..... چپ چاپ یہ قید کاٹ لوں گی۔ جانتی ہوں یہ قید میری زندگی کے اختتام پر ختم ہوگی..... مگر مجھ سے لکھنے پڑھنے کا حق مت چھینو۔ دیکھو..... جیلوں میں جو قیدی جاتے ہیں، اتنا حق تو انہیں بھی دے دیا جاتا ہے۔ انہیں جیل میں رہ کر بھی پڑھنے اور لکھنے کی سہولت دے دی جاتی ہے..... اگر وہ اصرار کریں تو..... تو پھر مجھے کیوں نہیں۔“ میں بولتے بولتے روہاںسی ہو گئی۔

”اس لیے کہ تمہارا جرم ان مجرموں سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔“ وہ رکھائی سے بولا۔
 ”کیا..... میرا جرم قتل سے بھی بڑا ہے۔“ میں چلائی۔

”ہاں، قتل سے بھی بڑا ہے۔ کسی کو جان سے مار دینے سے کہیں بڑا جرم کسی کے اعتماد اور بھروسے کا خون کرنا ہے۔ تم نے میرے اعتماد اور بھروسے کو قتل کیا ہے۔ اس لحاظ سے تمہاری سزا بھی سخت ترین ہوگی۔“
 ”ہر غلطی اور گناہ کے لیے معافی کا راستہ کھلا ہوتا ہے تو پھر میرے لیے کیوں نہیں؟“ میں باقاعدہ رونے لگی۔

”کچھ غلطیاں ناقابل معافی ہوتی ہیں۔“ وہ رعوت سے بولا۔ ”ویسے تم ہو بڑی بے شرم اور ڈھیٹ عورت۔ بجائے اپنے گناہ پر نادم ہونے کے..... مجھ سے بحث کر رہی ہو۔ پڑھنے، لکھنے کی اجازت طلب کر رہی ہو۔ تمہیں تو چاہیے..... نماز، جگنا نہ ادا کرنا اور ہر وقت مصلے پر بیٹھ کر اللہ سے اپنے گناہوں کی رورو کے معافی مانگنا مگر تم..... خدا کے آگے سجدہ ریز ہو کر رونے کے بجائے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے روتی رہتی ہو۔ نا عاقبت اندیش عورت تم نے اپنی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی خراب کر لی۔ اب بھی وقت ہے۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو.....“ وہ لمبا چوڑا لیکچر دے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چلا گیا اور میں وہیں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ دفعتاً میرے دل میں ایک اُبال سا اٹھا اور میں چلانے لگی۔

”نہیں مانگتی مجھے معافی..... میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گی..... خدا سے بھی نہیں..... اگر یہ گناہ عظیم ہے تو وہ انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہی کیوں کرتا ہے..... اور اگر انسان میں ایسے جذبات و دلیت کر دیئے تھے تو پھر اتنی سخت سزائیں کیوں.....“ میں ہسٹیر یا کی انداز میں چیخ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں میرے گرد میرے پیٹوں بچے اور بہو جمع ہو گئے۔ وہ مجھے سنبھال رہے تھے۔ پانی پلا رہے تھے۔ بھر میں تھک ہار کر نڈھال ہو گئی تو شاہ زیب اور فاریہ مجھے سہارا دے کر کمرے میں لائے اور بیڈ پر لٹا دیا۔



رفتہ رفتہ میری حالت میں تبدیلی آنی شروع ہو گئی۔ اب میں چیخنے چلانے کے بجائے خاموش رہنے لگی۔ اتنی خاموش کہ سب میری آواز کو ترسنے لگے۔ کوئی مجھ سے بات کرتا تو میں کھوٹی کھوٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگتی۔ بڑی مجبوری کی حالت میں کسی بات کا جواب دیتی..... وگرنہ خاموش رہتی۔ میری پیاری بیٹی مجھ سے باتیں کرنے کے لیے ترس جاتی۔ وہ اکیلی بولتی رہتی جب میں اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی تو وہ بھی چپ کر جاتی۔

بلال بھائی اپنے عہد پر قائم رہے۔ اس واقعے کے بعد نہ تو انہوں نے اپنی شکل دکھائی اور نہ میری صورت

دیکھی۔ زریں بڑی مستقل مزاجی سے میری خدمت کرتی اور گھر بھی دیکھتی..... مگر اب اس کی پوزیشن بھی بھاگ دوڑ والی نہ رہی تھی۔ اب فاریہ بھی اس کے ساتھ کچن کا کام کرنے لگی تھی۔

زریں کو نواں مہینہ شروع ہوا تو صائمہ بھابی حسبِ روایت اسے لینے آگئیں۔ میں نے تو کوئی اعتراض نہ کیا..... مگر زریں نے خود ہی جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے ماں سے کہا کہ امی میں یہاں ہی رہوں گی۔ اس گھر کو میری زیادہ ضرورت ہے۔

صائمہ نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ خاموشی سے چلی گئی۔ اب تو مہوش بھی آکر میرے پاس گھنٹوں بیٹھی رہتی..... مگر جب میں اس کی کسی بات جواب نہ دیتی تو اٹھ کر چلی جاتی۔ ممانی جان میری طرف دیکھ کر کڑھتی رہتیں اور بسا اوقات رونے بھی لگتیں۔ مجھ سے کرید کرید کر پوچھتیں کہ میں اتنی اُداس اور چپ کیوں رہتی ہوں..... مگر میں ان کا چہرہ دیکھے جاتی۔ آخر وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب میں دادی بن گئی۔ آدمی رات کے بعد زریں کو دروازہ کی تکلیف شروع ہوئی تو اس نے آکر مجھے جگایا۔ شاہ زیب بھی جاگ رہا تھا۔ میں نے شاہ زیب سے کہا کہ مہوش کو ساتھ لے جاؤ..... میں نہیں جاسکوں گی۔ وہ مہوش کو ساتھ لے گئے اور پھر فجر کے وقت زریں نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔ ممانی جان سن کر دوڑی دوڑی میرے پاس آئیں۔

”نورین..... تم دادی بن گئی ہو..... مبارک ہو..... تمہارے گھر پوتا پیدا ہوا ہے۔ ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ بڑا صحت مند اور گول منٹول سا ہے۔“ ممانی جان خوشی سے پھولی نہ سار ہی تھیں۔ میں سن کر مسکرانے لگی..... مگر منہ سے کچھ نہ بولی..... تو وہ جبار کے کمرے کی طرف جانے لگیں۔

”جبار کو بھی یہ خوشخبری دے دوں۔“ وہ جبار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگیں۔ فاریہ بھی یہ ہنگامہ سن کر اٹھ بیٹھی۔ وہ بھی بڑی ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔

”امی جان..... میں پھوپھو بن گئی ہوں.....“

”ہاں بیٹا..... تم پھوپھو بن گئی ہو۔“ میں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

”میں ابھی جا کر زوہیب بھائی کو جگا کر یہ خوشخبری دیتی ہوں۔“ وہ باہر کی طرف بھاگی۔

☆.....

بارہ بجے تک زریں اور شاہ زیب گھر آگئے اپنے بیٹے کے ساتھ..... جو مہوش نے اٹھایا ہوا تھا۔ میں اس وقت لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی جب وہ لوگ اندر داخل ہوئے۔ صائمہ بھابی نے زریں کو سہارا دے رکھا تھا جبکہ ننھے شہزادے کو مہوش نے اٹھا رکھا تھا۔ شاہ زیب بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر آیا۔ مہوش نے بچہ لا کر میری گود میں ڈال دیا۔

”مبارک ہو نورین.....“ مہوش کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

”تمہیں بھی.....“ میں آہستگی سے بولی۔

”دیکھو کتنا پیارا ہے..... بالکل شاہ زیب جیسا ہے..... ہے نا.....“ اس نے مجھ سے تائید چاہی۔

”ہاں..... شاید.....“ میں بولی۔

پھر شاہ زیب بولا۔ ”امی بہت بہت مبارک ہو آپ کو پوتے کی۔“

”تمہیں بھی شاہ زیب۔“

پھر صائمہ اور زریں نے بھی باری باری مجھے مبارک دی۔ اس کے بعد زریں اور صائمہ، زریں کے کمرے میں چلی گئیں..... جبکہ میں اور مہوش وہیں بیٹھی رہیں۔

”لومہوش..... اسے اس کی ماں کے پاس لے جاؤ۔“ میں نے بچے کو مہوش کی طرف بڑھایا۔ اسی اثنا میں فاریہ کمرے سے نکلی اور میری طرف لپک کر اس نے بچے کو اٹھالیا۔

”ہائے..... کتنا پیارا ہے.....“ وہ جھنجھکے کا منہ چومتے ہوئے بولی۔ ”ہے نا امی..... کتنا کیوٹ ہے..... دل چاہتا ہے بس دیکھتی ہی رہوں۔“ وہ بڑے والہانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ”میں ابھی ابو کو دکھا کر لاتی ہوں۔“ وہ بچے کو لے کر باپ کے کمرے میں چلی گئی۔

☆.....

اسی رات غفار میرے پاس آیا۔ میں بستر میں لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ کمرے میں آیا تو مجھے متوجہ کرنے کے لیے گلا کھٹکھارنے لگا۔ میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیسی ہونورین؟“ وہ میری طرف بغور دیکھ رہا تھا۔

”اچھی ہوں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”لگ تو نہیں رہی۔“

میں خاموش نظریں جھکائے بیٹھی رہی تو پھر بولا۔ ”کبھی شکل دیکھی ہے آئینے میں..... کتنی ڈراؤنی ہو گئی ہو۔“

وہ میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”ایسا کیا دکھ ہے تمہیں..... کون سا روگ لگا بیٹھی ہو جو تمہیں اندر ہی اندر دکھائے جا رہا ہے..... کسی کو بتا کیوں

نہیں دیتی۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”میری باتوں کا جواب دونورین..... کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ..... کیا میں اس قابل نہیں کہ تم مجھے اپنے دل

کی بات بتا سکوں۔“ وہ روہانسا ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”پلیز نورین..... اس طرح اپنے آپ کو ختم مت کرو۔ زندگی کی طرف لوٹ

آؤ..... دیکھو اب تو اللہ نے تمہیں اتنے خوبصورت تحفے سے نوازا ہے..... مجھے لگتا ہے میری باتوں کا تم پر کچھ اثر نہیں

ہونے والا..... اس لیے چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا..... چند لمحے کھڑا میری طرف دیکھتا رہا پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے

بعد میں اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میرے دماغ میں اس کا کہا گیا فقرہ گونجنے لگا۔

کبھی شکل دیکھی ہے آئینے میں..... کتنی ڈراؤنی ہو گئی ہو۔ میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی اور یہ شعر زبان

پر آتے آتے رہ گیا۔

بکھرے بال، سرخ آنکھیں، زرد چہرہ کون ہو تم؟

آج اپنے ہی عکس سے یہ سوال کر بیٹھے

☆.....

شاہ زیب کے بیٹے کا نام جبار نے ”علی“ رکھا۔ ابھی علی صرف سوا سال کا ہوا تھا کہ زریں پھر سے امید سے ہو گئی۔ جبار جب آفس سے آتا تو آتے ہی علی کو اٹھالیتا۔ وہ گھر بھر کی آکھ کا تارا تھا۔ میں بھی اسے گود میں اٹھائے نکلتی رہتی، مگر جب اس کے ساتھ باتیں نہ کرتی تو وہ محل کرچے اترنے کی ضد کرتا۔

سب سے زیادہ وہ زوہیب کی سنگت میں خوش رہتا اور پھر زوہیب نے ایک دن یہ خبر سنا کر سب کو چونکا دیا کہ وہ نیوزی لینڈ جا رہا ہے۔ سب نے منع کیا مگر میں خاموش رہی۔ اس نے ویزہ لگوا لیا۔ ساری تیاری مکمل کر لی اور پھر اس کی روانگی کا دن آن پہنچا۔ سب کو ملنے کے بعد میرے پاس آیا۔

”امی..... میں جا رہا ہوں۔“ وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں خاموش اس کی طرف دیکھتی رہی تو پھر بولا۔ ”اپنا خیال رکھیے گا..... اور مجھ سے جانے انجانے میں جو جو غلطیاں کوتاہیاں ہوئی ہیں، ان کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں..... معاف کر دیا ہے نا آپ نے.....“ وہ پوچھنے لگا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میرے حق میں دعا کیجئے گا۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلکے سے دبا یا۔

میں خاموش رہی تو وہ کھڑا ہو گیا۔

”اچھا امی..... خدا حافظ.....“ اس نے میرا ہاتھ اٹھایا اور چوم لیا..... پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں اس کو جاتا ہوا دیکھتی رہی پھر مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

☆.....

علی دو سال کا ہوا تو شیزا آ گئی۔ شیزا کی آمد بھی مجھے ہنسنے بولنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ بلکہ میری خاموشی اور زیادہ گھمبیر اور گہری ہو گئی۔

شیزا ابھی دو ماہ کی ہوئی تھی، جب میری طبیعت بہت زیادہ بگڑنے لگی۔ پورے جسم پر لال لال دھبے سے پڑنے لگے۔ تیز بخار ہر وقت رہنے لگا۔ شاہ زیب مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے ساری علامات دیکھ کر ٹیسٹ لکھ دیئے۔ تیسرے دن رپورٹس ملیں تو یہ انکشاف ہوا کہ میں بلڈ کیفرس کی مریضہ ہوں۔

یہ انکشاف میرے علاوہ ہر کسی کے لیے روح فرسا تھا۔ فاریہ اور شاہ زیب نے رورو کے اپنی حالت خراب کر لی مگر میں مطمئن تھی۔ بالآخر میری سزا ختم ہونے کا وقت آ ہی گیا۔ غفار اور مہوش بھی میری بیماری کا سن کر بہت پریشان اور آزرده تھے۔ مہوش خود بھی اب بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے شوگر کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر اور ہائی کولیسٹرول کی بیماری بھی تھی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جبار کے چہرے پر بھی میری بیماری کا سن کر شرمندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ وہ اب بہانے بہانے سے مجھے مخاطب کرنے لگا..... مگر میں اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی۔

پھر جبار اور شاہ زیب نے میرا علاج شروع کر دیا..... جو بہت مہنگا اور تکلیف دہ تھا۔ دوران علاج میرے جسم کے ہر حصے سے بال جھڑ گئے۔ اب میرے سر پر رومال باندھ دیا جاتا تھا۔

میں نے شاہ زیب کو سختی سے منع کیا تھا کہ میری بیماری کی خبر زوہیب کو نہ دی جائے۔ جب بھی اس کا فون آتا ”سب خیریت ہے“ کی اطلاع دی جاتی۔

اب جبار آ کر میرے پاس وقتاً فوقتاً بیٹھ جاتا۔ مجھ سے باتیں کرتا۔ جب میں کوئی جواب نہ دیتی تو افسوس ناک نظروں سے مجھے دیکھتا رہتا..... پھر سر جھکائے اٹھ کر چلا جاتا۔ آج بھی میں سر جھکائے بستر میں بیڑ کر اؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ جبار آ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔

”کیسی ہو؟“ اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اگر چاہو تو کتا میں وغیرہ پڑھ لیا کرو۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر تسخیرانہ انداز میں مسکرانے لگی۔

”جانتا ہوں..... مجھ سے بہت ناراض ہو..... میں نے شاید کچھ زیادہ ہی سخت رویہ اختیار کر لیا تھا۔“

میں لفظ ”شاید“ پر دل میں ہنسی۔

”دیکھو..... ساری پرانی باتیں بھول جاؤ۔ میں بھی بھول گیا ہوں..... تم تندرست ہو جاؤ گی تو پھر سے نئی زندگی شروع کریں گے۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں نے کھینچ لیا۔

”دل چھوٹا مت کرو۔ میں تمہارا علاج کروا رہا ہوں نا۔ انشاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں بچانے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہا دوں گا۔“

”مگر کیوں.....“ میں نے پہلی بار لب کھولے تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ”میری زندگی کی ضرورت کسے ہے۔ میرا جینا اور مرنا بالکل بے وقعت اور بے معنی ہے۔“ میری آواز بھرا گئی۔

”ایسا مت کہو نورین۔“ وہ تڑپ کر بولا۔ ”وہ سب غصے میں کہی گئی باتیں ہیں۔ ہم سب کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہے..... تم بولا کرو..... باہر چلی جایا کرو..... ہر جگہ ہر کہیں..... تم پر کوئی پابندی نہیں..... تم بالکل آزاد ہو۔“ وہ رونے لگا پھر آنسو پونچھ کر بولا۔ ”نورین میں نے تمہارے جرم سے زیادہ تمہیں سزا دی ہے۔ آئی ایم سوری نورین۔“

”آج پھر تم نے بہت دیر کر دی جبار..... ہمیشہ کی طرح۔ اب تو جینے کی خواہش ہی باقی نہیں رہی اور ویسے بھی کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ موت سے لوگ خواہ مخواہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں..... حالانکہ تکلیف تو زندگی دیتی ہے۔“ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سر گھٹنوں میں دے دیا۔

ہم سے زندگی کی حقیقت نہ پوچھو جاناں
بہت پر خلوص لوگ تھے جو تنہا کر گئے

☆.....

دوسرے دن بلال بھائی ندامت زدہ چہرہ لیے میرے سامنے کھڑے تھے۔

”نورین کیسی ہو؟“ وہ پڑمرہ لہجے میں بولے۔

”ابھی تک زندہ ہوں..... اگر سانسوں کی آمد و رفت کا نام زندگی ہے..... تو پھر میں زندہ ہوں۔“

میرا جواب سن کر وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔

”تمہارا علاج چل رہا ہے..... ٹھیک ہو جاؤ گی..... کینسر اب قابلِ علاج مرض ہے۔“ وہ کمزوری آواز

میں بولے۔

”کیا واقعی۔“ میں ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرائی۔ ”آپ کو یقین ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“
 ”ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ انک انک کر بولے۔

”اور اگر میں ٹھیک ہونا ہی نہ چاہوں تو.....“ میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”بس ایک بات کا فیصلہ نہیں کر پار ہی.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کس بات کا؟“ بلال بھائی نے پوچھا۔

”یہی کہ کنول کی موت زیادہ اذیت ناک تھی کہ میری۔ آپ بتانا پسند کریں گے۔“
 ”کیسی باتیں کر رہی ہوں؟“ وہ جڑبڑ ہو کر بولے۔

”اتنا آسان جواب تو ہے اس سوال کا..... اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو میں بتاتی ہوں۔“

میری موت..... کنول کی موت سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہے۔ اسے مرنے میں شاید پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے..... مگر میری موت تو سالوں پر محیط ہو گئی۔ ہر دن، ہر پل مجھے موت جیسی اذیت سے گذرنا پڑا ہے..... آپ نے ہی مجھے جبار کے حوالے کر کے اسے کھلی چھٹی دی تھی نا کہ وہ میرے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ چاہے تو ایک ہی جھگڑے میں میری جان لے لے اور اگر چاہے تو اذیت دے دے کر آہستہ آہستہ مارے..... اب یہ تو اس کی مرضی پر ڈیپنڈ کرتا تھا نا کہ وہ کس طریقے سے مجھے مارنا پسند کرے گا اور چونکہ وہ اذیت پسند تھا..... اس لیے اس نے طریقہ نمبر دو کا انتخاب کیا۔ اس طرح مارنے سے اسے دو فائدے حاصل ہوئے۔ نمبر ایک ہر روز، ہر لمحہ میری عزت نفس کو مجروح کر کے اپنی انا اور مردانہ غیرت کو تسکین پہنچاتا رہا اور نمبر دو اس طرح مارنے سے اس پر کوئی قانونی دفعہ بھی عائد نہیں ہوتی..... ہے نا۔“ میں نے اپنی بات کی تائید چاہی تو بلال بھائی بلک بلک کر رونے لگے۔

”بس کرو نورین..... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔“

”اب آپ جاسکتے ہیں..... آپ میرے لیے کب کے مر چکے ہیں۔“ وہ اٹھ کر چلے گئے تو میں ہانپتی ہوئی لیٹ گئی۔



میرا علاج چل رہا تھا..... مگر مرض میں کوئی افاقہ نہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میں نے جینے کی خواہش چھوڑ دی ہے..... اس لیے دوائیں بھی اثر نہیں دکھا پا رہیں۔ اسی دوران جبار ہارٹ اٹیک آنے سے دارفانی سے کوچ کر گیا۔ وہ رات کو سویا تو صبح اٹھ ہی نہ سکا۔ شاہ زیب نے جا کر بلایا جلا یا تو پتا چلا کہ وہ رات کو سوتے ہوئے موت کی دادی میں اتر گیا تھا۔

جبار کی موت پر نہ تو مجھے کوئی صدمہ محسوس ہوا اور نہ میری آنکھوں میں آنسو آئے۔ میں چپ چاپ پتھر کا بت بنی دیکھتی رہی۔

جبار کی موت کا صدمہ ممانی نے ایسا دل پر لگایا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ بھی اس کے پاس چلی گئیں۔ میں اب بھی رونے دھونے کے بجائے چپ چاپ سب کچھ دیکھتی رہی۔ آخر میں نے اپنا علاج روک دیا۔ جب موت ہی مقدر ہے تو پھر اس سے بھاگا کیوں جائے۔ شاہ زیب نے بہت اصرار کیا مگر میں نہ مانی۔

اور آج میں اتنے سالوں بعد اپنے گھر سے باہر اپنی مرضی سے نکلی تھی۔ قبرستان گئی تھی۔ وہاں پہلی بار خاور کی قبر پر جا کر فاتحہ خوانی کی تھی..... پھر جبار کی قبر پر حاضری دی..... اور اب گھر واپس آ کر بے پناہ تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ جبار کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی۔

باہر بارش ابھی تک پورے زور و شور سے ہو رہی تھی۔ فاریہ نے کمرے میں تھوڑا سا دروازہ کھول کر جھانکا تو میں نے فوراً آنکھیں موند لیں۔ اس نے مجھے سوتا ہوا سمجھ کر کمرے کی لائٹ بند کر دی اور زیرو واٹ کا بلب روشن کر دیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی تو میں پھر سے سوچوں میں کھو گئی۔

پھر میرے کانوں میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو دروازہ بند تھا تو پھر یہ کس کے قدموں کی آہٹ ہے جو میرے بیڈ کے پاس آ کر معدوم ہو گئی ہے۔ اوہ..... اب سمجھی..... یہ ملک الموت کے قدموں کی آہٹ ہے..... جو میری جان قبض کرنے آیا ہے۔ میں مسکرانے لگی..... تو آخر جانے کا وقت آ ہی گیا۔

اندر سے تو کب کے مر چکے ہیں ہم فراز

اے موت اب تو بھی آ جا کہ لوگ ثبوت مانگتے ہیں

عورت مینا کماری ہو یا نورین فلک ناز، ان کی قسمت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ ایک اپنے دور کی سپر اسٹار اور لاجواب اداکارہ تھی۔ ایک زمانہ اس کا پرستار تھا۔ دوسری ایک روایت پسند اور قد امت پسند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر گھٹ گھٹ کر چھینا اور سسک سسک کر مرنا دونوں کا مقدر ٹھہرا۔

☆.....